حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ کی کتاب

اُصولُ الافتاءِ و آدابُہ

کا آسان ترجمہ، تشریح

فتوٰی

تعارف ● اُصول ● آداب

فتوٰی کی اہمیت، تاریخ اور پس منظر، فقہ اسلامی کی بنیادیں، تقلید و اجتہاد
اجماعی مسائل کی نزاکت، مقاصد شریعت، ڈیڑھ سو سے زائد فقہاء و علماء کا تعارف
اور راہنما واقعات سمیت دیگر اہم علمی و فکری مباحث

مولانا محمد منصور احمد

ادارہ اسلامیات
کراچی ـــ لاہور

عالم اسلام کے عظیم فقیہ اور مفتی کے گرانقدر علمی تجربات کا نچوڑ

شیخ الاسلام حضرت مفتی **محمد تقی عثمانی** حفظہ اللہ تعالیٰ

کی تصنیف اصول الافتاء و آدابہ

کا آسان ترجمہ و تشریح

فتویٰ

تعارف • اصول • آداب

فتویٰ کی اہمیت، تاریخ اور پس منظر، فقہ اسلامی کی بنیادیں، تقلید و اجتہاد

اجماعی مسائل کی اہمیت، مقاصد شریعت، ڈیڑھ سو سے زائد علماء و فقہاء کا تعارف

اور راہنما واقعات سمیت دیگر اہم علمی و فکری مباحث

مولانا محمد منصور احمد
فاضل وسابق مدرس جامعہ دار العلوم کراچی

ادارۂ اسلامیات
کراچی، لاہور

نام کتاب .... فتویٰ، تعارف، اصول، آداب

مؤلف .... مولانا محمد منصور احمد

ناشر .... ادارۃ المقصود
+92-3212039293
+92-3143030313

صفحات 615

اشاعتِ اول .... شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

ملنے کے پتے:

- ادارہ اسلامیات، اردو بازار، کراچی
- ادارہ اسلامیات، ۱۹۰/ انارکلی، لاہور
- ادارہ اسلامیات، دینا ناتھ مینشن' مال روڈ، لاہور

پاکستان بھر کے معیاری کتب خانوں سے دستیاب ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اپنے اساتذہ کرام کے نام

جن کے دروس میں بیتے ہوئے لمحات میری زندگی کا قیمتی ترین اثاثہ ہیں

اور

جن کے نقوشِ قدم میرے لیے چراغ راہ ہیں

رحم الله من توفی منهم و بارک فی صحة و حیاة من هو باق منهم

(آمین ثم آمین)

دعا و اجازت

کتاب کی تکمیل کے بعد بندہ نے حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی خدمت میں مسوّدہ اور ایک طویل عریضہ بھیجا۔ آپ نے اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد جو جواب تحریر فرمایا اُس کے آخری دعائیہ کلمات آپ ہی کے قلم سے نذرِ قارئین ہیں:

آپ نے ماشاء اللہ کام
مکمل کر لیا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ نافع
ہوگا۔ بندہ کی طرف سے اجازت بھی ہے
اور دعا بھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ
اسے نافع اور مقبول بنائیں۔ آمین

[illegible]

بندہ کو اس سے جامعہ دارالعلوم کراچی میں تخصص سالِ اول کے دوران ایک استفتاء پر آپ کے قلم سے لکھا ہوا یہ جملہ یاد آ گیا، جو ویسے تو ایک معمول کی کاروائی سے متعلق ہے لیکن بندہ کیلئے یہ ایک تبرک اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ کی یادگار ہے۔

مولوی منصور احمد صاحب!
اس حدیث کی تحقیق کرکے
احقر کو مطلع فرمائیں

فتوی

• تعارف • اُصول • آداب

کی ترتیب ایک نظر میں

1 ......" اصول الافتاء و آدابه " کا مکمل ترجمہ

2 ......ابواب کی ترتیب سے ہر باب کے بعد مکمل اور مفصل حوالہ جات۔

3 ......البلاغ، مفتی اعظم رحمہ اللہ نمبر سے حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کا مضمون بعنوان "فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں"۔ نیز حضرت حکیم الامت، مجدد الملّۃ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے چند راہ نُما واقعات۔

4 ......"تشریحات" کے عنوان سے کتاب کے چند مقامات اور فقہی مسائل کی وضاحت مثلاً "توقیع کا مفہوم" "تحقیق المناط وغیرہ کا مفہوم"۔

5 ......کتاب میں مذکور ڈیڑھ سو سے زائد غیر معروف علماء وفقہاء کا تعارف۔

6 ......تین فہرستیں:

الف ...... فهرس الآيات الكريمة .

ب ...... فهرس الاحاديث النبوية و آثار الصحابة رضی اللہ عنہم.

ج ...... فهرس المسائل الفقهية .

قارئین کرام پہلے یہ پڑھیں

1 ......ترجمہ میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ غیر عربی دان قارئین اس کو مستقل کتاب کے طور پر پڑھ سکیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ اصل کے قریب تر ہی نہ ہو بلکہ جملوں کی ترتیب اور ترکیب بھی حتیٰ الوسع باقی رہے۔

2 ......کتاب کے ترجمہ کے دوران قوسین ( ) میں لکھی ہوئی عبارت اکثر و بیشتر مترجم کی طرف سے اضافہ ہے۔ اگر کہیں یہ عبارت' عربی حاشیہ کا ترجمہ ہے تو وہاں واضح طور پر ''از حاشیہ'' لکھ دیا گیا ہے۔

3 ...... بعض حوالہ جات جو نامکمل تھے، انہیں مکمل کر دیا گیا ہے تا کہ یکسانیت برقرار رہے۔ اس مقصد کے لیے بحمد للہ تعالیٰ تقریباً تمام اصل کتب سے مراجعت کی گئی ہے۔ اصل کتاب میں ''ح نمبر'' سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ قارئین ہر باب کے آخر میں ترتیب وار یہ حوالہ جات ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

4 ......جو امور مجھ جیسے طالب علم کیلئے قابل وضاحت ہو سکتے تھے، انہیں کتاب کے آخری حصہ ''تشریحات'' میں واضح کر کے ماخذ کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔ اس حصے میں جو مسائل صرف اہلِ علم کے لیے کارآمد ہیں، ان کی عربی عبارات کو ہی برقرار رکھا گیا ہے۔ اب اصل کتاب میں جہاں **تشریحات نمبر** لکھا ہو، اسے اسی حصہ میں قارئین دیکھ سکتے ہیں۔

5 ......بہت سے مقامات پر آسانی کیلئے نمبرات دیئے گئے ہیں اور نئے پیراگراف بھی بنائے گئے ہیں۔

6 ......قواعد رسم المفتی کے اجراء کیلئے باحوالہ فقہی مثالوں کا اضافہ ذکر کر دیا گیا ہے۔

7 ......قارئین کی آسانی کیلئے عربی کتب کے نام اور چند مشکل الفاظ، عربی رسم الخط میں ہی لکھے گئے ہیں۔

8 ......حواشی میں ذکر کیے گئے ۱۶۲ شخصیات کے تلخیص شدہ حالات، آسان اردو میں مستقل حصہ کے طور پر کتاب کے آخر میں بالترتیب "**تراجم الاعلام** یعنی تعارفِ شخصیات" کے عنوان سے لکھے گئے ہیں۔ اصل کتاب میں جس شخصیت کے ساتھ "**ت نمبر**" لکھا ہو، ان کے حالات اسی حصے میں متعلقہ نمبر پر دیکھنے چاہئیں۔

9 ......اصل کتاب سے آیت، حدیث، اثر اور فقہی مسئلہ (جس کا کتاب میں کہیں مجمل یا مفصل ذکر آیا ہے) نکالنے کیلئے تین فہرستیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

☆......☆......☆

پہلی بات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و علی آلہٖ و صحبہٖ اجمعین

امابعد !

اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے بندہ کو کافی عرصہ سے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور خطباتِ جمعہ کے ذریعے دینی خدمات کا موقع ملا ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں کئی اعتبار سے عوام سے بھی رابطہ رہتا ہے اور اُن کی باتیں پڑھنے، سننے اور سمجھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔

بہت سے قابلِ احترام دوست واحباب جنہوں نے مختلف دینی موضوعات پر از خود مطالعہ کیا ہوتا ہے، یا مختلف عصری اداروں سے اسلامی معلومات پر مبنی کورس کیا ہوتا ہے، وہ فتویٰ، تقلید، اجتہاد، عُرف، علّت، حاجت، ضرورت، مقاصدِ شریعت اور دیگر ایسے گہرے سنجیدہ علمی موضوعات پر "ناقص لٹریچر" پڑھنے کی وجہ سے چند در چند غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور مستند وباحوالہ بات کے بغیر، صرف وعظ ونصیحت سے یہ حضرات ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہوتے۔

ان کی طرف سے دینی مسائل میں رائے زنی ایک عام بات ہے، جسے یہ اپنے خیال میں "اجتہاد" سمجھتے ہیں۔ پھر جب جسارت زیادہ بڑھتی ہے تو بسا اوقات امت مسلمہ کے متفقہ اور اجماعی مسائل پر بھی تیشہ زنی کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ ہندوپاک کے ایک معروف مقرر، جو اپنے فی البدیہہ جوابات اور غیر مسلموں کے ساتھ بحث ومباحثہ کی بدولت کافی عرصہ تک الیکٹرانک میڈیا پر چھائے رہے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"فتویٰ دینے کی اجازت ہر کسی کو ہے کیونکہ فتویٰ دینے کا مطلب ہے اپنی رائے دینا"۔

حالانکہ قرآن وسنت کا ایک ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے کہ فتویٰ دینا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کیلئے ''اہل افتاء'' میں سے ہونا ضروری ہے۔ ہر کس و ناکس جسے علومِ دینیہ میں کوئی مہارت نہ ہو اُسے فتویٰ جاری کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو گمراہی کے دروازے کو مکمل طور پر کھول دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ یہی چاہتے ہیں۔

ایک عام مسلمان جسے اپنے دین سے کچھ بھی لگاؤ ہو وہ بھی جانتا ہے کہ خدمتِ اسلام کے مختلف میدان ہیں جو سب ہی اپنی اپنی جگہ نہایت اہم اور ضروری ہیں لیکن ان خدماتِ دینیہ میں سے افتاء یعنی فتویٰ دینے کا کام جتنا نازک اور حساس ہے شاید کوئی اور کام اتنی نزاکت کا حامل نہیں ہے۔

ایسے میں اردو زبان میں فتویٰ اور اُس کے متعلقہ مباحث پر ایک مستند کتاب کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی جو ایسے احباب کی خدمت میں پیش کی جاسکے۔ تاکہ مکمل صورت حال جاننے کے بعد یا تو اس عظیم کام کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرلی جائے، جیسے دنیا کے تمام دیگر شعبوں مثلاً میڈیکل، قانون، انجینئرنگ کے لیے مطلوبہ معیار پر پورا اترنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بس میں نہ ہو تو اس بھاری پتھر کو چوم کر ہی چھوڑ دیں اور از خود ہی اس سے دستبردار ہو جائیں۔

استاذِ محترم حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی کتاب "**اصول الافتاء و آدابہ**" جب بندہ کی نظر سے گزری تو اسے متعلقہ تمام مباحث کیلئے کافی وشافی پاکر بندہ نے اس کا ترجمہ شروع کردیا تاکہ اردو خواں طبقہ بھی اس عظیم علمی خزانے سے مستفید ہوسکے۔ اس کتاب میں ہر بات چونکہ ٹھوس دلائل کی بنیاد پر افراط وتفریط سے ہٹ کر تحریر کی گئی ہے اس لیے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ یہ بہت سے بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔ **ان شاء اللہ تعالیٰ** ۔

اسی طرح یہ کتاب ان علماء کرام اور طلبہ کرام کے لیے بھی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔ مفید ثابت ہوگی، جو بوجوہ اردو میں فتویٰ کے بارے میں کتاب پڑھنا چاہتے ہوں۔ اس موضوع پر اگرچہ پہلے بھی چند وقیع کتب اردو میں موجود ہیں لیکن اتنی مفصل، مدلل اور مستند کتاب اس حوالے سے بندہ کی نظر سے نہیں گزری۔ کتاب کے آخری حصے میں استفتاء یعنی فتویٰ پوچھنے کے بارے میں جو آداب اور ہدایات لکھی گئی ہیں وہ تو عام مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مفید اور اہم ہیں۔

افتاء کے میدان میں حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی گرانقدر اور بے مثل خدمات کا اعتراف عرب وعجم میں کیا جاتا ہے۔ عالمِ عرب میں مختلف فقہی اداروں کے مناصب اور آپ کی کتب اور مقالات کی وہاں پذیرائی کے علاوہ بندہ

کے پاس مسجدِ نبوی شریف (علیٰ صاحبه الف الف صلاة و سلاماً) اور مدینہ یونیورسٹی کے مدرّس فضیلۃ الشیخ دکتور محمد صالح حفظہ اللہ تعالیٰ کا وہ قلمی خط بھی موجود ہے، جس میں انہوں نے حضرت دامت برکاتہم کو "ابو حنیفة هذا الزمان" کے وقیع لقب سے یاد کیا ہے۔

حضرت مصنف دامت برکاتہم کا افتاء کے کام سے طویل تعلق اور بے مثال مہارت کی بناء پر آپ کی یہ کتاب صرف نصوصِ قرآن وسنت، آثارِ صحابہ اور متقدمین ومتاخرین سے منقول اقوال کا بہترین مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس شعبہ میں آپ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار بھی ہے۔

اہلِ علم کتاب کے مندرجہ ذیل مقامات مطالعہ فرما کر بندہ کی اس رائے سے ضرور اتفاق فرمائیں گے۔

(۱)...... طبقات الفقهاء کے بیان میں ایک عمدہ اور بہترین توجیہ۔ ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۱۳۲۔

(۲)...... طبقات المسائل کے ذیل میں المحیط البرهانی اور المحیط الرضوی کا تجزیہ۔ دیکھیں صفحہ ۱۶۵ و ۲۰۴۔

(۳)...... تلخیص قواعد رسم المفتی کی یوں تو پوری بحث ہی بالکل اچھوتے طرز پر ہے، بالخصوص آٹھویں قاعدے کے اختتام پر فقہاء کی ذکر کردہ وجوہ ترجیح کے بارے میں تبصرہ تو قابلِ دید اور لائق داد ہے۔ دیکھیں صفحہ ۲۱۸۔

(۴)...... تلفیق کی بحث میں اس کے جواز کی جو نسبت ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اور ابو سعود رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کی جاتی ہے، اُس کی مکمل تحقیق۔ دیکھیں صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۷۔

(۵)...... بحث اشتراط الاجتهاد فی الصدر الاول مسائل مجتہد فیہا میں قضاء کے ذیل میں "الدر المختار" اور "ردالمحتار" کی مختصر القدوری کی طرف ایک قول کی نسبت اور پھر اُس کی تحقیق۔ دیکھیں صفحہ ۲۶۸۔

(۶)...... تعامل کی بناء پر ترکِ قیاس اور تخصیصِ نص کی مختلف صورتوں کی تطبیق و توجیہ۔ دیکھیں صفحہ ۳۱۳۔

(۷)...... مشائخ بلخ کے قول کی عمدہ توجیہ۔ دیکھیں صفحہ ۳۱۳۔

(۸)...... حاجت اور ضرورت کے مراتب اور ان کے احکامات کے بارے میں اہم تنبیہات۔ دیکھیں صفحہ ۳۲۶۔

(۹)...... مفتی کو اپنی فتویٰ میں حکم کے ساتھ دلیل لکھنی چاہیے یا نہیں۔ ٹھوس اور معتدل رائے۔ دیکھیں صفحہ ۳۸۸۔

(۱۰)...... ان کے علاوہ دیگر بہت سی بکھری ہوئی مباحث کی بہترین ترتیب وتدوین بھی قارئین دیکھیں گے کہ صرف اسی کتاب کی خصوصیت ہے۔ ایسی کئی ابحاث تو متعدد صفحات پر مشتمل ہیں، مثلاً بحث عرف وتعامل۔

اصل مقصد تو اس کتاب کا صرف آسان ترجمہ لکھنا ہی تھا لیکن اپنی طالب علمانہ عادت سے مجبور ہو کر بہت کچھ مزید مفید اضافہ جات بھی ساتھ جمع کر دیئے ہیں، جن سے اب ہمارے عزیز طلبہ ''اردو شرح'' کا کام بھی لے سکتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ ترجمہ ''خاک'' کو ''عالم پاک'' سے ملانے اور ''ریشم'' میں ''ٹاٹ'' کا پیوند لگانے کی جسارت ہے۔ اسی طرح یہ بندہ اپنی کم علمی اور کم فہمی سے خوب آگاہ ہے، اس لیے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس اردو کتاب میں جو غلطی دیکھیں، اُسے میری طرف منسوب کریں اور حضرت استاذِ محترم دامت برکاتہم کی اصل کتب کی طرف مراجعت کیے بغیر کسی بھی بات کی اُن کی طرف نسبت نہ کریں۔

جن عزیز ساتھیوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی طرح کا تعاون بھی کیا، میں تہہ دل سے اُن کا شکر گزار اور ہمہ وقت اُن کے لیے دعا گو ہوں۔ بالخصوص مولانا محمد شعیب (فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی) اور مولانا اسدالرحمٰن (فاضل جامعہ فاروقیہ کراچی) نے کتاب کی تصحیح اور ترتیب میں خوب تعاون کیا ہے۔ جزاھما اللہ خیر الجزاء

اللہ کریم اپنی بارگاہِ عالی میں اس مجموعہ کو قبول فرمائیں، حضرت استاذِ محترم زید مجدھم، میرے تمام اساتذہ کرام، والدین، اہل خانہ اور دیگر احباب کیلئے ذخیرۂ آخرت بنائیں۔

(آمین ثم آمین)

محمد منصور احمد عفا اللہ عنہ
فاضل و سابق مدرس جامعہ دارالعلوم کراچی
خادم طلبۂ مرکز الجمیل الاسلامی، اسلام آباد
۱۵/۷/۱۴۳۶ھ
0092-321-2039293
0092-314-3030313
i.maqsood313@yahoo.com

مضامینِ کتاب کی مفصل فہرست

فتویٰ اور اس کی عظمت

اسلاف کے مناہج افتاء

فقہاء کے طبقات اور مراتب

مذہبِ حنفی کے مطابق قواعدِ رسم المفتی کی تلخیص

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا

زمانہ کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی

فتویٰ دینے کے احکام اور اس کا طریقہ کار

(ضمیمہ نمبر ١)

(ضمیمہ نمبر ٢)

"تشریحات"

تعارف شخصیات

الفهارس

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا خاتم النبیین ' و علی آلہ و صحبہ اجمعین و علی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین .

اما بعد !

میں نے جامعہ دارالعلوم کراچی میں، تخصص فی الافتاء کے طلبہ کو دورانِ تدریس چند یادداشتیں املاء کروائی تھیں۔ ان میں، میں نے علامہ ابنِ عابدینؒ کی ''شرح عقود رسم المفتی'' کی تلخیص پیش کی تھی اور ساتھ ہی مختلف کتابوں سے فتویٰ کی حقیقت، اُس کی تاریخ، شرائط اور آداب کے متعلق چند فوائد کا اضافہ بھی کیا تھا۔

طلبہ انہی یادداشتوں کے مجموعے کو آپس میں مسلسل نقل کرتے رہے تاکہ یہ فوائد اُن کے مقاصد میں اُن کیلئے کار آمد ثابت ہوں اور بہت سے طلبہ نے مجھے اس کی اشاعت کے بارے میں بھی کہا تاکہ وہ لکھنے اور فوٹو کاپی کروانے کی زحمت سے بچ جائیں۔ لیکن میں اس پر نظر ثانی سے قبل اور اسے مستقل تالیف کی شکل میں ازسرِ نو لکھنے سے پہلے شائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری بہت سی مشغولیات اور مسلسل سفروں کی بناء پر اسی طرح کئی سال بیت گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت عطا فرمائی کہ میں اس پر نظر ثانی کرسکوں تو میں نے، طلبِ علم کیلئے اور اُن منتشر موضوعات کا مطالعہ کرنے کیلئے، جن کی وضاحت اور ضبط کی خود مجھے بھی ضرورت تھی، بہت سی کتابوں کی مراجعت کی۔ بالآخر میں نے اپنی یادداشتوں کے مجموعہ سے چند باتوں کو کاٹ دیا اور بہت سی ایسی مباحث جن کا اس موضوع سے گہرا تعلق تھا، اُن کا اضافہ کردیا۔

میں نے اپنی وسعت کی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ وہ مسائل جو قابلِ تنقیح تھے، اُن پر خوب غور و خوض کر کے اُنہیں واضح کر دوں اور اپنے مطالعہ کے نتائج اس کتاب میں پیش کر دوں، تا کہ یہ ایک جامع تالیف بن کر اپنے مقاصد میں پوری اتر سکے اور مجھ جیسے طلبہ کیلئے اُن کے فرائض کی ادائیگی میں معاون ثابت ہو۔

الحمدللہ تبارک وتعالیٰ! اب میں اپنی یادداشتوں کے مجموعے کو اپنی اس کتاب کی شکل میں پیش کر رہا ہوں، جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ میں اس توفیق پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں اور اُسی سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اپنی قدرت اور رحمت سے اس کتاب کو فائدہ مند بنا دے۔

یہاں میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے دل کی گہرائی سے اپنے رفیقِ کار اور بھائی مولانا شاکر صدیق جاکھورا حفظہ اللہ کا بھی شکریہ ادا کروں، جنہوں نے اس پورے کام کے دوران مراجعتِ کتب، استخراجِ مسائل اور فقہی عبارات کو نقل کرنے میں، میرا ساتھ دیا۔

انہوں نے اُن فقہاء کے مختصر حالات بھی جمع کر دیئے ہیں، جن کا تذکرہ اس کتاب میں آیا ہے۔ یہ کتاب میں اس ترتیب سے ہیں کہ جہاں پہلی مرتبہ کسی شخصیت کا تذکرہ آیا تو وہاں حاشیہ میں ان کے حالات ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اُنہی حضرات کے حالات پر اکتفاء کیا گیا ہے جو فقہ میں شہرت رکھتے تھے اور طلبہ کو ان کے حالات جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ (جدید ترتیب میں یہ تمام حالات ''تعارف شخصیات'' کے عنوان سے الگ حصہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں)

رہے وہ حضرات جن کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں جیسے مشہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یا آئمہ اربعہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تو اُن کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ہر شخص ان کے حالات سے آگاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ، برادرِ عزیز کو جزائے خیر عطا فرمائے، دنیا و آخرت میں انہیں بہترین بدلہ دے اور اپنے محبوب اور رضاء کے کاموں کی توفیق سے انہیں نوازے۔ قارئین کرام کتاب کے آخر میں اُن تمام شخصیات کے ناموں کی فہرست بھی دیکھ لیں گے جن کے حالات حواشی میں جابجا آئے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

میں اللہ کریم سے دعا گو ہوں کہ اس حقیر کاوش کو وہ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اس کے نفع کو عام فرمائے اور جس دن کوئی مال، جاہ یا اولاد کام نہ آئے گی، اُس دن بندۂ ضعیف کے لیے اس کو ذخیرہ بنائے۔ بے شک وہ ہی ہر چیز پر قادر اور دعائیں قبول کرنے کے لائق ہے۔

محمد تقی عثمانی

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

1

فتویٰ اور اس کی عظمت

(الفتویٰ وخطورتہا)

مباحث

- فتویٰ کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ۔
- شرعی فتاویٰ (الفتاوی التشریعیة)۔
- فقہی فتاویٰ (الفتاوی الفقهية)۔
- جزئی فتاویٰ (الفتاوی الجزئية)۔
- افتاء اور قضاء کے درمیان فرق۔
- اختلافِ امت کا فتویٰ دینے سے [illegible]

(فکر انگیز اقوال اور سبق آموز واقعات)

فتوی کے لغوی اور اصطلاحی معنی

(الفتوی فی اللغة والاصطلاح)

الفتویٰ، فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض حضرات نے اس کو فاء کے ضمہ کیساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ تاج العروس (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح اور زیادہ مشہور ہے۔ جب کہ فُتیا، فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ان دونوں الفاظ کی جمع فتاویٰ (واؤ پر زبر کے ساتھ) اور فتاوِی (واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ) آتی ہے اور جمع کے یہ دونوں صیغے علماء کے کلام میں عام استعمال ہوتے ہیں۔

الفتویٰ اور الفتیا یہ اَفتی یُفتی اِفتاءً کے حاصل مصدر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور لغت میں اس کا معنی یہ ہیں:

الاجابة عن سوال سواء کان متعلقا بالاحکام الشریعة ام بغیرھا

(کسی بھی سوال کا جواب دینا خواہ وہ احکام شریعت کے متعلق ہو یا غیر احکامِ شریعت کے متعلق)۔

(۱)......جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بادشاہِ مصر کی یہ بات نقل کی گئی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ۔ (یوسف:۴۳)

(اے سردارو! مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو)۔

(۲)......اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھی کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

(یوسف ۴۶)

(یوسف! اے دوست ہمیں بتایئے ان سات فربہ گایوں کے بارے میں جن کو سات لاغر گائیں

کھاتی ہیں اور ان سات ہری بالیوں کے بارے میں اور دوسری سات خشک ہیں تا کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں کہ وہ اس خواب کی تعبیر جان لیں)۔

(۳)......اسی طرح ملکۂ سبا کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

قَالَتْ يَآيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ۔

(النمل:۳۲)

(اے سردارو! مجھے میرے معاملے میں بتاؤ کیونکہ میں کسی معاملے کا بھی قطعی فیصلہ تب تک نہیں کرتی جب تک تم حاضر نہ ہو)۔

ان تینوں مقامات میں اِفتاء کا لفظ ایسے سوال کے جواب دینے کیلئے استعمال ہوا ہے جو احکام شرعیہ کے متعلق نہیں ہے۔ پھر اس کلمے (اِفتاء) کو شرعی سوال کے جواب دینے ہی کیلئے خاص کر دیا گیا اور اسی معنی میں بھی قرآن مجید نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

(۱)......وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ (النساء:۱۲۷)

(اور وہ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان عورتوں کے بارے میں)۔

(۲)......اسی طرح ارشاد ہے:

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ (النساء:۱۷۶)

(وہ آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے **کلالہ** (وہ شخص جس کا انتقال ہو جائے اور اس کے نہ باپ دادا ہوں اور نہ ہی بیٹے پوتے وغیرہ) کے بارے میں)۔

اسی معنی میں نبی کریم ﷺ نے اِفتاء کا لفظ اپنی کئی احادیث شریفہ میں استعمال کیا ہے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

اَجْرءُ کم علی الفُتیا اَجْرءُ کم علی النار ح۱۰

(تم میں سے فتویٰ دینے پر زیادہ جرأت کرنے والا آگ پر زیادہ جرأت کرنے والا ہے)۔

لہٰذا اس دور کی اصطلاح میں اس لفظ (فتویٰ) کے معنی یہ ہیں:

"الجواب عن مسئلةٍ دينيةٍ"

(یعنی دینی مسئلے کا جواب دینا)

ہم نے دینی مسئلے کا لفظ اختیار کیا نہ کہ شرعی مسئلے کا۔ کیونکہ مفتی صرف احکام شرعیہ عملیہ کا ہی جواب نہیں دیتا بلکہ بسا اوقات دینی اعتقادی مسائل کا جواب بھی دیتا ہے اور کبھی کسی حدیث کے معنی کے بارے میں یا حدیث کی سند کی کیفیت کے بارے میں اور دیگر اِن مسائل کے متعلق جو دین اور دینی علوم سے متعلق ہیں، بھی جواب دیتا ہے۔

پھر فتویٰ اور افتاء کا اطلاق فقہاء کے کلام میں تین معانی پر ہوتا ہے اور اس کو ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱)......تشریعی فتاویٰ (الفتاویٰ التشریعیة)

(۲)......فقہی فتاویٰ (الفتاویٰ الفقهیة)

(۳)......جزئی فتاویٰ (الفتاویٰ الجزئیة)

(۱)......تشریعی فتاویٰ

(الفتوی التشریعیة)

یہ وہ فتاویٰ ہیں جو شارع (اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ) کی جانب سے صادر ہوئے ہیں یا تو قرآن کریم کی وحی متلو (جو تلاوت کی جاتی ہے) کے ذریعے یا احادیث نبوی ﷺ کی وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) کے ذریعے اور یہ عام طور پر نبی ﷺ کے دورِ مبارک میں کسی سوال کے جواب میں یا کسی فوری پیش آنے والے مسئلے کو بیان کرنے کیلئے آئے اور پھر عام شرعی قاعدے بن گئے۔ ان کی مثالیں یہ ہیں:

(۱)......وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۚ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ (النساء: ۱۲۷)

(اور وہ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان عورتوں کے بارے میں)۔

(۲)...... يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ (النساء: ۱۷۶)

(آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کلالہ کے بارے میں)۔

(۳)...... يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ (البقرة: ۱۸۹)

(لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ انہیں بتا دیجئے کہ یہ

لوگوں کے (مختلف معاملات) اور حج کے اوقات متعین کرنے کیلئے ہیں)۔

(۴)......يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ (البقرة:۲۱۷)

(لوگ آپ سے حرمت والے مہینے (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، مگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے خلاف کفر کی روش اختیار کرنا، مسجد حرام پر بندش لگانا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال کر باہر کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے اور فتنہ، قتل سے بھی زیادہ سنگین چیز ہے)۔

(۵)...يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ. (البقرة:۲۱۹)

(لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑا ہے۔ اور لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم لوگ غور وفکر سے کام لو)۔

(۶)......يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(الانفال:۱)

(لوگ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو کہ مال غنیمت کا اختیار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو حاصل ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات درست کرلو۔ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو)۔

(۷)......قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ

يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ (المجادلة:۱)

(اے پیغمبر! اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث کر رہی ہے اور وہ اللہ سے فریاد کرتی جاتی ہے۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے جاننے والا ہے)۔

یہ آیت حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ اُن کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان سے ظِہار کرلیا تھا۔

(شوہر جب اپنی بیوی کو اپنی ماں یا بہن وغیرہ سے تشبیہ دے کر اپنے اوپر حرام کرلے تو اسے ظِہار کہتے ہیں)۔

اس تشریعی فتوے کی مثال جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو وہ حدیث ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے:

''ایک خاتون نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ حج کریں گی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہو گئیں، کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں تم ان کی طرف سے حج کرلو''۔

فتویٰ کی یہ قسم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ مکمل ہو جانے کے بعد ختم ہو گئی۔

(۲)......فقہی فتاویٰ

(الفتوى الفقهية)

فقہی فتاویٰ سے مراد وہ فتاویٰ ہیں کہ فقہاء میں سے کوئی فقیہ اُن کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ کسی مخصوص واقعے کے متعلق سوال کے جواب میں نہیں ہوتا بلکہ وہ مختلف تفریعات کے ضمن میں ہوتا ہے یا کسی عمومی سوال کے جواب میں، جس کا تعلق کسی متعین جزئی واقعے سے نہیں ہوتا اور یہ اس فقیہ کا طریقۂ کار ہوتا ہے جو مسائل فقہیہ کی تدوین کرتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسی جزئیات کا تصور کرتا ہے جس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا گیا اور پھر وہ ان کے احکام، شرعی دلائل سے مستنبط کرتا ہے اور ایسے فتوے کو وہ کسی کتاب یا رسالے میں بیان کرتا ہے یا کسی عمومی سوال یا فرضی سوال کے جواب میں

بیان کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کسی فقیہ سے پوچھا جائے کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو اپنی بیوی کو "سر حتک" کہے اور اس سوال میں اس کو کسی متعین واقعے کا حوالہ نہ دیا گیا ہو (تو یہ فتویٰ کی دوسری قسم "الفتاوی الفقهية" کی مثال ہے)۔

(۳)......جزئی فتاویٰ

(الفتوى الجزئية)

اس سے مراد وہ فتویٰ ہے جس میں کسی متعین واقعے کے بارے میں سوال کا جواب دیا جاتا ہے اس طرح کہ فقہ کے کُلی حکم کو جزئی واقعے پر منطبق کیا جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی متعین شخص کے بارے میں سوال کیا جائے کہ اس نے اپنے ورثاء میں والدین، ایک بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی۔ اب اس کے ترکے کو اس کے ورثاء میں کیسے تقسیم کیا جائے گا؟ (اب اس سوال کا جواب "الفتویٰ الجزئية" کی مثال ہوگا)۔

اکثر و بیشتر افتاء کے لفظ کا اطلاق اس آخری قسم پر ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی اس کا اطلاق فقہی فتاویٰ پر بھی ہوتا ہے۔ (جیسے فتاویٰ قاضی خان وغیرہ کتب کے مسائل)

افتاء اور قضاء کے درمیان فرق

(الفرق بين الافتاء والقضاء)

فتویٰ اور قضاء کے درمیان مندرجہ ذیل امور سے فرق واضح ہو جاتا ہے:

(۱)......فتویٰ، حکم شرعی کے صرف ظاہر کرنے اور بیان کرنے کو کہتے ہیں جیسے جواز، ندب، استحباب، وجوب، کراہت اور حرمت جیسے احکام۔

افتاء میں مستفتی پر حسّی اعتبار سے کچھ لازم نہیں کیا جاتا کہ وہ فتویٰ کے مقتضیٰ پر لازمی عمل کرے۔ قضاء میں جس کو حکم دیا جاتا ہے اس پر حسّی طور پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کرے جو قاضی نے صادر کیا ہے (یعنی نافذ کرنا قاضی کا کام ہے، مفتی کا کام صرف حکمِ شرعی بتانا ہے)۔

(۲)......فتویٰ اس سوال پر مبنی ہوتا ہے جو سائل مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے لہٰذا مفتی یہی فرض کر کے حکم شرعی کا

اظہار کرتا ہے کہ سوال واقعہ کے مطابق ہوگا۔ مفتی کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ گواہ وغیرہ طلب کر کے حقیقتِ واقعہ میں سوال کے درست ہونے کی تحقیق کرے، اسی وجہ سے مفتی یہ کہتا ہے کہ ''صورت مسئولہ'' میں یہ حکم ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ حقیقت میں واقعہ کے مطابق بھی ہو۔

(جب کہ قضاء میں قاضی حقیقت واقعہ کی ہر طرح تحقیق و تفتیش کرتا ہے۔ صرف مدعی کے بیان پر حکم صادر نہیں کرتا)۔

(۳)......فتویٰ ان تمام معاملات میں جاری ہوتا ہے جن پر وجوب، حرمت، اباحت، نُدب، کراھت یا صحت (عمل کا صحیح ہونا) اور بطلان (عمل کا باطل ہونا) مرتب ہوں۔

جبکہ قضاء ان معاملات میں جاری نہیں ہوتی جن پر صرف ندب یا کراھت تنزیہیہ مرتب ہوں کیونکہ نُدب اور کراہت تو اس کا نام ہے کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ابھارا جائے، بغیر اس کو لازم کیے۔ جبکہ قضاء میں تو زبردستی اور لازمی طور پر عمل کروایا جاتا ہے۔

(مندوب: وہ کام ہے جسے نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا ہو لیکن ہمیشہ یا اکثر نہیں بلکہ کبھی کبھی۔ جو یہ کرے گا اُسے ثواب ملے گا اور نہ کرنے والے کو گناہ نہیں ملے گا۔ اسے مستحب اور تطوع بھی کہتے ہیں۔

مکروہ تنزیہی: وہ کام ہے جس کے نہ کرنے میں ثواب ہو اور کرنے میں عذاب نہ ہو)

(۴)......فتویٰ صرف احکامِ فقہیہ میں منحصر نہیں ہوتا بلکہ عقائد اور عبادات کے بھی متعلق ہوتا ہے جبکہ قضاء عقائد اور عبادات کے متعلق نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ بطور تابع ہونے کے (قاضی کے فیصلے میں) آجائے۔

اسلافِ امت کا فتویٰ دینے سے ڈرنا اور احتیاط کرنا

(تهيّب السلف للفتيا)

امام نووی رحمہ اللہ (ت ۱) نے "المجموع شرح المهذب" کے مقدمہ میں فرمایا ہے: (ح ۲)

دیکھو فتویٰ دینا ایک بہت عالی مرتبہ، بہت زیادہ پیش آنے والا اور انتہائی فضیلت والا کام ہے کیونکہ مفتی انبیاء کرام علیہم السلام کا وارث ہے اور فرضِ کفایہ (وہ فرض جسے چند لوگ ادا کرلیں تو باقی سے بھی مواخذہ نہیں ہوگا) کو ادا کرنے والا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کام بہت سے خطرات (یا غلطیاں) پیش آنے کی جگہ بھی ہے، اسی لیے علماء نے کہا ہے:

المفتي موقّع عن الله سبحانه و تعالىٰ

(یعنی مفتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے والا ہے)۔

لہٰذا ایک مفتی پر لازم ہے کہ وہ منصب افتاء کی عظمت کا احساس کرے اور یہ بات یاد رکھے کہ فتویٰ دینے کا مطلب اپنی ذاتی آراء کا اظہار یا صرف عقل کے ذریعے فیصلہ کر لینا یا اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی کام کر لینا نہیں ہے بلکہ افتاء تو ان شرعی احکام کو واضح کر کے بیان کرنے کا نام ہے جو اللہ پاک نے اپنے بندوں کیلئے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مقرر فرمائے ہیں، وہ احکام جو بندوں کیلئے دنیا و آخرت میں ابدی سعادت کے ضامن ہیں۔

منصب افتاء کی عظمت و ہیبت کیلئے یہ بات کافی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نیابت اور جانشینی ہے۔ اور یہ تو آسمانوں اور زمین اور تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نمائندگی ہے۔

جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ (ت ۲) نے اس کا نام "توقیع" رکھا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب بادشاہوں کے ہاں "توقیع" کا منصب اور عہدہ ایسی چیز ہے جس کی فضیلت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی قدر و عظمت سے کوئی جاہل ہو سکتا ہے اور یہ مرتبہ بلند ترین عہدوں میں سے ہے، تو آسمان و زمین کے پروردگار کی طرف سے "توقیع" کا منصب کیسا عظمت والا ہوگا۔

(توقیع کی تفصیل "تشریحات نمبر ۱" میں دیکھیں)

لہٰذا جو شخص بھی اس منصب پر فائز ہو اسے چاہیے کہ وہ اس کیلئے خوب تیاری کر لے اور اس کا سامان اچھی طرح جمع کر لے اور اس مقام کی قدر کو پہچان لے جس میں وہ کھڑا کیا گیا ہے۔ حق بات کہنے میں اس کے دل میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے اور اس کو حق بات کا واضح اظہار کرنا چاہیے۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ وہی اس کا مددگار اور اس کی راہنمائی کرنے والا ہے اور کیونکر (یہ کام عظیم ذمہ داری والا نہیں ہوگا) کہ یہ تو وہ منصب ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بیان فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ (النساء: ۱۲۷)

(اور وہ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان عورتوں کے بارے میں، اور اس کتاب (یعنی قرآن مجید) کی جو آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں)۔

اور جس منصب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اختیار کیا ہو تو یہ اس کے شرف اور جلالتِ شان کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ (النساء:۱۷۶)

ترجمہ: ''آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے' **کلالہ** کے بارے میں''۔

اس لیے مفتی کو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے فتوے میں کس ذاتِ پاک کی نیابت کر رہا ہے اور اسے یقین رکھنا چاہیے کہ کل اُس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور وہ اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ ح.۵

اسی طرح افتاء کی نزاکت کو بیان کرنے کیلئے وہ حدیث پاک کافی ہے جو نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اجرء کم علی الفتیا اجرء کم علی النار ح.۶

(تم میں سے جو شخص فتویٰ دینے پر زیادہ جری ہے وہ تم میں سے سب سے زیادہ آگ پر جری ہے)

اس مقام پر اسلافِ امت کے بہت سے آثار بھی ہیں جو فتویٰ دینے سے ڈرنے کے متعلق ہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس سے بچنے کے بارے میں ہیں' ہم اُن میں سے یہاں چند ذکر کرتے ہیں:

ابن عبدالبر رحمہ اللہ ت.۳ (مالکی) نے اپنی سند کے ساتھ عقبہ بن مسلم رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے' وہ فرماتے ہیں:

''میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی صحبت میں ۳۴ مہینے رہا (تقریباً ۳ سال) اکثر اُن سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ فرماتے لا ادری (مجھے معلوم نہیں)''۔

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے:

''کیا تم جانتے ہو کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہماری پشتوں کو اپنے لیے جہنم کا پل بنالیں''۔

ح.۷

خطیب بغدادی رحمہ اللہ ت.۴ نے ''باب الزجر عن التسرع الی الفتویٰ مخافۃ الزلل'' (باب جو غلطی کے خوف سے فتویٰ دینے میں جلد بازی پر سخت تنبیہ کے لیے ہے) میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ (الزخرف:۱۹)

(ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جائے گا اوران سے باز پرس کی جائے گی)۔

اسی طرح اللہ کا ارشاد ہے:

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ (الاحزاب:۸)

(تا کہ اللہ تعالیٰ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں پوچھے)۔

اسی طرح اللہ پاک کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق:۱۸)

(انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے ہر وقت دیکھنے کیلئے تیار)۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کسی مسئلے میں اس وقت تک فتویٰ نہیں دیتے تھے جب تک وہ پیش نہ آ جائے اور وہ اس بات میں اللہ پاک پر اعتماد کرتے تھے کہ جب کوئی حادثہ پیش آئے گا تو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کو اس کے جواب کی توفیق بھی دے دے گا اور ان میں سے ہر شخص یہ پسند کرتا تھا کہ اس کا ساتھی ہی اُس کی طرف سے فتویٰ دینے کیلئے کافی ہو جائے۔

ح.۸

پھر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"لقد رایت ثلاثمائة من اهل بدر مامنهم من احد الا وهو يحب ان يكفيه صاحبه الفتوى"

(بلاشبہ میں نے تین سو بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے اور ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو یہ نہ پسند کرتا ہو کہ ان کے ساتھی ہی فتویٰ دینے کیلئے ان کی طرف سے کافی ہو جائیں)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"ما رايت احدا جمع الله فيه من آلة الفتيا ما جمع في ابن عيينة اسكت عن الفتيا منه"

(میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا' کہ جس کے پاس اللہ نے فتویٰ دینے کے اتنے اسباب جمع کیے ہوں جتنے سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ میں جمع کیے ہیں، پھر وہ فتویٰ دینے میں ان سے زیادہ خاموش ہو)۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"اعلم الناس بالفتوی اسکتهم فیه، واجهل الناس بالفتوی انطقهم فیه"

(فتاویٰ کا سب سے بڑا عالم وہ ہے جو فتویٰ دینے میں سب سے زیادہ خاموش رہے اور سب سے زیادہ اس سلسلے میں جاہل وہ شخص ہے جو فتویٰ دینے میں زیادہ بولنے والا ہو)۔

بشر بن الحارث رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"من احب ان یُسأل، فلیس باھل ان یُسأل" ح ۹

(جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے تو وہ اس بات کا اہل نہیں کہ اس سے سوال کیا جائے)۔

عطاء ابن سائب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ادرکت اقواما ان کان احدھم یسال عن الشیئ فیتکلم وانه لیرعد" ح ۱۰

(میں نے ایسے علماء کو پایا ہے کہ اگر ان میں سے کسی سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ اس بارے میں اس طرح گفتگو کرتے کہ ان پر کپکپاہٹ طاری ہوتی)۔

اشعث رحمہ اللہ، محمد بن سیرین رحمہ اللہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"کان اذا سئل عن شی من الفقه، الحلال والحرام، تغیر لونه و تبدل، حتی کانه لیس بالذی کان" ح ۱۱

(جب ان سے فقہ میں کسی چیز کی حلت اور حرمت کے بارے میں پوچھا جاتا تو ان کا رنگ متغیر اور تبدیل ہو جاتا یہاں تک کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ وہ نہیں ہیں۔ (بلکہ کوئی اور شخص ہیں)۔

امام مالک رحمہ اللہ کے ایک شاگرد فرماتے ہیں:

"واللہ ان کان مالك اذا سئل عن مسألة کانه واقف بین الجنة والنار"۔

(اللہ کی قسم جب امام مالک رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ایسا لگتا تھا گویا کہ وہ جنت اور جہنم کے درمیان کھڑے ہیں)۔

محمد بن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان العالم بين الله و بين خلقه، فلينظر كيف يدخل عليهم" ح،۱۲

(بلاشبہ عالم اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، پس اسے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ ان کے درمیان کیسے داخل ہو رہا ہے؟)۔

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے:

"انكم تستفتوننا استفتاء قوم كانا لانسال عما نفتيكم به" ح،۱۳

(بیشک تم لوگ ہم سے اس طرح سوال کرتے ہو گویا کہ ہم سے ان فتاویٰ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو ہم تمہیں دیتے ہیں)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"من تكلم فى شئ من العلم و تقلده و هو يظن ان الله لا يسئله عنه كيف افتيت فى دين الله؟ فقد سهلت عليه نفسه و دينه"۔

(جس شخص نے کوئی علمی گفتگو کی اور اُس کا ذمہ دار بن گیا، پھر وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ پاک اس سے اس بارے میں سوال نہیں کرے گا کہ تو نے اللہ کے دین میں کیسے فتویٰ دیا؟ تو ایسے شخص کا نفس اور دین اس پر سہل ہو جائیں گے (یعنی خطرے میں پڑ جائیں گے)۔

انہی سے منقول ہے:

"لو لا الفرق من الله ان يضيع العلم ما افتيت احدا، يكون له المهنا و علىّ الوزر"

(اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا اس بات سے کہ علم ضائع ہو جائے گا تو میں کسی کو فتویٰ نہ دیتا کہ اس کے لیے تو مفت کی سہولت ہے اور سارا بوجھ مجھ پر ہے)۔

محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اول من يدعى الى الحساب يوم القيامة الفقهاء"

(قیامت کے دن حساب کیلئے سب سے پہلے فقہاء کو بلایا جائے گا)۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"یغفر للجاهل سبعون ذنباً قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد" (۱۴-ح)

(جاہل کے ستر گناہ معاف کر دیے جائیں گے اس سے پہلے کہ عالم کا ایک گناہ بخشا جائے)۔

(شاید اس لیے بھی کہ عالم کے گناہ کی پیروی دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں)۔

ابن خلدہ رحمۃ اللہ علیہ (ت ۵) نے ایک مرتبہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمن (ت ۶) کو کہا:

"انی اری الناس قد احاطوا بك، فاذاسئلك الرجل عن مسالة فلا یکن همتك ان تخلصه، ولکن لتکن همتك ان تخلص نفسك"

(بیشک میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے پس جب بھی کوئی شخص آپ سے مسئلہ پوچھے تو آپ کی فکر یہ نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اس کو بچالیں بلکہ آپ کی فکر یہ ہونی چاہیے کہ آپ اپنے نفس کو بچالیں (یعنی مسئلہ بتانے میں احتیاط سے کام لیں)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، ابن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ (ت ۷) سے نقل کرتے ہیں:

ان کے پاس کوئی شخص آتا اور کسی مسئلے کے بارے میں پوچھتا تو وہ اس کو مسئلہ بتا دیتے۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے کسی اور کو بھیجتے جو اس کو واپس بلا لاتا۔ ابن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ اسے کہتے: مجھ سے کچھ جلدی ہوگئی تھی لہٰذا میں نے تمہیں جو کچھ بتایا تھا تم اس کو قبول نہ کرو، یہاں تک کہ دوبارہ مجھ سے پوچھ لو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ اہل مدینہ میں سب سے کم فتوے دینے والے تھے نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ولیس من یخشی الله کمن لا یخشاه"

(جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جو اللہ سے نہ ڈرتا ہو)۔

انہی کا ارشاد ہے:

"ما علمت فقله ودل علیه و مالم تعلم فاسکت عنه وایاك ان تتقلد للناس قلادة سوء" (۱۵-ح)

(جو تجھے معلوم ہو وہ تو کہہ دے اور اس کی راہنمائی کر دے اور جو تجھے معلوم نہ ہو تو اس سے خاموش رہ اور اس بات سے بچتا رہ کہ لوگوں کو کسی غلط راہ پر لگا دے)۔

ابوسعید عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ، جو مالکیہ کے ائمہ میں سے ہیں اور مدوّنہ کے مرتب ہیں، ان کا لقب سُحنون (ت ۸۰) ہے (یہ ایک پرندہ کا نام ہے جو بہت دور سے اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے، ان کی ذہانت کی بناء پر ان کو یہ لقب ملا) انہوں نے فرمایا:

"اشقی الناس من باع اخرته بدنیاه، واشقی منه من باع اخرته بدنیا غیره"

(لوگوں میں سب سے بدبخت شخص وہ ہے جو اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے بدلے بیچ ڈالے اور اس سے بھی بڑا بدبخت وہ ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالے)۔

(اسی معنی میں سنن ابنِ ماجہ کی یہ مرفوع حدیث بھی ہے:

من شر الناس منزلة یوم القیمة عبد اذهب آخرته بدنیا غیره

(مشکوٰة، باب الظلم)

(قیامت کے دن مرتبے کے اعتبار سے بدترین آدمی وہ ہوگا جو دوسرے کی دنیا کے بدلے اپنی آخرت برباد کر دے)۔

حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ (ت ۹۰)، امام سحنون رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"ففکرت فیمن باع آخرته بدنیا غیره، فوجدته المفتی... الخ" (ح ۱۶)

(میں نے اس بات میں بہت غور کیا کہ وہ کون شخص ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کی دنیا کے بدلے بیچتا ہے، پس مجھے پتہ چلا کہ یہ وہ مفتی ہے جس کے پاس کوئی ایسا شخص آتا ہے جو اپنی بیوی یا باندی کے بارے میں حانث ہو چکا ہے تو یہ اسے کہہ دیتا ہے "لاشئی علیک" یعنی کوئی مسئلہ نہیں (آپ اپنی بیوی یا باندی سے استفادہ کر سکتے ہیں)۔ پس وہ حانث شخص چلا جاتا ہے اور اپنی بیوی اور باندی سے نفع اٹھاتا ہے۔ پس یہی مفتی ہے جس نے اپنے دین کو اس کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالا)۔

انتخابات میں بے دین اور نااہل لوگوں کو ووٹ دینے والے بھی اس زمرے میں آجاتے ہیں کہ دوسرے کی دنیا

کی خاطر اپنی آخرت برباد کردیتے ہیں۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ ان میں سے بعض آثار نقل کرنے کے بعد، کہتے ہیں:

"قل من حرص علی الفتیا وسابق الیها وثابر علیها ...الخ"

(جو شخص بھی فتویٰ دینے کا حریص ہو اور اس کیلئے آگے بڑھتا ہو اور مسلسل ہمیشہ فتوے دیتا ہو تو اس کی توفیق کم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے معاملے میں مضطرب رہتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص مجبوراً فتویٰ دیتا ہے' خود اس کو اختیار نہیں کرتا لیکن اس سے چھٹکارے کی کوئی گنجائش نہیں پاتا اور وہ اس کام کو دوسرے پر ٹالتا ہے' تو اللہ کی طرف سے اس کی خوب مدد ہوتی ہے)۔

اور انہوں نے اپنی اس بات پر اس حدیث صحیح سے استدلال کیا ہے:

"لا تسئل الا مارة ، فانك ان اعطيتها عن مسئلة و كلت اليها ، وان اعطيتها عن غير مسئلة اعنت عليها" ح ۱۷

(تم امارت کا سوال مت کرو کیونکہ اگر یہ عہدہ سوال کرنے سے ملا تو تم اسی کے سپرد کردیے جاؤ گے اور اگر تمہیں عہدہ بغیر سوال کیے مل گیا تو تمہاری مدد کی جائے گی)۔

امام نووی رحمہ اللہ، حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

"ادركت عشرين ومائة من الانصار الصحابة، يسال احدهم عن المسئلة فيردها هذا الى هذا، حتى ترفع الى الاول" ح ۱۸

(میں نے ایک سو بیس انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسا پایا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ہر ایک دوسرے پر ڈال دیتا، یہاں تک کہ وہ مسئلہ دوبارہ پہلے شخص کے پاس ہی پہنچ جاتا)۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"ما منهم من يحدث بحديث الا ودان اخاه كفاه اياه، ولا يستفتي عن شئ الا ودان اخاه كفاه الفتيا" ح ۱۹

(ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو بھی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ یہی پسند کرتا تھا کہ اس کا بھائی اس کی طرف سے اس کیلئے کافی ہو جائے، اسی طرح جب اس سے کوئی استفتاء کیا جاتا تو وہ یہ پسند کرتا کہ اس کا بھائی فتویٰ دینے کیلئے اس کی طرف سے کافی ہو جائے)۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے عمیر بن سعید رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

سالت علقمة ت:١٠ عن مسألة ، فقال : ائت عبيدة فسله ... الخ ۔ ح:٢٠

(میں نے علقمہ رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ تم عَبِیْدہ رحمہ اللہ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو، میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا: علقمہ رحمہ اللہ کے پاس جاؤ! میں نے کہا: حضرت! علقمہ رحمہ اللہ ہی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا پھر مسروق رحمہ اللہ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو، میں مسروق رحمہ اللہ ت:١١ کے پاس گیا اور اُن سے مسئلہ پوچھا تو مسروق رحمہ اللہ نے کہا کہ تم علقمہ رحمہ اللہ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ میں نے عرض کیا کہ علقمہ رحمہ اللہ نے مجھے عَبِیْدہ رحمہ اللہ کے پاس بھیجا تھا اور انہوں نے آپ کی خدمت میں بھیج دیا، اس پر مسروق رحمہ اللہ نے کہا کہ اچھا پھر عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کے پاس چلے جاؤ۔ میں ان کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا تو انہوں نے بھی اس کو ناپسند کیا، پھر میں علقمہ رحمہ اللہ کے پاس آیا اور ان کو یہ بات بتائی۔ وہ کہتے ہیں اس وقت عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ "فتویٰ دینے پر سب سے زیادہ جری وہ ہی ہوگا جو علم کے اعتبار سے سب سے کم تر ہو)۔

امام نووی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

"من افتی عن کل ما یسال فھو مجنون" ح:٢١

(جو شخص ہر سوال پر فتویٰ دے دے تو وہ مجنون ہے)

امام شعبی رحمہ اللہ ت:١٢، حسن رحمہ اللہ اور ابو الحَصِیْن ت:١٣ فرماتے ہیں:

"ان احدکم لیفتی فی المسئلة، ولو وردت علی عمر بن الخطاب لجمع لها اهل بدر" (ح:۲۲)

(بے شک تم میں سے کوئی شخص کسی مسئلہ میں فتویٰ دے دیتا ہے' حالانکہ اگر وہ مسئلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوتا تو وہ اس پر مشورہ کیلئے اہلِ بدر کو جمع کر لیتے)۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اور سحنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اجسر الناس علی الفتیا اقلهم علماً" (ح:۲۳)

(لوگوں میں فتویٰ دینے پر سب سے زیادہ جسارت کرنے والا شخص وہ ہی ہوگا' جو اُن میں علم کے اعتبار سے سب سے کم ہوگا)۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ اُن سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب نہیں دیا۔ جب اُن سے عرض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"حتی ادری ان الفضل فی السکوت او الجواب"۔

(میں اُس وقت تک جواب نہیں دوں گا) جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہاں فضیلت خاموش رہنے میں ہے یا جواب دینے میں ہے)۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی سنن کے مقدمہ میں ایک باب قائم فرمایا ہے اور اس پر یہ عنوان لگایا ہے:

"باب من هاب الفتیا و کره التنطع والتبدع"۔

(یہ باب اُن حضرات کے بارے میں ہے جنہوں نے فتویٰ دینے سے خوف کھایا اور بے جا تشدد اور نت نئی باتوں کے گھڑنے کو ناپسند کیا)۔

اس باب میں انہوں نے زُبَید (ت ۱۴۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

"ما سالت ابراهیم عن شئ الا عرفت الکراهیة فی وجهه"

(میں نے ابراہیم رحمہ اللہ (نخعی) سے کبھی کسی بارے میں نہیں پوچھا مگر میں نے اُن کے چہرے میں ناگواری محسوس کر لی)۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے عمر بن ابی زائدہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"ما رأیت احدا اکثر ان یقول اذا سئل عن شیئ: لا علم لی به من الشعبی"

(میں نے کسی کو بھی جب اُس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے، جواب میں امام شعبی رحمہ اللہ سے زیادہ یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ "مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہے")۔

ابن عون رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"کان الشعبی اذا جاءہ شیئ اتقی، و کان ابراھیم یقول و یقول و یقول"

(جب امام شعبی رحمہ اللہ کے پاس کوئی سوال آتا تو وہ اُس سے بچتے اور ابراہیم رحمہ اللہ خوب گفتگو کرتے)۔

اس پر ابوعاصم رحمہ اللہ نے فرمایا:

"کان الشعبی فی ھذا احسن حالاً عند ابن عون من ابراھیم"

(اس بات میں، ابن عون رحمہ اللہ کے نزدیک شعبی رحمہ اللہ کی حالت، ابراہیم رحمہ اللہ سے زیادہ اچھی تھی)۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے جعفر بن ایاس رحمہ اللہ سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں "میں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے عرض کیا:

"مالك لا تقول فی الطلاق شیئا؟"

(کیا وجہ ہے کہ آپ طلاق کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے؟)۔

انہوں نے فرمایا:

"ما منه شیئ الا قد سالت عنه، ولکنی اکرہ ان احل حراما او احرم حلالاً"

(ت ۹۴ھ)

(طلاق کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جس کے بارے میں، میں نے (اپنے اساتذہ سے) نہ پوچھا ہو۔ لیکن میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ کہیں کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہ قرار دیدوں)۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ابن عون رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"کنت عند القاسم ابن محمد اذ جاءہ رجل فساله عن شیئ فقال القاسم لا احسنه ...الخ"

(میں قاسم بن محمد رحمہ اللہ (ت ۱۰۶ھ) کے پاس تھا تو ایک آدمی اُن کے پاس آیا اور اُن سے کسی چیز

کے بارے میں پوچھا۔ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''میں اس سوال کا جواب' اچھی طرح نہیں جانتا'')۔
اس پر وہ شخص کہنے لگا: ''مجھے تو آپ کے پاس ہی بھیجا گیا اور میں آپ کے علاوہ کسی کو جانتا بھی نہیں''۔
قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''تم میری داڑھی کی لمبائی اور میرے گرد لوگوں کے ہجوم کو نہ دیکھو۔ اللہ کی قسم! میں اس مسئلے کو اچھی طرح نہیں جانتا''۔

اس پر وہاں اُن کے پہلو میں بیٹھے ہوئے قریش کے ایک بزرگ نے کہا:

"یا ابن اخی! الزمها. فوالله ما رایتك فی مجلس انبل منك الیوم"

(اے بھتیجے! اس بات کو لازم پکڑلو۔ اللہ کی قسم میں آج کے دن اس مجلس میں تم سے زیادہ معزز کسی کو نہیں دیکھ رہا)

(یعنی جو بات نہ جانتے ہو صاف صاف کہہ دو کہ میں نہیں جانتا)۔

تب قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"والله لان یقطع لسانی احب الیّ من ان اتکلم بما لا علم لی به"۔ ح،۲۵

(اللہ کی قسم! اگر میری زبان کاٹ دی جائے تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کوئی ایسی بات کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے فتویٰ دینے میں احتیاط وتقویٰ سے کام لینے کے بارے میں بہت روایات منقول ہیں' جنہیں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۶ نے خوب تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے' ہم اُن میں سے چند یہاں لکھتے ہیں:

عبدالرحمن العمری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں! مجھے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا:

"ربما وردت علیّ المسالة تمنعنی من الطعام والشراب والنوم"

(کبھی میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے جو مجھے کھانے' پینے اور سونے تک سے روک دیتا ہے)۔

ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۷ کہتے ہیں' میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"انی لافکر فی مسالة منذ بضع عشرة سنة. فما اتفق لی فیها رای الی الان"

(ایک مسئلہ کے بارے میں مجھے غور وفکر کرتے ہوئے دس سے زائد سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی

تک اُس کے بارے میں میری کوئی حتمی رائے نہیں بنی)۔

ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے ہوئے سنا:

"ربما وردت علیّ المسالة فاسهر فيها عامة ليلي"

(بسا اوقات میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے، جس میں، میں اکثر شب جاگتا رہتا ہوں)۔

ابن عبدالحکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ سائل کو کہتے:

"انصرف حتی انظر فيها"

(آپ واپس چلے جائیں تاکہ میں اس بارے میں غور وفکر کرسکوں)۔

سائل چلا جاتا اور پھر مسلسل چکر کاٹتا رہتا۔ ہم نے اس بارے میں جب امام مالکؒ رحمۃ اللہ علیہ سے بات کی تو وہ رو پڑے اور فرمایا:

"انی اخاف ان يكون لی من السائل يوم وایّ يوم!"

(میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرا اور اس سائل کا ایک دن آمنا سامنا ہوگا اور وہ کتنا سخت دن ہوگا (یعنی روزِ قیامت)۔

ابن عبدالحکم رحمۃ اللہ علیہ مزید یہ بھی فرماتے ہیں:

"كان مالك اذا جلس نكس راسه، ويحرك شفتيه بذكر الله... الخ"

(امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جب بیٹھتے تو اپنا سر جھکا لیتے، اپنے ہونٹوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ حرکت دیتے رہتے اور دائیں بائیں نہ دیکھتے۔ جب آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا اور آپ کا رنگ زردی مائل سرخ تھا لیکن آپ بالکل زرد پڑ جاتے، سر جھکا لیتے اور اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتے، پھر فرماتے "ماشاء الله ولا قوة الا بالله"۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ سے پچاس مسائل پوچھے جاتے لیکن آپ کسی ایک کا جواب بھی نہ دیتے)۔

بعض علماء فرماتے ہیں:

"لكانّما مالك والله اذا سئل عن مسألة واقف بين الجنة والنار"

(اللہ کی قسم! جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی سوال کیا جاتا تو ایسا لگتا تھا گویا وہ جنت اور جہنم کے

درمیان کھڑے ہوئے ہیں)۔

موسیٰ بن داؤد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"ما رایت احداً من العلماء اکثر ان یقول: ما أحسن" من مالك

(میں نے علماء میں سے کسی کو بھی امام مالک رحمہ اللہ سے زیادہ یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ "مجھے یہ مسئلہ اچھی طرح نہیں معلوم")۔

ابن مہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امام مالک رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ پوچھا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس مسئلہ کیلئے اُسے مغرب (افریقہ) سے چھ ماہ کی مسافت سے بھیجا گیا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اسے کہا:

"اخبر الذی ارسلك انه لا علم لی بها"

(جس نے آپ کو بھیجا ہے' آپ اُسے جا کر بتادیں کہ مجھے اس مسئلہ کا علم نہیں ہے)

وہ شخص کہنے لگا کہ پھر کسے یہ مسئلہ معلوم ہوگا؟ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"من علمه الله"

(جس کو اللہ تعالیٰ سکھادے)۔

امام مالک رحمہ اللہ سے ایک شخص نے ایک سوال کیا اور وہ سوال اُسے اہلِ مغرب (افریقی ممالک کے لوگوں) نے دے کر آپ کے پاس بھیجا تھا۔

آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما ادری! ما ابتلینا بهذه المسألة فی بلدنا، ولا سمعنا احداً من اشیاخنا تکلم بها، ولکن تعود"

(مجھے معلوم نہیں' ہمارے شہر میں ہمیں کبھی یہ مسئلہ پیش نہیں آیا اور ہم نے اپنے اساتذہ میں سے بھی کسی کو اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا' لیکن تم پھر دوبارہ آنا)۔

جب اگلا دن ہوا تو وہ شخص اس حال میں آیا کہ اُس نے اپنا سامان ایک خچر پر لاد رکھا تھا اور اُسے کھینچ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا: "حضرت! میرا مسئلہ؟"۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما ادری ماھی"

(مجھے اُس کے بارے میں علم نہیں ہے)۔

اس پر وہ شخص کہنے لگا: ''اے ابوعبداللہ! میں اپنے پیچھے ایسے لوگ چھوڑ کر آیا ہوں، جو یہ کہتے ہیں کہ روئے زمین پر آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے''۔

اس پر امام مالک رحمہ اللہ نے بغیر کسی گھبراہٹ کے فرمایا:

"اذا رجعت فاخبرھم انی لا احسن"

(جب تم اُن کے پاس جاؤ تو اُنہیں بتا دینا کہ میں یہ مسئلہ اچھی طرح نہیں جانتا)۔

ایک اور شخص نے آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا اور پھر کہا ''مجھے جواب دیجئے!'' آپ نے فرمایا:

"ویحك، اتر ید ان تجعلنی حجۃ بینك وبین اللہ ؛ فاحتاج انا اولاً ان انظر کیف خلاصی، ثم اخلصك"

(تیرا ناس ہو! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ مجھے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجت بنا لے؟ تو ایسی صورت میں پہلے مجھے اس کی ضرورت ہے کہ میں یہ دیکھ لوں کہ میری بچت اور خلاصی کیسے ہو گی، پھر میں تجھے بچاؤں گا)۔

ابن ابی حازم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اذا سالك انسان عن مسألۃ فابدأ بنفسك فاحرزھا"

(جب کوئی انسان آپ سے کوئی مسئلہ پوچھے تو آپ پہل اپنی ذات سے کریں کہ اُس کی حفاظت کر لیں'' (یعنی غلط مسئلہ بتا کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال دیں)

خالد بن خراش رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں عراق سے امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں چالیس مسائل لے کر آیا تو انہوں نے مجھے صرف پانچ کا جواب دیا)۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں، میں نے ابن ہرمز رحمہ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"ینبغی ان یورث العالم جلساءہ قول "لا ادری"...الخ"

(عالم کو چاہیے کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو "لا أدری" (میں نہیں جانتا) خوب سکھا دے۔

تاکہ یہ جملہ اُن کے ہاتھوں میں ایک بنیادی ضابطہ بن جائے اور وہ گھبراہٹ میں یہی کہا کریں۔ جب بھی اُن میں سے کسی سے ایسی بات پوچھی جائے جو اس نے روایت نہیں کی تو وہ صاف کہہ دے "لاأدری")۔

ابنِ وھب رحمہ اللہ (ت ۱۸۰) کہتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ اکثر سوالات جواُن سے پوچھے جاتے' اُن کے جواب میں "لاأدری" کہہ دیتے تھے۔

عمر بن یزید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں جب میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے بات کی (کہ لوگ جواب نہ ملنے سے پریشان ہوتے ہیں) تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"یرجع اهل الشام الی شامهم واهل العراق الی عراقهم واهل مصر الی مصرهم، ثم لعلّی ارجع عما افتیتهم به"

(شام والے شام واپس چلے جائیں گے' اہلِ عراق عراق کو لوٹ جائیں گے اور مصر کے رہنے والے وہاں پہنچ جائیں گے' پھر میں شاید اُن فتاویٰ کی طرف اکیلا ہی لوٹ جاؤں گا جو میں اُن کو دیتا رہا ہوں)۔

عمر بن یزید رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے یہ بات لیث رحمہ اللہ (ت ۱۹۰) کو بتائی تو وہ رو پڑے اور فرمایا "اللہ کی قسم! مالک رحمہ اللہ تو لیث سے زیادہ مضبوط تھے" یا ایسا ہی کوئی اور جملہ فرمایا۔

ابن وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے تیس ہزار مسائل ایسے پوچھے جو اُن کی زندگی میں پیش آئے، تو انہوں نے ان مسائل میں سے ایک تہائی (یا آدھے یا جتنے مسائل اللہ تعالیٰ نے چاہے) اُن کے بارے میں فرمایا:

"مجھے اچھی طرح معلوم نہیں اور میں نہیں جانتا"۔

کسی نے امام مالک رحمہ اللہ کو کہہ دیا کہ "جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "لاادری" تو پھر کون جانتا ہوگا"؟

امام مالک رحمہ اللہ نے اُسے فرمایا:

"ویحك ما عرفتنی؟ وما انا؟ وای شئ منزلتی حتی ادری مالا تدرون... الخ"

(تیرا ناس ہو! تو نے مجھے پہچانا نہیں؟ اور میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میرا مرتبہ ہی کیا ہے جب تک میں وہ نہ جان لوں' جو تم نہیں جانتے"۔ پھر آپ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بات بطور حجت

پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''میں کون ہوں؟ لوگوں کو صرف خود پسندی اور سرداری کی طلب نے برباد کر دیا ہے اور یہ چیز تو بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے)۔

مصعب رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "لا ادری" (مجھے معلوم نہیں)۔

سوال کرنے والے نے کہا:

"انها مسألة خفيفة سهلة، وانما اردت ان اعلم بها الامير"

(یہ تو بالکل ہلکا اور آسان مسئلہ ہے اور میں تو یہ چاہتا تھا کہ امیر کو یہ مسئلہ جا کر بتاؤں)۔

یہ سوال کرنے والا کچھ صاحبِ حیثیت شخص تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا:

"مسألة خفيفة سهلة؟ ليس في العلم شئ خفيف... الخ"

(ہلکا اور آسان مسئلہ؟ علمِ دین میں کوئی چیز ہلکی نہیں ہے)۔

کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سن رکھا ہے:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل۔ ۵)

(ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں)۔

لہٰذا علم سارا ہی بھاری ہے اور خاص طور پر وہ علم، جس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

ابن قاسم رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کو ایک مرتبہ کہا:

''اہل مدینہ کے بعد اہلِ مصر سے زیادہ خرید و فروخت کے مسائل جاننے والا کوئی نہیں''۔

امام مالک رحمہ اللہ نے پوچھا:

''انہوں نے یہ مسائل کس سے سیکھے ہیں؟''

ابن قاسم رحمہ اللہ نے عرض کیا:

''آپ سے ہی سیکھے ہیں''۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما اعلمها انا، فكيف يعلمونها؟"

(میں تو خود ان مسائل کو سب سے زیادہ نہیں جانتا، پھر اہلِ مصر نے کیسے مجھ سے یہ مسائل سیکھ لیے؟)۔

قعنبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا تو آپ کو روتا ہوا پایا۔ میں نے پوچھا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''مجھ سے زیادہ کسے رونا چاہیے؟ کہ میں کوئی بات کرتا ہوں تو اُسے قلم سے لکھ لیا جاتا ہے اور پھر دور دراز کے علاقوں تک پھیلا دیا جاتا ہے''۔ ح ۲۶

حضرت سحنون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

" انی لأ سال عن مسألة فاعرف فی ای کتاب وورقة وصفحة وسطر ، فما یمنعنی عن الجواب فیھا الا کراھة الجرأۃ بعدی علی الفتیا" ح ۲۷

(مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے اور میں اُس کے بارے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ کس کتاب کے، کس ورق اور کس صفحہ کی کس سطر میں لکھا ہوا ہے لیکن مجھے جواب سے صرف یہ بات روک لیتی ہے کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں (کہ لوگ میری بات کو جواز بنالیں گے اور اُن کی) میرے بعد فتویٰ دینے پر جرأت بڑھ جائے گی)۔

علامہ ماوردی شافعی رحمۃ اللہ علیہ ت ۲۰ اپنی کتاب ''ادب الدین والدنیا'' میں فرماتے ہیں:

''جن باتوں کا میں تمہیں اپنی حالت کا حوالہ دے کر ڈراتا ہوں اور بچنے کا کہتا ہوں' اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے خرید و فروخت کے مسائل میں ایک ایسی کتاب لکھی' جس میں' میں نے بقدرِ استطاعت فقہاء کی کتابوں سے خوب مسائل جمع کر لیے۔ میں نے اس کتاب کو لکھنے کیلئے اپنے آپ کو خوب مشقت میں ڈالا اور اپنے دل و دماغ کو خوب تھکا دیا' یہاں تک کہ جب وہ مرتب شکل میں مکمل ہوگئی۔ اور میں اس بارے میں خود پسندی میں مبتلا ہونے ہی لگا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ تمام لوگوں میں سے مجھے ہی خرید و فروخت کے مسائل کا سب سے زیادہ علم ہے (کہ اچانک یہ واقعہ پیش آ گیا)۔

میرے پاس' میری مجلس میں دو دیہاتی افراد آئے اور مجھ سے ایک ایسے سودے کے بارے میں سوال کرنے لگے جو انہوں نے گاؤں میں کیا تھا۔ یہ سودا چند شرائط پر مبنی تھا' جو چار مسائل پر

مشتمل تھیں، مجھے ان میں سے کسی چیز کا جواب بھی سمجھ نہیں آیا۔ تب میں سر جھکا کر سوچنے لگا اور اپنی اور اُن کی حالت سے عبرت پکڑنے لگا۔ اتنے میں اُن دونوں نے کہا:

''کیا آپ کے پاس ہمارے سوال کا' جو ہم نے آپ سے کیا ہے' کوئی جواب نہیں ہے، حالانکہ آپ تو اس جماعتِ علماء کے بڑے ہیں؟''۔

میں نے کہا: ''نہیں! میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے''۔

اس پر اُن دونوں نے کہا:

''افسوس ہے آپ پر'' اور یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ پھر وہ دونوں ایک ایسے عالم کے پاس پہنچے کہ میرے بہت سے شاگرد بھی شاید علم میں اُن سے آگے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اُن دیہاتیوں نے اُس عالم سے مسئلہ پوچھا اور انہوں نے فوراً اُن کو ایسا جواب دے دیا جس سے وہ دونوں مطمئن ہو گئے اور وہ واپس ہوئے تو اُن کے جواب سے خوش اور اُن کے علم کی تعریف میں رطب اللسان تھے......

یہ واقعہ میرے لیے تو مؤثر نصیحت اور خوفناک وعظ بن گیا' کہ ان دونوں کے سامنے میرے نفس کی ساری برتری جاتی رہی اور خود پسندی کا سارا جوش غائب ہو گیا۔ (ح.۲۸)

★...★...★

حواشی (۱)

فتویٰ اور اس کی عظمت
(الفتوی وخطورتها)

(۱)سنن الدارمی ،باب الفتیا وما فیه من الشدة ،رقم الحدیث ۱۵۹ الجزء ۱، الصفحة ۱۷۹ ،طبع دار القلم دمشق۔

سنن سعید بن منصور ،باب قول عمر فی الجد ،رقم الحدیث ۵۶ الجزء ۱ ،الصفحة ۶۳ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

میں یہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی روایت سے ہے ،اور الجامع الصغیر اور فیض القدیر المناوی ۱۵۸ (رحمہ اللہ/۱) میں اس پر صحیح ہونے کی علامت لگائی گئی ہے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی مراسیل کے مقبول ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

(۲) صحیح البخاری ،معلقاً، کتاب التوحید ،باب وکان الله سمیعاً بصیرا (النساء ۱۳۴) الصفحة ۱۳۳۵ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

سنن أبی داؤد، کتاب الطلاق ،باب فی الظهار ،رقم الحدیث ۲۲۱۴، الصفحة ۳۵۴ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الحج ،باب الحج والنذور عن المیت والرجل یحج عن المرأة ،رقم الحدیث ۱۸۵۲، الصفحة ۳۳۶ الی ۳۳۷ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴) المجموع شرح المهذب النووی ،باب اداب الفتوی والمفتی والمستفتی ،الجزء ۱، الصفحة

۴۰،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

اصول الافتاء میں قدیر الموقع ہے اور اصل کتاب میں " کبیر الموقع " اور اسی طرح اصول الافتاء میں معرض للخطر اور اصل کتاب میں "معرض للخطاء " ہے۔

(۵) اعلام الموقعین عن رب العالمین،فصل ما یشترط فیمن یوقع عن اللہ و رسولہ ۔الجزء ۱،۲ ،الصفحۃ ۹،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۶) اس کی تخریج پہلے حاشیہ نمبر ا میں گزر چکی ہے۔

(۷) جامع بیان العلم وفضلہ ،ابن عبد البر،باب مایلزم العالم اذاسئل عما لایدریہ من وجوہ العلم ،رقم الحدیث ۱۰۰۵،الجزء ۳،الصفحۃ ۶۳،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔

(۸) الفقیہ والمتفقہ ،الخطیب ،باب الزجر عن التسرع الی الفتوی مخافۃ الزلل ،الجزء :۳،الصفحۃ ۱۹۵،طبع مکتبۃ الظاھریۃ دمشق۔

(۹) أخلاق العلماء ،الآجری، کتاب اخلاق العالم الجاھل المفتتن بعلمہ ،رقم الحدیث ۸۰،الجزء ۱،الصفحۃ ۹۲،طبع الدار البیضاء۔

(اصول الافتاء میں "بشر بن الحارث قال" ہے جب کہ اصل کتاب میں "سمعت بشرا قال :سفیان" ہے)۔

(۱۰) المعرفۃ والتاریخ ،الفسوی ۔الحسن بن صالح ،الجزء ۱ ،الصفحۃ ۳۷۷،طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت۔

(۱۱) الطبقات الکبری،ابن سعد،ابو مدینۃ السدوسی، محمد بن سیرین الجزء ۷،الصفحۃ ۱۹۵،طبع مکتبۃ الخانجی ،القاھرۃ۔

المعرفۃ والتاریخ ،الفسوی ،محمد بن سیرین ،الجزء ۱،الصفحۃ ۱۹۳،طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت۔

حلیۃ الاولیاء،ابو نعیم ،ابن سرین،الجزء ۱،الصفحۃ ۳۲۸،طبع دار الکتب العربی بیروت۔

(۱۲) حلیۃ الأولیاء ،ابو نعیم ،محمد بن المنکدر ،الجزء ۱،الصفحۃ ۲۶۱،طبع دار الکتب العربی بیروت۔

سنن الدارمی ،باب من هاب الفتیا و کره التنطع والتبدع ،رقم الحدیث، ۱۳۹،الجزء۱، الصفحة۱۵۸، دار القلم دمشق ، قال :ان العالم یدخل فیما بین الله وبین عباده فلیطلب لنفسه المخرج۔

حلیة الاولیاء میں یہ روایت ان الفاظ سے ہے "الفقیه یدخل بین الله وبین عباده فلینظر کیف یدخل۔

(۱۳)الزهد، ابن المبارك، باب فی الذب عن عرض المؤمن ،رقم الحدیث۱۸۱۸، الجزء۴، الصفحة۳۱۴،مؤسسة الرسالة بیروت۔

(۱۴)حلیة الاولیاء، ابونعیم ،سفیان بن عیینة، الجزء ۳، الصفحة۲۸۸،طبع دار الکتب العربی ،بیروت۔

ہمارے سامنے موجودہ نسخہ میں "یحدث عن فضیل بن عیاض قال" کا اضافہ ہے اور آخر میں "واحد" کا لفظ نہیں ہے۔

(۱۵)جامع بیان العلم وفضله،ابن عبد البر ،باب ما جاء فی ذم القول فی دین الله بالرأی والظن والقیاس علی غیر أصل وعیب الاکثار من المسائل دون اعتبار ،رقم الحدیث ۱۱۱۳۶،الجزء ۳، الصفحة۳۷۵،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

ہمارے سامنے موجودہ نسخہ میں "ما علمته فقل به " *کے الفاظ ہیں* (مذکورہ آثار الفقیه والمتفقه " خطیب بغدادی، الجزء ۱، الصفحة ۳۴۹ الی ۳۵۹، ۲، ۳۴۹ تا ۳۵۹ طبع دار ابن الجوزی *میں بھی ہیں*)

(۱۶) ادب المفتی والمستفتی ،ابن الصلاح ،باب بیان شرف حرمة الفتوی وخطرها ،وغررها ،الصفحة ۸۱ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی،

(۱۷)صحیح البخاری ،کتاب الاحکام ،باب من لم یسأل الامارة اعانه الله ،رقم الحدیث ۷۱۳۶،الصفحة۱۲۹۴ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۱۸)سنن الدارمی ،باب من هاب الفتیا وکره التنطع والتبدع، رقم الحدیث ۱۳۸، الجزء ۱ ،الصفحة ۱۵۶ ،طبع دار القلم دمشق۔

میں یہ *الفاظ ہیں* "عن داؤدقال :سالت الشعبی کیف کنتم تصنعون اذا سئلتم قال :علی

الخبير وقعت كان اذسئل الرجل قال لصاحبه :أفتهم .فلا يزال حتى يرجع الى الاول۔

(۱۹) سنن الدارمی ،باب من هاب الفتيا و كره التنطع والتبدع ،رقم الحديث ۱۳۷ الجزء ۱، الصفحة۱۵۶،طبع دار القلم دمشق۔

میں یہ الفاظ ہیں، لقد ادركت فی هذا المسجد عشرين ومائة من الانصار ومامنهم احد يحدث بحديث الاودان اخاه كفاه الحديث، ولا يسال عن فتيا الاودان اخاه كفاه الفتيا۔

جامع بيان العلم و فضله ، ابن عبدالبر ، باب تدافع الفتوى وذم من سارع اليها ، رقم الحديث ۱۱۱۸۰، الجزء ۳، الصفحة ۴۲۱،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۲۰) الفقيه والمتفقه، الخطيب، باب القول فی السئوال عن الحادثة والكلام فيها قبل وقوعها ،رقم الحديث ۶۳۳، الجزء ۲، الصفحة ۲۰۸، طبع مكتبة الظاهرية دمشق۔

(۲۱) سنن الدارمی، باب بلا ترجمة، رقم الحديث ۱۷۶، الجزء ۱ الصفحة ۱۹۷، طبع دار القلم دمشق۔

الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ یہ اثر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تخریج ہے اور اثر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ اور تخریج یہ ہے، جامع بيان العلم وفضله ،ابن عبد البر ،باب تدافع الفتوى وذم من سارع اليها، رقم الحديث ۱۱۸۲، الجزء ۳، الصفحة ۴۲۳ طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

" عن يحيى بن سعيد قال: قال ابن عباس (ان من افتى الناس فی كل ما يسألونه عنه لمجنون)"

(۲۲) المدخل الى السنن الكبرى، البيهقی، باب التوقی عن الفتيا والتثبت فيها ،رقم الحديث ۶۵۷، الجزء ۲، الصفحة ۱۷۷، طبع دار الخلفاء لكتاب الاسلامی كويت۔

عن ابی حصين قال: ان احدهم ليفتی فی المسألة ،ولو وردت على عمر بن الخطاب لجمع لها اهل بدر۔

اصول الافتاء میں یہاں "ان احدكم" ہے، جبکہ اصل کتاب میں "ان احدهم" ہے، نیز انہی الفاظ کے ساتھ یہ اثر اصول الافتاء کے آخری باب احكام الافتاء ومنهجه میں " آداب الافتاء" کے زیر عنوان ص ۳۱۸ پر بھی منقول ہے۔

(۲۳) جامع بيان العلم وفضله ،ابن عبد البر، باب تدافع وذم من سارع اليها ،رقم الحديث ۱۱۱۸۶، الجزء ۳، الصفحة ۴۲۷، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۲۴) سنن الدارمی ،باب من هاب الفتياء و كره التنطع والتبدع ،رقم الحديث ۱۳۶، الجزء ۱

الصفحة ۱۵۳،طبع دار القلم دمشق۔

(۲۵) جامع بیان العلم وفضله، ابن عبد البر، باب ما یلزم العالم اذا سئل عما لا یدریه من وجوه العلم ،رقم الحدیث۹۹۹،الجزء۳،الصفحة ۵۸،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۲۶) ترتيب المدارك وتقريب المسالك ،تحريه فى العلم والفتياء والحديث وورعه فيه وانصافه،الجزء۱،الصفحة ۱۴۱الى ۴۲،طبع دار مكتبة الحياة بيروت۔

(۲۷) ترتيب المدارك وتقريب المسالك ،ذكر بقايا فضائل سحنون وتقاه وخوفه وزهده وتحريه،الجزء۱،الصفحة ۲۳۱،طبع دار مكتبة الحياة بيروت۔

(۲۸) طبقات الشافعية الكبرى ،السبكى ،على بن محمد بن حبيب الامام الجليل القدر رفيع الشان ابو الحسن الماوردى ،الجزء ۵، الصفحة ۱۷۵ ،(الطبقة الرابعة فيمن توفى بين الاربعمائة والخامس مائة)طبع دار المعرفة بيروت۔

...★...

2

اسلاف کے مناہج افتاء

(مناهج الفتوى فى السلف)

مباحث

- [illegible] میں۔
- [illegible] اور تابعین [illegible] کا طریقہ کار۔
- [illegible] میں فتویٰ۔
- [illegible] میں۔
- [illegible] تابعین جنہوں نے نہ پیش آنے والے مسائل میں فتویٰ دینے سے اعراض کیا۔
- وہ فقہاء جنہوں نے ان مسائل پر فتاویٰ دیے جو ابھی پیش نہیں آئے تھے اور ان کی دلیل۔
- [illegible] تابعین میں اہم فتویٰ۔
- اختلاف صحابہ [illegible] و تابعین [illegible] اور فقہاء کے اسباب۔
- [illegible]
- [illegible] حدیث اور اصحاب رائے۔
- [illegible]
- [illegible] مذاہب کی پیروی کا سلسلہ۔

فتویٰ عہد نبوت میں

(الفتویٰ فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم)

سب سے پہلے جنہوں نے منصب افتاء کو سنبھالا وہ سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ ہیں اور وہ اللہ پاک کی طرف سے اس کی واضح وحی کے ذریعے فتویٰ دیتے تھے، آپ ﷺ کے فتاویٰ احکام کے جامع ہوتے ہیں اور یہ قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامیہ کا سب سے بڑا ماخذ ہیں، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ان فتاویٰ کو سینوں اور اوراق میں محفوظ کرتے تھے، جیسا کہ تدوینِ حدیث اور کتابتِ حدیث کی بحث میں یہ امور ثابت ہو چکے ہیں۔

تشریحات نمبر (۲) میں عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کے احادیث مبارکہ کے مجموعوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں

آپ ﷺ کے زمانے میں کوئی دوسرا شخص منصبِ افتاء پر فائز نہیں ہوا، ہاں کبھی کبھی آپ ﷺ نے افتاء اور قضاء کا کام اپنے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے سپرد فرمایا ہے اور شاید اس کا مقصد ان حضرات کو اجتہاد اور استنباط کی عملی مشق کرانا تھا۔

استنباط کا مفہوم تشریحات نمبر (۳) میں دیکھیں

جیسا کہ حاکم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے:

"ان رجلین اختصما الی النبی صلی الله علیه وسلم . فقال لعمرو : اقض بینهما . فقال : اقضی بینهما وانت حاضر یارسول الله ! قال : نعم علی انك ان اصبت فلك عشر اجور ، وان اجتهدت فاخطأت فلك اجر " (ح،۱)

(دو افراد اپنا جھگڑا لے کر نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو کہا کہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کی موجودگی میں، میں

فیصلہ کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں تم فیصلہ کرو۔ اگر تم نے درست فیصلہ کیا تو تمہارے لیے دس (۱۰) اجر ہیں، اور اگر تم نے اجتہاد کیا اور غلطی کی تو تمہارے لیے ایک اجر ہے)۔

اس کی (دوسری) مثال وہ ہے جو مسندِ احمد میں حضرت معقل مزنی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

"امرنی النبی صلی الله علیه وسلم ان اقضی بین قوم فقلت ما احسن ان اقضی یارسول الله! قال: الله مع القاضی مالم یحف عمداً"۔ (ح ۲)

(مجھے نبی ﷺ نے ایک قوم کے درمیان فیصلہ کرنے کا حکم دیا، تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اچھی طرح فیصلہ نہیں کر پاتا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک کی مدد اس وقت تک قاضی کے ساتھ ہوتی ہے، جب تک وہ جان بوجھ کر ظلم نہ کرے)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم دور دراز کے شہروں میں بھیجتے وقت فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، جیسا کہ وہ حدیث ہے جو محدثین کرام رحمہم اللہ (امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام نسائی رحمہ اللہ) نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے نقل کی ہے:

"لما اراد ان یبعث معاذاً الی الیمن، قال: کیف تقضی اذا عرض لك قضاء؟" قال: اقضی بکتاب الله، قال، فان لم تجد فی کتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم، قال، فان لم تجد فی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا فی کتاب الله؟ قال: اجتهد رای ولا آلو، فضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم صدره فقال: الحمد لله الذی وفق رسولَ رسولِ الله لما یُرضی رسول الله"۔ (ح ۳)

(جب حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنا چاہا تو ان سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آئے گا تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی کتاب کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر تم نے کتاب اللہ میں نہ پایا تو کیا کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا: کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے سنت رسول اللہ ﷺ اور کتاب اللہ دونوں میں اس کو نہ پایا تو کیا کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا میں اپنی رائے کے ذریعے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں

کروں گا۔ آپ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا ''تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے اللہ کے رسول ﷺ کے قاصد کو ایسی بات کی توفیق دی جس نے اللہ کے رسول ﷺ کو راضی کر دیا)۔

اس حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ کو بعض محدثین کرام نے دو وجہ سے معلّل قرار دیا ہے:

(۱)......حارث بن عمرو رحمہ اللہ کے مجہول ہونے کی بناء پر۔

(۲)......حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے شاگرد (جن سے روایت منقول ہے) اُن کے مجہول ہونے کی بناء پر۔

لیکن یہ ایسی حدیث پاک ہے' جس کو ہر زمانے اور ہر علاقے کے علماء نے قبول کیا ہے۔

علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث اگر چہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ایسے شاگردوں سے مروی ہے' جن کے نام ذکر نہیں' لیکن یہ بات کوئی نقصان نہیں پہنچاتی' کیونکہ اس سے تو حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ کی شہرت کا پتہ چلتا ہے اور پھر حارث بن عمرو رحمہ اللہ جن سے یہ حدیث نقل کر رہے ہیں' وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے کوئی ایک شاگرد نہیں بلکہ شاگردوں کی ایک جماعت ہے۔ تو اگر وہ ایک شاگرد کا نام لے لیتے تو بھی یہ صورت (کہ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد راوی ہے) حدیث کی شہرت پر زیادہ دلالت کرنے والی ہے۔

ہم بھلا ایسا کیوں نہ کہیں' حالانکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کا علم' دین' فضل اور سچائی میں جو مرتبہ ہے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے' کوئی بھی اُن کے شاگردوں میں سے متہم' کذّاب یا مجروح نہیں ہے' بلکہ وہ تو سب ہی مسلمانوں کے بہترین اور پسندیدہ لوگوں میں سے ہیں۔ اسی لیے اہلِ علم نے اُن سے حدیث نقل کرنے میں شک سے کام نہیں لیا۔

بھلا ہم اس حدیث کو کیسے قبول نہ کریں حالانکہ شعبہ رحمہ اللہ جیسے محدث اس حدیث کے علمبردار ہیں۔ جن کے بارے میں بعض آئمہ حضرات نے فرمایا:

اذا رأیت شعبة فی اسناد حدیث فاشدد یدیك به

(جب تم شعبہ کو کسی حدیث کی سند میں دیکھو تو اُس حدیث کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لو)۔

ابوبکر الخطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث عبادۃ بن نُسی رحمہ اللہ نے بھی عبدالرحمن بن غنم رحمہ اللہ کے واسطے سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ لہٰذا یہ سند متصل ہوئی اور اس کے راوی اپنی ثقاہت میں مشہور ہیں۔ پھر ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اہلِ علم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کو بطور دلیل پیش کیا ہے، جس سے ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ حدیث اہل علم کے ہاں صحیح ہے)۔ (ح،۴)

(امام شعبہ رحمہ اللہ کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:

کنت عند سفیان فاتاہ موت شعبة فقال الیوم مات الحدیث۔

(میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کے ہاں تھا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ کے انتقال کی خبر ملی، جس پر انہوں نے فرمایا: ''آج علمِ حدیث رخصت ہو گیا'')۔

پھر اس حدیث کی تائید تو اُس حدیث صحیح سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

"اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اصاب فله اجران واذا حکم فاجتھد ثم اخطأ فله اجر" (ح.۵)

(جب کوئی حاکم فیصلہ کرتا ہے اور خوب کوشش کرتا ہے پھر اگر وہ درست ہو تو اس کیلئے دو اجر ہیں اور جب وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے لیکن اس میں غلطی کرے تو اس کیلئے ایک اجر ہے)۔

افتاء میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا طریقہ کار

(منهج الصحابة والتابعين فی الافتاء)

ابھی جو تفصیل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذری، بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس پر عمل کرنا ثابت ہے۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سنن دارمی میں قاضی شریح رحمہ اللہ (ت،۲۱) سے روایت کی ہے:

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا کہ اگر تمہارے پاس کتاب اللہ کا کوئی حکم آئے تو اس

کے مطابق فیصلہ کرو اور تمہیں اس سے ہرگز لوگ نہ موڑیں، پس اگر تمہارے پاس ایسا معاملہ آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سنت رسول اللہ میں کوئی بات ہے، تو اس کو دیکھو جس پر تمام لوگ متفق ہیں تو اس کو لے لو، اور اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں نہ کتاب اللہ کا کوئی حکم ہے اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں ہے اور نہ ہی تم سے پہلے کسی نے اس کے بارے میں گفتگو کی ہے، تو تم دو باتوں میں سے جسے چاہو منتخب کرلو، یا تو اپنی رائے کے ذریعے اجتہاد کرو اور پھر تم آگے بڑھو تو تم آگے کیسے جاؤ گے۔ اور اگر تم چاہو تو بس (اجتہاد سے) پیچھے ہٹ جاؤ، تب تم پیچھے کر دیئے جاؤ گے اور میں تو تمہارے لیے پیچھے رہنے کو ہی بہتر سمجھتا ہوں''۔

امام دارمی رحمہ اللہ ہی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''جب تم سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے تو تم کتاب اللہ میں دیکھو، اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو سنتِ رسول اللہ ﷺ میں دیکھو اگر وہاں بھی نہ پاؤ تو وہ جواب دو جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو۔ اگر وہ سوال ان میں سے بھی نہ ہو تو تم اپنی رائے سے اجتہاد کرو''۔

انہوں (امام دارمی رحمہ اللہ) نے ہی حضرت عبداللہ بن یزید رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی مسئلے کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے، وہاں اس کا حکم موجود ہوتا تو سائل کو اس سے آگاہ کرتے، اگر قرآن پاک میں حکم موجود نہ ہوتا تو احادیث رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے، اگر وہاں بھی اس کا حکم نہ پاتے تو حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اقوال میں غور فرماتے، اگر یہاں بھی مسئلے کا حکم پانے میں ناکامی ہوتی تو اپنی رائے کا استعمال فرماتے''۔ (ح ۱۰)

علامہ بیہقی رحمہ اللہ (ت ۲۲۰) نے حضرت مسلمہ بن مخلد رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور فرمایا:

''اے میرے چچا کے صاحبزادے! ہمیں تو فیصلے پر مجبور کر دیا گیا ہے اب ہم کیا کریں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں، اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم موجود نہ ہو تو سنت رسول اللہ ﷺ میں اسے تلاش کریں، اگر وہاں بھی نہ ملے تو اہل رائے کو جمع کر کے اجتہاد کریں، اجتہاد کے بعد فیصلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔

اسی طرح امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت ادریس الاودی رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا:

''حضرت سعید بن ابو بردہ رحمہ اللہ ہمارے پاس ایک مکتوب لے کر آئے اور کہا کہ یہ وہ مکتوب ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس ارسال کیا تھا، پھر انہوں نے مکمل حدیث بیان کی اور اُس میں یہ بھی مذکور تھا کہ اگر کسی مسئلہ کا حکم قرآن وسنت میں نہ پاؤ اور تمہارے دل میں کھٹکے تو اپنے فہم وفراست سے اس کا حکم تلاش کرو، **امثال و اشباہ** (پیش آئے ہوئے مسئلے سے ملتے جلتے دیگر مسائل) کا خیال رکھ کر مسئلے میں غور کرو اور مسائل کو ایسے ہی قیاس کرو، اور جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو اور تمہاری رائے میں جو اصل حکم کے زیادہ قریب ہو اُسے اختیار کرنے کی کوشش کرو''۔ ح۔۷

اشباہ کا معنیٰ تشریحات نمبر (۴) میں دیکھیں

حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا، جس سے اس حدیث کی تائید ہوتی ہے، اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اس قول کی توثیق ہوتی ہے کہ تمام سلف صالحین نے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ پر عمل کیا ہے۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں فتویٰ

(الفتوی فی عهد الصحابة رضی الله عنهم اجمعین)

ابن قیم رحمہ اللہ نے **اعلام الموقعین** میں ذکر فرمایا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جن حضرات کے فتاویٰ محفوظ ہیں، ان سب مرد وخواتین کی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں سے سات افراد ایسے ہیں جن سے بکثرت فتاویٰ منقول ہیں وہ حضرات یہ ہیں:

(۱)...... حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ (۲)...... حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ (۳)...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ (۴)...... ام المومنین حضرت صدیقہ بنتِ صدیق عائشہ رضی اللہ عنہا۔ (۵)...... حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۶)...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (۷)...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

ابن حزم رحمہ اللہ ت۔۲۳ نے نقل کیا ہے کہ ان حضرات میں سے ہر ایک کے فتاویٰ ایک ضخیم کتاب میں جمع

کئے جاسکتے ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے کہ امیر المومنین مامون الرشید کے پڑ پوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ بیس کتابوں میں جمع کیے تھے۔ اور یہ ابوبکر رحمہ اللہ علم وحدیث کے بڑے آئمہ اسلام میں سے تھے۔

وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جن سے درمیانی تعداد میں فتاویٰ منقول ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما جیسے حضرات ہیں۔

ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ان سب حضرات میں سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک بہت مختصر جز (کاپی) تیار ہوسکے۔ ان کے علاوہ باقی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بہت کم فتویٰ دینے والے تھے۔

ان حضرات سے ایک، دو یا چند اور مسئلے منقول ہیں اور ممکن ہے کہ خوب اچھی طرح تلاش اور بحث کے بعد ان سب حضرات کے فتاویٰ ایک مختصر جز میں جمع کردیئے جائیں۔

پھر ابن قیم رحمہ اللہ نے ابن حزم رحمہ اللہ کے حوالے سے ایسے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام نقل فرمائے اور اس کے بعد تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور امرءۃ غامدیہ رضی اللہ عنہا (ان دونوں ہستیوں پر ان کے اقرار کی بناء پر حدِ رجم جاری کی گئی تھی) کو بھی ان میں شامل کیا ہے، شاید ان کا خیال یہ ہوا کہ ان دونوں حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت کے بغیر جو اقرار کیا تھا وہ اپنے نفس پر اقرار کے جائز ہونے کا ایک فتویٰ ہی لگاتا تھا، اور انہیں اس پر برقرار رکھا گیا۔ اگر یہی بات ہے تو یہ بڑا عجیب خیال ہے، یا شاید ابن حزم رحمہ اللہ کو ان دونوں کا کوئی اور فتویٰ مل گیا ہوگا۔ (ح، ۸)

حضرت ماعز اور غامدیہ خاتون رضی اللہ عنہا کا مکمل واقعہ تشریحات نمبر (۵) میں ملاحظہ فرمائیں

(یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ابن حزم اور ابن قیم رحمہما اللہ کی بتائی ہوئی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ اُس مبارک

دور میں بھی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود مسائل مستنبط نہیں کرتے تھے' بلکہ یہ فریضہ چند اہلِ علم ہی ادا کرتے تھے اور باقی حضرات اُن کی پیروی کرتے تھے۔ پھر آج کے دور میں' جب کہ علم وعمل میں بہت کمی آ چکی ہے' ہر شخص کو یہ دعوت کیسے دی جا سکتی ہے کہ وہ براہِ راست قرآنِ مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل واحکام نکالے اور حضراتِ آئمہ کرام رحمہم اللہ کی تقلید کرنے کے بجائے ازخود ہی مجتہد بن بیٹھے)۔

بعض معاصر علماء نے چند صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فتاویٰ الگ الگ کتابوں کی شکل میں جمع کیے ہیں' جن میں سے چند اہم کو ہم مندرجہ ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

(۱)......موسوعة فقه ابی بکر رضی اللہ عنہ۔ یہ دکتور محمد رواس قلعہ جی کی تالیف ہے۔ (دار النفائس)

(۲)......موسوعة فقه عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ دکتور محمد رواس قلعہ جی کی تالیف ہے۔ (مکتبة الفلاح)

(۳)......فقه عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ موازناً بفقه اشهر المجتهدین' یہ دکتور رویعی بن راجح الرحیلی کی تالیف ہے۔ (جامعة ام القریٰ)

(۴)......فقه عمر رضی اللہ عنہ، یہ حضرت شاہ ولی اللہ (ت ۱۱۷۶) محدثِ دہلوی کی تالیف ہے اس کا اردو ترجمہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے کیا ہے۔ (ادارہ ثقافتِ اسلامی' لاہور)

(۵)......موسوعة فقه عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، دکتور محمد رواس قلعہ جی۔ (جامعة ام القریٰ)

(۶)......موسوعة فقه علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، دکتور محمد رواس قلعہ جی۔ (دار النفائس)

(۷)......موسوعة فقه عائشة رضی اللہ عنہا حیاتها وفقهها، شیخ سعید فائز الدخیل۔ (دار النفائس)

(۸)......موسوعة فقه عبد الله ابن مسعود رضی اللہ عنہ، دکتور محمد رواس قلعہ جی۔ (جامعة ام القریٰ)

(۹)......فقه انس بن مالك رضی اللہ عنہ جمعاً ودراسةً، دکتور عبد المحسن بن محمد بن عبد المحسن المنیف۔

(۱۰)......موسوعة فقه عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما، عصره وحیاته، دکتور محمد رواس قلعہ جی۔ (دار النفائس)

(۱۱)...... انفرادات ابن عباس رضی اللہ عنہما عن جمهورِ الصحابة فی الاحکام . الفقهیة (دراسةً مقارنةً)، محمد سمیعی سید عبد الرحمن الرستاقی۔ (مکتبة الفرقان)

(۱۲)......معجم فقه السلف عترة وصحابة وتابعین' الشیخ محمد المنصر الکتانی کی تالیف ہے۔ (جامعة ام القریٰ۔ مطابع الصفا بمکة المکرمة)

تقلیدِ صحابہ کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ تشریحات نمبر (۶) میں ملاحظہ فرمائیں

فتویٰ دورِ تابعین میں

(الفتوی فی عھد التابعین)

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد فتاویٰ کیلئے اکابرِ تابعین کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور یہ حضرات مختلف ایسے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے جو مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے بعد آباد کئے تھے، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے **اعلام الموقعین** کے شروع میں ان میں سے بہت سے حضرات کے نام گنوائے ہیں، اسی طرح بہت سے علماء نے ان کے طبقات کے بارے میں مختلف کتابیں تحریر کی ہیں۔ جو مختصر اجزاء کی شکل میں بھی ہیں اور کئی کئی جلدوں میں بھی۔

فقہاء تابعین کی بنیادی طور پر دو قسمیں تھیں، پہلی قسم میں وہ حضرات تھے جن کی زیادہ تر مشغولیت حدیث پاک کی روایت کرنا تھا اور وہ فقہ میں صرف وہ ہی بات کرتے جو کتاب وسنت میں صراحتاً آئی ہو اور وہ ایسے مسائل جزئیہ کے استنباط کی فکر میں نہیں پڑتے تھے جو اَب تک پیش نہ آئے ہوں اور یہ اس وجہ سے تھا کہ ان میں سے زیادہ تر حضرات رائے اور قیاس میں غور وفکر کو برا سمجھتے تھے اور وہ سوائے سخت ضرورت کے فتویٰ دینے اور استنباط کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور وہ دلیل کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات نقل کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ سوال کو برا سمجھا ہے۔

دوسری قسم کے تابعین وہ حضرات تھے جنہوں نے اپنے آپ کو فقہ اور فتویٰ کیلئے فارغ کر لیا تھا' لہٰذا وہ حضرات صرف احادیث اور آثار کی روایت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ مسائل جمع کرتے اور جزئیات کی تفریع کرنے میں بھی خوب کوشش کرتے تھے' یہاں تک کہ فقہ کے ہر باب میں ان سے کوئی نہ کوئی فتویٰ منقول ہے اور بعض حضرات تو ایسے تھے کہ جن کی فقہ کو مدوّن بھی کیا گیا ہے جیسے امام شعبی رحمہ اللہ اور امام مکحول رحمہ اللہ (ت ۲۵) ۔

وہ فقہاء جنہوں نے نہ پیش آنے والے مسائل میں فتویٰ دینے سے اعراض کیا

(الفقھاء الذین منعوا من الافتاء فیما لم یقع)

پہلی قسم کے حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ مفتی اور فقیہ کیلئے مناسب طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ صرف ان واقعی اور حقیقی

مسائل پر اکتفاء کرے جو اس کے سامنے کسی ایسے شخص کی طرف سے پیش کیے جائیں' جس کو وہ پیش آئے ہوں اور یہ بات ایک فقیہ اور عالم کیلئے نامناسب ہے کہ وہ فقہی جزئیات کی تفریع میں پڑ جائے اور ان معاملات کے احکامات بیان کرے جو عملی طور پر ابھی پیش ہی نہیں آئے۔ کیونکہ وہ ان مسائل کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ان حضرات نے اپنی بات پر اس حدیث مرفوع (وہ حدیث' جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو) سے استدلال کیا ہے جو ابوسلمہ (ت ۲۶،) بن عبدالرحمنؒ سے مرسلاً (وہ حدیث' جس کی روایت کرنے والوں میں کسی صحابی کا نام موجود نہ ہو) منقول ہے' یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تستعجلوا بالبلية قبل نزولها، فانكم اذا فعلتم ذلك لم يزل منكم من يوفق ويسدد، وانكم ان استعجلتم بها قبل نزولها تفرقت بكم السبل ههنا وههنا۔ واشار عن يمينه وعن شماله۔

(کسی مصیبت کے آنے سے پہلے تم جلدی مت کرو۔ پس جب تم ایسا کرو گے تو ہمیشہ تم میں ایسے لوگ رہیں گے جن کو توفیق دی جاتی رہے گی اور ان کو درست رائے پر رکھا جائے گا اور اگر تم نے مصیبت کے آنے سے پہلے جلدی کی تو مختلف راستے تمہیں اِدھر اُدھر بانٹ دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں اور بائیں جانب اشارہ فرمایا)۔ (ح ۹،)

اسی طرح کی ایک اور روایت امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی سنن کے مقدمے میں وہب بن عمرو جمحی رحمہ اللہ سے بھی نقل کی ہے:

لا تعجلوا بالبلية قبل نزولها، فانكم ان لا تعجلوها قبل نزولها لا ينفك المسلمون وفيهم، اذا هي نزلت، من اذا قال وفق وسدد، وانكم ان تعجلوها، تختلف بكم الاهواء فتاخذوا هكذا وهكذا، واشار بين يديه وعن يمينه وعن شماله۔ (ح ۱۰،)

(اس روایت کا مفہوم بھی تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلی روایت کا ابھی گزر چکا ہے)

امام دارمی رحمہ اللہ نے یہ مؤقف (یعنی ابھی تک پیش نہ آنے والے مسائل میں فتویٰ دینے کو ناپسند کرنا) بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے حماد بن زید مقری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے بتایا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک دن کوئی شخص آیا۔ اس نے کوئی ایسی بات پوچھی کہ مجھے پتہ

نہیں چلا کہ وہ کیا بات ہے؟ تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو بات پیش نہ آئی ہو اس کے بارے میں مت پوچھو۔ پس بے شک میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنا ہے کہ وہ ایسے شخص پر لعنت کرتے تھے جو کوئی ایسا سوال کرتا جو ابھی پیش ہی نہ آیا ہو۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے جب کوئی سوال کیا جاتا تو وہ پوچھتے کہ کیا یہ پیش آ چکا ہے؟ پس اگر لوگ کہتے کہ ہاں پیش آ چکا ہے تو وہ اپنے علم کے مطابق اور اپنی رائے کے مطابق گفتگو فرماتے اور اگر لوگ کہتے کہ پیش نہیں آیا تو آپ فرماتے کہ اس معاملے کو چھوڑ دو یہاں تک کہ پیش آ جائے۔

عامر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں:

''حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے پوچھا: کیا یہ مسئلہ اب تک پیش آیا ہے؟

لوگوں نے کہا: نہیں۔

اس پر انہوں نے فرمایا:

جب تک یہ مسئلہ پیش نہیں آتا، ہمیں چھوڑ دو۔ جب پیش آ گیا تو ہم تمہاری طرف سے اُس کا بوجھ اٹھا لیں گے''۔

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ (ت ۱۰۶ھ) سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ کی قسم میں اُس شخص کو سخت تنگی میں مبتلا کر دوں گا، جو ایسے مسائل کے بارے میں پوچھتا پھرے گا جو ابھی تک پیش نہیں آئے۔ جو مسائل پیش آ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو بیان فرما چکا ہے''۔ (ج۱، ۱۱)

(اس ارشاد میں ''احرج'' ''التحریج'' سے ہے، جس کے معنی ہیں ''تنگی کر دینا'' یہ حدیث بھی اس معنیٰ میں ہے:

اللھم انی احرج حق الضعیفین الیتیم والمراءۃ۔

(یعنی اے اللہ! میں دو کمزور طبقات، یتیم اور عورت کے حق کو تنگ کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بھی ان پر ظلم کرنا چاہے تو میں ان کا حق اُس پر حرام قرار دیتا ہوں۔ کذا فی تاج العروس۔ از حاشیہ)

خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ بات نقل کی ہے کہ:

''اے لوگو! جو کچھ ہوا نہیں، اُس کے بارے میں مت سوال کرو۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے شخص پر

لعنت فرماتے تھے یا اُسے برا بھلا کہتے تھے جو ایسے مسائل کے بارے میں سوالات کرتا تھا جو ابھی تک پیش نہیں آئے''۔

خطیب نے امام شعبی رحمہ اللہ سے اور انہوں نے حضرت مسروق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:
میں نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: کیا اب تک ایسا ہو چکا ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا:

''جب تک ایسا نہیں ہوتا، ہمیں راحت سے رہنے دو۔ جب ایسا واقعہ پیش آ گیا تو ہم اجتہاد کر کے اپنی رائے تمہیں بتا دیں گے''۔

اسی طرح انہوں نے موسیٰ بن علی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابن شہاب رحمہ اللہ سے کسی چیز کی بابت پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

''اس کے بارے میں، میں نے کچھ نہیں سن رکھا اور نہ ہی ہمیں ایسا مسئلہ کبھی پیش آیا ہے''۔

موسیٰ بن علی رحمہ اللہ نے عرض کیا: ''آپ کے چند بھائیوں کو تو یہ مسئلہ پیش آ چکا ہے''۔

ابن شہاب رحمہ اللہ نے فرمایا:

''میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سن رکھا اور نہ ہمیں یہ پیش آیا ہے اور نہ ہی میں اس بارے میں کچھ کہوں گا''۔

امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''ہم نے اس شہر (مدینہ منورہ) کو اس حال میں پایا تھا کہ علماء (مسائل کی) اُس کثرت کو ناپسند کرتے تھے، جیسا کہ آج کل ہو رہی ہے''۔ (ح ۱۲)

وہ فقہاء جنہوں نے ان مسائل پر فتاویٰ دیے جو ابھی پیش نہیں آئے تھے اور ان کی دلیل

(الفقهاء الذين افتوا فى المسائل التى لم تقع، وحجتهم)

دوسری قسم کے علماء جنہوں نے اپنے آپ کو اس کام کیلئے وقف کیا تھا کہ وہ احکامِ فقہیہ بیان کریں اور اس طرح تدوین فقہ کریں کہ ضرورت پڑنے پر بعد میں آنے والوں کیلئے آسانی ہو جائے۔ اس کیلئے انہوں نے ایسے مسائل کے

بارے میں گفتگو کی جن کے پیش آنے کا صرف احتمال تھا اور گذشتہ آثارِ صحابہ اور تابعین (یعنی اُن کے ارشادات) کو انہوں نے اس پر محمول کیا کہ اس کام میں بہت زیادہ تقویٰ اور احتیاط کی ضرورت ہے (نہ یہ کہ آئندہ پیش آنے والے مسائل پر غور ہی نہ کیا جائے)۔

امام بیہقی رحمہ اللہ ان آثار کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

''مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ابوعبداللہ الحلیمی رحمہ اللہ (ت ۲۸۰) نے اس طریقے کو علم فقہ حاصل کرنے والوں کیلئے جائز قرار دیا ہے کیونکہ ایک عالم اور فقیہ کی طرف سے ان کے سوالات کے جوابات دینے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی غلطیوں پر تنبہ ہو جائے اور وہ غور وفکر اور اجتہاد کا طریقہ سیکھ لیں۔ یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ ان مسائل پر عمل کریں''۔

پھر امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اسی طور پر فقہاء اجتہادی مسائل بیان کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں تا کہ طلباءِ فقہ کی راہنمائی ہو اور اجتہاد کے طریقہ کار پر ان کو تنبیہ کر دی جائے''۔ (ح ۱۳)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے آثارِ صحابہ وتابعین نقل کرنے کے بعد فرمایا:

''یہ وہ آثار ہیں جن سے وہ حضرات دلیل پیش کرتے ہیں جو حوادث میں ان کے پیش آنے سے پہلے گفتگو کرنے سے منع کرتے ہیں اور ہم اللہ کی مدد سے ان کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے مسائل کو ناپسند فرمانا صرف اپنی امت پر شفقت اور مہربانی کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ اُس وقت یہ خوف تھا کہ ایک چیز حلال ہو اور پھر کسی سوال کرنے والے کے سوال کی وجہ سے اللہ اسے حرام کر دے، تو یہ سوال امت کیلئے ایک نفع بخش چیز کی حرمت کا ذریعہ بن جائے گا اور امت اس سوال کی وجہ سے مشقت اور نقصان سے دوچار ہو جائے گی، اب یہ وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ختم ہو گئی ہے اور شرعی احکام طے ہو گئے ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ تو کوئی حرام قرار دینے والا ہے نہ کوئی جائز قرار دینے والا''۔

پھر خطیب رحمہ اللہ نے ایسے سوالات کے جواز پر جو ابھی تک پیش نہ آنے والے واقعات کے بابت ہوں، حضرت رافع رضی اللہ عنہ بن خدیج کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے:

عن رافع بن خديج رضى الله تعالى عنه : قال : قلت : يارسول الله. انا نخاف

ان نلقی العدو غدا، ولیس معنا مدی، فنذبح بالقصب؟ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما انہر الدم وذکرت علیہ اسم اللہ فکل، ما خلا السن والظُفر۔

(وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ہمیں ڈر ہے کہ کل دشمنوں سے ہمیں جنگ پیش آئے گی اور ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں۔ کیا ہم بانس (کی دھار) سے ذبح کرلیں؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو چیز بھی خون بہادے اور تم اس پر اللہ کا نام لے لو' ایسے ذبح کو کھاؤ سوائے دانت اور ناخن کے)۔

(اس سلسلے میں مکمل مسئلہ یہ ہے کہ ہر اُس آلہ سے جانور کو ذبح کرنا جائز ہے' جو خون بہانے کا سبب بن جائے' جیسے بانس کا چھلکا وغیرہ' سوائے ایسے دانت اور ناخن کے جو جسم سے جڑے ہوئے ہوں۔ اگر دانت اور ناخن جسم سے الگ ہوں تو اُن سے ذبح کیا ہوا جانور حلال ہوگا لیکن اس میں چونکہ جانور کو بلا وجہ ضرورت سے زیادہ تکلیف میں مبتلا کرنا ہے' اس لیے ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

دیکھیں: الھدایة، کتاب الذبائح، ۴/۴۳۷، طبع رحمانیہ لاھور اور ردالمحتار، کتاب الذبائح، ۹/۴۹۴، طبع دار المعرفة بیروت)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایسے سوال کا برا نہیں منایا جو ابھی تک پیش ہی نہیں آیا تھا حالانکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ایسا کل ہوسکتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے انہیں یہ نہیں کہا کہ تم نے ایسی چیز کے بارے میں کیوں پوچھا جو ابھی تک پیش ہی نہیں آئی۔

اسی طرح خطیب رحمہ اللہ نے یزید بن سلمہ رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کے پاس کھڑے ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کیا فرماتے ہیں اگر ہمارے اوپر ایسے اُمراء آجائیں جو ہم سے اپنا حق مانگیں اور ہمارا حق ہم سے روکیں' کیا ہم ان سے جنگ کریں؟ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ تم کیوں اللہ کے رسول ﷺ سے ایسی بات کے بارے میں پوچھتے ہو جو ابھی پیش ہی نہیں آئی؟ اُن صاحب نے کہا کہ جب تک خود رسول اللہ ﷺ مجھے منع نہیں فرمائیں گے میں یہ سوال کرتا رہوں گا۔ پھر تو ان صاحب نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نہیں! تم پر وہ بوجھ ہوگا جو تم نے اٹھایا اور ان پر وہ بوجھ ہوگا جو انہوں نے اٹھایا''۔ (ح ۱۴۷)

خطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان صاحب کو نہ تو سوال کرنے سے روکا اور نہ ہی اس پر نکیر فرمائی بلکہ بغیر کسی ناپسندیدگی کے اس کا جواب مرحمت فرمایا۔ اور احادیث و آثار میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں جو سختی کی تھی اور ایسے سوالات کرنے والے پر لعنت کی تھی تو احتمال اس بات کا ہے کہ اس شخص کا مقصد اس سوال سے ضد اور مغالطہ دینا ہو، سمجھنا اور کوئی فائدہ حاصل کرنا نہ ہو۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ بن عسل کو اس جرم میں کہ اس نے ''مشکلات القرآن'' میں چند حروف پر سوالات کھڑے کئے تھے' سزا بھی دی اور جلاوطن بھی کیا اور اس کا عطیہ و وظیفہ بھی منسوخ کر دیا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا ڈر تھا کہ وہ کمزور علم والے مسلمانوں سے ایسے گہرے علمی سوالات کر کے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنا چاہتا ہے اور قرآنِ مجید کے اصل نازل شدہ معنی میں تحریف کے ذریعے انہیں گمراہ کرنا چاہتا ہے اور وہ قرآن مجید کی درست تفسیر سے ہٹ کر فاسد تاویلات کی طرف مڑ رہا ہے' اور ایسے کام سے تو خود رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا اور ایسا کرنے والے کی مذمت فرمائی۔

(از حاشیہ:

صبیغ بن عسل ایک ایسا شخص تھا جو عام لوگوں سے مشکلات القرآن اور متشابہات کے بارے میں سوالات کرتا تھا۔ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں مختلف روایات نقل کی ہیں جن سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سزا دی تھی اور مسلمانوں کو اس کے پاس بیٹھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ بہت سی غلطیوں کا شکار ہو چکا تھا اور متشابہات میں کھود کرید سے کام لیتا تھا۔

دیکھیں تاریخ دمشق، ابنِ عساکر ۲۳/۴۰۸ تا ۴۱۳)

پھر خطیب رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ''اغلوطات'' سے منع فرمایا ہے۔ عیسیٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اغلوطات'' سے مراد وہ مسائل ہیں' جن کی کسی حال میں ضرورت پیش نہیں آتی۔

اسی طرح انہوں نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے منقول رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سیکون اقوام من امتی یغلطون فقهاء هم بعضل المسائل، اولئک شرار امتی''

(عنقریب میری امت میں کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو اپنے فقہاء کو مشکل مسائل سے مغالطے

میں ڈالیں گے‘ یہ میری امت کے بدترین لوگ ہوں گے)۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

شرار عباد اللہ ینتقون شرار المسائل یعمون بها عباد اللہ۔

(اللہ کے بندوں میں بدترین لوگ وہ ہیں‘ جو شر پر مبنی مسائل اس لیے چن کر جمع کر لیتے ہیں تاکہ ان مسائل کے ذریعے اللہ کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیں)۔

پھر خطیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ‘ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان دونوں کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہ منقول ہے کہ انہوں نے نت نئے پیش آنے والے واقعات کے احکام کے بارے میں اُن کے پیش آنے سے پہلے گفتگو فرمائی اور علم فرائض و میراث میں بھی (اسی طرح) باہمی غور و فکر کیا۔ انہی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی کرتے ہوئے تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر بعد میں آنے والے مختلف علاقوں کے فقہاء نے بھی اسی راستے کو اپنایا۔ لہٰذا ان سب کی طرف سے اس بات پر اجماع ہو گیا کہ یہ طریقۂ کار جائز ہے‘ مکروہ نہیں ہے اور مباح ہے‘ ممنوع نہیں ہے۔

باقی جہاں تک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ‘ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی احادیث (جو گزشتہ عنوان کے تحت لکھی جا چکی ہیں) کا تعلق ہے تو وہ اس پر محمول ہیں کہ ان حضرات نے غلطی کے خوف سے اور اجتہاد میں پائے جانے والے خطرات کے پیش نظر‘ اپنی رائے پر مبنی مسائل بتانے سے احتراز کیا۔ ان کی رائے میں جو مسائل ابھی پیش نہیں آئے‘ اُن کے بارے میں (اجتہاد نہ کرنے کی) گنجائش اُن کیلئے تھی اور اسی طرح اُن کی رائے میں‘ ایسے مسائل کے بارے میں گفتگو اسی وقت کرنی چاہیے‘ جب وہ پیش آ جائیں اور واقعی ضرورت درپیش ہو‘ تو ایسی حالت میں جو شخص حق بات تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہو‘ اللہ تعالیٰ بھی اُسے توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی بات منقول ہے‘‘۔

پھر خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ صلت رحمۃ اللہ علیہ بن راشد سے نقل کیا ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے جھڑک دیا اور فرمایا:

’’کیا ایسا ہو چکا ہے؟‘‘ میں نے عرض کیا: ’’جی ہاں‘‘۔

توانہوں نے فرمایا:

''واقعی! اللہ کی قسم؟'' میں نے عرض کیا: ''قسم بخدا'' (ایسا ہو چکا ہے)۔

تب انہوں نے فرمایا:

بے شک ہمارے اساتذہ نے ہمیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بتایا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"ایھا الناس! لا تعجلوا بالبلاء قبل نزوله... الخ"۔

''اے لوگو! مصیبت کے پیش آنے سے پہلے جلدی نہ مچاؤ کہ وہ تمہیں الگ الگ راستے پر ڈال دے۔ پس اگر تم نے مصیبت کے پیش آنے سے پہلے جلدی نہ کی تو مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے افراد رہیں گے کہ جب اُن سے سوال کیا جائے گا تو اُن کی درست بات کی طرف (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) راہنمائی کی جائے گی۔ یا یہ الفاظ ارشاد فرمائے ''انہیں توفیق دی جائے گی''۔

خطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ اُن حضرات کا طریقۂ کار تھا' جو صاحبانِ تقویٰ تھے اور اپنے دین کے بارے میں بہت ڈرنے والے تھے''۔ ح، ۱۵

عہدِ تابعین میں آئمہ فتویٰ

(آئمة الفتوى فى عهد التابعين)

(گذشتہ سطور میں دو قسم کے تابعین کا تذکرہ ہوا) یہ سب ہی حضرات اپنے فتاویٰ میں احادیث اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے استدلال کرتے تھے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ایسے امام موجود تھے جن کی لوگ فقہ اور فتویٰ میں پیروی کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں حضرت سعید ابن مسیب رحمہ اللہ ت، ۲۹ ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، عروہ بن زبیر رحمہ اللہ ت، ۳۰، اور عبید اللہ رحمہ اللہ ت، ۳۱ اور قاسم بن محمد رحمہ اللہ، سلیمان بن یسار رحمہ اللہ ت، ۳۲ اور خارجہ بن زید بن ثابت رحمہ اللہ ت، ۳۳ تھے۔ ان حضرات کو ''فقهاء سبعه'' کہا جاتا تھا۔

بعض حضرات نے ان سات میں ابو سلمہ بن عبد الرحمن رحمہ اللہ کی جگہ ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث بن

ہشام رحمہ اللہ (ت ۴۰۰) کا نام ذکر کیا ہے، بعض حضرات نے ان سب کے ناموں کو ایک شعر میں بھی جمع کیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے:

الا کل من لا یقتدی بأئمة!
فقسمته ضیزیٰ عن الحق خارجة
فخذ هم عبید الله، عروة، قاسم
سعید، ابو بکر، سلیمان، خارجة!

"خبردار! جو شخص بھی آئمہ کی پیروی نہیں کرتا تو اس کی تقسیم ظالمانہ اور ناحق پر مبنی ہے۔ یہ آئمہ عبید اللہ، عروہ، قاسم، سعید، ابوبکر، سلیمان اور خارجہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں' ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو"۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے مزید ایسا ہی ایک شعر لکھا ہے:

اذا قیل: من فی العلم سبعة ابحر؟
روایتهم لیست عن العلم خارجة؟
فقل هم عبید الله، عروة، قاسم
سعید، ابو بکر، سلیمان، خارجة

"جب پوچھا جائے کہ علم کے سات سمندر کون ہیں' جن کی روایات علم سے ذرا بھی ہٹ کر نہیں ہوتیں۔ تو تم کہہ دو کہ وہ عبید اللہ، عروہ، قاسم، سعید، ابوبکر، سلیمان اور خارجہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں"۔

فقہاء مدینہ میں ان سات حضرات کے علاوہ دیگر بھی کئی نام شمار کیے جاتے ہیں، جیسے نافع رحمہ اللہ، ابن شہاب زہری رحمہ اللہ، قاضی یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ، ابان رحمہ اللہ (ت ۱۰۵) بن عثمان غنی رضی اللہ عنہ، سالم رحمہ اللہ (ت ۱۰۶) بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، علی بن الحسین زین العابدین رحمہ اللہ، ربیعہ بن اُبی عبد الرحمن رحمہ اللہ (ربیعۃ الرائے)، ابوجعفر الباقر رحمہ اللہ، ابوالزناد عبد اللہ بن ذکوان رحمہ اللہ۔

مکہ مکرمہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ (ت ۱۱۷) (انتہائی سیاہ، ایک ہاتھ نہیں تھا اور کانے تھے، لیکن علم و فضل میں شان یہ تھی کہ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ عطاء کے ہوتے ہوئے تم میرے پاس آتے ہو؛ یہ پہلے مکہ میں غلام تھے) علی ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ، مجاہد بن جبر رحمہ اللہ، عمرو بن دینار رحمہ اللہ، عبد اللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ، عبد الملک بن جریج رحمہ اللہ وغیرہ نے شہرت پائی۔

کوفہ کے مشہور فقہاء

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ، عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ، علقمہ رحمہ اللہ، اسود رحمہ اللہ، مرہ الہمدانی رحمہ اللہ، سعید ابن جبیر رحمہ اللہ مسروق بن الاجدع رحمہ اللہ، عبیدہ بن عمرو السلمانی رحمہ اللہ، قاضی شریح بن حارث الکندی رحمہ اللہ (عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ کے دور میں قاضی رہے) ابراہیم بن یزید النخعی رحمہ اللہ۔

بصرہ کے مشہور فقہاء کرام

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، محمد بن سیرین رحمہ اللہ، ابوالعالیہ الریاحی رحمہ اللہ، حسن بن ابو الحسن یسار رحمہ اللہ (زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام) ابوالشعثاء جابر بن زید رحمہ اللہ، قتادہ بن دعامہ السدوسی رحمہ اللہ (ت، ۳۸) ۔

اہل شام کے مشہور فقہاء کرام

ابوادریس الخولانی رحمہ اللہ (ت، ۳۹) مکحول بن ابومسلم رحمہ اللہ، رجاء بن حیوۃ الکندی رحمہ اللہ (ت، ۴۰) (انہی رجاء نے سلیمان بن عبدالملک کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنے بعد خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو بنادیں۔ گویا ان کے اس ایک مشورے نے تاریخ اسلام میں ایک تابناک باب کا اضافہ کردیا) عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، شرحبیل بن سمط رحمہ اللہ، قبیصہ بن ذؤیب رحمہ اللہ۔

اہل مصر کے مشہور فقہاء کرام جو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے مشہور تلامذہ تھے۔

ابوالخیر مرثد بن عبداللہ الیزنی رحمہ اللہ، یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ۔

یمن کے مشہور فقہاء کرام

طاؤس بن کیسان الجندی رحمہ اللہ، وھب بن منبہ الصنعانی رحمہ اللہ، یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ۔

ان تمام حضرات کے فتاویٰ کا بڑا حصہ مختلف مؤطات، مسندات اور سنن کی کتابوں میں مروی ہے جیسے مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق، کتاب الاثار، شرح معانی آلاثار للطحاوی رحمہ اللہ۔

حدیث پاک کی کتابوں کی مختلف اقسام کا تعارف تشریحات نمبر (۷) میں دیکھیں

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں تابعین میں سے فتویٰ دینے والے حضرات کے نام تفصیل سے لکھے ہیں۔

اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ اور فقہاء رحمہم اللہ کے اسباب

(اسباب اختلاف الصحابة والتابعين والفقهاء)

شیخ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں تحریر فرمایا ہے:

''جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فقہ مدون نہیں تھی اور اس وقت احکام کے متعلق ایسی بحث بھی نہیں ہوتی تھی جیسا کہ فقہاء اپنی پوری کوشش خرچ کر کے ہر چیز کے ارکان، شروط اور آداب الگ الگ بیان کرتے ہیں''۔

(از حاشیہ: یہاں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مراد یہ نہیں ہے کہ فقہاء نے نماز کے افعال کی جو تقسیم ارکان، شرائط اور سنن کی شکل میں کی ہے وہ کوئی من گھڑت چیز ہے اور یقیناً فقہاء ایسا کرنے سے بہت دور تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ یہ فقہی اصطلاحات نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں معروف نہیں تھیں بلکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم، علامات اور قرائن کے ذریعے یہ سمجھ لیتے تھے کہ کون سا کام نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے اور نماز اس کے بغیر درست ہی نہیں ہوگی اور کون سا کام مستحسن اور مستحب ہے کہ اُس کے بغیر بھی نماز درست ہو جائے گی۔ گویا ان فقہی اصطلاحات کے مفاہیم اور مطالب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج اور طریقۂ کار سے ظاہر ہونے والے قرائن سے معلوم ہو جاتے تھے۔ ہاں البتہ انہوں نے ان افعال نماز کو اُن فقہی اصطلاحات سے تعبیر نہیں کیا، جو بعد میں فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے اپنے کلام میں استعمال فرمائیں)۔

وہاں تو حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے، پس صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپ کو دیکھ کر اسی طرح وضو کرتے اور یہ بیان نہیں کیا جاتا تھا کہ یہ کام فرض ہے اور یہ کام آداب میں سے ہے۔ اسی طرح یہ بھی بیان نہیں کیا جاتا تھا کہ وضو کے فرائض چھ ہیں یا چار ہیں اور ایسا بھی کبھی فرض نہیں کیا گیا کہ کوئی شخص پے در پے وضو نہیں کرے گا، تاکہ پھر اس پر یہ حکم لگائے جائے کہ اس کا وضو صحیح ہوگا یا فاسد، الا ماشاء اللہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ مختلف واقعات کے بارے میں استفتاء کرتے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو فتویٰ دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاملات پیش کیے جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا فیصلہ فرماتے۔ اسی

طرح آپ ﷺ لوگوں کو کوئی اچھا کام کرتے دیکھتے تو اس کی تعریف فرما دیتے اور کوئی برائی دیکھتے تو اس سے روک دیتے۔

ہر صحابی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق حضور ﷺ کی عبادات، فتاویٰ اور فیصلوں کو دیکھا' ان کو سمجھا اور ان کو یاد رکھا اور پھر ان میں سے ہر کام کا ایک شرعی حکم مختلف قرائن سے معلوم کیا۔ پس بعض کاموں کو انہوں نے مباح قرار دیا اور بعض کاموں کو ایسی نشانیوں اور قرائن کی بنیاد پر جو ان کے نزدیک کافی تھے' منسوخ قرار دیا اور ان کے نزدیک اس سلسلے میں بہترین طریقہ کار صرف قلبی اطمینان اور سکون ہی تھا' بغیر اس کے کہ وہ حضرات استدلال کے مروجہ طریقوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ جیسے تم دیہاتی لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگو سے مقصد کو سمجھ جاتے ہیں اور ان کے دل مختلف تصریحات، کنایات اور اشارات سے ایسے مطمئن ہوتے ہیں کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ بس آپ ﷺ کا زمانہ مبارک اسی طرح تکمیل کو پہنچا پھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف شہروں میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک مختلف علاقوں کے راہنما بنے، واقعات بکثرت پیش آنے لگے اور مسائل گردش کرنے لگے اور ان حضرات سے فتاویٰ پوچھے جانے لگے تب ان میں سے ہر ایک نے اپنی یادداشت اور استنباط کے مطابق جواب دیا اور اگر انہیں اپنے حافظے اور استنباط میں کوئی ایسی بات نہ مل سکی جس سے وہ جواب دے سکیں تو انہوں نے اجتہاد کرتے ہوئے اس علت کو پہچانا جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے احکام کا دارومدار رکھا تھا، پس انہوں نے جہاں بھی علت پائی وہاں حکم کو جاری کر دیا اور ان میں سے کسی نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غرض اور مقصد سے موافقت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پس اسی سے ان حضرات کے درمیان اختلاف پیدا ہوا''۔ (۱۰)

پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس اختلاف کے اسباب کو واضح کیا ہے جو فقہی فروعات میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان واقع ہوا تھا اور یہ اختلاف کسی ایسے شخص پر پوشیدہ نہیں رہ سکتا جس نے محدثین اور فقہاء کی لکھی ہوئی کتب احادیث و آثار اور ان کی شروحات پڑھ رکھی ہوں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اس دور میں طریقہ کار دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حضرات اپنی پوری کوشش خرچ کرتے تھے کہ انہیں پیش آئے ہوئے مسئلے میں قرآن وسنت کی کوئی صریح نص مل جائے اور اس کیلئے وہ

حضرات اپنے سے کم مرتبے والوں سے بھی پوچھتے تھے' پس اگر انہیں رسول اللہ ﷺ سے قابل اعتماد واسطے کے ذریعے کوئی نص مل جاتی تو وہ اس کو مضبوطی سے تھام لیتے' اس پر خوب خوش ہوتے اور مطمئن ہو جاتے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک دادی اپنی میراث کا مطالبہ لے کر آئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا! ''کتاب اللہ میں تو تیرا کوئی حصہ بیان نہیں ہوا اور سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں۔

لہٰذا آپ واپس جائیں یہاں تک کہ میں اور لوگوں سے پوچھ لوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا اور آپ ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ عطا فرمایا۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر ان کی تائید کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دادی کا یہی حصہ مقرر فرما دیا''۔ (ح،۱۷)

علقمہ رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ لوگ آئے اور کہا کہ ہم میں سے ایک شخص نے نکاح کیا نہ تو اس نے بیوی کا مہر مقرر کیا تھا اور نہ ہی رخصتی ہوئی تھی کہ وہ مر گیا تو اب کیا حکم ہے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جب سے میں رسول اللہ ﷺ سے جدا ہوا ہوں' اس سے زیادہ مشکل سوال مجھ سے نہیں کیا گیا' لہٰذا تم لوگ کسی اور کے پاس جاؤ۔ وہ لوگ آپ کے پاس ایک مہینے تک آتے رہے اور کہنے لگے کہ ہم اگر آپ سے نہیں پوچھیں گے تو کس سے پوچھیں گے؟ آپ اس شہر میں صحابہؓ میں سے سب سے بڑے ہیں اور ہمیں آپ کے علاوہ کوئی نہیں ملتا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر اس بارے میں، میں اپنی پوری کوشش کر کے ایک رائے دیتا ہوں' پس اگر وہ درست ہوئی تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوئی تو میرے اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس سے بری ہوں گے' میری رائے یہ ہے کہ اس کو اس کے خاندان کی دیگر عورتوں جیسا مہر ملے گا نہ اس سے کم ہوگا نہ زیادہ (یعنی مہر مثل) اور اس کو میراث بھی ملے گی اور اس پر چار مہینے دس دن کی عدت بھی لازم ہوگی۔ یہ بات قبیلہ اشجع کے لوگ سن رہے تھے انہوں نے کھڑے ہو کر کہا: (ح،۱۸)

ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے وہی فیصلہ فرمایا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون جن کا نام بروع بنت واشق تھا کے بارے میں فرمایا تھا۔

علقمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس بات سے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ اسلام لانے کے بعد کسی اور موقع پر نہیں ہوئی تھی''۔ (ح،۱۹)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب شام کے سفر میں تھے اور وہاں طاعون کی وباء پھیل چکی تھی تو انہوں نے مہاجرین وانصار سے یہ مشہور کیا، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی ضرورت سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا:

''مجھے اس بارے میں معلومات ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم کسی علاقے میں طاعون کے بارے میں سنو تو وہاں نہ جاؤ اور اگر تمہاری موجودگی میں کسی علاقے پر طاعون کی وباء آجائے تو اس سے بچنے کیلئے وہاں سے مت بھاگو''۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی تعریف کی اور واپس پلٹ آئے۔ (ح،۲۰)

اور اس کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بہت سے مسائل میں قیاس اور رائے کو اختیار کرنے میں مجبور ہوئے۔ اور بسا اوقات ان کے درمیان غور وفکر کے طریقہ مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا۔ اس کی مثال یہ مسئلہ ہے کہ جب انہیں اس بارے میں کوئی صریح نص نہیں ملی کہ دادا بھائیوں کو میراث سے محروم کرے گا یا نہیں؟ (یعنی دادا کے ہوتے ہوئے میت کے بھائی وارث بنیں گے یا نہیں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خیال یہ تھا کہ دادا بھائیوں کو میراث سے محروم کردے گا۔ ان حضرات نے اپنے اس مؤقف پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا جو قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے نقل کیا گیا ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ۔ (یوسف ۳۸)

(اور میں نے تو اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے)

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو بھی ''اب'' قرار دیا ہے۔ (حالانکہ یہ تو دادا اور پردادا ہیں لہٰذا پتہ چلا کہ جیسے باپ میت کے بھائیوں کو میراث سے محروم کردیتا ہے وہی حکم دادا کا بھی ہے)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''میرا وارث بنے گا میرا پوتا نہ کہ میرا بھائی تو پھر میں کیوں اپنے پوتے کا وارث نہیں بنوں گا''۔

(ح،۲۱)

ان کے قیاس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب پوتا بھائیوں کو محروم کر رہا ہے تو پھر مناسب یہی ہے کہ دادا بھی ان کو میراث سے محروم کرے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میراث میں بھائیوں کو دادا کے ساتھ حصہ دینے کے قائل تھے۔

ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے قیاس کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں ان کی چند مسانید میں روایت کیا گیا ہے ہم فائدے کے پیش نظر اُسے یہاں لکھتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مدینہ منورہ میں جعفر بن محمد صادق رحمہ اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ہشام بن حکم (ت ۱۷۹) (جو اپنے وقت میں شیعہ امامیہ کا بڑا راہنما سمجھا جاتا تھا) اس نے امام صاحب پر چوٹ کرتے ہوئے حضرت جعفر رحمہ اللہ کو مخاطب کر کے کہا:

> ''اے اولادِ رسول! یہ ہیں ابوحنیفہ رحمہ اللہ جو بہت قیاس کرتے ہیں۔ پھر اس نے امام صاحب کو مخاطب کر کے کہا: آپ نے یہ قیاس کہاں سے سیکھا ہے؟''۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جواب دیا:

> ''میں نے یہ قیاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے سیکھا ہے جو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورے کے دوران فرمایا تھا۔ یہ مشورہ دادا اور میت کے بھائیوں کے درمیان میراث کی تقسیم کے بارے میں تھا''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

> ''اے امیر المومنین! اگر ایک درخت ہو اس سے ایک شاخ نکلے پھر اس ایک شاخ سے دو شاخیں نکلیں ان دونوں میں سے ایک شاخ کے زیادہ قریب کیا ہوگا۔ کیا اس کے ساتھ کی وہ شاخ جس سے وہ نکلی ہے یا درخت (تنا)؟''۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ''اگر ایک نہر ہو جس سے ایک پانی کی نالی نکل رہی ہو پھر آگے چل کر اس ایک نالی سے دو نالیاں نکلیں تو ان میں سے کون سی زیادہ قریب ہوگی ایک نالی اپنی ساتھی نالی کے زیادہ قریب ہوگی یا اصل نہر کے؟''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر دادا اور بھائیوں میں مال تقسیم کر دیا۔

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے قیاس کر رہے ہیں۔ یہ سن کر حضرت جعفر رحمہ اللہ نے خاموشی اختیار کی۔ (ح ۲۲)

ان دونوں مثالوں کا حاصل یہی ہے کہ جب دادا اور بھائی دونوں میت کے قرب میں برابر ہیں تو دونوں میراث میں بھی شریک ہوں گے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے ثور بن زید الدیلی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد (شرعی سزا) کے بارے میں مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر عرض کیا: ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسے شخص کو اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں۔ کیونکہ جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو اس کو نشہ آتا ہے اور جب کسی کو نشہ آتا ہے تو وہ اَول فول بکتا ہے اور جب وہ ایسی باتیں کرتا ہے تو تہمت لگاتا ہے (اور تہمت کی حد قرآن مجید میں اسّی کوڑے بیان ہوئی ہے) پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے حد مقرر فرمائی''۔ (ح ۲۳)

(تنبیہ): اس مثال میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قیاس سے حد کو ثابت نہیں کیا بلکہ شراب پینے کی سزا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ایسے شخص کو چالیس (۴۰) ضربیں لگوائیں یا تو ایسے کوڑے سے جس کے دو حصے تھے یا دو جوتوں سے یا تو جو مسئلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش آیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ چالیس ضربوں کا اعتبار کیا جائے یا آلۂ ضرب کے متعدد ہونے کی وجہ سے انہیں (۸۰) ضربیں شمار کیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں احتمالوں میں سے ایک کو قیاس سے ترجیح دی اور میں نے (حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم) نے اس کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تکملة فتح الملهم (باب حد الخمر '۲/۲۹۰، طبع دار القلم دمشق) میں واضح کر دیا ہے۔

پھر حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف شہروں میں پھیل گئے اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو علم سکھایا، تابعین نے ان سے علم حاصل کیا اور اس کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ پس ہر تابعی عام طور پر اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں جو انہوں نے اپنے استاد سے سنی یا اپنے شہر کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سیکھی، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سعید ابن مسیب رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد اس بات کی طرف گئے ہیں کہ اہل حرمین فقہ میں سب سے زیادہ مضبوط ہیں اور ان حضرات کے مذہب کی بنیاد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ اور مدینہ منورہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں۔ جب کہ ابراہیم

نخعی رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد سمجھتے تھے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد، فقہ میں سب سے مضبوط ہیں اور ان کے مذہب کی بنیاد حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاوی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور فتاویٰ اور قاضی شریح رحمہ اللہ جیسے قضاۃ کوفہ کے فیصلے تھے......

سعید ابن المسیب رحمہ اللہ فقہاءِ مدینہ کے ترجمان تھے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ جبکہ ابراہیم نخعی فقہاء کوفہ کے ترجمان تھے، پس جب یہ دونوں حضرات کوئی بات کہیں اور اس کو کسی کی طرف منسوب نہ کریں تو اکثر و بیشتر وہ بات ان کے اسلاف سے صراحتاً یا اشارۃً منقول ہوتی ہے، انہی دونوں حضرات سے ان کے علاقے کے لوگوں نے فقہ حاصل کی اور پھر اس میں مزید اضافہ کیا"۔ (ح، ۲۴)

فقہ کی تدوین

(تدوین الفقہ)

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین کے دور میں فقہ کا سلسلہ روایتِ حدیث کے ساتھ جڑا ہوتا تھا۔ کچھ راویانِ حدیث تو وہ تھے جو صرف روایت کرتے اور فقہی احکام کے استنباط کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تھے اور کچھ وہ تھے جو روایت اور استنباط دونوں کو جمع کرتے اور اپنے شاگردوں کو احادیث و آثار کے ساتھ احکام فقہیہ کی تعلیم بھی دیتے، جب اسلام دور دراز کے علاقوں تک پھیل گیا تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ فقہ کی تدوین کی جائے، تاکہ ہر عام و خاص احکام فقہیہ کی ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کر سکے۔ اسی وجہ سے کئی تابعین نے احادیث اور آثار کو ابواب فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا اور یہی تدوین فقہ کا آغاز تھا، جیسے امام شعبی رحمہ اللہ کی "الابواب" (ح، ۲۵) اور مکحول شامی رحمہ اللہ کی "سنن"۔ (ح، ۲۶)

امام رامہر مزی رحمہ اللہ (ت، ۴۲) نے ذکر کیا ہے (ح، ۲۷) کہ سب سے پہلے جنہوں نے تصنیف کی اور باقاعدہ باب قائم کیے وہ بصرہ میں ربیع بن صبیح رحمہ اللہ تھے، ان کے بعد بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے یہ کام کیا، یمن میں معمر بن راشد رحمہ اللہ، مکہ میں ابن جریج رحمہ اللہ، (مدینہ منورہ میں) امام مالک رحمہ اللہ نے کتابیں لکھیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کتاب الآثار لکھی، ابن ابی ذئب رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے مؤطا

مالک سے بھی ضخیم مؤطا تصنیف کی تھی، اسی طرح سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ اور ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کتابیں تصنیف کیں۔

اصحاب حدیث اور اصحاب رائے

(اصحاب الحدیث و اصحاب الرأی)

جب مسائل فقہیہ کی اقسام بہت زیادہ ہوگئیں تو علماء کی ایک بڑی تعداد نے اپنی کوششوں کو احکامِ فقہیہ کے استنباط، ان کی تعلیم اور ان کی تدوین کیلئے وقف کر دیا، تب علماء کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک قسم کے وہ حضرات تھے کہ جن کی پوری توجہ احادیث و روایات کی طرف تھی، وہ حضرات یا تو فقہی احکام پر بالکل غور ہی نہیں فرماتے تھے یا صرف کبھی کبھار تبعاً ان کا ذکر کر دیتے، ایسے حضرات کو اصحاب حدیث کہا جاتا تھا۔

دوسری قسم کے علماء وہ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو استنباطِ مسائل کیلئے وقف کیا تھا اور انہوں نے سوائے مسائل فقہیہ کے لیے استدلال و استنباط کی ضرورت کے روایت حدیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، ان حضرات کو اصحاب الرائے کہا جاتا تھا۔

بعض لوگوں کو ان ناموں سے دھوکا لگا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اصحاب حدیث بالکل رائے اور قیاس ہی کے منکر تھے اور اصحاب الرائے اپنی آراء کو نصوص پر مقدم کرتے تھے (العیاذ باللہ) حق بات وہ ہی ہے جو ہم نے بتادی کہ یہ دونوں نام صرف ان دونوں قسم کے علماء کی خاص مصروفیات کے میدان کے پیش نظر رکھے گئے تھے، ورنہ سب حضرات ہی کتاب و سنت کی نصوص کو اجتہاد اور قیاس پر مقدم سمجھتے تھے۔ البتہ نصوص کی تفسیر کے بارے میں اُن کے درمیان اختلافِ رائے ہو جاتا تھا۔

اسی طرح بہت سے لوگوں نے اجتہاد و رائے کے لفظ سے دھوکا کھایا اور وہ یہ سمجھے کہ اس سے مراد وہ شخصی رائے ہے جو کسی انسان کی سوچ و بچار اور نری عقل پر مبنی ہو حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں رائے کا لفظ اس حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ سے لیا گیا ہے جو اجتہاد کی حجیت پر دلیل ہے جس میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا "اجتهد رأيي" تو اس رائے سے مراد غیر منصوص مسائل کو منصوص پر قیاس کرنا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا، یہ خط امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ادریس اودی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی سنن میں نقل کیا ہے

،اس میں یہ الفاظ ہیں:

''سعید بن ابو بردہ رحمہ اللہ ہمارے پاس ایک خط لائے اور فرمایا: ''یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف خط ہے۔ پھرانہوں نے مکمل حدیث بیان کی، جس میں یہ بھی ہے کہ جب تک تمہارے پاس قرآن وسنت کی کوئی واضح بات نہ ہوتو ان مسائل میں خوب غور سے کام لو جو تمہارے دل میں کھٹکیں' پس تم امثال اوراشباہ کو پہچانو اور پھر دیگر امور کوانہی پر قیاس کرو اور تمہاری رائے میں جو حکم، اللہ کو زیادہ محبوب اور اصل احکام کے زیادہ مشابہ ہو' اُس کے مطابق فیصلہ کرو''۔ ح،۲۸

(یعنی آپس میں ملتے جلتے مسائل پر غور کرو' دوسرے لفظوں میں مقیس' مقیس علیہ اور علت کو خوب سمجھ کر قیاس کرو)۔

اصحاب رائے اس بات سے بالکل بری تھے کہ وہ اپنی ذاتی آراء کو کتاب وسنت پر مقدم رکھتے ۔ وکیع رحمہ اللہ ت،۴۳ ،امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں' جواصحاب رائے میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، کہ انہوں نے فرمایا:

"البول فی المسجد احسن من بعض قیاسھم"۔ ح،۲۹

(بعض لوگوں کا قیاس تو مسجد میں پیشاب کرنے سے بھی بدتر ہوتا ہے)۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے حسن ابن صالح سے نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ نعمان ابن ثابت رحمہ اللہ نہایت سمجھدار' صاحب علم اور علم میں پختگی رکھنے والے تھے۔ جب ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی کوئی صحیح حدیث آجاتی تو کسی اور طرف نہ جاتے۔ ح،۳۰

اسی طرح بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ اصحاب رائے صرف حنفیہ ہیں حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں چونکہ یہ لقب ان تمام فقہاء کا تھا جنھوں نے اپنے آپ کو استنباط مسائل کے لیے وقف کیا تھا اور تفریع جزئیات میں ہی لگ گئے تھے، چنانچہ یہ لقب بکثرت فقہاءِ مالکیہ کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے مؤطا کی جو شرح لکھی' اس کا نام رکھا" الاستذکار لما تضمنہ الموطاء من معانی الرای والاثار" ہے، ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں ایک مستقل باب اصحاب رائے پر لکھا ہے، جس میں انہوں نے ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ ،امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ، ربیعۃ الرائے ، زفر رحمہ اللہ ت،۴۴ ،اوزاعی رحمہ اللہ ، سفیان ثوری رحمہ اللہ ، مالک بن انس رحمہ اللہ ۔ابو یوسف رحمہ اللہ ،محمد بن حسن رحمہ اللہ ،کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ح،۳۱

حافظ ابوالولید فرضی رحمہ اللہ نے بھی چند علماءِ مالکیہ کا اسی نام (اصحاب الرائے) سے تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً وہ احمد بن ہلال بن زید عطار رحمہ اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"كان حافظاً للشروط، نبيلاً في الرأي على مذهب اصحاب مالك". (ح ۳۲۷)

(یہ شروط کے حافظ تھے، رائے کے ماہر تھے اور امام مالکؒ کے شاگردوں کے مذہب پر تھے)۔

ان حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابتداءِ زمانہ میں حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہاء پر بھی "اصحاب الرائے" کے نام کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد ازاں چونکہ فقہاءِ حنفیہ نے فقہی جزئیات کی تفریع پر بہت کام کیا، اس لیے یہ لقب تقریباً انہی کیلئے خاص ہو کر رہ گیا۔

مزید یہ کہ جن حضرات نے مذہبِ حنفیہ کے دلائل میں گہرے غور و خوض سے کام نہیں لیا اور انہوں نے ان کے بعض مسائل کو ظاہری طور پر اُن احادیث کے خلاف دیکھا، جو انہیں پہنچی تھیں، اسی طرح وہ علماء اُن احادیث سے بھی آگاہ نہیں تھے، جن سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے، تو وہ اس گمان میں پڑ گئے کہ یہ مسائل خالص رائے پر ہی مبنی ہیں۔

یہ بات بعض لوگوں کی زبانی، ایسی مشہور ہوئی کہ کئی مخلص محدثین کرام بھی اس غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے "اصحاب الرائے" کے لقب کو حنفیہ کے ساتھ ہی خاص کر کے ایک اصطلاح بنا ڈالی اور اس وجہ سے حنفیہ پر نکتہ چینی کی۔

اس بارے میں حق اور درست بات وہ ہی ہے، جو سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی رحمہ اللہ نے "شرح مختصر الروضة" میں تحریر فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ جان لو کہ "اصحاب الرائے" اپنی اضافت (یعنی عام لفظ ہونے) کے اعتبار سے تو ہر وہ شخصیت ہے، جو اپنی رائے کو احکامِ شریعت کی تفریعات بیان کرنے میں استعمال کرتا ہے، لہٰذا یہ لقب تمام علماءِ اسلام کو ہی شامل ہے۔ کیونکہ آئمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی اپنے اجتہاد میں غور و فکر اور رائے سے بے نیاز نہیں ہے۔ اگرچہ یہ صرف تحقیقِ مناط اور تنقیحِ مناط کے درجے میں ہی ہو، جس کے درست ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تحقیق مناط وغیرہ کا مطلب سمجھنے کیلئے "تشریحات نمبر (۱۶)" ملاحظہ فرمائیں

ہاں یہ لفظ (اصحاب الرائے) علمیّت (یعنی خاص نام) ہونے کے اعتبار سے اسلاف کرام رحمہم اللہ کے عُرف میں اہلِ عراق کا مخصوص نام ہے۔ اہلِ عراق سے مراد اہلِ کوفہ ہیں، جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے پیروکار ہیں"۔

علامہ سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (ت ۷۱۰ھ) نے پھر بعض وہ وجوہات بیان کی ہیں، جن کی بناء پر حنفیہ نے بعض احادیث مبارکہ کے ظاہری معنیٰ کو چھوڑا اور پھر بعض علماء نے اسی بناء پر حنفیہ پر طعن کیا ہے، پھر وہ فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں آئمہ سلف کی طرف سے بہت زیادہ نکتہ چینی کی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ آخری انتہاء تک پہنچ گئے ہیں۔ دل ان باتوں کا تذکرہ کر کے خوش نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ان باتوں سے بالکل محفوظ رکھا ہے، جو ان حضرات نے اُن کے بارے میں کہیں اور جن عیوب کو آپ کی طرف اُنہوں نے منسوب کیا، اُن سے بھی آپ کو بچایا ہے۔ آپ کے بارے میں پوری بحث کا خلاصہ یہی ہے کہ آپ نے سنت کی مخالفت کبھی بھی ضد اور عناد کی بناء پر نہیں کی۔ ظاہری طور پر جو مخالفت کہیں نظر آتی ہے تو وہ واضح حجتوں اور صحیح اور بالکل عیاں دلائل پر مبنی اجتہاد کی وجہ سے ہے۔ آپ کے دلائل لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔ آپ کے مخالفین نے آپ کے بارے میں بہت کم انصاف سے کام لیا ہے۔ اگر آپ سے کسی اجتہاد میں خطاء ہوگئی تو بھی آپ کیلئے ایک اَجر ہے اور اگر آپ کا اجتہاد درست ہوا تو پھر دو اَجر ہیں۔ آپ پر طعن و تشنیع کرنے والے یا تو وہ لوگ ہیں، جو حسد میں مبتلا ہیں یا وہ لوگ ہیں، جو اجتہاد کے مواقع سے ہی جاہل اور بے خبر ہیں۔ امام احمد (بن حنبل) رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے بارے میں جو آخری صحیح بات منقول ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے آپ کی تحسین فرمائی اور آپ کی تعریف کی ہے۔ یہ بات ہمارے آئمہ میں سے ابوالورد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اُصول الدین میں ذکر کی ہے۔ (ح ۳۳)

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

(از حاشیہ:

اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ امام عبدالفتاح ابوغدۃ رحمۃ اللہ علیہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے ہی ان منقول عبارات کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی تھی)

فقہی مذاہب کا ظہور

(ظهور المذاهب الفقهية)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے دور میں بہت سے فقہاء مجتہدین رحمہم اللہ تھے جو مسائل

لوگوں کو پیش آتے وہ اس بارے میں فتویٰ دیتے تھے لیکن ان کا مقصد کوئی ایسا فقہی ضابطہ اور قانون بنانا نہیں تھا جس میں تمام ابواب فقہیہ آ جائیں لوگوں کو ان کے علاقے میں جو عالم بھی با آسانی مل جاتے 'وہ اُن سے اپنے روزمرہ کے مسائل پوچھ لیتے اور کسی ایک فقیہ سے تمام مسائل پوچھنے کو لازم نہیں سمجھتے تھے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ کی حکمت اور فیصلے کے مطابق لوگوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے مسائل کیلئے ایک ایسی فقہ کی ضرورت پڑی۔ جو ایک جامع قانون کی شکل میں مدون ہو اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرے، تو اللہ تعالیٰ نے جلیل القدر فقہاء کو اس بات کی توفیق دی کہ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق احکامِ شریعت کی تشریح کی اور ان احکام کو ایسے مدون قانون کی شکل میں پیش کیا جس کی مثال دیگر مذاہب و ادیان میں نہیں ملتی۔ امتِ مسلمہ کے محسن ان فقہاء امت نے اپنی پوری زندگیاں قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کے سرچشموں سے اجتہاد واستنباط کے ذریعے احکام شرعیہ مستنبط کرنے میں کھپا دی، پھر ان کے عظیم شاگردوں نے جامع کتابوں کی شکل میں اپنے اساتذہ کے مسائل کو مدون کیا اور ان میں اضافے کیے۔

(چاروں مشہور مذاہب فقہیہ میں ان کی مثالیں یہ ہیں)" المدونہ" یہ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے فقہی احکام کی جامع کتاب ہے۔ اسی طرح امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ کی کتابیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذاہب کی جامع ہیں، ان حضرات کے بعد امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی فقہ کو خود ہی مدون فرمایا اور اپنی کتاب کا نام "الام" رکھا۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے شاگردوں نے بھی آپ کی ان روایات سے آپ کا مذہب مدون کیا جو مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے، اس طرح یہ مذاہب فقہیہ مدون اور مکمل شکل میں امت کے سامنے آئے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہی مذاہب اس وقت صرف مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) میں منحصر نہیں تھے بلکہ فقہاء کبار کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جنہوں نے اپنے فقہی مذہب کی بنیاد ڈالی، لیکن قضاء وقدر کے فیصلوں کے مطابق ان حضرات کے مذاہب نہ تو مدون ہوئے اور نہ ہی ویسے عام ہو سکے جیسے چاروں مشہور فقہی مذاہب۔ آج اگرچہ ان مذاہب کثیرہ کا کچھ تذکرہ تو اُن کتابوں میں مل جاتا ہے جو مذاہب فقہیہ کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ لیکن وہ مکمل صورت میں نہیں پائے جاتے (اس کے برخلاف چاروں مشہور مذاہب مدون بھی ہیں) اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے لوگوں نے انہی چار مذاہب پر اکتفاء کر لیا اور عام بھی ہوئے۔

مذہب حنفی سب سے پہلے عراق میں پھیلا عباسی خلفاء کے دور میں تو یہ سب سے بڑا فقہی مذہب تھا کیونکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ، ہارون الرشید رحمہ اللہ کے قاضی القضاۃ تھے اور پھر یہ مذہب کئی بڑے بڑے اسلامی ممالک تک پہنچا جن میں

سے ماوراءالنہر کے علاقے (وسطِ ایشیا کے ممالک کرغیزستان، تاجکستان وغیرہ) ترکی سندھ، ہندوستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مذہب خلافت عثمانی ترکیا اور اسکے زیرنگین علاقوں کا سرکاری قانون بھی تھا۔ مالکیہ کا مذہب خاص طور پر بلادِ مغرب یعنی اندلس، الجزائر، مراکش اور تیونس میں پھیلا۔ شافعیہ کا مذہب مصر، شام، مالیزیا اور انڈونیشیا وغیرہ میں پھیلا۔ حنابلہ کا مذہب عام طور پر جزیرۂ عرب کے علاقوں میں رائج رہا۔

مذہب کے لفظ کے اردو اور عربی معنی میں فرق ''تشریحات نمبر (۸)'' میں دیکھیں

ماوراءالنہر کا مفصل مفہوم ''تشریحات نمبر (۹)'' میں دیکھیں

تقلید اور متعین مذہب کی پیروی کا مسئلہ

(مسئلة التقليد والتمذهب)

لوگ زمانۂ قدیم ہی سے اپنے وہ مسائل علماء سے پوچھا کرتے تھے، جو ان کی ضرورت ہوتے۔ کیونکہ عوام اصل ماخذ شریعت یعنی قرآن وسنت سے استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کیلئے تو یہ لازمی ہے کہ وہ ایسے شخص کی طرف رجوع کریں جو ان احکامِ شریعت کو جانتا ہو۔ قرآن مجید نے بھی اسی بات کا حکم دیا ہے۔

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (النحل ۴۳)

(اگر تمہیں اس بات کا علم نہیں ہے تو جو علم والے ہیں ان سے پوچھ لو)۔

ظاہر ہے کہ جب ان کو اس مفتی اور عالم کے علم اور تقویٰ پر اطمینان ہوگا تو وہ اس سے اس کے قول پر دلیل کا مطالبہ بھی نہیں کریں گے اور اصطلاح میں تقلید کا مطلب یہی ہے:

العمل بقول الغير من غير معرفة دليله او مطالبته بالدليل

(یعنی دوسرے کی بات بغیر دلیل جانے یا بغیر دلیل مانگے، اس پر عمل کر لینا)

خیر القرون (اسلام کے ابتدائی زمانے) میں لوگ اس بات کی پابندی نہیں کرتے تھے کہ کسی ایک ہی عالم سے مسائل پوچھیں اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کی پیروی نہ کریں۔ ہاں ایسا ضرور ہوتا تھا کہ جس کو اپنے شہر کے جس عالم سے زیادہ مناسبت ہوتی تھی، وہ انہی پر بنسبت دیگر علماء کے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ لہٰذا وہ اس مناسبت اور اعتماد کی

بناء پر تمام مسائل یا اکثر مسائل میں انہی عالم سے رجوع کرتے تھے۔

جیسے صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر کسی خاتون کو طواف زیارت کے بعد حیض آجائے تو کیا وہ طواف وِداع کو چھوڑ کر اپنے وطن جاسکتی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

''ہاں وہ طواف وِداع چھوڑ کر جاسکتی ہے''۔

اس پر اہل مدینہ نے کہا کہ ہم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بات کو چھوڑ کر آپ کی بات قبول نہیں کرسکتے۔

اسماعیلی رحمہ اللہ کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

''ہمیں کوئی پرواہ نہیں کہ آپ ہمیں فتویٰ دیں یا نہ دیں، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایسی عورت واپس نہیں جاسکتی''۔ (۲۰۶)

طیالسی رحمہ اللہ کی روایت میں تو یہاں تک الفاظ ہیں:

''اے ابن عباس رضی اللہ عنہ! اگر آپ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی مخالفت کریں گے، تو ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے''۔ (۲۰۷)

ظاہر ہے کہ اہلِ مدینہ کا یہ رویہ صرف اس لئے تھا کہ انہیں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر زیادہ اعتماد اور ان سے زیادہ مناسبت تھی، حالانکہ خود حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بعد میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جاننے پر اپنے قول سے رجوع کرلیا تھا۔

جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے طاؤس رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، جب ان کو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا:

''آپ یہ فتویٰ کیسے دیتے ہیں کہ عورت آخری طواف کئے بغیر چلی جائے؟''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''یہ میری بات نہیں آپ فلاں انصاری صحابیہ رضی اللہ عنہا سے پوچھ لیں (یہ بظاہر ام سلیم رضی اللہ عنہا تھیں جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا؟''

اس واقعہ کے راوی طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (پوچھ کر) واپس آئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ہنستے ہوئے فرمایا:

''میں تو آپ کو پہلے بھی سچا ہی سمجھتا تھا''۔ ح.۳۶

تب حضرت زید رضی اللہ عنہ کے رجوع کے بعد اہلِ مدینہ نے بھی اسی بات کو تسلیم کرلیا کہ ایسی خاتون کے لیے واپسی جائز ہے''۔

اسی کی ایک اور مثال وہ روایت ہے جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ابو مسلم رحمہ اللہ خولانی سے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''میں اہل دمشق کی مسجد میں آیا وہاں ایک حلقے میں (تیس ۳۰ کے قریب جیسا کہ کثیر بن ہشام کی روایت میں ہے) بڑی عمر کے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تشریف فرما تھے۔ ح.۳۷
ان میں ایک سُرمئی آنکھوں اور چمکدار دانتوں والے نوجوان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ان حضرات کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوتا تو وہ اسی نوجوان سے پوچھتے، کہتے ہیں میں نے اپنے ہمنشین سے پوچھا کہ ''یہ نوجوان کون ہے؟'' تو اس نے کہا ''یہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب ان کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوتا ہے تو سب اُنہی کے پاس آتے ہیں اور اُنہی کی رائے کو اختیار کرتے ہیں''۔ ح.۳۸

ایسی بہت سی مثالیں دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ملتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عوام میں سے بہت سے لوگ اُنہی حضرات کی طرف رجوع کرتے تھے، جن پر ان کو اعتماد ہوتا تھا اور وہ ان کے فتاویٰ کو دیگر حضرات کے فتاویٰ پر ترجیح دیتے تھے اور ایسے لوگ بھی ہوتے تھے، جو کسی ایک سے فتاویٰ پوچھنے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں مذاہبِ فقہیہ مدوّن ہی نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ لوگ اس میں کوئی ممانعت نہیں سمجھتے تھے کہ جو بھی عالم ان کو میسر آجائے اسی سے فتویٰ طلب کرلیں۔ اگرچہ وہ عالم ان کے علاوہ ہو جن سے وہ عام طور پر مسائل میں رجوع کرتے ہوں۔

پھر اس زمانہ میں اس بات کا ڈر بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص مختلف مذاہب میں سے وہ سب کچھ منتخب کرلے گا جو اس کی خواہشات کے مطابق ہو کیونکہ یہ بہت مشکل تھا کہ مستفتی جس سے مسئلہ پوچھ رہا ہے، اس کی رائے کو پوچھنے سے پہلے جان سکے اور ایسا مذاہب فقہیّہ کے مدون نہ ہونے کی بناء پر تھا۔

اس زمانے کے بعد کہ جب چاروں فقہاء کے مذاہب اپنے اپنے خاص سلیقے سے مدون ہوگئے اور ان کے بارے میں کتابیں لکھی گئیں اور پھر ایسے مختلف مدارس وجود میں آئے جو الگ الگ فقہ کی تعلیم دیتے ہیں تو ان مذاہب کے

اقوال، لوگوں کے درمیان معروف اور مشہور ہو گئے۔ پس اگر اب ہر ایک کو یہ گنجائش دیدی جائے کہ وہ ان اقوال میں سے جب اور جو چاہے اختیار کر لے تو اس کا لازمی نتیجہ، اتباعِ شریعت مطہرہ کے بجائے اتباع ہواء و خواہشات ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فقہاء میں سے تو ہر ایک اپنی دلیل کی قوت کی بناء پر ایک قول کو لیتے ہیں، خواہشاتِ نفس کی پیروی کے طور پر نہیں، تو دوسرے مجتہد کو بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایسے قول کو اختیار کر لے یا پھر شریعتِ اسلامیہ کی بنیادوں یعنی قرآن وسنت سے زیادہ مضبوط شرعی دلیل کی بنیاد پر اسے رد کر دے لیکن عوام جو ان فقہی آراء کے درمیان شرعی دلائل کی بناء پر موازنہ نہیں کر سکتے، اگر انہیں اس بات کی گنجائش دے دی جائے کہ وہ جس بات کو چاہیں لے لیں اور جس کو چاہیں رد کر دیں تو ان کے بارے میں یہ اندیشہ ہے وہ ان فقہی آراء میں سے ان کو لے لیں گے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہوں گی اور انکا یہ چناؤ، ان اقوال کے شرعی دلائل کی بنیاد پر نہیں ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان مذاہب میں سے ہر ایک کا ایک خاص نظام (اصطلاحات اور مخصوص طرز بیان) ہوتا ہے جو اسی کے فریم (طریقہ کار) کے مطابق کام کرتا ہے، اس طرح کہ اس کے اکثر مسائل آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایک حکم کو اس میں سے لے لیا جائے اور دوسرے حکم کو جو اسی سے جڑا ہوا ہے، چھوڑ دیا جائے تو یہ سارا نظام ہی خراب ہو جائے گا، اور تلفیق کی ایک ایسی صورت وجود میں آئے گی جس کو کوئی بھی صحیح نہیں کہتا۔ (تلفیق کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

ایک عام شخص کیلئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ان باریک باتوں کو جان سکے۔ اس لئے اگر مختلف مذاہب سے مسائل چُننے کا عوام کو اختیار دیدیا جائے، تو اس کا نتیجہ شریعتِ منورہ میں بدانتظامی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

اسی لئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ایک متعین مذہب کو اختیار کیا جائے۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ کسی بھی متعین مذہب کا پیروکار اپنے امام کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ بذاتِ خود اس امام کی اطاعت لازم ہے۔ (العیاذ باللہ) بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شخص اپنے امام کے علمِ شریعت اور دلائلِ شریعت پر بنسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کرتا ہے یا اس لئے کہ اس پیروکار کے لئے دیگر آئمہ کے مذاہب کے بنسبت اپنے امام کے مذہب کو جاننا آسان ہے۔

اس طرح ایک مذہب کی تعیین کے ساتھ شریعت کے پیروی کرنے میں لوگوں کی حالات بالکل منظم ہو جاتے ہیں اور وہ خواہشات کی پیروی اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچ جاتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مختلف فقہاء کے اقوال کو صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے بغیر کسی دلیل کی بنیاد کے چُن لینا، ان باتوں میں سے ہے جس کی قدیم

اور جدید تمام علماء نے مذمت کی ہے۔

امام معمر بن راشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص گانے بجانے کے جواز اور عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کے بارے میں اہل مدینہ کے قول کو اختیار کرے اور متعہ اور بیع صرف کے جواز پر اہل مکہ کا قول منتخب کرلے اور نشہ آور چیزوں کے بارے میں اہل کوفہ کا قول اختیار کرلے، تو ایسا شخص اللہ کے بندوں میں سب سے بدترین ہوگا'' ح،۳۹

(ان میں سے کئی مسائل کی نسبت ان کے قائلین کی طرف صرف شہرت کی بناء پر ہے ورنہ محققین کے ہاں یہ نسبت ثابت نہیں)۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی شخص شفعہ لینے والا ہو تو وہ پڑوسی کے لئے شفعہ کا قائل ہوجائے، (جیسا کہ حنفیہ کا مذہب ہے) اور جب وہ خریدار ہو تو وہ اسی شفعہ کے عدمِ ثبوت کا قائل ہوجائے۔ (جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے) تو ایسا کرنا بالاجماع ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا نکاح کرتے وقت فاسق کی ولایت (سرپرستی) کے صحیح ہونے کا قائل ہو (جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے) اور طلاق دیتے وقت فاسق کی ولایت کے فاسد ہونے کا قائل ہوجائے (جیسا کہ شافعیہ کا مسلک ہے) تو اس کے ناجائز ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اگر کوئی متعین مستفتی ایسے حالات میں یہ کہے کہ میں پہلے تو یہ بات نہیں جانتا تھا اور آج سے میں اس کا التزام کرتا ہوں، تو اس بات کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے تو دین کے ساتھ کھیل کود کا دروازہ کھل جائے گا اور ایسا کرنا اس بات کا ذریعہ بن جائے گا کہ حلال اور حرام کو صرف اپنی خواہشات پر طے کیا جائے''۔ ح،۴۰

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''(تقلیدِ شخصی) اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی مذہب کی اپنی مرضی کے مطابق پیروی کی اجازت دے دی جائے، تو اس کا انجام یہ نکلے گا کہ وہ شخص تمام مذاہب کی رخصتوں (آسانیوں اور سہولتوں) کو اپنی خواہشات کی اتباع میں اکٹھا کرتا رہے گا۔ اور اُسے تو حلال اور حرام کرنے اور

واجب اور جائز کرنے کا کُھلا اختیار مل جائے گا، اور یہ چیز پھر اس کو بالکل شرعی ذمہ داری کی قید سے بھی آزاد کر دے گی بخلاف ابتدائی دورِ اسلام کے، کیونکہ اس وقت مختلف حوادث کے احکام بتانے والے مذاہب نہ تو مرتب تھے اور نہ ہی مشہور تھے، لہٰذا اب ہر شخص پر یہ لازم ہے کہ وہ کسی بھی ایک مذہب کا خوب سوچ سمجھ کر انتخاب کر لے اور پھر متعین طور پر اسی کی تقلید کرے"۔

ح ۴۱

ابن خلدون رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے:

"تمام شہروں میں تقلید صرف آئمہ اربعہ ہی کے لئے باقی رہ گئی ہے اور باقی تمام حضرات کے مقلدین مٹ گئے۔ جب مختلف علوم کی اصطلاحات قسما قسم کی ہوگئیں تو لوگوں نے فقہی اختلاف اور اس کے راستوں کو بند کر دیا۔ پھر جب ہر شخص اجتہاد کے درجے پر پہنچنے سے معذور ہو گیا اور اس بات کا ڈر پیدا ہو گیا کہ اجتہاد کو نااہل لوگوں کی طرف منسوب کر دیا جائے گا اور ایسے لوگوں کو مجتہد کہا جائے گا، جن کی رائے اور دین کے بارے میں بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

تب لوگوں نے اجتہاد (مطلق) سے عاجز ہونے اور اس کے سخت مشکل ہونے کی تصریح کر دی اور لوگوں کو انہی حضرات کی تقلید کا پابند کر دیا جن کے پہلے سے مقلدین موجود تھے اور اس بات سے روک دیا گیا کہ لوگ نااہلوں کی تقلید اختیار کریں۔ کیونکہ اس میں تو دین کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔ اب تو صرف مجتہدین کے مذہب کو نقل کرنا ہی باقی رہ گیا ہے جب کہ ہر مقلد اپنے امام کے مذہب پر ہی عمل کرتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ صرف اصول کی تصحیح اور روایت کی سند متصل ہونے کا خیال رکھتا ہے، آج تو فقہ کا خلاصہ اور نچوڑ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس دور میں اجتہاد کا دعویٰ کرنے والا مردود اور ناکام ہے، کوئی اس کی پیروی کرنے والا نہیں ہے۔ جب کہ آج تمام اہل اسلام انہی چاروں آئمہ کی تقلید پر متفق ہو چکے ہیں"۔ ح ۴۲

حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ بات یاد رکھیں کہ لوگ پہلی اور دوسری صدی میں کسی ایک مذہب کی تقلید پر متفق نہیں تھے، ۲۰۰ھ کے بعد مجتہدین کی متعین طور پر تقلید شروع ہوئی اور ایسے لوگ بہت کم ہو گئے جو کسی متعین امام کے مذہب پر اعتماد نہ رکھتے ہوں اور اس دور میں یہی لازم تھا۔ اگر آپ یہاں پر یہ

اعتراض کریں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانے میں تو واجب نہ ہو اور دوسرے زمانے میں وہی چیز واجب قرار پائے حالانکہ شریعت تو ایک ہی ہے؟

میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اصل واجب یہ ہے کہ امت میں ایسے افراد ہوں جو فروعی احکام کو شریعت کے تفصیلی دلائل سے سمجھ سکتے ہوں۔ اس بات پر تمام اہل حق کا اجماع ہے۔ کیونکہ جو چیز کسی واجب کے حصول کا ذریعہ بنے تو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ ہاں کسی واجب کے حاصل کرنے کے کئی راستے ہوں تو غیر متعین طور پر ان میں سے کسی ایک سے اس کو حاصل کرنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی واجب کو حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہو تو پھر وہ ہی ایک مخصوص راستہ اختیار کرنا واجب ہوتا ہے..... تو اس بناء پر مناسب یہ ہے کہ متعین امام کی تقلید کو لازم کہا جائے۔ البتہ یہ کبھی واجب ہوگا (جیسے آج عامی افراد کے لئے) اور کبھی واجب نہیں ہوگا''۔ (ح۴۳)

(جیسا کہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ میں، نیز تقلید کے درجات میں ماہرین علوم اسلامیہ کے لیے تقلید کے بارے میں آگے مزید تفصیل آرہی ہے)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''یہ چاروں مذاہب جن کی تدوین ودرستگی ہوچکی ہے، ساری امت یا کم از کم ان میں سے قابل اعتماد افراد کا، آج کے دن تک ان کی تقلید جائز ہونے پر اجماع ہے اور اس تقلید میں جو مصلحتیں ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، خاص طور پر ان دنوں جب ہمتیں انتہائی پست ہو چکی ہیں اور لوگ خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور ہر شخص جس کی کچھ رائے ہو وہ اپنی رائے ہی کے گھمنڈ میں مبتلا ہے''۔ (ح۴۴)

آئمہ اربعہ کی تقلید (میں منحصر رہنے کی بات) اس کے باوجود کی جاتی ہے کہ فقہاءِ مجتہدین تو ہر دور میں مسلمانوں کے ممالک میں سے ہر ملک میں بہت زیادہ پائے جاتے تھے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ ان کے مذاہب ویسے عام مدون نہیں ہوسکے جیسے فقہاءِ اربعہ رحمہم اللہ کے مذاہب مدون ہوئے۔ اور ان چاروں آئمہ کے مذاہب کی نسبت ان کی طرف تواتر کی حد تک پہنچ گئی۔ اسی طرح ان حضرات کے ایسے شاگرد بھی بہت ہوئے جنھوں نے ان کے مذاہب کو پہلے خود پڑھا پھر اس میں خوب بحث وتمحیص کی اور اس پر تفریعات قائم کیں اور یہ بات دیگر مذاہب کو نصیب نہیں ہوسکی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ ان مجتہدین کے مذاہب کو خاص طور پر اختیار کرنا، ایسا راز ہے جو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دلوں میں ڈالا اور کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر سب علماء کو اسی پر جمع فرمادیا''۔ ح۔۴۵

انہی باتوں کے پیشِ نظر علماء نے فرمایا ہے کہ غیر مجتہد کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان ہی چار مذاہب کی تقلید کرے اور ان کے علاوہ کسی اور مذہب کی تقلید نہ کرے۔

حضرت امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کسی شخص کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ آئمہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے مذہب کو یا پہلے حضرات میں سے کسی کے مذہب کو اختیار کرلے حالانکہ وہ حضرات اپنے بعد میں آنے والوں کی نسبت زیادہ بڑے عالم اور زیادہ بڑے مرتبے والے تھے، اس لئے کہ وہ حضرات علم کی تدوین اور اس کے اصول وفروع منضبط کرنے کیلئے فارغ نہیں ہوسکے۔ چنانچہ ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی مقررہ مذہب نہیں، جس کو تہذیب اور درستگی حاصل ہوچکی ہو۔ اس ذمہ داری کو انکے بعد میں آنے والے آئمہ نے نبھایا، جو حضراتِ صحابہ وتابعین کے مذاہب کو بڑھانے والے تھے۔ اور یہی حضرات مختلف واقعات کے پیش آنے سے پہلے ان کے احکام کو مرتب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے احکام کے اصول وفروع واضح کرنے میں خوب ترقی کی جیسے کہ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر حضرات''۔ ح۔۴۶

علامہ مناوی رحمہ اللہ نے حافظ ذھبی رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''ہم پر لازم ہے کہ ہم یہ یقین رکھیں کہ آئمہ اربعہ، سفیان ثوری رحمہ اللہ، سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، امام اوزاعی رحمہ اللہ، داؤد ظاہری رحمہ اللہ ت۔۴۶، اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اور تمام آئمہ ہدایت پر تھے۔ اور اس شخص کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی جائے گی جو ان آئمہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتا ہے جن سے یہ بالکل بری تھے۔

جمہور کے مطابق صحیح بات یہ ہے کہ فروعی احکام میں جب اختلاف ہوجائے تو صحیح بات تک پہنچنے والا ایک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیے ہیں، ان میں اللہ کی طرف سے کوئی

علامت ہوتی ہے اور مجتہد کو اسی بات کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے کہ وہ اس تک صحیح طریقہ سے پہنچے۔اس میں غلطی کرنے والا بھی گناہ گار نہیں ہے بلکہ اس کو بھی اجر دیا جائے گا، پس جو شخص صحیح بات تک پہنچا، اس کے لئے دو اجر ہیں اور جس نے غلطی کی اس کے لئے ایک اجر ہے۔

ہاں اگر مجتہد خود کوتاہی کرے تو وہ بالاتفاق گناہ گار ہوگا، اور غیر مجتہد پر یہ لازم ہے کہ وہ کسی متعین مذہب کی تقلید کرے......لیکن حضرات صحابہ وتابعین کی تقلید جائز نہیں ہے۔اور ان تمام حضرات کی جن کے مذاہب مدون نہیں ہوئے۔(جیسا کہ امام حرمین رحمہ اللہ نے فرمایا)

لہٰذا اب قضاء اور افتاء میں آئمہ اربعہ کے علاوہ کی تقلید ممنوع ہے، کیونکہ چاروں مذاہب ہی پھیل چکے ہیں اور واضح طور پر ان کو لکھا جا چکا ہے، یہاں تک کہ ان کے مطلق کو مقید کرنا اور ان کے عام کو خاص کرنا بھی واضح ہو چکا ہے۔(یعنی ان مذاہب کی جملہ تفاصیل طے ہوگئی ہیں) بخلاف دیگر مذاہب کے کیونکہ ان کے پیروکار ختم ہو چکے ہیں۔امام رازی رحمہ اللہ نے تو اس بات پر محققین کا اجماع نقل کیا ہے کہ عوام کو مشہور اور نمایاں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید سے بھی روکا جائے گا"۔(وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے) (ح، ۴۷)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ایک دوسرے مقام پر یہ فرماتے ہیں:

"دیکھو! ان چاروں مذاہب کو لینے میں بہت بڑی مصلحت ہے اور ان تمام سے منہ پھیرنے میں بڑی خرابی ہے اور ہم اس کو کئی طرح واضح کریں گے......" (ح، ۴۸)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی انسان جو خود احکامِ شریعت سے ناواقف ہو اور ہندوستان یا ماوراء النہر کے علاقہ میں رہتا ہو جہاں کوئی شافعی، مالکی، یا حنبلی عالم موجود نہ ہو اور نہ ہی ان مذاہب کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تقلید کرے اور اس پر حرام ہے کہ وہ ان کے مذہب سے نکلے۔کیونکہ ایسی صورت میں تو وہ شریعت کی پابندیوں سے نکل جائے گا اور بالکل مہمل اور بے کار رہ جائے گا۔

بخلاف اس کے کہ کوئی شخص حرمین شریفین میں ہو تو وہاں اس کے لئے تمام مذاہب کو جاننا آسان ہے لیکن وہاں بھی اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ بغیر اعتماد کے صرف اٹکل سے عمل

کرتا ہے اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ عوام کی زبانوں سے مسائل لے نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ کسی غیر معروف کتاب سے مسائل اخذ کرلے۔جیسا کہ یہ تمام باتیں 'النهر الفائق شرح كنز الدقائق" میں ذکر کی گئی ہیں'' (ح ۹۹)

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوگیا کہ اصل مقصد ان احکامِ شریعت کی پیروی کرنا ہے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔اور چونکہ غیر مجتہد کے لئے عام طور پر یہ آسان نہیں ہوتا کہ وہ خود ان احکام کا استنباط کرے یا تو اس وجہ سے کہ وہ ان کو سمجھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا یا اس وجہ سے کہ نصوص بسا اوقات ایک سے زیادہ معنی کا احتمال رکھتی ہیں یا اس وجہ سے کہ کبھی ظاہری طور پر دلائل میں تعارض آجاتا ہے، تو اب وہ غیر مجتہد کسی ایسے مجتہد کی بات پر اعتماد کر لیتا ہے جس کی بات پر اس کو دوسرے حضرات کی نسبت زیادہ یقین ہوتا ہے، یا ایسے مجتہد کی بات پر یقین رکھتا ہے کہ جن کا مذہب اس کے علاقہ میں مشہور ہوتا ہے۔بس یہی کچھ ہے جسے متعین مذہب اختیار کرنا یا تقلیدِ شخصی کہتے ہیں۔

لیکن کسی متعین مذہب کو اختیار کرنا اس کے خلاف نہیں کہ کوئی ماہر عالم جن کی گہری نظر احکامِ شریعت کے دلائل پر ہو، وہ شرعی مسائل میں سے کسی مسئلہ میں دوسرے مذہب کا قول اختیار کرلیں، اپنی خواہشات کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان مضبوط دلائل کی بنیاد پر جو ان کے سامنے آئے ہوں۔اسی وجہ سے تو بہت سے فقہاءِ حنفیہ نے کئی مسائل میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔جیسے، مزارعت کا مسئلہ، تعلیمِ قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ، اور جس شخص کو دھوکہ دیا گیا ہو، اس کو اختیار ملنے کا مسئلہ، (خيار المغبون، جس شخص سے خرید وفروخت میں بہت زیادہ دھوکہ کیا گیا ہو تو اس کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ملتا ہے) اس کی مزید تفصیل ''تشریحات نمبر (۱۰)'' میں دیکھیں نیز دیگر ایسے مشہور مسائل (جن کی وضاحت "الافتاء على المذهب الغير" کے باب میں آئے گی)۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ متعین امام کی تقلید کوئی بذاتِ خود حکم شرعی نہیں، یہ تو صرف ایک ایسا فتویٰ ہے، جو دینی امور کو منظم رکھنے کے لئے جاری کیا گیا ہے تاکہ اس کے بغیر جو دین کے ساتھ کھلواڑ اور خواہشات کی پیروی کے خدشات پائے جاتے ہیں، ان سے بچا جا سکے۔

میں نے اپنے والد مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ (ت ۴۷) سے بارہا سنا ہے، وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ (ت ۴۸) کا یہ قول نقل فرماتے تھے:

''کہ مذہبِ متعین کی تقلید کرنا بذاتِ خود حکم شرعی نہیں، لیکن یہ ایسا فتویٰ ہے، جو دینی معاملات کو منظم رکھنے کے لئے جاری کیا گیا ہے''۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ (ت ۴۹، ح ۵۰) اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں:

''سو ہم تقلیدِ شخصی کو فی نفسہ فرض یا واجب نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلیدِ شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترکِ تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے''۔

اس بات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب خواہشات کی پیروی سے اطمینان ہو تو اِس عالم کے لئے جو شرعی دلائل میں غور وفکر کرنے کا اہل ہے کوئی ایسا قول اختیار کرلینا جو اس کے نزدیک دلیل کے اعتبار سے زیادہ راجح ہے، ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (ت ۵۰) فرماتے ہیں:

''اسی واسطے تقلیدِ غیر شخصی کو فقہاء نے کتابوں میں منع لکھا ہے، مگر جو عالم (تقلید) غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو اور نہ اس کے سبب سے عوام میں ہیجان ہو، اس کو تقلیدِ غیر شخصی اب بھی جائز ہوگی''۔ (ح ۵۱)

ایک دوسرے مقام پر حضرت رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے:

''الغرض بعد ثبوت اس امر کے کہ یہ مسئلہ اپنے امام کا خلاف کتاب وسنت کے ہے، ترک کرنا ہر مومن کو لازم ہے، اور کوئی بعد وضوح اس امر کے اس کا منکر نہیں، مگر عوام کو یہ تحقق ہی کیونکر ہوسکتا ہے''۔

(ح ۵۲)

شیخ المشائخ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو نہایت اعتدال اور انتہائی خوبی کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا ہے، لہٰذا ہم ان کی بات انہی کے الفاظ میں یہاں لکھتے ہیں:

''جس طرح تقلید کا انکار قابل ملامت ہے، اسی طرح اس میں غلو و جمود بھی موجب مذمت ہے، اور تعیین طریق حق کے (لئے) اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ تقلید مجتہد کی اس کو شارع و بانیٔ احکام سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ اس کو مبیّن احکام (احکام بیان کرنے والا) اور موضح شرائع (شریعتوں کو واضح کرنے والا) ومظہر مراد اللہ ورسول (اللہ اور اس کے رسول کی مراد ظاہر کرنے والا) اعتقاد کرکے کی جاتی ہے۔ پس جب تک کوئی امر منافی (خلاف) اور رافع اس اعتقاد کا نہ پایا جاویگا، اس وقت تک تقلید کی جاویگی، اور جس مسئلے میں کسی عالمِ وسیع النظر، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے، یا کسی عامی کو ایسے عالم سے، بشرطیکہ متقی بھی ہو، بشہادتِ قلب (دل کی گواہی سے) معلوم ہوجاوے کہ اس مسئلے میں

راجح دوسری جانب ہے، تو دیکھنا چاہئے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیلِ شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو، تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ وتشویش عوام کا ہو، مسلمانوں کو تفریقِ کلمہ (اختلاف) سے بچانے کے لئے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے''۔

دلیل اس کی یہ حدیثیں ہیں...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھ سے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

''تم کو معلوم نہیں کہ تمہاری قوم یعنی قریش نے جب کعبہ بنایا ہے، تو بنیاد ابراہیمی سے کمی کردی ہے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر آپ اسی بنیاد پر تعمیر کرادیجئے۔ فرمایا کہ اگر قریش کا زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا''۔

روایت کیا اس کو بخاری ومسلم نے ترمذی اور نسائی اور مالک نے۔ ح ۵۳

ف: یعنی لوگوں میں خوامخواہ تشویش پھیل جاوے گی کہ دیکھو! کعبہ گرادیا، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کرتا۔ دیکھئے: باوجودیکہ جانب راجح یہی تھی کہ قواعد ابراہیمی پر تعمیر کردیا جاتا، مگر چونکہ دوسری جانب بھی یعنی ناتمام رہنے دینا بھی، شرعا جائز تھی، گو مرجوح تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخوف فتنہ وتشویش اسی جانب مرجوح کو اختیار فرمایا...... (نیز) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (سفر میں) فرض چار رکعت پڑھی، کسی نے پوچھا کہ ''تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر (قصر نہ کرنے میں) اعتراض کیا تھا، پھر خود چار پڑھی؟ آپ نے جواب دیا کہ خلاف کرنا موجبِ شر ہے۔ ح ۵۴

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ باوجودیکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک جانب راجح، سفر میں قصر کرنا ہے۔ مگر صرف شر اور خلاف سے بچنے کے لئے اتمام فرمالیا (چار رکعت مکمل نماز پڑھی) جو جانب مرجوح تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی جائز سمجھتے تھے۔

بہرحال! ان حدیثوں سے اس کی تائید ہوگئی کہ اگر جانب مرجوح بھی جائز ہو تو اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔ اور اگر اس جانب مرجوح میں گنجائش عمل نہیں بلکہ ترک واجب یا ارتکاب امر ناجائز لازم آتا ہے اور بجز قیاس کے اس پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی اور جانب راجح میں حدیث صحیح صریح موجود ہے۔ اس وقت بلا تردد حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا، اور اس مسئلے میں کسی طرح تقلید جائز نہ ہوگی، کیونکہ اصل دین قرآن وحدیث ہے۔ اور تقلید سے یہی مقصود ہے، کہ قرآن وحدیث پر سہولت وسلامتی سے عمل ہو، جب دونوں میں موافقت نہ رہی، قرآن وحدیث پر عمل ہوگا۔ ایسی حالت

میں بھی اسی پر جمے رہنا یہی تقلید ہے جس کی مذمت قرآن وحدیث واقوال علماء میں آئی ہے، چنانچہ حدیث ہے...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''میں حضور ﷺ کے حضور میں حاضر ہوا اور آپ کو یہ آیت پڑھتے سنا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اہل کتاب نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا رکھا تھا خدا کو چھوڑ کر'' (التوبہ: ۳۱) اور ارشاد فرمایا کہ ''وہ لوگ ان کی عبادت نہ کرتے تھے، لیکن وہ جس چیز کو حلال کہہ دیتے، وہ اس کو حلال سمجھنے لگتے اور جس چیز کو حرام کہہ دیتے، اس کو حرام سمجھنے لگتے۔''

روایت کیا اس کو ترمذی نے۔ ح.۵۵

مطلب یہی ہے کہ ان کے اقوال کو جو یقیناً ان کے نزدیک بھی کتاب اللہ کے خلاف ہوتے مگر ان کو کتاب اللہ پر ترجیح دیتے، سو اس کو آیت اور حدیث میں مذموم فرمایا گیا اور تمام اکابر محققین کا یہی معمول رہا کہ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ قول ہمارا یا کسی کا خلاف حکم خدا اور رسول کے ہے، فوراً ترک کر دیا۔

چنانچہ حدیث میں ہے، نمیلہ انصاری سے روایت ہے کہ کسی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کچھوے کے کھانے کو پوچھا، انہوں نے یہ آیت قُل لا اجد الخ (الانعام: ۱۴۵) پڑھ دی (جس سے استنباط کرنا حکم، حلت کا تھا) ایک معمر آدمی ان کے پاس بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کچھوے کا ذکر آیا، تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''منجملہ خبائث کے وہ بھی خبیث ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: اگر یہ بات رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے تو حکم یوں ہی ہے جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا۔ روایت کیا اس کو ابوداؤد نے۔

ح.۵۶

علماءِ حنفیہ بھی ہمیشہ اس عمل کے پابند رہے، چنانچہ ''جواب شبہ چہاردہم'' میں ان حضرات کا امام صاحب رحمہ اللہ کے بعض اقوال کو ترک کر دینا مذکور ہو چکا ہے، جن سے منصف آدمی کے نزدیک ان حضرات پر تعصب وتقلید جامد کی اس تہمت کا غلط ہونا متیقن (یقینی) ہو جاویگا۔ جس کا منشا اکثر پر بلا درایت (بغیر سمجھ) نظر کرنا ہے۔ اور ''مقصد سوم'' میں ایسی نظر کا غیر معتمد علیہ ہونا ثابت کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس مسئلے میں ترکِ تقلید کے ساتھ بھی کسی مجتہد کی شان میں گستاخی وبدزبانی کرنا، یا دل سے بدگمانی کرنا کہ انہوں نے اس حدیث کی مخالفت کی ہے، جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ان کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو، یا بسند ضعیف پہنچی ہو، یا اس کو کسی قرینہ شرعیہ سے ماؤل (تاویل شدہ) سمجھا ہو، اس لئے وہ معذور ہیں ، اور حدیث نہ پہنچنے سے ان کے کمالِ علمی میں طعن کرنا بھی بدزبانی میں داخل ہے۔ کیونکہ بعض حدیثیں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم

کو جن کا کمالِ علمی مسلم ہے، کسی وقت تک نہ پہنچی تھیں، مگر ان کے کمال علمی میں اس کو موجب نقص نہیں کہا گیا۔

چنانچہ حدیث میں...... عبید بن عمیر سے حضرت ابوموسیٰ کے حضرت عمرؓ کے پاس آنے کی اجازت مانگنے کے قصے میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مجھے مخفی رہ گیا، مجھے بازاروں میں جا کر سودا سلف کرنے، نے مشغول کر دیا۔ روایت کیا اس کو بخاری نے۔ (ح، ۵۷)

اسی طرح مجتہد کے اس مقلد کو جس کو اب تک اس شخص مذکور کی طرح اس مسئلے میں شرح صدر نہیں ہوا اور اس کا اب تک یہی حُسنِ ظن ہے کہ مجتہد کا قول خلاف حدیث نہیں ہے۔ اور اس گمان سے اب تک اس مسئلے میں تقلید کر رہا ہے، اور حدیث کو رد نہیں کرتا لیکن وجہ موافقت کو مفصل سمجھتا بھی نہیں، تو ایسے مقلد کو بھی بوجہ اس کے کہ وہ بھی دلیل شرعی سے متمسک (جڑا ہوا) ہے، اور اتباع شرع ہی کا قصد کر رہا ہے، بُرا کہنا جائز نہیں۔

اسی طرح اس مقلد کو اجازت نہیں کہ ایسے شخص کو بُرا کہے کہ جس نے بعذر مذکور اس مسئلے میں تقلید ترک کر دی ہے۔ کیونکہ ان کا یہ اختلاف ایسا ہے جو سلف سے چلا آیا ہے جس کے باب میں علماء نے فرمایا ہے کہ اپنا مذہب ظناً صواب، محتمل خطاء اور دوسرا مذہب ظناً خطاء اور محتمل صواب ہے، جس سے یہ شبہ بھی دفع ہو جاتا ہے کہ جب سب حق ہے تو ایک ہی پر عمل کیوں کیا جاوے؟ پس جب دوسرے میں بھی احتمال صواب ہے تو اس میں کسی کی تضلیل یا تفسیق یا بدعتی وہابی کا لقب دینا، اور حسد و بغض وعناد و نزاع وغیبت وسبّ وشتم، وطعن ولعن کا شیوہ اختیار کرنا جو قطعاً حرام ہیں، کس طرح جائز ہوگا؟

البتہ جو شخص عقائد یا اجماعیات میں مخالفت کرے، یا سلف صالحین کو بُرا کہے وہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے، کیونکہ اھل سنت وجماعت وہ ہیں جو عقائد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہوں اور یہ امور ان کے عقائد کے خلاف ہیں، لہٰذا ایسا شخص اہل سنت سے خارج اور اہل بدعت وہویٰ میں داخل ہے۔ اسی طرح جو شخص تقلید میں غلو کرے قرآن وحدیث کو رد کرنے لگے ان دونوں قسم کے شخصوں سے حتی الامکان اجتناب واحتراز لازم سمجھیں، اور مجادلہ متعارفہ سے بھی اعراض کریں۔ (ح، ۵۸)

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی خاص مذہب کو اختیار کرنا یا کسی مجتہد کی تقلید کرنا اس شخص کے لئے جو متعارض دلائل کے درمیان موافقت نہ پیدا کر سکتا ہو، صرف اس لئے ہے کہ قرآن وسنت سے ثابت شدہ احکام شریعت تک پہنچا جائے۔ اسی لئے علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ عقائد اور وہ احکام جو قطعی طور پر نصوص میں آئے ہیں، ان میں تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کا فرض ہونا اور شراب، خنزیر، سود، جھوٹ، دھوکہ

بازی، اور خیانت کا حرام ہونا، یہ سب ان احکام میں سے ہیں جن میں نہ تو اجتہاد کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں آئی ہوئی نصوص ایک سے زیادہ معنیٰ کا احتمال رکھتی ہیں۔ ح ۵۹

اسی طرح کوئی متعین مذہب اختیار کرنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس مذہب کے علماء کسی بھی مسئلہ میں اپنے امام کے قول کی مخالفت نہیں کریں گے۔ چنانچہ اسی طرح کی بات امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ت ۵۱ جو حنفی المذہب ہیں ان کے بارے میں منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''ابوعبید بن حربویہ ت ۵۲ (شافعی) مختلف مسائل کے بارے میں مجھ سے مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے انہیں کسی مسئلہ کے بارے میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے کہ: ''یہ تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نہیں ہے'' اس پر میں نے انہیں کہا کہ ''قاضی صاحب! یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بات کی ہو، میں بھی وہ ہی کہوں'' انہوں نے جواب دیا کہ میں تو تمہیں صرف ان کا مقلد ہی خیال کرتا تھا، جس پر میں نے کہا کہ ''تقلید تو صرف کوئی متعصب شخص ہی کر سکتا ہے''۔ تو انہوں نے مزید کہا ''اور اسی طرح کند ذھن شخص''۔ یہ جملہ پورے مصر میں اتنا پھیلا کہ ضرب المثل بن گیا''۔ ح ۶۰

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس سے یہ تھا کہ کسی متعین مذہب کو اختیار کرنا، اس کے منافی نہیں ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص بھی کسی بھی مسئلہ میں اپنے امام کے قول کے علاوہ کسی بات کو اختیار نہیں کر سکتا ورنہ تو یہ تعصب ہو جائے گا۔

(تعصب کا مطلب ہے: بے جا طرف داری، ہٹ دھرمی یعنی بات صحیح ثابت ہو جانے پر بھی نہ ماننا)

یہاں یہ بات واضح ہو گئی کہ تقلید کے کئی مراتب ہیں:

(۱) پہلا درجہ

عامی شخص کی تقلید ہے جس کو قرآن وسنت کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور جو علوم قرآن وسنت سے متعلقہ ہیں ان میں اس کو مہارت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، اس میں وہ علماء بھی شامل ہیں جو کسی مدرسہ یا جامعہ سے رسمی طور پر فارغ التحصیل ہوں اور ان میں قرآن وسنت کی روشنی میں آراءِ فقہیہ کو پرکھنے کی صلاحیت نہ ہو۔ ان تمام کا حکم یہ ہے کہ وہ امام معین کی پیروی کریں اور صرف اپنے امام کے قول پر ہی عمل کریں کیونکہ ان کے امام کا قول ہی ان کے حق میں

دلیل ہے اور ان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی رائے سے اپنے امام کے قول کو کتاب وسنت کے خلاف قرار دیں کیونکہ ان کے پاس وہ مطلوبہ علم اور استعداد نہیں ہے جو ایسا حکم لگانے کے لئے ضروری ہے۔

(۲) تقلید کا دوسرا درجہ

یہ ماہر عالم کی تقلید ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے کہ جو مکمل اجتہاد کے درجے کو تو نہ پہنچا ہو لیکن قرآن وسنت کے علوم کی وسیع معرفت، اپنے امام کے مذہب کی مہارت اور ماہر اساتذہ کے پاس ایک طویل عرصہ تک فقہ اور افتاء کی مشغولیت سے اس کو ایسی مضبوط صلاحیت حاصل ہوگئی ہو جس سے وہ فقہی احکام کے دلائل میں غور وفکر کرسکتا ہو، تو ایسا عالم اگرچہ اکثر فقہی ابواب میں اپنے امام کی تقلید کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے امام کے کسی قول کو نص صریح کے معارض دیکھتا ہے، خوب غور وفکر کے بعد بھی اسے اس نص کا کوئی جواب نہیں ملتا تو اس کے لئے جائز ہے کہ اس نصِ صریح کی وجہ سے اپنے امام کے قول کو چھوڑ دے، جیسا کہ ہم پہلے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عبارت میں نقل کر چکے ہیں۔

اسی طرح گذشتہ صفات کے حامل عالم کو اگر یہ محسوس ہو کہ کسی مسئلے میں اس کے امام کے قول پر عمل کرنے میں سخت تنگی ہے اور ایسی عمومی ضرورت پیش آچکی ہے کہ آئمہ اربعہ کے مذاہب، جن کی پیروی کی جاتی ہے، ان میں سے کسی دوسرے کے قول کو لینا ضروری ہوگیا ہے، تو اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی دوسرے مجتہد کے قول پر فتویٰ دے اور عمل کرے۔ جیسا کہ حنفیہ نے زوجۂ مفقود اور دیگر کئی مسائل میں اسی بات پر عمل کیا ہے اور اپنے مقام پر اس کی تفصیل آجائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

(ایسی مثالیں اس کتاب کے حصہ "الافتاء علی المذھب الغیر" میں بکثرت موجود ہیں)

لیکن اس زمانے میں احتیاط اسی میں ہے کہ وہ مسائل جن میں عام ابتلاء پایا جاتا ہو کوئی شخص تنہا فتویٰ نہ دے بلکہ وہ دیگر حضرات سے مشورہ کرے اور علماء راسخین کی ایک جماعت کے اتفاق کے بعد ہی ایسا فتویٰ جاری کیا جائے۔

(۳) تیسرا درجہ

یہ مجتہد فی المذہب کی تقلید ہے، جو اصول میں اپنے امام کا مقلد ہوتا ہے، لیکن اُسے فروع یا مخصوص نئے پیش آنے والے مسائل میں درجہ اجتہاد حاصل ہوتا ہے اس قسم میں اصحابِ تخریج، اصحاب ترجیح اور مجتہد فی المسائل سب ہی شامل ہیں۔ جیسا کہ ابھی (اگلے باب "طبقات الفقہاء" میں) تفصیل آئے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

(۴) چوتھا درجہ

یہ مجتہد مطلق کی تقلید ہے جو اگرچہ کتاب وسنت سے مستقل طور پر مسائل مستنبط کرتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ تقلید سے اس کو بھی چھٹکارا نہیں ہوتا یعنی وہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال پر نظر رکھتا ہے، احکامِ قرآن وسنت کی تشریح میں ان سے استدلال کرتا ہے اور بسا اوقات جب اُسے قرآن وسنت کی کوئی نص صریح نہیں ملتی تو اپنی ذاتی رائے پر صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے کسی قول کو، جو اسے مل جاتا ہے، ترجیح دیتا ہے، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، اکثر وبیشتر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول کو لیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، ابن جریج رحمہ اللہ کے قول کو لیتے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ مدینہ منورہ کے فقہاءِ سبعہ کے اقوال کو لیتے ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ مجتہد مطلق کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ان کا اجتہاد اس بات کے خلاف نہیں ہوتا کہ وہ کبھی کبھار کسی دوسرے کی تقلید بھی کرلیں۔ آپ آئمہ میں سے ابراہیم رحمہ اللہ کو پائیں گے کہ وہ بعض احکام میں اپنے سے بڑے عالم کی تقلید کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے حج کے ایک مسئلہ کے بارے میں فرمایا: ''یہ میں نے عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کی تقلید میں کہا ہے'' (ح ۶۱)

☆......☆......☆

حواشی (٢)

اسلاف کے مناہج افتاء

(مناهج الفتوی فی السلف)

(١) المستدرك على الصحيحين، الحاكم، كتاب الاحكام، رقم الحديث ٧١٠٤، الجزء ١٦، الصفحة ٣٢٦، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

"وقال صحيح الاسناد ولم يخرجاه بهذه السياقة، وقال الذهبي، فرج بن فضالة، ضعفوه،

(٢) مسند احمد، حديث معقل بن يسار، رقم الحديث ٢٠٣٠٥، الجز ٣٣، الصفحه ٤٢٠،

"وفی اسناده نفيع بن الحارث وهو ابو داود الاعمى متروك الحديث، والله اعلم

(٣) سنن الترمذی، كتاب الاحكام، باب ماجاء فی القاضی كيف يقضی، رقم الحديث ١٣٢٧، الصفحة ٣٤٣، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

وسنن الدارمی، باب الفتياء وما فيه من الشدة، رقم الحديث ١٧٠، الجزء ١، الصفحة ١٩٠، طبع دار القلم دمشق۔

ومسند احمد، حديث معاذ بن جبل، رقم الحديث ٢٢٠٠٧، الجزء ٣٦، الصفحة ٣٣٣۔

وسنن ابی داود، كتاب الاقضية، باب اجتهاد الرای فی القضاء، رقم الحديث ٣٥٩٢، الصفحة ٥٦٩ الی ٥٧٠، طبع دار الكتب العلمية، بيروت،

(٤) اعلام الموقعين عن رب العالمين' ابن قيم رحمه الله، فصل، حديث، معاذ رضي الله عنه حين بعثه الرسول الی اليمن، الجزء ١، الصفحة ١٥٤ الی ١٥٥، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(٥) صحيح البخاری، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب اجر الحاكم اذا اجتهد فاصاب او أخطاء، رقم الحديث ٧٣٥٢، الصفحة ١٣٢٩، طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۶)سنن الدارمی ،باب الفتیاء مافیہ من الشدۃ ،رقم الحدیث ۱۶۸الی۱۷۱، الجزء ۱، الصفحۃ ۱۸۸الی۱۹۱، طبع دار القلم دمشق۔

(۷) السنن الکبری، البیہقی، کتاب اداب القاضی ،باب ما یقضی بہ القاضی ویفتی بہ المفتی،الجزء۱۰ ،الصفحۃ۱۱۵،

(۸) اعلام الموقعین عن رب العالمین'ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ،فصل الاصحاب رضی اللہ عنہم، الجزء،۱،الصفحۃ۹الی ۱۲،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔

(۹)المدخل الی السنن الکبری ،البیہقی ،باب من کرہ المسا لۃ ۔عما لم یکن ولم ینزل بہ وحی،رقم الحدیث ۲۲۶،الجزء۱،الصفحۃ ۲۲۶،طبع دار الخلفاء للکتاب الاسلام کویت۔

(۱۰) سنن الدارمی ،باب التورع عن الجواب فیما لیس فیہ کتاب ولاسنۃ ،رقم الحدیث ۱۱۸،الجزء ا،الصفحۃ ۱۳۵،طبع دار القلم دمشق۔

(۱۱) سنن الدارمی ،باب کراھیۃ الفتیاء، رقم الحدیث ۱۲۶،الجزء۱، الصفحۃ ۱۴۴ ،طبع دارالقلم دمشق۔

(۱۲)الفقیہ والمتفقہ ،الخطیب ،باب القول فی السوال عن الحادثۃ والکلام فیھاقبل وقوعھا ،رقم الحدیث ۶۱۴الی۶۲۱،الجزء ۲،الصفحۃ ۱۸۸ الی ۱۹۵،طبع مکتبۃ الظاھریۃ دمشق۔

(۱۳)المدخل الی السنن الکبری ،البیہقی ،باب من کرہ المسا لۃ عمالم یکن ولم ینزل بہ وحی،رقم الحدیث ۲۲۶،الجزء۱،الصفحۃ ۲۲۶،طبع دار الخلفاء لکتاب الاسلامی کویت۔

(۱۴) الفقیہ والمتفقہ ،الخطیب ،باب القول فی السوال عن الحادثۃ والکلام فیھا قبل وقوعھا ،رقم الحدیث ۶۲۴،الجزء۲،الصفحۃ ۱۹۸ الی ۱۹۹ ،طبع مکتبۃ الظاھریۃ دمشق۔

صحیح مسلم ، کتاب الامارۃ،باب فی طاعۃ الا مراء وان منعوا الحقوق رقم الحدیث ۱۸۴۶ ،الصفحۃ ۷۴۰،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔

صحیح مسلم کتاب الاضاحی ،باب جوازالذبح بکل ماانھر الدم الاالسن والظفروسائر العظام ،رقم الحدیث۱۹۶۸،الصفحۃ ۷۸۲،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔

وفیہ ان السائل سلمۃ بن یزید الجعفی رضی اللہ عنہ نفسہ۔

(۱۵) الفقیه والمتفقه ،الخطیب ،باب القول فی السوال عن الحادثة والكلام فيها قبل وقوعها ،رقم الحديث ۶۲۵ الى ۶۳۱،الجزء ۲، الصفحة ۱۹۹ الى ۲۰۵،طبع مكتبة الظاهرية دمشق۔

(۱۶) حجة الله البالغة شاه ولی الله الدهلوی رحمۃ اللہ علیہ،اسباب اختلاف الصحابة والتابعين فی الفروع الجزء ۱، الصفحة ۴۶۹ الى ۴۷۶،طبع مكتبة رشيدية بشاور۔

(۱۷) سنن ابی داود، كتاب الفرائض ،باب فی ميراث جدة ،رقم الحديث ۲۸۹۴، الصفحة ۴۶۵ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت،

سنن الترمذی ،كتاب الفرائض ،باب ماجاء فی ميراث الجدة ،رقم الحديث ۲۱۰۱، الصفحة ۵۰۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۱۸) سنن النسائی، كتاب النكاح ،باب اباحة التزويج بغير صداق، رقم الحديث ۳۳۵۲،الى ۳۳۵۳،الصفحة ۵۴۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

ایک روایت کے مطابق یہ بات کہنے والے حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۱۹) سنن النسائی ،كتاب النكاح ،باب اباحة التزويج بغير صداق ،رقم الحديث ۳۳۵۵ ،الصفحة ۵۴۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۲۰) صحيح البخاری، كتاب الطب ،باب مایذكر فی الطاعون ،رقم الحديث ۵۷۲۹،الصفحة ۱۰۶۵ الى ۱۰۶۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۲۱) صحيح البخاری ، كتاب الفرائض ،باب ميراث الجد مع الاب والاخوة ،الصفحة ۱۲۲۴،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۲۲) جامع المسانيد،الخوارزمی،الجزء ۲،الصفحة ۳۳۸،طبع مكتبة الاسلامية فيصل آباد۔

(۲۳) مؤطا الامام مالك ، كتاب الاشربة ،باب الحد فی الخمر ،رقم الحديث ۱۳۲۵،الجزء ۵، الصفحة ۲۳۶ ، طبع دار الكتب العلمية بيروت ۔

(۲۴) حجة الله البالغة،شاه ولی الله الدهلوی رحمۃ اللہ علیہ،باب اسباب اختلاف الصحابة والتابعين فی الفروع،الجزء ۱، الصفحة ۴۷۷ الى ۴۷۸،طبع مكتبة رشيدية بشاور۔

(۲۵) دیکھیں ،تدریب الراوی مع التقریب ،السیوطی رحمہ اللہ ،شرح مقدمة الماتن تحت قوله ،اول مصنف فی صحیح المجرد ،الجزء ۱ ،الصفحة ۸۹ ،طبع میر محمد کراتشی

(۲۶) کتاب الفهرست ،ابن الندیم ،الفن السادس من المقالة السادس ،مکحول الشامی ،الصفحة ۲۸۳ ،طبع نور محمد کتب خانه کراتشی۔

(۲۷) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی ،الرامهر مزی ،باب من استثقل اعادة الحدیث ،الحد الفاصل ،الجزء ۱ ،الصفحة ۶۱۱ الی ۶۱۲ ،طبع دار الفکر بیروت۔

(۲۸) السنن الکبری ،البیهقی ، کتاب آداب القاضی ،باب ما یقضی به القاضی ویفتی به المفتی۔۔۔ الجزء ۱۰ ،الصفحة ۱۱۵۔

(۲۹) تهذیب التهذیب ،ابن حجر ،فی ترجمة یحی بن صالح ،ابو زکریا ،ویقال ابو صالح الشامی ،رقم الحدیث ۳۷۲ ،الجزء ۱۱ ،الصفحة ۲۰۱ الی ۲۰۲ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۳۰) الانتقاء فی فضائل الثلاثة الفقهاء الجزء ۱ ،الصفحة ۱۹۹ ،طبع مکتبة المطبوعات الاسلامیة حلب۔

(۳۱) المعارف ابن قتیبة ،الصفحة ۴۹۳ الی ۵۰۰ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۳۲) تاریخ علماء الاندلس ،ابن الفرضی ،باب احمد ،الجزء ۱ ،الصفحة ۱۸ ، طبع دار المصریة القاهرة۔

(۳۳) شرح مختصر الروضة ،حجج منکری القیاس ،الحجة السابعة ،الجزء ۳ ،الصفحة ۲۸۹ الی ۲۹۰ ،

(۳۴) فتح الباری شرح صحیح البخاری ، کتاب الحج ،باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت ،الجزء ۳ ،الصفحة ۴۷۹ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

اصول الافتاء میں، روایت اسماعیلی ہے، جبکہ اصل کتاب میں زاد الثقفی کے الفاظ ہیں

(۳۵) فتح الباری شرح صحیح البخاری ، کتاب الحج ،باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت ،الجزء ۳ ،الصفحة ۵۰۷ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۳٦) صحيح مسلم ، كتاب الحج ،باب وجوب طواف الوادع وسقوطه عن الحائض، رقم الحديث ١٣٢٨، الصفحة ٤٩٢، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

السنن الكبرىٰ، البيهقي، كتاب الحج، باب ترك الحائض الوداع، الجزء ٥، الصفحة ١٦٣،

(۳۷) مسند احمد، حديث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، رقم الحديث ٢٢٠٦٢ الى ٢٢٠٨٠، الجزء ٣٦، الصفحة ٣٨٣ الى ٣٩٩، طبع مؤسسة الرسالة بيروت -

(۳۸) مسند احمد، حديث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، رقم الحديث ٢٢٠٢٠ الى ٢٢٠٦٤، الجزء ٣٦، الصفحة ٣٥٩ الى ٣٨٣، طبع مؤسسة الرسالة بيروت۔

(۳۹) التلخيص الحبير فى تخريج احاديث الرافعي الكبير، ابن حجر، كتاب النكاح' الفصل الخامس فصل الاتيان فى الدبر حرام، رقم الحديث ١٦٦٢، الجزء ٣، الصفحة ٣٣٥، مكتبة نواز المكة المكرمة۔

(۴۰) مجموع الفتاوىٰ، ابن تيمية، باب المحرمات فى النكاح، الجزء ٣٢، الصفحة ١٠٠ الى ١٠١، طبع مطابع الرياض۔

(۴۱) المجموع شرح المهذب، النووى، فصل فى آداب المستفتى وصفته واحكامه (الثالثة) هل يجوز للعاصى ان يتخير ويقلد اى مذهب شاء، الجزء ١، الصفحة ٥٥، طبع دار الفكر بيروت۔

(۴۲) مقدمة ابن خلدون' الباب السادس من الكتاب الاول، فى العلوم وأصنافها والتعليم وطرقه، الفصل السابع فى علم الفقه وما يتبعه من الفرائض، الجزء ١ الصفحة، ٢٥٥۔ طبع نور محمد كتب خانه كراتشي۔

(۴۳) الانصاف فى بيان أسباب الاختلاف، شاه ولى الله الدهلوى، الصفحة ٦٨ الى ٧٠، طبع دار النفائس بيروت۔

(۴۴) حجة الله البالغة، شاه ولى الله الدهلوى رحمة الله عليه، باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها، حكم التقليد والرد على ابن حزم فى تحريمه، الجزء ١، الصفحة ٥٠٥ الى ٥٠٦، طبع مكتبة رشيدية بشاور،

(٤٥) الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف ،شاہ ولی اللہ الدھلوی ،الصفحة ٤٣،طبع دار النفائس بیروت۔

(٤٦) المجموع شرح المھذب ،النووی ،فصل فی أداب المستفتی وصفته وأحکامه (الثالثة) ھل یجوز للعاصی ان یتخیر ویقلد أی مذھب شاء ،الجزء ١ ، الصفحة ٥٥، طبع دار الفکر بیروت۔

(٤٧) فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، المناوی، تحت حدیث، اختلاف أمتی رحمة، الجزء ١ الصفحة ٢٧٢، المکتبة التجاریة الکبریٰ مصر۔

(٤٨) عقد الجید مع الترجمة بالأردیة، الصفحة ٥٣، طبع محمد سعید اینڈ سنز۔

(٤٩) الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف، شاہ ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ، الصفحة ٧٧ الی ٧٨ ،طبع دار النفائس بیروت۔

(٥٠) وعظ اتباع المنیب، خطبات حکیم الأمت، الجزء ٦، الصفحة ١٧٢۔

(٥١) تذکرة الرشید، الجزء ١، الصفحة ١٣٢ ،طبع ادارة اسلامیات، لاھور۔

(٥٢) سبیل الرشاد؛ الامام رشید احمد الکنکوھی رحمه الله ،الصفحة ٣٠ الی ٣١، طبع دھلی ١٣٥٢ھ۔

(٥٣) صحیح البخاری، کتاب الحج ،باب فضل مکة وبنیانها ، رقم الحدیث ١٥٨٣، الصفحة ٢٩٢ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

صحیح مسلم ، کتاب الحج ،باب نقض الکعبة وبنائها ،رقم الحدیث ١٣٣٣، الصفحة ٤٩٦ الی ٤٩٧، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

"لولا أن قومك حدیث عهد بالجاهلیة ،لهدمت الکعبة وجعلت لها بابین"

سنن النسائی ، کتاب مناسك الحج ،باب بناء الکعبة ،رقم الحدیث ٢٨٩٧، الصفحة ٤٧٢ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

مؤطا الامام مالك ، کتاب الحج ،باب ماجاء فی بناء الکعبة ،رقم الحدیث ٨١٠ ،الجزء ٣، الصفحة ٩٢ ، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۵۴) سنن ابی داود، کتاب المناسک، باب الصلاۃ بمنیٰ، رقم الحدیث ۱۹۶۰، الصفحۃ ۳۱۵ الی ۳۱۶، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۵۵) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ التوبۃ، رقم الحدیث ۳۰۹۵، الصفحۃ ۷۱۵، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۵۶) سنن ابی داود، کتاب الأطعمۃ، باب فی اکل حشرات الأرض، رقم الحدیث ۳۷۹۹، الصفحۃ ۶۰۰، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۵۷) صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الحجۃ علی من قال، ان احکام النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت ظاهرۃ، وما کان یغیب بعضهم عن مشاهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامور الاسلام، رقم الحدیث ۷۳۵۳، الصفحۃ ۱۳۲۹، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۵۸) الاقتصاد فی التقلید والاجتهاد، الشیخ أشرف علی التهانوی رحمه الله تعالیٰ، الصفحۃ ۸۴ الی ۸۹، طبع ادارہ اسلامیات۔

(۵۹) دیکھیں: الذخیرۃ، القرافی، الجزء ۱، الصفحۃ ۱۴۸، طبع دار الغرب الاسلامی۔

(۶۰) رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ابن حجرؒ ذکر ابی عبید بن حربویه، الجزء ۱، الصفحۃ ۱۲۰

(۶۱) اعلام الموقعین عن رب العالمین، ابن قیم رحمہ اللہ، أقسام المفتین اربعۃ، الفائدۃ التاسعۃ والعشرون، الجزء ۴، الصفحۃ ۱۶۲ الی ۱۶۴، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

❖ ❖ ❖

3

فقہاء کے طبقات اور مراتب

طبقات الفقہاء

مباحث

- فقہاء حنفیہ کے طبقات
- ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر پہلا اعتراض
- ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر دوسرا اعتراض
- ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر تیسرا اعتراض
- ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر چوتھا اعتراض
- فقہاء شافعیہ کے طبقات
- طبقات مسائل حنفیہ
- مسائل اصول یا ظاہر الروایہ
- امام محمد رحمہ اللہ کی المبسوط
- الجامع الصغیر
- الجامع الکبیر
- الزیادات اور زیادات الزیادات
- السیر الصغیر
- السیر الکبیر
- امام محمد رحمہ اللہ کی مزید تین (۳) کتابیں
- مسائل النوادر
- مسائل الفتاوی والواقعات
- مسائل حنفیہ کی ایک تقسیم از شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ

فقہائے حنفیہ کے طبقات

(طبقات الفقهاء الحنفية)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ (ت، ۵۳) نے شرح عقود رسم المفتی میں ذکر کیا ہے کہ فقہائے حنفیہ کے مختلف طبقات (درجے اور مراتب) ہیں۔ علامہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ (ت، ۵۴) نے ان کو سات طبقات میں منحصر کیا ہے:

(۱) پہلا طبقہ

مجتہدین فی الشرع کا طبقہ ہے جیسے آئمہ اربعہ رضی اللہ عنہم، اور وہ تمام حضرات جو اصول کے قواعد کی بنیاد رکھنے اور چاروں دلائل (قرآن وسنت، اجماع وقیاس) سے فروعی احکام کے استنباط میں انہی کے راستے پر چلے، اس طرح کہ انہوں نے فروع اور اصول میں کسی کی بھی تقلید نہیں کی۔

(۲) دوسرا طبقہ

یہ مجتہدین فی المذہب کا طبقہ ہے، جیسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے وہ تمام شاگرد جو ان مذکورہ بالا دلائل سے اپنے استاذ کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق احکام کے استخراج پر قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اگرچہ کچھ فروعی احکام میں امام صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کیا لیکن اصولی قاعدوں میں وہ انہی کے مقلد تھے۔

(۳) تیسرا طبقہ

یہ ان حضرات کا طبقہ ہے جو صرف ایسے مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی

روایت منقول نہیں ہے، جیسے امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۵۵)، امام ابو جعفر الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ، ابو الحسن کرخی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۵۶)، شمس الدین الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۵۷)، شمس الائمہ السرخسی رحمۃ اللہ علیہ، فخر الاسلام البزدوی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۵۸)، فخر الدین قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۵۹) وغیرہم۔ یہ حضرات اگر چہ اصول وفروع میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت کی قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن یہ حضرات ان مسائل کے احکام مستنبط کرتے تھے، جن میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی تصریح نہیں تھی، ایسے اصولوں کے مطابق جن کی وضاحت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما چکے تھے۔ اور ان قواعد کے تقاضوں کے مطابق، جنہیں تفصیل سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیان کر چکے تھے۔

(۴) چوتھا طبقہ

یہ اصحاب التخریج کا طبقہ ہے، جو مقلدین ہوتے ہیں، جیسے ابو بکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۶۰) اور ان جیسے دیگر حضرات، یہ اگر چہ اجتہاد کی بالکل قدرت نہیں رکھتے لیکن اصولوں کے احاطہ کرنے اور مسائل کے ماخذ کو ضبط کرنے کی وجہ سے اس بات کی قدرت ضرور رکھتے ہیں کہ کسی ایسے مجمل قول کی تفصیل بیان کر دیں، جس میں دو صورتوں کا احتمال ہو یا کسی ایسے حکم کی تفصیل کر دیں، جو دو باتوں کا احتمال رکھتا ہو اور یہ (قول اور حکم) صاحب مذہب یا ان کے مجتہد شاگردوں میں سے کسی سے منقول ہو۔ یہ حضرات یہ کام، اصول میں اپنی رائے اور غور وفکر سے نیز فروع میں اس مسئلہ سے ہم شکل اور ملتے جلتے مسائل پر قیاس کر کے سرانجام دیتے ہیں۔

ہدایہ کے بعض مقامات پر جو یہ الفاظ آئے ہیں "کذا فی تخریج الکرخی رحمۃ اللہ علیہ" اور "تخریج الرازی رحمۃ اللہ علیہ" تو وہ اسی قسم میں سے ہیں۔

(۵) پانچواں طبقہ

یہ اصحاب الترجیح کا طبقہ ہے جو مقلدین ہوتے ہیں جیسے ابو الحسین قدوری رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۶۱)، صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۶۲)، اور ان دونوں جیسے دیگر حضرات۔ ان حضرات کا کام یہ ہے کہ بعض روایات کو دوسری روایات پر اپنے ان الفاظ کے ذریعہ ترجیح دیتے ہیں کہ یہ اولیٰ ہے، اور یہ روایت کے اعتبار سے زیادہ صحیح

ہے، اور یہ زیادہ واضح ہے، اور یہ قیاس کے زیادہ موافق ہے ، اور اس میں لوگوں کیلئے زیادہ سہولت ہے، وغیرہ۔

(٦) چھٹا طبقہ

یہ ان مقلدین کا طبقہ ہے جو روایات اَقْویٰ (اسم تفضیل کے ساتھ) قوی، ضعیف، ظاہر الروایۃ، ظاہر المذہب، اور روایت نادرہ کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے معتبر متون کے مصنفین رحمہم اللہ، مثلاً صاحبِ کنز (ت، ٦٣)، صاحبِ المختار (ت، ٦٤)، صاحب الوقایۃ (ت، ٦٥)، اور صاحبِ مجمع (ت، ٦٦)۔ ان حضرات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنی کتابوں میں مردود اقوال اور ضعیف روایات نقل نہیں کرتے۔

(٧) ساتواں طبقہ

یہ ان مقلدین کا طبقہ ہے جو گزشتہ طبقات میں ذکر کئے گئے کسی کام کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ لاغر (ضعیف) اور فربہ (صحیح) کے درمیان فرق کر سکتے ہیں، اسی طرح وہ دائیں بائیں کی تمیز نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو جو کچھ پاتے ہیں اس کو ایسے جمع کر دیتے ہیں جیسے رات میں لکڑیاں چننے والا (کہ اُسے گیلی اور خشک لکڑیوں کا پتہ نہیں چلتا) لہٰذا جو ایسے لوگوں کی پیروی کرے گا تو وہ پوری طرح تباہی سے ہمکنار ہوگا۔ (ایسے لوگوں کو صرف عوامی شہرت کی وجہ سے طبقاتِ فقہاء میں جگہ دیدی گئی ہے۔)

یہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی عبارت ہے جو ابن عابدین رحمہ اللہ نے "شرح عقود رسم المفتی" میں ان کے کسی رسالہ سے نقل کی ہے۔ علامہ طحطاوی رحمہ اللہ (ت، ٦٧) نے ذکر کیا ہے کہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ نے یہ تفصیل اپنے رسالہ "وقف البنات" (ح، ۱) میں ذکر کی ہے۔

(حاشية الطحطاوي على الدر المختار اواخر المقدمة ۱/۵۱)

اسی کو بہت سے متاخرین علماء نے لیا اور انہوں نے فقہاء کے طبقات کو بغیر کسی اعتراض اور احتیاط کے ویسے ہی ذکر کر دیئے جیسے ابن کمال پاشا رحمہ اللہ نے ذکر کئے تھے۔ لیکن بعد میں آنے والے بہت سے گہرا علم رکھنے والے علماء نے اس پر تنقید کی ہے کیونکہ ان کے کلام میں بہت سی وجوہات کی بناء پر کئی قابلِ غور باتیں (اعتراض) ہیں۔

ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ کی تقسیم پر پہلا اعتراض

(الملاحظة الاولىٰ فی تقسیم ابن کمال باشا رحمه الله تعالىٰ)

پہلا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے مجتہدین فی المذہب میں سے شمار کیا ہے جو اصول میں اپنے امام کی تقلید کرتے ہیں۔اس بات پر علامہ شہاب الدین المرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ناظورۃ الحق میں سخت رد کیا ہے۔

(حاشیہ کا ترجمہ:

ناظورۃ الحق کا تعارف: اس کتاب کا پورا نام "ناظورة الحق فی فرضية العشاء وان لم يغب الشفق" ہے۔اس کا قلمی نسخہ مکتبہ دارالعلوم کراچی میں موجود ہے اس میں ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ کی تقسیم پر تفصیلی رد ہے۔اس کے مؤلف ہارون بن بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کا لقب شہاب الدین تھا اور یہ تیرہویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، ان کی پیدائش ریاست قازان کے ایک شہر میں ۱۲۳۳ھ میں ہوئی اور انہوں نے بخارا اور سمرقند میں تعلیم حاصل کی۔زرکلی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بہت سے علماء نے ان سے علم حاصل کیا اور یہ علی الاعلان اجتہاد سے کام لیتے تھے۔اور اپنے مناظروں میں بعض متقدمین پر بڑے سخت اعتراضات کرتے تھے۔اس لئے ان کے معاصرین ان سے کبیدہ خاطر رہے۔اسی بناء پر اپنے عہدے سے معزول بھی ہوئے لیکن بعد ازاں یہ دوبارہ اس منصب پر فائز ہو گئے۔

(الاعلام للزرکلی ۱۷۸/۳)

حضرت دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ان کا مدرسہ آج تک قازان میں موجود ہے اور میں نے اسکی زیارت کی ہے۔ان علاقوں کے علماء میں ان کی اچھی شہرت ہے اور ان کی علوم میں مہارت تو ان کی کتاب ''ناظورۃ الحق'' وغیرہ سے ظاہر ہے۔یہ کتاب اگرچہ اصل تو اس موضوع پر ہے کہ ان علاقوں میں عشاء کی نماز فرض ہے جن میں شفق غائب ہی نہیں ہوتا، ریاست قازان انہی میں سے ہے جو بلغار کے قریب واقع ہے، لیکن انہوں نے اس کتاب میں فقہ اور اصولِ فقہ کے بارے میں بہت عمدہ بحثیں تحریر فرمائی ہیں)۔

اسی طرح مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (ت ۱۳۰۴) نے الجامع الصغیر اور عمدۃ الرعایۃ کے مقدمہ

میں ذکر کیا ہے کہ صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اصول میں مخالفت معمولی نہیں ہے یہاں تک کہ امام غزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) نے اپنی کتاب "المنخول" میں فرمایا کہ ان دونوں حضرات نے دوتہائی مذہب میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے۔ (ح ۲)

علامہ مرجانی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے اور وہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما اور امام زفر رحمہ اللہ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

"ان حضرات کا فقہ میں حال اگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بلند نہ ہو تو ان سے کم بھی نہیں ہے۔ موافق اور مخالف سبھی کی زبان پر یہ بات ہے اور اب تو یہ ضرب المثل بن گئی ہے کہ " ابوحنیفہ رحمہ اللہ ابو یوسف رحمہ اللہ " کہ ابو یوسف رحمہ اللہ تو ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔ یعنی ابو یوسف رحمہ اللہ فقاہت میں بہت بلند درجے پر فائز ہیں"۔

(اس مقولہ کے بارے میں وضاحت شرح جامی کے حاشیہ ملا عبدالغفور میں یوں ہے:

"قوله(لاقرينة)فلو وجدت قرينةمعينة للمراد لم يجب التقديم،مثل ابو حنيفةابويوسف،اذالمقصودتشبيه الثاني بالاول")۔

(بحث المبتداء والخبر،۴۳،طبع علوم اسلامية)

امام نووی رحمہ اللہ نے "تهذيب الاسماء" میں ابو المعالی الجوینی رحمہ اللہ (ت ۴۷۸ھ) سے یہ بات نقل کی ہے:

"امام مزنی رحمہ اللہ (ت ۲۶۴ھ) نے جو قول بھی اختیار کیا ہے میرا خیال یہ ہے کہ وہ اصل مذہب ہی کے ساتھ ملحق ہوئی تخریج ہے، نہ کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کی طرح، کیونکہ یہ دونوں حضرات تو اپنے استاد سے اصول میں بھی اختلاف کرتے ہیں"۔ (ح ۳)

اسی وجہ سے علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے:

"حق بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ مستقل مجتہد تھے اور اجتہاد مطلق کے مرتبہ پر فائز تھے، البتہ ان دونوں حضرات کی طرف سے اپنے استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حسنِ تعظیم اور ان کی انتہائی عزت کرنے کی وجہ سے ان دونوں نے انہی کی بنیاد کو اپنایا اور انہی کے مذہب کو نقل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور انہی کی طرف منسوب ہوئے"۔ (ح ۴)

گویا کہ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کو مجتہدِ منتسبین میں سے قرار دیا ہے نہ کہ مجتہد فی المذہب۔ مجتہدِ منتسب، یہ فقہاء کی ایک مستقل قسم ہے جس کو ابن کمال پاشا رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کیا اور دیگر بہت سے

حضرات نے جنہوں نے طبقاتِ فقہاء کا تذکرہ کیا ہے، انہوں نے اس قسم کو بھی ذکر کیا ہے۔ پھر اس کے مصداق کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور اس بارے میں تین قول ہیں:

(۱) پہلا قول

وہ ہے جو علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ مجتہدِ منتسب حقیقت میں مجتہدِ مطلق ہی ہوتا ہے۔ اور وہ اصول وفروع میں کسی کی تقلید نہیں کرتا، لیکن اپنے آپ کو اپنے استاد کی طرف ان کے عزت واحترام کی وجہ سے منسوب کرتا ہے۔

(۲) دوسرا قول

وہ ہے جو امام نووی رحمہ اللہ نے ابن الصلاح رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ:

مجتہدِ منتسب، مجتہدِ مطلق ہی ہوتا ہے لیکن اس کو مجتہد مستقل کی طرف اس لئے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ اجتہاد میں اسی کے راستے پر چلتا ہے۔ انہوں نے ابو اسحاق اسفرائینی رحمہ اللہ (ت، ۴۲) سے یہ بات نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

''وہ حضرات جو مذہب شافعی کی طرف گئے تو اس کی تقلید کی وجہ سے نہیں گئے، بلکہ اس وجہ سے گئے کہ انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کے اجتہاد وقیاس کے راستوں کو سب راستوں سے سیدھا پایا، تو جب کبھی اُن کے لئے اجتہاد کرنا ضروری ٹھہرا، تو وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے راستہ پر چلے اور انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ ہی کے (اصولوں کے) راستے، احکام شریعت کی معرفت حاصل کی''۔

اور ابو علی سنجی رحمہ اللہ نے ایسی ہی بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ہم نے دیگر آئمہ کو چھوڑ کر امام شافعی رحمہ اللہ کی پیروی اس لئے کی ہے کیونکہ ہم نے ان کی بات کو تمام اقوال سے زیادہ راجح اور زیادہ معتدل پایا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ ہم نے ان کی تقلید اختیار کی ہے''۔ (ح، ۵)

خلاصہ یہ ہوا کہ مجتہدِ منتسب، مجتہدِ مستقل کی طرف صرف اس لئے منسوب ہوتا ہے کہ اس کا اجتہاد اکثر مسائل میں ان کے اجتہاد کے موافق ٹھہرتا ہے، جن کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ یہ نسبت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ یہ اصول یا فروع میں ان کی تقلید کرتا ہے۔ اسی قول کو ابن الصلاح رحمہ اللہ (ح، ۶) اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ (ت، ۴۳) نے اختیار کیا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر مزید یہ بھی اضافہ فرمایا ہے کہ یہاں مستقل اور مطلق کے درمیان عموم خصوص کی نسبت ہے۔ پس ہر مجتہد مستقل، مجتہدِ مطلق ہے لیکن ہر مجتہدِ مطلق، مجتہدِ مستقل نہیں ہے۔ (ح، ۷)

(یہ منطق کی اصطلاح ''عموم خصوص مطلق'' کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ'' وہ نسبت کہ ایک کلی تو دوسری کلی کے ہر ہر فرد پر صادق ہو اور دوسری پہلی کے ہر ہر فرد پر صادق نہ ہو۔ پہلی کلی کو عام مطلق اور دوسری کو خاص مطلق کہتے ہیں۔ جیسے ہر انسان حیوان ہے لیکن ہر حیوان انسان نہیں ہے۔ حیوان عام مطلق اور انسان خاص مطلق ہے)۔

(گویا ان کے نزدیک مجتہدِ مطلق کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم مجتہدِ مطلق مستقل اور دوسری قسم مجتہدِ مطلق منتسب۔)

(۳) تیسرا قول

یہ وہ قول ہے جو شیخ عبدالوھاب شعرانی رحمہ اللہ (ت، ۷۴) نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آئمہ متبوعین کے بعد میں آنے والے زمانوں میں) وہ تمام حضرات جنہوں نے اجتہاد مطلق کا دعویٰ کیا ہے تو مطلق سے مراد ان کی صرف منتسب ہے جو اپنے امام کے قواعد سے نہیں نکلتا، جیسے امام مالک رحمہ اللہ کے ساتھ ابن قاسم رحمہ اللہ اور اصبغ رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ محمد رحمہ اللہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ مزنی رحمہ اللہ اور ربیع رحمہ اللہ'' (ت، ۷۵)۔ (ح، ۸)

اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ شعرانی رحمہ اللہ نے مجتہد منتسب کو اصول میں اپنے امام کا مقلد قرار دیا ہے۔ اور اس کا حال وہی ہوتا ہے جو ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تقسیم میں مجتہد فی المذہب کا ہے لیکن شعرانی رحمہ اللہ نے مجتہد منتسب کو مطلق بنا دیا ہے۔ شاید ان کی مراد بھی وہ ہی ہے جو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ''الانصاف'' میں لکھی ہے کہ مجتہد منتسب یہ مجتہدِ مطلق اور مجتہد فی المذہب کے درمیان ایک الگ قسم ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں پھر یہ جان لو کہ یہ مجتہد یعنی مجتہدِ مطلق کبھی تو مستقل ہوتا ہے اور کبھی کسی مستقل مجتہد کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

(الف) مجتہدِ مستقل وہ ہے جو تمام مجتہدین سے تین خصوصیات کے ساتھ ممتاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ تم یہ صفات امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں بالکل واضح طور پر دیکھو گے:

(۱) مجتہدِ مستقل ان اصول و قواعد میں تصرف کرتا ہے جن سے فقہی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ امام

شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "کتاب الاُم" کے شروع میں ذکر کیا ہے......

(۲) مجتہدِ مستقل احادیث و آثار کو جمع کر کے ان کے احکام کو حاصل کرتا ہے اور ان سے فقہی احکام کے لینے پر تنبیہ کرتا ہے۔ مختلف احادیث و آثار کو جمع کر کے ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دیتا ہے اور ان کے کئی احتمالات میں سے ایک کو متعین کر دیتا ہے......

(۳) مجتہدِ مستقل اپنے پاس آنے والی تفریعات کے جوابات دیتا ہے جن کے جوابات ان سے پہلے ان بہترین زمانوں میں جن کی خیر کی گواہی (احادیث مبارکہ میں دی گئی ہے) نہیں دیئے گئے (یعنی زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہ وتبع تابعین رحمۃ اللہ علیہ)......اور ایک چوتھی خصوصیت بھی ہے جو اِن تینوں کے بعد آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت عامہ نصیب ہونا ہے......

(ب) مجتہدِ مطلق منتسب وہ پیروی کرنے والا ہوتا ہے جو پہلی خصوصیت میں تو سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ (یعنی مجتہدِ مستقل کی پیروی کرتا ہے) دوسری خصوصیت میں وہ مجتہدِ مستقل کا قائم مقام ہوتا ہے۔

(ج) مجتہد فی المذہب وہ ہے جو پہلی اور دوسری صفت میں تو مجتہدِ مستقل کی بات کو تسلیم کرتا ہے اور اُنہی کی طرز پر تفریعات قائم کرنے میں ان کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ ح،۹

(الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص۸۱، ۸۲)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مجتہدِ منتسب اس امام کی تقلید کرتا ہے بنیادی استنباط کے طریقہ کار میں، جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس بات میں کہ حدیث مُرسَل حجت ہے یا نہیں؟ اور اس بات میں کہ کسی روایت کو ترجیح سند کے صحیح ہونے کی بنیاد پر دی جائیگی یا اس کے راویوں کے فقیہ ہونے کی بنیاد پر۔ اسی طرح دیگر ان اصولوں میں بھی وہ پیروی کرتا ہے جو مجتہدین سے صراحتاً ثابت ہیں۔ اگر چہ وہ اپنے امام کی ایسے بعض اصولوں میں مخالفت بھی کرتا ہے جو کتبِ اصول میں ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً حقیقی اور مجازی معنیٰ میں جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مجاز حقیقت کا جانشین تکلم کے اعتبار سے ہے یا حکم کے اعتبار سے؟۔

ان دونوں مسائل کی تفصیل "تشریحات نمبر (۱۱) اور (۱۲)" میں دیکھیں

ایسے اصولوں کا بڑا حصہ فقہاء سے صراحتاً ثابت نہیں ہے بلکہ ان کو اصولِ فقہ کے ماہرین نے فقہاء سے نقل کردہ روایات سے مستنبط کیا ہیں۔

صاحبین رحمۃ اللہ علیہما، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو اختلاف کرتے ہیں وہ ایسے اصولی مسائل میں ہے جن میں کبھی

کبھار مجتہد منتسب اپنے امام سے اختلاف کر لیتا ہے۔ رہا مجتہد فی المذہب تو وہ اصول میں سے کسی چیز میں بھی اپنے امام سے اختلاف نہیں کرتا بلکہ اپنے امام کے ہی قائم کردہ قواعد پر مسائل کی تفریع کرتا ہے۔ (لہٰذا صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کا مجتہد فی المذھب نہ ہونا بالکل ظاہر ہے)۔

اب آپ کے سامنے علامہ مرجانی رحمہ اللہ اور شیخ لکھنوی رحمہ اللہ کی بات کا صحیح ہونا واضح ہو چکا ہوگا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کو مجتہدین فی المذہب میں سے بنا دینا درست نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک مجتہدِ مطلق ہے اور ان کی نسبت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف کی جاتی ہے۔ بظاہر امام زفر رحمہ اللہ کا بھی یہی مقام و مرتبہ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

رہے مجتہد فی المذہب تو ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تعریف کے مطابق ممکن ہے کہ ہم ان میں سے ان جیسے حضرات کو شمار کر لیں، امام ابوجعفر طحاوی رحمہ اللہ، صاحبِ فتح القدیر شیخ ابن الھمام رحمہ اللہ (ت، ٧٦) اور امام ابوالحسن کرخی رحمہ اللہ، یہ تینوں حنفیہ میں سے ہیں۔

امام ابواسحاق المروزی رحمہ اللہ (ت، ٧٧) اور امام غزالی رحمہ اللہ شوافع میں سے ہیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ (ت، ٧٨) اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ مالکیہ میں سے ہیں۔

ابن عبدالھادی رحمہ اللہ اور ابن رجب رحمہ اللہ حنابلہ میں سے ہیں۔

یہ تمام حضرات اگرچہ بعض فروعی مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں لیکن اصول میں اُنہی کی تقلید کرتے ہیں۔

ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر دوسرا اعتراض

الملاحظة الثانية

ان میں سے بعض طبقات تو باہم متباین (بالکل الگ الگ) ہیں جیسے مجتہد مطلق اور مجتہد فی المذہب اور ان طبقات کی بعض قسمیں باہم متباین نہیں ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ وہ کئی قسمیں ایک ہی شخص (فقیہ) میں جمع ہو جائیں جیسے مجتہد فی المسائل، اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح (پھر ان کو طبقات فقہاء کی الگ الگ قسم شمار کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟)

حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں اس بندہ ضعیف عفا اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اقسام مختلف کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے ہے نہ

کہ افراد اور اشخاص کے اعتبار سے اور اس کی مراد یہ ہے کہ فقہاء کی ذمہ داریاں اور کام ان تین اقسام پر منقسم ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک شخص بیک وقت ان تمام یا ان میں سے کچھ کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ علماء کی مختلف اقسام ہوتی ہیں، مفسر، محدث، فقیہ، اور متکلم لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص پر یہ تمام القابات صادق آتے ہیں تو اب وہ عالمِ قرآن مجید میں مشغولیت کے اعتبار سے مفسر ہے، اور حدیث پاک میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے محدث ہے، اور فقہ میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے فقیہ ہے' تو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی عالم بیک وقت مجتہد فی المسائل بھی ہو اور تخریج وترجیح کا اہل بھی ہو۔

اسی لئے فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ مجتہدین فی المسائل میں نے التحریر اور مسلم الثبوت کی شروحات سے ہیں پھر بعض فقہاء نے ان کو اصحاب التخریج میں سے شمار کیا ہے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ وہ مجتہدین فی المذہب میں سے ہیں جیسا کہ ان کے اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے جو قاضی ابو عبید ابن حربویہ شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ پیش آیا تھا اور ہم اسے تقلید کی بحث میں نقل کر چکے ہیں۔

اسی طرح علامہ نسفی رحمہ اللہ کو گزشتہ تقسیم کے اعتبار سے چھٹے طبقے میں یعنی اصحاب تمییز میں رکھا گیا ہے حالانکہ بہت سے فقہاء حنفیہ نے ان کو مجتہدین فی المذہب میں سے قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ کے بعد کوئی مجتہد فی المذہب نہیں پایا گیا جیسا کہ بحر العلوم رحمہ اللہ میں ذکر کیا ہے''۔ (ح،۱۰)

علامہ شہاب الدین مرجانی رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ تمام حضرات مجتہدین فی المذہب کے مرتبے پر فائز تھے۔

ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقسیم پر تیسرا اعتراض

الملاحظة الثالثة

علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کے کلام کے نقل کرنے کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ بعد میں آنے والے بہت سے حضرات نے طبقات کی اس تقسیم میں ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی تقلید کی ہے۔ پھر فرماتے ہیں مختلف اقسام کے تحت ذکر کئے گئے فقہاء کرام کو ان طبقات میں شامل کرنا کئی اعتبار سے قابل اعتراض ہے:

(۱) ان حضرات کا امام خصاف رحمہ اللہ، امام طحاوی رحمہ اللہ، اور امام کرخی رحمہ اللہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اصول وفروع

میں سے کسی میں بھی اپنے امام کی مخالفت کی قدرت نہیں رکھتے تھے تو ان حضرات کی تردید خود بخود طبقات حنفیہ میں ذکر کردہ ان آئمہ کے حالات اور کتب فروع اور کتب اصول میں ان سے منقول اقوال اور آراء سے ہو جاتی ہے۔

(۲) ان حضرات نے ابوبکر رازی جصاص رحمہ اللہ کو ان لوگوں میں سے شمار کیا ہے جو بالکل ہی اجتہاد پر قدرت نہیں رکھتے حالانکہ یہ حقیقت سے بہت دور کی بات ہے۔ پھر انہی حضرات نے تو شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ، امام سرخسی رحمہ اللہ، امام بزدوی رحمہ اللہ، اور قاضی خان رحمہ اللہ کو مجتہدین فی المذہب میں سے (شاید علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کی مراد یہاں مجتہد فی المسائل ہے) شمار کیا ہے حالانکہ امام جصاص رازی رحمہ اللہ تو زمانہ کے اعتبار سے اِن سے مقدم، شان کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر، علم میں ان سے زیادہ اور باریکیوں کو سمجھنے میں ان سے زیادہ فہم رکھتے تھے۔

(۳) علامہ قدوری رحمہ اللہ کی شان قاضی خان رحمہ اللہ سے کہیں بڑھ کر ہے اور صاحب ہدایہ رحمہ اللہ بھی قاضی خان رحمہ اللہ سے اگر بڑھ کر نہ ہوں تو کم کسی طرح نہیں ہیں۔ اب قاضی خان رحمہ اللہ کو تو تیسرے مرتبہ پر فائز کر دینا اور قدوری رحمہ اللہ اور صاحب ہدایہ رحمہ اللہ کا درجہ ان سے گھٹا دینا بالکل نامناسب بات ہے۔ ج ۱۱۰

علامہ مرجانی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کا اعتراض کیا ہے اور اس میں مزید یہ اضافہ بھی کیا ہے:

''فقہاءِ عراق پر چونکہ حضرات اسلاف کے طریقے کے مطابق القاب میں سادگی، عنوانات میں شوخی کا نہ ہونا اور عاجزی کا اظہار غالب تھا، اسی طرح یہ حضرات اسلاف کے طریقے کے مطابق زبردست قسم کے القابات، ہرے بھرے اوصاف سے بچتے تھے اور اپنی بلندی کے اظہار، اپنے نفس کی قدر افزائی اور دین میں پختگی، تقویٰ اور ادب میں کمال پر اپنی حالت کی پسندیدگی سے بہت دور تھے۔

اسی طرح ان پر گمنامی، عہدۂ قضاء سے بچنا اور سرکاری کاموں سے پرہیز کا مزاج ہی غالب تھا...... سیدھے سادے ایسے ناموں کے ذریعے جنہیں عام لوگ استعمال کرتے ہیں اور عوام ان کو برتتے ہیں کہ کسی کی نسبت اس کے پیشے کی طرف کر دی، کسی کی قبیلہ کی طرف اور کسی کی بستی محلے کی طرف وہ حضرات دوسروں سے امتیاز میں بس اسی پر اکتفاء کر لیتے تھے۔

جیسے خصاف (موچی) جصاص (چونا بنانے یا فروخت کرنے والا) قدوری (ھانڈیاں بنانے یا بیچنے والا) ثلجی (برف بیچنے والا) (یاد رہے کہ مشہور امام محمد بن شجاع ثلجی رحمہ اللہ کی نسبت ان کے جدامجد ثلج بن عمر بن مالک بن عبد مناف کی طرف ہے، نہ کہ برف فروشی کی طرف۔ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے الفوائد البھیۃ میں اس کی تصریح کی ہے)۔ طحاوی (طحاء نامی علاقہ کا رہنے والا) کرخی (مقام کرخ کا باشندہ) الصمیری (صمیر کا رہنے والا)۔

اب ان کے جو متاخرین علماء آئے انہوں نے بھی ان حضرات سے نقلِ روایت ایسے ہی سیدھے سادے ناموں پر اکتفاء کیا اور ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ خراسان اور خاص طور پر ماوراء النہر کے رہنے والوں کا قرون وسطیٰ اور آخری زمانہ میں غالب مزاج یہ تھا کہ وہ دوسروں پر بلندی کے اظہار میں خوب غلو کرتے اور اپنے حال پر پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے...... لہٰذا ان کے القابات بھی بڑی فضیلت والے تجویز کئے گئے اور انہیں عظیم اوصاف کے ساتھ موصوف بتایا گیا جیسے: شمس الائمہ، فخر الاسلام، صدر الشریعہ۔ پھر ان کے بعد آنے والے حضرات بھی مسلسل اسی طرز پر چلتے رہے...... جب ان حضرات میں سے کوئی اپنوں میں سے کسی کا ذکر کرتا تو ان کے اوصاف بیان کرنے میں خوب مبالغہ کرتا اور وہ یوں کہتے "الشیخ، الامام، الاجل، الزاھد، الفقیه، اور دیگر ایسے الفاظ اور یہ حضرات جب کسی دوسرے کی بات نقل کرتے تو بس اپنے ان جیسے الفاظ پر کوئی اضافہ نہ کرتے کہ "کرخی نے کہا اور جصاص نے کہا"۔

بسا اوقات ان علماء کے علاوہ بھی لوگ جو ان کی بات کو سنتے اور قبول کرتے تھے' وہ بھی انہی کی پیروی کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ شخص جو خود علماء کے احوال، ان کے مراتبِ کمال، ان کے طبقات اور فقہاء کے درجات سے جاہل ہوتا وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا اور اوصاف والقاب کی عزت وشرافت سے موصوف کی نیک نامی پر استدلال کرنا شروع کر دیتا۔ یہ چیز اس کو اپنے علماء کے علاوہ دوسروں سے انکار پر اور ان کے علاوہ دیگر اللہ کے بندوں کی توہین پر آمادہ کر دیتی۔

ابن کمال رحمہ اللہ چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے افتاء کے عہدے پر فائز تھے اس لئے ان کے پاس کتب فتاویٰ کی طرف مراجعت اور زیادہ مطالعہ کرنے کے لئے وقت کی کمی تھی کیونکہ اسی کثرت مطالعہ سے تو ان کی ضرورت حاصل ہوتی اور ان کو مشقت سے چھٹکارا ملتا لیکن ان کی نگاہ بھی بس اسی پر جا کر ٹھہر گئی جو اس ماوراء النہر کے لوگوں نے اپنے القاب کی بلندی اور دیگر حضرات کے رتبے کو کم کرنے کی عادت کے طور پر اپنائی ہوئی تھی اور وہ انہی کی طرف لپک پڑے۔

۱۲۰ج

حضرت دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

"اس عبد ضعیف عفا اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اگر ہم ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تقسیم کو افراد کی تقسیم کے بجائے کاموں اور ذمہ داریوں کی تقسیم مان لیں جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں تو وہ اشکال دور ہو جائے گا جو علامہ لکھنوی رحمہ اللہ اور علامہ مرجانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

وہ اس طرح کہ امام قدوری رحمہ اللہ اور صاحب ھدایہ رحمہ اللہ کا اصحاب الترجیح میں سے ہونا اس بات

کے خلاف نہیں کہ یہ دونوں حضرات مجتہدین فی المسائل میں سے بھی ہوں اور ان دونوں حضرات کو اصحاب الترجیح میں سے شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی کتابوں میں کچھ روایات مذہب کی دیگر روایات پر ترجیح بکثرت ملتی ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دونوں آئمہ مسائل میں اجتہاد کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتے تھے"۔ واللہ سبحانہ اعلم

ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ کی تقسیم پر چوتھا اعتراض

الملاحظة الرابعة

ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ نے ساتواں طبقہ جو بیان فرمایا ہے تو اس سے مراد ان کی ایسی کتابوں کے مؤلفین ہیں جن پر فتویٰ میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جیسے قنیہ اور قہستانی (ت ۹۷) وغیرہ دیگر کتابیں جن کی تفصیل عنقریب ان شاء اللہ آئے گی۔ اس لئے ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جو شخص ان کی پیروی کرے تو وہ مکمل تباہی سے دوچار ہوجائے گا۔ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کردہ سات طبقات میں سے تیسرا، چوتھا اور پانچواں طبقہ (یعنی مجتہدین فی المسائل، اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح) یہ معنیٰ کے اعتبار سے مجتہدین فی المذہب میں داخل ہیں، پھر ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان حضرات کے علاوہ دیگر فقہاء صرف احکام نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، ان حضرات نے ہمارے سامنے اپنے استنباط کردہ مسائل بیان کئے ہیں جن کے بارے میں متقدمین سے کوئی صراحت منقول نہیں، تو ہم پر انہی کی پیروی کرنا لازم ہے۔ یہی حال ان حضرات کی ترجیحات کا ہے اگرچہ وہ امام صاحب کے قول کے علاوہ (کسی اور قول کو) ہی کو ترجیح دیں...... کیونکہ ان حضرات نے کسی بھی مسئلہ کو ترجیح صرف اندازہ اور اٹکل سے نہیں دی بلکہ مسائل کے مآخذ پر مطلع ہونے کے بعد ترجیح دی ہے، جیسا کہ ان حضرات کی کتابیں اس پر گواہ ہیں۔ برخلاف اس بات کے جو البحر الرائق میں ہے"۔ (ح ۱۳۷)

(از حاشیہ:

ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے البحر الرائق میں یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ مشائخ کی ترجیحات پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا، جب وہ

امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کے خلاف ہوں۔اور فتویٰ ہمیشہ امام صاحب رحمہ اللہ کے قول پر ہی دیا جائے گا۔

(البحر الرائق کتاب القضاء)

فقہاء شافعیہ کے طبقات

طبقات الفقهاء الشافعية

جیسے حنفیہ نے اپنے فقہاء کے سات مذکورہ طبقات بیان کئے ہیں اسی طرح شافعیہ نے بھی اپنے فقہاء کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا ہے۔جن کی تفصیل حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے:

(۱) پہلا طبقہ

یہ مجتهد مطلق مستقل کا طبقہ ہے۔ابن الصلاح رحمہ اللہ نے ان کی تعریف اپنے ان الفاظ سے کی ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو بغیر کسی کے تقلید کئے اور بغیر کسی کے مذہب کے پابند ہوئے مستقل طور پر شرعی دلائل سے شرعی احکام حاصل کرتا ہے۔انہوں نے ''مستقل'' کے الفاظ اس لئے کہے کہ اس سے مجتہد منتسب سے احتراز ہو جائے۔

(۲) دوسرا طبقہ

مجتهد مطلق منتسب یہ وہ ہی ہے جن کا بیان پہلے امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب **المجموع شرح المهذب** کی عبارت میں ابو اسحاق اسفرائینی رحمہ اللہ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔یعنی یہ وہ فقیہ ہیں جو امام شافعی رحمہ اللہ کے طرز اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا اجتہاد امام شافعی رحمہ اللہ کے اجتہاد کے موافق رہتا ہے۔اس لئے ان کو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔اس نسبت کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید کی ہوتی ہے۔

اسی طبقہ میں امام مزنی رحمہ اللہ ،امام ابوثور رحمہ اللہ (ت ۸۰) ،اور امام ابن المنذر رحمہ اللہ (ت ۸۱) جیسے حضرات شامل ہیں،جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے **المجموع شرح المهذب** کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

لیکن ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں یہ کہتا ہوں کہ ان حضرات سے تقلید کی بالکل نفی کرنے کا دعویٰ درست نہیں ہوسکتا' سوائے

اس کے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان حضرات نے اجتہاد مطلق کے تمام علوم کا احاطہ کر لیا تھا اور مجتہد مستقل کے مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے۔ مگر یہ بات ان تمام حضرات یا ان میں سے اکثر حضرات کے حالات کے مناسب نہیں ہے"۔

شاید بعض مسائل میں اس جیسی تقلید' اُن کے مجتہد مطلق ہونے کے منافی بھی نہیں ہے' جیسا کہ ہم ابن قیم رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ بات پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

(گزشتہ باب "مناهج الفتویٰ فی السلف" کی بالکل آخری سطور دیکھیں)

ابن الصلاح رحمہ اللہ اس طبقہ کے بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اس حالت میں مجتہد منتسب کا فتویٰ بھی مجتہد مستقل مطلق کے حکم میں ہے۔ اس پر عمل بھی کیا جائے گا اور اجماع اور اختلاف کی بابت اس کا لحاظ بھی کیا جائے گا"۔

(۳) تیسرا طبقہ

مجتهد مقيد "یہ وہ شخص ہے جو اپنے امام کے مذہب کو مستقل طور پر دلائل سے ثابت کرتا ہے' لیکن اپنے دلائل میں اپنے امام کے اصول وقواعد سے تجاوز نہیں کرتا"۔

ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس مجتہد کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فقہ کا عالم، اصول فقہ سے باخبر، اور دلائل احکام کو تفصیل سے جانتا ہے۔ قیاس اور معانی کے طریقوں کی بصیرت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ تخریج اور استنباط مسائل میں خوب مشقت اٹھاتا ہے اور اس کے امام کے مذہب کے جو غیر منصوص مسائل ہیں ان کو امام کے مذہب کے اصول وقواعد کے ساتھ ملحق کرنے میں نگران کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور یہ تقلید کی ملاوٹ سے خالی نہیں ہوتا کیوں کہ مجتہد مستقل کے مقابلہ میں بعض علوم اور ذرائع میں (اس کا درجہ) کم ہوتا ہے، مثلاً علم حدیث، یا لغتِ عرب، میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر اجتہاد مقیّد والوں میں انہی دونوں علوم میں کچھ کوتاہی پائی جاتی ہے۔

یہ مجتہد مقید اپنے امام کی نصوص کو اصول بنا کر اس سے ویسے ہی مسائل مستنبط کرتا ہے جیسے مجتہد مستقل، نصوصِ شارع سے مسائل کا استنباط کرتا ہے۔ کبھی اس کے سامنے ایسا حکم بھی آتا ہے جس

کی دلیل اس کے امام پہلے ہی بیان کر چکے ہیں تو یہ اسی پر اکتفاء کرتا ہے اور اس بحث میں نہیں پڑتا کہ اس دلیل کے معارض کوئی اور دلیل ہے یا نہیں۔ اور نہ ہی یہ حکم کی شرائط میں ایسے مکمل طور پر غور وفکر کرتا ہے جیسے مجتہد مستقل کا کام ہے۔ مذہب میں اصحاب وجوہ وطرق (اس کا مطلب آگے آرہا ہے) اسی حالت پر ہوتے ہیں اور ہمارے تمام آئمہ یا اکثر وبیشتر انہی صفات کے حامل تھے"۔

ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اس قسم کے بارے میں مزید بھی چند اہم فوائد بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجتہد مقید کسی خاص فقہی مسئلہ یا کسی خاص فقہی باب میں مستقل طور پر اجتہاد کرتا ہے اور فتویٰ دیتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلی قسم میں گزر چکا ہے۔

(۲) مجتہد مقید جیسے حضرات کے کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امام کے مذہب پر مزید مسائل کی تخریج کرتے ہیں۔

تخریج کے دو معنیٰ ہیں

(الف) کہ کسی مسئلہ میں ان کے امام کی طرف سے نص ہی نہ ہو تو وہ مجتہد مقید اس مسئلہ کا حکم امام کے اصول کے مطابق اس طرح بیان کریں گے کہ ان کو کوئی دلیل اسی قسم کی مل جائے جس طرح کی دلیل سے ان کے امام نے دلیل پیش کی ہے۔ اور یہ نئی دلیل امام کی شرط کے موافق ہو تو وہ اسی دلیل کے تقاضا کے مطابق فتویٰ دیں گے۔ ایسی حالت میں کبھی ایک مجتہد مقید کی تخریج دیگر ان کے ساتھیوں کی تخریج کے مخالف بھی ہوسکتی ہے۔ اور ایسی صورت میں دونوں تخریجوں میں سے ہر ایک کو "وجه" کہتے ہیں۔ یہ فقہ شافعی کی اصطلاح ہے اور یہ حضرات **اصحاب الوجوہ** ہیں۔

(ب) تخریج کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ امام سے دو مختلف صورتوں میں دو مختلف نصوص منقول ہیں اور ان دونوں سے نئی صورت مطلوبہ کے حکم کی تخریج ممکن ہے، تو یہ مجتہد مقید ان دونوں نصوص میں سے کسی ایک کو اسی کی اساس پر تخریج حکم کے لئے اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے قول کو "مخرَّج" کہا جاتا ہے۔

ذکر کردہ تخریج جو دو نصوص میں اختلاف کے وقت ہوتی ہے' اس کی شرط یہ ہے کہ دونوں مسئلوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہو اور ایسی صورت میں کسی مشترکہ علت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مندرجہ ذیل ارشاد میں' جو غلام کے لئے بیان ہوا ہے باندی کو بھی اسی میں شامل کر دیا جائے:

"من اعتق شركاً له في عبدٍ قوّم عليه"

''جو شخص کسی مشترکہ غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دے تو بقیہ کی آزادی کے لئے غلام کی قیمت لگا دی جائے گی (اور غلام اتنے پیسے کما کر دوسرے شریک کو ادا کرنے سے مکمل آزاد ہو جائے گا)''۔

جب تک دونوں مسئلوں کے درمیان فرق کرنا ممکن ہو تب تک اصح قول کے مطابق تخریج جائز نہیں ہے اور مجتہد مقید پر لازم ہے کہ وہ وجہ فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں نصوص کو اپنے ظاہر پر برقرار رکھیں۔ ایسی صورتوں میں تخریج کے بارے میں اکثر و بیشتر فقہاء میں اختلاف ہوتا ہے کیوں کہ دونوں مسئلوں کے درمیان فرق ممکن ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔

(۳) جب مجتہد مقید [illegible]امام سے غیر منصوص مسئلے میں گزشتہ فائدے میں بیان کردہ طریقہ کے مطابق مسئلے کی تخریج کر[illegible] اس پر فتوی دے دیں تو اب ان کے فتوی پر عمل کرنے والا اصل امام کا مقلد سمجھا جائے گا یا اسی مجتہد مقید کا مقلد؟

امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ اور ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اس رائے کو اختیار کیا ہے کہ وہ اپنے امام ہی کا مقلد سمجھا جائے گا کیونکہ اس قول کی بھی تخریج امام کے اصول پر ہوئی ہے۔ شیخ ابو اسحاق شیرازی رحمہ اللہ (ت، ۸۲) نے ان سے اختلاف کیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ ایسے مسئلے کو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔

(۴) چوتھا طبقہ

یہ ان حضرات کا ہے جو آئمہ مذہب میں سے اصحاب الوجوہ والطرق کے مرتبہ کو نہیں پہنچے لیکن خود فقیہ النفس ہوتے ہیں۔ اور اپنے امام کے مذہب کے حافظ، اپنے مذہب کے دلائل کے جاننے والے ہوتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ دلائل قائم کرتے ہیں اپنے مذہب کو دلائل سے مؤید کرتے ہیں، مسائل کی صورتیں بیان کرتے ہیں، اضافی باتوں کو حذف کرتے ہیں، تمہیدات قائم کرتے ہیں۔ مسائل کو ثابت کرتے ہیں، مختلف اقوال کا موازنہ کرتے ہیں، اور ان میں باہم ترجیح دیتے ہیں۔

لیکن یہ پہلے طبقہ والوں سے درجہ میں کم ہوتے ہیں (اور اس کی چار وجوہات ہو سکتی ہے)

(۱) یا تو یہ مذہب کے حفظ اور یادداشت میں ان حضرات تک نہیں پہنچ پاتے۔

(۲) یا اس وجہ سے کہ انہوں نے تخریج اور استنباط میں ان جیسی مشق نہیں کر رکھی ہوتی۔

(۳) یا اس وجہ سے کہ یہ علم اصول فقہ میں ماہر نہیں ہوتے۔مہارتِ تامہ نہ پائی جانے کے باوجود فقہ کے حفظ اور دلائل کی معرفت کے ضمن میں یہ حضرات قواعد اصول فقہ کے مختلف جوانب سے بالکل کورے بھی نہیں ہوتے۔

(۴) یا اس وجہ سے کہ یہ حضرات ان علوم میں کچھ پیچھے ہوتے ہیں جو اجتہاد کے لئے ضروری ہیں' جب کہ یہ اسبابِ اجتہاد اصحاب الوجوہ والطرق کو حاصل ہوتے۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر تک آنے والے اکثر متاخرین مصنفین کی یہی حالت تھی، جنہوں نے مذہب کو مرتب کیا، مذہب کو زوائد سے پاک کیا، اور ایسی کتابیں تصنیف کیں کہ آج کل لوگوں کی زیادہ مشغولیت انہی کے کتابوں میں ہے۔لیکن یہ حضرات وجوہ مسائل کی تخریج میں اور مذہب کے طریقوں کو واضح کرنے میں (گزشتہ طبقات والے حضرات جو) دوسری حالت والے ہیں' اُن تک نہیں پہنچ پائے۔

باقی رہی ان کے فتاویٰ کی بات تو یہ حضرات بھی اپنے فتاویٰ میں اپنے سے پہلے حضرات کی تفصیل کی طرح خوب وضاحت کرتے ہیں یا کم از کم ان کے قریب قریب توضیح کردیتے ہیں، اور یہ حضرات بھی طے شدہ مسائل پر قیاس کرتے ہیں اور اس سلسلے میں یہ صرف قیاسِ جلی اور قیاس لافارق (جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے) پر اکتفاء نہیں کرتے (قیاس لافارق کی مثالیں یہ ہیں) جیسے باندی کو غلام پر اس صورت میں قیاس کرنا جب کوئی ایک شریک اس کو آزاد کردے اور مرد کو عورت پر اس مسئلے میں قیاس کرنا کہ جب مشتری سے ثمن کی وصولی ناممکن ہوجائے تو بائع اپنے مال کے علاوہ سے بھی اپنا حق وصول کرسکتا ہے۔

ان طبقے والے حضرات میں وہ بھی ہیں جن کے فتاویٰ جمع کئے گئے اور الگ سے مرتب کئے گئے' لیکن مذہب کے ساتھ مل جانے اور مذہب میں معتبر ہونے میں ان کے فتاویٰ اصحاب الوجوہ کے فتاویٰ کے مرتبہ تک نہیں پہنچتے اور نہ ہی ان کے فتاویٰ میں اس درجہ کی قوت ہوتی ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

(۵) پانچواں طبقہ

یہ وہ حضرات ہیں جو واضح مسائل اور مشکل مسائل میں حفظِ مذہب، نقلِ مذہب، اور فہمِ مذہب کا کام سرانجام دیتے ہیں البتہ ان کی شخصیت میں دلائل قائم کرنے اور قیاس کو ضبط کرنے میں کچھ کمی ہوتی ہے۔یہ حضرات جب اپنے امام کی منصوص شدہ مسائل یا اپنے مذہب کے آئمہ مجتہدین کی تفریعات اور تخریجات میں سے اپنے مذہب کے تحریر شدہ مسائل نقل کرتے ہیں تو ان کی نقل اور فتویٰ پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

باقی رہے وہ مسائل جن کو وہ مذہب میں منقول نہیں پاتے تو اگر وہ ان کے ہم معنیٰ کوئی مسئلہ منقول مسائل میں پالیتے ہیں اس طرح کہ بغیر کسی اضافی فکر اور تامل کے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں (ایک غیر منقول مسئلہ اور دوسرا منقول مسئلہ) کوئی وجہ فرق نہیں ہے جیسے باندی بنسبتِ غلام کے کہ جس پر شریک کی طرف سے آزادی کرنے کے مسئلے میں واضح نص آئی ہے تو ایسی صورتوں میں اس طبقے والے کے لئے غیر منقول شدہ کو منقول شدہ مسائل کے ساتھ ملحق کرنا اور اس کے بارے میں فتویٰ دینا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح (ان کے لئے اُس وقت بھی فتویٰ دینا جائز ہوتا ہے) جب اس غیر منقول شدہ مسئلے کا کسی ایسے ''ضابطے'' میں شامل ہونا انہیں معلوم ہوجائے جو ضابطہ مذہب میں منقول بھی ہے اور اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اور جو مسائل ایسے نہ ہوں تو اس طبقہ والے پر لازم ہے کہ وہ ان کے بارے میں فتویٰ دینے سے رُک جائے۔

لیکن ایسا ہونا فقیہ مذکور (پانچویں طبقے والے فقیہ) کے لئے بہت نادر ہے۔ کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا پیش آئے کہ نہ تو مذہب میں صراحتاً اس کا حکم بیان ہوا ہو اور نہ ہی وہ مذہب کے منصوص شدہ مسائل کے معنی میں بغیر کسی فرق کے شامل ہوسکے اور نہ ہی مذہب میں تحریر شدہ ضابطوں میں سے کسی کے تحت وہ مسئلہ درج ہوسکے۔ جیسا کہ امام ابو المعالی الجوینی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

اس طبقے والے فقہاء صرف فقیہ النفس ہی ہوسکتے ہیں کیونکہ مسائل کا درست طریقہ پر تصور کرنا اور ان کی صورتِ مسئلہ بیان کرنے کے بعد ان کے احکام کو نقل کرنا، جو کچھ واضح ہوتے ہیں اور کچھ پوشیدہ، یہ کام صرف ایسا فقیہ النفس ہی کرسکتا ہے جسے فقہ میں بڑا حصہ نصیب ہوا ہو۔ میں کہتا ہوں (یعنی ابن الصلاح رحمہ اللہ) کہ مناسب یہ ہے کہ اس طبقہ والوں میں اور اس سے پہلے طبقے والوں میں جس حفظِ مذہب کا ذکر گزرا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کا بڑا حصہ تو فقیہ النفس کے تجربہ اور مہارت کی وجہ سے اس کے ذہن میں ہو اور باقی مذہب اور وہ مسائل جو مذہب سے قریبی طور پر جُڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو مطالعہ کے ذریعہ وہ جاننے کی قدرت رکھتا ہو۔

پھر ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ مفتیان کرام کی پانچ قسمیں اور ان کی شرائط ہیں اور ان قسموں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس میں حفظِ مذہب اور فقیہ نفس (جس کی وضاحت ابھی گزری ہے) کی شرط نہ ہو اور یہ شرائط مفتیوں کی آخری قسم کے علاوہ کیلئے ہیں، جو سب سے کم تر درجہ ہے ...... پس جو شخص منصب افتاء

پر فائز ہو اور فتویٰ دینے کے در پے ہو اور فقہاء کی ان پانچوں اقسام میں سے کسی کی حالت پر بھی وہ نہ ہو تو وہ بڑے معاملے کو لے کر لوٹے گا۔ (یعنی سخت وبال کا مستحق ہوگا)''۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (المطففين ۴،۵)

(کیا یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ انہیں ایک بڑے زبردست دن میں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟)۔

اور جو شخص صرف اس گمان سے کہ وہ اہل فتویٰ میں سے ہے' فتویٰ دینے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ اس بارے میں اپنے نفس کو متہم سمجھے (یعنی اپنے اوپر اعتماد نہ کرے) اور اللہ جو اس کا رب تبارک وتعالیٰ ہے اس سے ڈرے اور صرف اپنی ذات سے سرٹیفیکیٹ لے لینے اور اس پر نظر کر لینے سے ہرگز دھوکہ نہ کھائے۔

امام ابو المعالی رحمہ اللہ وغیرہ نے قطعی طور پر یہ قرار دیا ہے کہ ایسا شخص جو اصولی ہو' خوب ماہر ہو اور فقہ میں تصرف (تفریعات) کر سکتا ہو اس کے لئے بھی صرف اتنی صلاحیت سے فتویٰ دینا جائز نہیں اور اگر خود اس کے ذاتی معاملات میں بھی کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ دیگر حضرات سے استفتاء کرے اور اسی حکم میں وہ بھی ملحق ہے جو فقہ میں تصرف کرنے والے، بڑے غور وفکر کرنے والے، اور فقہ میں بحثیں کرنے والے آئمہ اختلاف اور بڑے مناظرین ہیں تو ان کا بھی وہی حکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے حکم کو مستقل طور پر سمجھنے کے اہل نہیں ہیں کیونکہ ان میں صلاحیتِ اجتہاد کی کمی ہے اور نہ ہی وہ اس واقعہ کے حکم کو کسی پہلے امام کے مذہب سے سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہ مذہب کے حافظ بھی نہیں ہیں اور نہ ہی ان کو معتبر طریقہ سے مذہب کی اطلاع ہے۔ واللہ اعلم

ح ۱۴۷

یہ طبقاتِ حنفیہ جو ابن کمال پاشا رحمہ اللہ نے ذکر فرمائے اور وہ طبقات شافعیہ جو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے ذکر فرمائے ہیں یہ مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ میں نے ان کے ہاں ان ناموں کی تصریح نہیں پائی۔

(حضرت مصنف دامت برکاتہم حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس کی تفصیل کے لئے امام حطاب رحمہ اللہ کی باب القضاء میں وہ عبارت دیکھیں جس میں انہوں نے مفتی کی تین قسمیں بیان کی ہے جو درحقیقت مجتہد مطلق، مجتہدِ مقید، اور مجتہدِ منتسب کی طرف ہی لوٹتی ہیں۔ اسی طرح "مقدمة الانصاف للمرداوی رحمہ اللہ" میں بھی ان جیسی اقسام کی راہنمائی ملتی ہے'')۔

طبقات مسائل حنفیہ

طبقات المسائل الحنفية

یادرکھیں کہ حنفیہ نے جیسے فقہاء کومختلف طبقات پر تقسیم کیا ہے اسی طرح انہوں سے مسائل کو بھی مختلف درجات میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ تعارض کے وقت مفتی اعلیٰ درجہ کے مسائل کو اختیار کرے اور راجح قول پر مرجوح قول کو ترجیح دینے کی غلطی نہ کرے۔

''علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے شرح عقود رسم المفتي اور شرح مقدمة الدر المختار میں ذکر فرمایا ہے کہ ہمارے آئمہ حنفیہ کے مسائل کے تین طبقات ہیں:

(۱) مسائل الاصول

ان کا نام ظاہر الروایۃ بھی ہے اور یہ مسائل آئمہ مذہب یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ، اور امام محمد رحمہ اللہ سے منقول ہیں۔

ان حضرات کو علماء ثلاثہ بھی کہا جاتا ہے، امام زفر رحمہ اللہ اور حسن بن زیاد رحمہ اللہ (ت، ۸۳) اور دیگر وہ تمام حضرات جنہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے فقہ حاصل کی وہ بھی ان میں شامل ہیں۔

لیکن عام طور پر ظاہر الروایۃ کہتے وقت یہی ہوتا ہے کہ وہ آئمہ ثلاثہ کا یا ان میں سے بعض کا قول ہے۔ یہ مسائل جنہیں ظاہر الروایۃ اور اصول کا نام دیا گیا ہے، یہ وہ ہیں جو امام محمد رحمہ اللہ کی مندرجہ ذیل کتابوں میں موجود ہیں۔ المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، السیر الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الکبیر، ان کتابوں کو ظاہر الروایۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ امام محمد رحمہ اللہ سے ثقہ راویوں کے واسطے سے بدرجہ تواتر یا بدرجہ شہرت منقول ہیں (یعنی یہ من قبیل اضافة الصفة الی الموصوف ہیں اصل عبارت یہ تھی، ''الروايات التي ظهرت وانتشرت عن الامام محمد رحمہ اللہ'')۔

(۲) مسائل النوادر

یہ وہ مسائل ہیں جو انہی مذکورہ آئمہ سے منقول ہیں لیکن یہ سابقہ کتابوں میں موجود نہیں بلکہ یا تو یہ مسائل امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر کتابوں میں ہیں جیسے کیسانیات، ھارونیات، جرجانیات، اور رقیات ان کتابوں کو غیر ظاہر الروایۃ کہا گیا ہے کیونکہ یہ کتابیں پہلی چھ کتابوں کی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے واضح، ثابت اور صحیح روایات کے ساتھ مروی نہیں ہیں۔

اسی طرح یہ مسائل امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر حضرات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ جیسے حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب " المجرد "، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب " الامالی "، اسی طرح یہ مسائل بعض الگ الگ روایات سے بھی مروی ہیں جیسے ابن سماعہ (ت ۸۴) اور معلیٰ بن منصور (ت ۸۵) وغیرہما رحمہما اللہ کی بعض متعین مسائل میں روایات۔

(۳) الفتویٰ والواقعات

یہ وہ مسائل ہیں جنہیں متاخرین مجتہدین نے اس وقت اصول سے مستنبط کیا جب ان سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا اور آئمہ مذہب متقدمین سے ان مسائل کے بارے میں انہیں کوئی روایت نہیں ملی۔

اب ہم آنے والی سطور میں وہ معلومات ذکر کرتے ہیں، جو ان تینوں طبقات میں سے ہر طبقے کے بارے میں جاننا مناسب ہے۔

مسائل اصول یا ظاہر الروایۃ

مسائل الاصول او ظاهر الرواية

اکثر فقہاء حنفیہ کے نزدیک مسائل اصول اور ظاہر الروایۃ ایک ہی معنی کی دو تعبیریں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ نے شرح ہدایہ میں ذکر کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے اور ان کے کلام سے جو فرق ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسائل اصول وہ ہیں جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ چھ کتابوں میں آئے ہیں۔ جب کہ ظاہر الروایۃ وہ ہے جو آئمہ مذہب سے صحیح روایت سے ثابت ہے اور بعد میں آنے والے مجتہدین نے اس پر فتویٰ بھی دیا ہے، خواہ وہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی اور کی روایت ہی ہو۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روایت نادرہ بھی کبھی (ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کے مطابق) ظاہر الروایۃ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی اس بات کی بنیاد مبسوطِ سرخسی رحمہ اللہ کی ایک عبارت پر رکھی ہے، جس میں حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی ایک روایت کو ذکر کر کے اسے ظاہر الروایۃ کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن ابن عابدین رحمہ اللہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کسی روایت کا امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہونا اس کے منافی تو نہیں کہ وہ امام محمد رحمہ اللہ کی چھ مذکورہ کتابوں میں بھی موجود ہو، یہ بالکل ممکن ہے کہ اس روایت کو (مبسوط سرخسی میں) ظاہر الروایۃ کا نام ان چھ کتابوں میں پائے جانے کی وجہ سے دیا گیا ہو۔ ح ۱۵

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی المبسوط

مبسوط الامام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ

امام محمد رحمہ اللہ کی مذکورہ چھ کتابوں میں سب سے پہلے لکھی جانے والی کتاب المبسوط ہے۔ اس کو الاصل بھی کہا جاتا ہے اس کو اصل یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ سب سے پہلے تصنیف کی گئی اور یا اس وجہ سے کہ یہ باقی سب کتب سے اہم، طویل ترین اور زیادہ مفصل ہے نیز یہ ظاہر الروایۃ کی دیگر کتابوں کے لئے بنیاد ہے۔

حاجی خلیفہ ''کشف الظنون'' میں لکھتے ہیں:

> ''امام محمد شیبانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۸۹ھ) کی کتاب مبسوط کو انہوں نے پہلے الگ الگ لکھا تھا۔ سب سے پہلے انہی میں سے نماز کے مسائل لکھے اور اس کا نام کتاب الصلاۃ رکھا۔ مسائلِ بیوع تالیف کئے تو ان کا نام کتاب البیوع رکھا۔ یہی صورت حال کتاب الأیمان اور کتاب الاکراہ کی ہے۔ پھر انہوں نے ان کتابوں کو جمع کیا تو المبسوط وجود میں آگئی اور جہاں کہیں کتب فقہ میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے، تو اس سے مراد یہی (المبسوط کے اجزاء) ہوتے ہیں''۔ ح ۱۶

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب فقہاء اپنی کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ امام محمد رحمہ اللہ نے مثلاً کتاب المضاربۃ یا کتاب الماذون میں یہ بات لکھی ہے تو ان کی مراد مبسوط ہی کی یہ کتابیں ہوتی ہیں۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے حسن بن داؤد رحمہ اللہ سے اپنی سند کے ساتھ یہ دلچسپ بات نقل کی ہے ''بصرہ والے چار کتابوں پر فخر کرتے ہیں:

''پہلی جاحظ کی البیان والتبیین، دوسری انہی کی کتاب الحیوان، تیسری امام سیبویہ کی الکتاب اور چوتھی امام خلیل نحوی کی العین اور ہم اہل کوفہ ان سب کے مقابلہ میں حلال وحرام کے ان ستائیس ہزار مسائل پر فخر کرتے ہیں' جو کوفہ کے ایک شخص نے جس کا نام محمد بن حسن رحمہ اللہ ہے (ایک کتاب میں جمع کئے ہیں) یہ ایسے قیاس اور عقلی دلائل پر مبنی مسائل ہیں کہ لوگوں (فقہاء) کے لئے ان سے جاہل رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔

اسی کی طرف امام مزنی رحمہ اللہ نے' جب ان سے امام محمد رحمہ اللہ کے بارے میں پوچھا گیا' تو اپنے اس جواب سے انہوں نے اشارہ کیا کہ ''اکثرھم تفریعاً'' (کہ وہ تمام فقہاء سے زیادہ تفریعات قائم کرنے والے ہیں)۔

(ح،۱۷)

شیخ محمد زاھد الکوثری رحمہ اللہ (ت،۸۶) فرماتے ہیں امام محمد رحمہ اللہ کی سب سے طویل کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ کتاب الاصل ہے جو المبسوط کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو حفظ کیا تھا اور انہوں نے اپنی کتاب الام اسی کے طرز پر لکھی ہے اور اہلِ کتاب میں سے ایک دانا شخص نے مبسوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے اسلام قبول کرلیا تھا۔

ھٰذا کتاب محمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الاکبر

(جب تمہارے چھوٹے محمد رحمہ اللہ کی کتاب کا یہ عالم ہے تو تمہارے بڑے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتاب کا کیا حال ہوگا) (ح،۱۸)

''یہ کتاب چھ جلدوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات کی ہے اس کتاب کو امام محمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے جیسے ابو سلیمان جوزجانی رحمہ اللہ (ت،۸۷) ، محمد بن سماعہ تمیمی رحمہ اللہ ، اور ابو حفص کبیر بخاری رحمہ اللہ (ت،۸۸) ''اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بہت مقبولیت سے نوازا ہے' یہ کتاب بہت سے فروعی مسائل پر مشتمل ہے' حرام وحلال کے ان مسائل کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں کہ لوگوں (علماء) کے لئے ان سے ناواقف رہنے کی

گنجائش نہیں ہے۔ یہی کتاب ہے جس پر ابوالحسن بن داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اہل بصرہ کے مقابلے میں فخر کیا تھا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اس کتاب میں طریقہ کار یہ ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فروعات ذکر کرنے کے ساتھ ان مسائل میں اپنی رائے کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان مسائل پر دلالت کرنے والی ایسی احادیث جو اُن کے طبقے میں سے جمہورِ فقہاء کی پہنچ میں ہوں وہ ذکر نہیں کرتے۔ وہ احادیث کو صرف ان مسائل میں ذکر کرتے ہیں' جہاں بسا اوقات عام فقہاء کے علم میں دلائل غائب رہتے ہیں۔ اگر اس ضخیم کتاب سے آثار کو الگ کر کے جمع کیا جائے تو وہ ایک مختصر سی جلد میں آ جائیں گے''۔ ح ۱۹

اس کتاب کا مشہور نسخہ ابوسلیمان جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔

''اس کے بہت سے مسائل امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سوالات کے جوابات کے طور پر بیان کئے اور بہت سے مسائل از خود بھی بیان فرمائے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں آئمہ حنفیہ کے مذہب کو بیان کرنے کا طریقہ کار ذکر کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''میں تمہارے سامنے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور اپنا قول واضح کر کے بیان کر دوں گا اور جس مسئلے میں اختلاف بیان نہیں کروں گا' وہ ہم سب کا متفقہ قول ہو گا''۔

اس کتاب کو علامہ ابوالوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ، اور ڈاکٹر مجید الخذوری حفظہ اللہ نے مختلف نسخوں سے تحقیق کے بعد شائع کیا ہے اور یہ بار ہا طبع ہو چکی ہے لیکن اس کا شائع شدہ حصہ مکمل کتاب نہیں' بلکہ وہ صرف اس کی سولہ (۱۶) کتابوں پر مشتمل ہے' جب کہ یہ کتاب یعنی کتاب الاصل ترپن (۵۳) کتابوں پر مشتمل تھی' جیسا کہ ابن ندیم نے الفہرست میں ذکر کیا ہے۔

فقہاءِ حنفیہ میں بہت سے حضرات نے اس کتاب کی شرح لکھی ہے' جن میں سے شیخ الاسلام ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ ت ۸۹ جو خواہرزادہ کے نام سے مشہور ہیں' ان کی شرح کا نام مبسوط الکبری ہے۔ اسی طرح شمس الآئمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۴۴۸ یا ۴۴۹ھ) ح ۲۰ جہاں کہیں ''خلاصہ'' میں نسخہ شیخ الاسلام وغیرہ کا لفظ آئے تو اس سے مراد ان حضرات کی لکھی ہوئی مبسوط کی شروحات ہوتی ہیں۔ ح ۲۱

الجامع الصغیر

الجامع الصغیر

بظاہر امام محمد رحمہ اللہ نے المبسوط کے بعد جو کتاب لکھی وہ الجامع الصغیر ہے۔ علامہ عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس کتاب کی شرح کے مقدمہ میں شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کی ہے:

''اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ ہے کہ جب امام محمد رحمہ اللہ دیگر کتابوں کی تالیف سے فارغ ہوئے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ان سے یہ فرمائش کی کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے جتنے مسائل ان کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کئے ہیں اور ان کو یاد ہیں وہ سب جمع کر دیں۔ انہوں نے یہ مسائل جمع کر کے یہ کتاب امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے سامنے پیش کی تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے (ان کی تحسین کرتے ہوئے) فرمایا کہ انہوں نے مسائل کو خوب یاد رکھا لیکن تین مسائل میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ اس پر امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی نہیں ہوئی ہے لیکن آپ اپنی روایت کو بھول گئے ہیں''۔

> ایک روایت کے مطابق یہ چھ مسائل تھے جن کا تفصیلی ذکر بندہ نے ''تشریحات نمبر (۱۳)'' میں کر دیا ہے۔

علی القمی الحنفی (ت ۹۰) کہتے ہیں:

''امام ابو یوسف رحمہ اللہ اپنی جلالت شان کے باوجود سفر وحضر میں کبھی اس کتاب کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے''۔

علی رازی رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

''جو شخص یہ کتاب سمجھ گیا تو وہ ہمارے علماء میں سب سے زیادہ فہم رکھنے والا ہوگا اور جس نے یہ کتاب یاد کر لی تو وہ ہمارے علماء میں سب سے زیادہ یادداشت والا ہوگا۔ ہمارے مشائخ متقدمین تو کسی کو عہدہ قضاء اس وقت تک نہیں سونپتے تھے جب تک اس کتاب کا امتحان اس سے نہ لے لیتے۔ اگر اس کو یہ کتاب یاد ہوتی تو وہ اس کو عہدہ قضاء سونپ دیتے ورنہ اس کو حکم دیتے کہ

تم یہ کتاب یاد کرلو"۔

ہمارے شیخ "الحلوائی رحمۃ اللہ علیہ" فرمایا کرتے تھے کہ الجامع الصغیر کے زیادہ تر مسائل المبسوط میں مذکور ہیں۔

اس لیے کہ درحقیقت اس کتاب کے مسائل کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ مسائل جن کی روایت اس کتاب کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی۔

(۲) وہ مسائل جن کا ذکر دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے لیکن وہاں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ مسئلہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے یا کسی اور کے قول کے جب کہ یہاں الجامع الصغیر میں اس باب کی ہر فصل کے ہر مسئلے میں تصریح ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ان میں سے کونسا ہے۔

(۳) وہ مسائل (جو دیگر کتابوں میں موجود ہیں لیکن) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو یہاں دوبارہ الگ الفاظ سے بیان کیا ہے اور الفاظ کے بدلنے سے ایسا فائدہ حاصل ہوگیا جو پہلی کتابوں میں ذکر کردہ الفاظ سے حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

ان کی مراد ۳رتیسری قسم سے وہ مسائل ہیں جنہیں فقیہ ابوجعفر ہندوانی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۹۱) نے اپنی تصنیف کردہ کتاب "کشف الغوامض" میں ذکر کیا ہے۔

پھر علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصغیر کی شرح میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ الجامع الصغیر کا مصنف کون ہے؟ بعض حضرات نے تو اس کو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی (مشترکہ) تالیف کہا ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے"۔

"کیوں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جب المبسوط کی تالیف سے فارغ ہوئے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں جس میں ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مسائل روایت کریں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کی تصنیف تو کی مگر ترتیب نہیں دی اور ابوعبداللہ حسن بن احمد زعفرانی الفقیہ الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (ت، ۹۲) نے اس کتاب کو مرتب کیا"۔

فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح میں فرمایا ہے:

"امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کی روایت سے ایک کتاب لکھیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھی اور اس کی سند امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تک بیان

کی۔ پھر جب انہوں نے یہ کتاب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کی تحسین کی اور فرمایا ابو عبداللہ (امام محمد رحمۃ اللہ علیہ) نے خوب یاد رکھا لیکن چند مسائل کے روایت کرنے میں ان سے غلطی ہوگئی ہے۔ جب یہ بات امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو خوب یاد ہے لیکن ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ خود ہی بھول گئے ہیں اور وہ چھ مسائل ہیں (ح،۲۲) ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر اعتماد کیا ہے"۔

ہدایہ کی شرح **غایۃ البیان** جو امیر کاتب اتقانی رحمۃ اللہ علیہ (ت،۹۳) کی تصنیف ہے اس کے **باب الاذان** میں ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے **الجامع الصغیر** میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ان کی کنیت سے نہیں بلکہ نام (یعقوب) سے کیا ہے تاکہ شیخین (ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ) کے درمیان تعظیم میں برابری کا وہم نہ ہو کیونکہ کنیت تعظیم کے لئے ہوتی ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو خود امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ جہاں وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کریں، وہاں ان کا صرف نام ذکر کریں۔ اسی بنیاد پر ہمارے مشائخ بخارا نے فرمایا ہے کہ یہ بھی ادب میں شامل ہے کہ بعض طلبہ دیگر طلبہ کو اپنے استاد کی موجودگی میں مولانا کے لفظ سے نہ پکاریں تاکہ استاد اور شاگرد کے درمیان تعظیم میں برابری سے بچا جا سکے"۔

اسی کتاب میں ہے:

"مبسوط کا نام اصل اس لئے رکھا گیا کیوں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سب سے پہلے تصنیف کیا تھا۔ پھر انہوں نے **الجامع الصغیر**، پھر **الجامع الکبیر**، اور پھر **زیادات** کی تصنیف کی۔ **السیر الکبیر** کی جو شرح شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تصنیف **السیر الکبیر** تھی۔ اور اس سے پہلے انہوں نے **السیر الصغیر** تصنیف فرمائی تھی"۔ (ح،۲۳)

فقہاء حنفیہ کی طرف سے اس کتاب کی مختلف جہات میں خدمت کی گئی، شروحات لکھی گئیں، حواشی تحریر کئے گئے اور اس کی تلخیص کی گئی۔ اس کی مشہور ترین شروحات یہ ہیں:

۱) شرح الامام ابی جعفر الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۲۱ھ)

۲) شرح الامام ابی بکر الجصاص الرازی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۷۰ھ)

۳) شرح الامام ابی عمر الطبری رحمۃ اللہ علیہ (ت،۹۴) (المتوفی ۳۴۰ھ)

۴)شرح الظہیر البلخی رحمہ اللہ ت۹۵ (المتوفی ۵۵۳ھ)

۵)شرح قاضی خان رحمہ اللہ (المتوفی ۵۹۲ھ)

۶)شرح صدرالشہید رحمہ اللہ ت۹۶ (۵۳۶ھ شہید ہوئے ہیں)

۷)شرح ابی نصر العتابی رحمہ اللہ ت۹۷ (المتوفی ۵۸۰)

۸)شرح فقیہ ابی اللیث السمر قندی رحمہ اللہ ت۹۸ (المتوفی ۳۷۳ھ)

۹)شرح فخر الاسلام البزدوی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۸۲ھ)

۱۰)شرح قاضی الاسبیجابی رحمہ اللہ ت۹۹ (المتوفی ۴۸۰ھ)

۱۱)شرح ابی جعفر الھندوانی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۶۲ھ)

۱۲)شرح ابی الحسن الکرخی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۴۰ھ)

علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے الجامع الصغیر پر اپنی شرح کے مقدمہ میں اس کی تمام معلوم شروحات کو شارحین کے حالات کے ساتھ ذکر کر دیا ہے (جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً)

الجامع الکبیر

الجامع الکبیر

بظاہر امام محمد رحمہ اللہ نے الجامع الکبیر کو الجامع الصغیر کے بعد تالیف فرمایا ہے۔ یہ ایسی عجیب اور دقیق کتاب ہے کہ بڑے بڑے علماء اس کی دقت اور اس میں لکھی گئیں بہت زیادہ تفریعات کی وجہ سے حیرت زدہ رہ گئے ہیں۔

علامہ اکمل الدین بابرتی رحمہ اللہ ت۱۰۰ فرماتے ہیں:

''یہ کتاب واقعی اپنے نام کی طرح تمام اہم اور بڑے مسائل فقہ کی بہت زیادہ جامع ہے۔ یہ کتاب اہم روایات اور مستحکم عقلی اصولوں پر مشتمل ہے گویا کہ یہ دوسروں کو عاجز کر دینے والی ہے اور فقہ کی تمام باریک باتوں کو پورا پورا بیان کرنے والی ہے۔ جو بھی اس کی وادی میں اُترا اس نے اپنی پوری عمر کھپا دینے کے بعد اسی بات کی گواہی دی ہے اور اس سے دور رہنے والا ممکن نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے

کچھ بھی حاصل کر پائے۔اسی لئے تو محققین نے اپنی توجہ ہمیشہ اس کی تحقیق کی طرف مبذول رکھی ہے اور محققین میں اس کے لفظی حل اور تطبیق مسائل کی طرف توجہ کی شدید رغبت رہی ہے۔محققین نے اس کی بہت سے شروحات لکھیں اور اس کو بہت واضح اور خوب تشریح شدہ کتاب بنادیا ہے''۔ ح ۲۴

امام محمد بن شجاع ثلجی رحمہ اللہ ت ۱۰۱ فرماتے ہیں:

''زمانہ اسلام میں کوئی بھی کتاب، فقہ میں امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی الجامع الکبیر کے مثل نہیں لکھی گئی اور پھر فرماتے ہیں کہ امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی حالت الجامع الکبیر میں ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص گھر بنائے، اُس گھر کی جتنی بھی منزلیں اوپر بناتا جائے تو ساتھ ہی ایک سیڑھی بھی بناتا جائے جس سے وہ گھر کی اُوپر والی منزل پر پہنچ جائے۔یہاں تک کہ وہ گھر کو اسی طرح مکمل تعمیر کرلے، تو پھر خود اس سے نیچے اُتر آئے اور ساری سیڑھیاں توڑ دے اور اب لوگوں کو کہے کہ تم جیسے اس گھر پر چڑھ سکتے ہو چڑھ جاؤ''۔

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے امام ثلجی رحمہ اللہ کی بات کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حق بات یہ ہے کہ یہ کتاب جدت طرازی میں ایک نمایاں نشانی کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ یہ قواعد لغت اور اصولِ حساب پر تفریعات میں انتہائی باریک باتوں پر مشتمل ہے۔پھر ساتھ ہی یہ کتاب شریعت مبارکہ کے دقیق اصولوں کے استعمال پر بھی مشتمل ہے۔

غالباً امام محمد رحمہ اللہ نے اس کو اسی لئے تالیف کیا تھا کہ یہ خوب متاثر کن ہو اور اس کے ذریعہ فقہاء کی تفریعات کے طریقوں میں خوب سمجھداری اور بیدار ذہنی لوگوں کو معلوم ہو جائے۔جب تک اس کتاب کی شرح نہ کی جائے تو عقل اس کی تفریعات کی وجوہ سمجھنے میں حیران ہی رہتی ہے۔اور یہ بلاشبہ شروع و آخر سے ویسی ہی کتاب ہے جیسے ابن الشجاع رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔مگر اب کتاب کی یہ سیڑھیاں ابوابِ کتاب میں واپس لگادی گئی ہیں، جیسا کہ شیخ جمال الحصیری رحمہ اللہ ت ۱۰۲ کی الجامع الکبیر پر دونوں شروحات سے واضح ہوتا ہے، اس طرح کہ وہ ابواب کتاب میں سے ہر کتاب کے شروع میں یہ کہتے ہیں: ''اس باب کا بنیادی قاعدہ یہ ہے'' اور ''اس باب کی بناء فلاں فلاں قاعدے پر ہے''۔یوں اس کتاب کی وجوہِ تفریعات کو سمجھنا اب بہت آسان ہوگیا ہے''۔ ح ۲۵

امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ شرح الجامع الکبیر میں کہتے ہیں کہ:

''میں نے الجامع الکبیر کے بعض مسائل نحو کے ایک معروف ماہر (یعنی ابوعلی فارسی) کو پڑھ کر سنائے تو وہ اس کتاب کے مصنف کی علمِ نحو میں مہارت اور تجربہ پر تعجب کا اظہار کرتے رہے''۔ ح،۲۶

جمال الدین بن عبید اللہ رحمہ اللہ نے محرم ۶۱۵ھ کو موصل سے قاضی شرف الدین بن عُنَین رحمہ اللہ کی طرف خط میں یہ لکھا:

'' میں ایک طویل عرصہ سے امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی کتاب الجامع الکبیر میں غور وفکر کر رہا ہوں اور میرے دل میں اس کا کچھ حصہ نقش ہوگیا ہے۔ اور یہ کتاب اپنے فن میں عجیب وغریب ہے۔ اس جیسی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی''۔ ح،۲۷

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''جو شخص ماہر علماء کا فقہ میں امتحان لینا چاہے تو اسے چاہیے کہ الجامع الکبیر کی کتاب الأیمان کو لازم پکڑے''۔ (یعنی اس کا امتحان لے)۔ ح،۲۸

الجامع الکبیر کو امام محمد رحمہ اللہ سے ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے اور اس کے مشہور راویوں میں سے ابو سلیمان جوزجانی رحمہ اللہ، ابو حفص کبیر رحمہ اللہ اور علی ابن معبد ابن شداد رحمہ اللہ ت،۱۰۳، ہشام ابن عبید اللہ رازی رحمہ اللہ ت،۱۰۴ اور محمد بن سماعہ تمیمی رحمہ اللہ ہیں، اس کتاب کے دقیق مسائل اور مشکل تخریجات کی وجہ سے بہت سے آئمہ فقہاء نے اس کی شروحات لکھی ہیں جیسی:

امام ابوحازم عبدالحمید ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ (التوفی ۲۹۲ھ)

امام علی بن موسیٰ القمی رحمہ اللہ ت،۱۰۵ (التوفی ۳۰۵ھ) ح،۲۹

امام محمد بن احمد الطحاوی رحمہ اللہ (التوفی ۳۷۱ھ)

ابوعمرو احمد بن محمد الطبری رحمہ اللہ (التوفی ۳۴۰ھ)

ابوبکر احمد بن علی الجصاص الرازی رحمہ اللہ (التوفی ۳۷۰ھ)

فقیہ ابواللیث نصر بن محمد السمرقندی رحمہ اللہ (التوفی ۳۷۳ھ)

محمد بن علی المعروف ''بابن عبدک'' الجرجانی رحمہ اللہ ت،۱۰۶ (التوفی ۳۴۷ھ)

شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد الحلوانی رحمہ اللہ (التوفی ۴۴۹ھ)

شمس الائمہ ابوبکر محمد بن احمد السرخسی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۸۳ھ)

فخر الاسلام علی البزدوی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۸۲ھ)

صدر الشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز بن مازہ البخاری (الشہید ۵۳۶ھ)

امام برہان الدین محمود بن احمد (ت ۱۰۷) صاحب المحیط رحمہ اللہ (المتوفی ۶۱۶ھ) (ح ۳۰)

علاء الدین محمد بن عبدالحمید السمرقندی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۵۲ھ)

ابو حامد احمد بن محمد العتابی البخاری رحمہ اللہ (المتوفی ۵۸۶)

حسن بن منصور الاوزجندی (قاضی خان رحمہ اللہ)(المتوفی ۵۹۲ھ)

برھان الدین علی بن ابوبکر بن عبدالجلیل المرغینانی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۹۳ھ)

جمال الدین محمود بن احمد الحصیری البخاری رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۶ھ) (ح ۳۱)

(دیکھیں کشف الظنون ج ۱ ص ۵۶۸، ۵۶۹)

الزیادات اور زیادات الزیادات

الزیادات وزیادات الزیادات

یہ دونوں کتابیں الجامع الکبیر کا تکملہ اور تتمہ ہیں۔

شیخ ابوالوفاء افغانی رحمہ اللہ، قاضی خان رحمہ اللہ سے شرح زیادات الزیادات کے مقدمہ میں نقل فرماتے ہیں:

جب امام محمد رحمہ اللہ الجامع الکبیر کے تالیف سے فارغ ہوئے تو انہیں کچھ ایسی تفریعات یاد آئیں جو انہوں نے الجامع الکبیر میں ذکر نہیں کی تھیں تو انہوں نے ایک دوسری کتاب لکھی تا کہ اس میں وہ تفریعات ذکر کردیں۔ اس نئی کتاب کا نام انہوں نے الزیادات رکھا، پھر انہیں مزید کچھ فروعات یاد آئیں تو انہوں نے ایک کتاب ان فروعات کے ذکر کے لئے تصنیف کی، جس کا نام انہوں نے زیادات الزیادات رکھا۔

اس کی تکمیل سے پہلے ہی امام محمد رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا اور وہ اسے مکمل نہیں کر پائے۔ جیسا کہ قاضی خان رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں لکھا ہے۔

(از حاشیہ:
شیخ ابوالوفاء رحمہ اللہ کی مراد شاید قاضی خان رحمہ اللہ کی شرح زیادات الزیادات ہے کیوں کہ مذکورہ بالا عبارت قاضی خان رحمہ اللہ کی شرح الزیادات میں موجود نہیں ہے جیسا کہ اس کے محقق شیخ محمد قاسم حفظہ اللہ نے اپنے مقدمہ کے ص ۱۰۲ پر ذکر کیا ہے)

چونکہ یہ کتاب الجامع الکبیر کا تکملہ ہے اس لئے اس کا اسلوب بھی مسائل کی باریک بینی اور فرضی تفریعات کے توسع میں اس سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اپنی ایک علمی مجلسِ املاء میں تھے 'انہوں نے چند دقیق تفریعات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان مسائل کی یہ تفریعات محمد بن حسن رحمہ اللہ کے لئے بڑی مشکل ہوں گی۔ جب یہ بات امام محمد رحمہ اللہ کو پہنچی انہوں نے الزیادات تالیف کی تا کہ یہ کتاب اس بات کی دلیل بن جائے کہ ایسی تفریعات اور جو اس سے بھی باریک تر تفریعات ہیں' ان کو بیان کرنا امام محمد رحمہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ح ۳۲۰

بعض حضرات نے امام محمد رحمہ اللہ کی ان تفریعی جزئیات میں بہت زیادہ کاوش پر اعتراض کیا ہے کہ "بہت سی جزئیات تو ایسی ہیں کہ بسا اوقات ان کا پیش آنا ہی بہت مشکل ہے" لیکن شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ اپنے اس قول سے بیان کی ہے:

> "اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے یہ مسائل کیوں ذکر کئے حالانکہ ہر عقلمند شخص یہ جانتا ہے کہ یہ مسائل نہ تو اس وقت پیش آئے تھے اور نہ ہی ان کی ضرورت پڑی تھی؟
> ہم اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں کہ کوئی شخص بھی اس علم کو سیکھے بغیر جس کی اس کو ضرورت نہیں ہے' اُس علم کے لئے تیار نہیں ہوسکتا جس کی اس کو ضرورت ہے (جیسے ہر علم وفن کے ماہرین کو مبادیات میں بہت سی ایسی چیزوں کا علم حاصل کرنا پڑتا ہے جن کی بظاہر ان کو ضرورت نہیں ہوتی) تو اس طرح سارا علم فقہ ہی اس علم میں سے ہے جس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کسی مصیبت سے نمٹنے کے لئے تو اس کے پیش آنے سے پہلے ہی تیاری کی جاتی ہے (تو اگر کوئی مسئلہ آج پیش نہیں آیا تو ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد پیش آجائے اس لئے اس کی تعلیم کو بے کار نہیں کہا جاسکتا)۔ ح ۳۲۲

یہ کتاب چونکہ تکملہ ہے' اس وجہ سے یہ تمام ابواب فقہ پر مشتمل نہیں ہے۔ اس کے زیادہ تر مسائل کا تعلق معاملات سے ہے۔

بہت سے علماء نے اس کتاب کی شروحات لکھی ہیں؛ جن میں سے کچھ یہ ہیں:

محمد بن سماعہ رحمہ اللہ (المتوفی ۲۳۳ھ) ح،۳۴

ابونصر عتابی رحمہ اللہ (المتوفی ۵۸۰ھ)

برھان الدین بن مازۃ رحمہ اللہ (المتوفی ۶۱۶ھ)

تاج الدین کردری رحمہ اللہ ت،۱۰۸ (المتوفی ۵۶۲ھ) ح،۳۵

ابوحفص سراج الدین ہندی رحمہ اللہ ت،۱۰۹ (المتوفی ۷۷۳ھ) ح،۳۶

شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۴۹ھ)

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۸۳ھ)

ابوعبداللہ جرجانی رحمہ اللہ ت،۱۱۰ (المتوفی ۳۹۷ھ) وقاضی خان رحمہ اللہ (المتوفی ۵۹۲ھ)۔

یہ کتاب اوراس کی شرح دنیا بھر کے مکتبوں میں شاذ و نادر ہی موجود تھی۔ میرے بھانجے مولانا محمد قاسم اشرف نے قابل قدر محنت کے ساتھ قاضی خان رحمہ اللہ کی "شرح الزیادات" کی تحقیق کو سرانجام دیا اور عمدہ تعلیقات کا اضافہ کر کے مختلف نسخوں کا باریک بینی سے جائزہ لینے اور ان کی تصحیح کے بعد اس شرح کو انہوں نے چھ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک مفید مقدمہ کا اضافہ بھی کیا جس میں انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ اور ان کی کتب' قاضی خان رحمہ اللہ اور ان کی تالیفات اور کتاب الزیادات اور اس کے نسخوں کے بارے میں تفصیلات بتائی ہیں۔ اس طرح یہ پوشیدہ خزانہ اہل علم کی پہنچ میں آ گیا ہے۔ اللہ پاک ان کو بہترین جزائے خیر عطاء فرمائیں اور ان کے علم، عمر اور عمل میں برکت عطاء فرمائیں۔

اس کتاب کی خصوصیات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ قاضی خان رحمہ اللہ ہر باب کے شروع میں ان اصولوں کی تشریح کر دیتے ہیں جن پر امام محمد رحمہ اللہ نے اس باب کے مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ اس طرح ہم جیسے طلبہ کے لئے مسائل اور ان کے ماخذ کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ کتاب کے محقق مولانا محمد قاسم حفظہ اللہ نے کتاب کے آخر میں شرح الزیادات سے خلاصہ کے طور پر تمام قواعد وضوابطِ فقہیہ ایک جگہ جمع کر دیے ہیں۔

السیر الصغیر

السیر الصغیر

اس کتاب کا موضوع احکامِ سیر ہے۔

(سیر، سیرۃ کی جمع ہے۔لغوی اعتبار سے تو یہ لفظ ہر کام کے طریقے اور طرز پر بولا جاتا ہے جیسے اب سیرۃ نبوی کا لفظ عام ہے لیکن فقہاءِ متقدمین اور محدثین اکثر مقامات پر اس کا استعمال رحمت دو عالم ﷺ کے غزوات کے لئے کرتے تھے، اور یہاں یہی معنیٰ مراد ہے)۔

اس بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ السیر الصغیر درحقیقت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی علم سِیَرْ پر لکھی ہوئی اس کتاب کی تلخیص ہے جو انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ، امام زفر بن ہذیل رحمہ اللہ، اسد بن عمرو رحمہ اللہ (ت ۱۱۱)، حسن بن زیاد لؤلؤی رحمہ اللہ، حفص بن غیاث نخعی رحمہ اللہ، عافیہ بن یزید رحمہ اللہ اور اپنے صاحب زادے حماد رحمہ اللہ اور ایسے دیگر بڑے آئمہ کو املاء کروائی تھی۔ان حضرات نے یہ کتاب امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کی اور اس میں مزید اضافے کئے اور اس کتاب کو مختلف ترتیبات پر مرتب کیا اور اس کی تہذیب وتدوین کی' یہاں تک کہ یہ نئی ترتیبات سب کی سب اپنے اپنے مرتبین کی طرف منسوب ہوئیں۔ (ج ۳۷)

ہم تک ان سب کتابوں میں سے صرف امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب پہنچی ہے جس کا نام السیر الصغیر ہے۔

امام حاکم شہید رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الکافی میں اس کو مکمل نقل کیا ہے۔شمس الآئمہ سرخسی رحمہ اللہ نے المبسوط میں اس کی شرح کی ہے۔یہاں تک کہ وہ دسویں جلد کے آخر میں فرماتے ہیں:

انتہی شرح السیر الصغیر المشتمل علی معنًی اثیرٍ باملاء المتکلم بالحق المنیر المحصور لاجلہ شبہ الاسیر المنتظر للفرج من العالم القدیر۔

(السیر الصغیر کی شرح مکمل ہوئی جو بہت پُراثر معانی پر مشتمل ہے اور اس شرح کو ایک ایسے شخص نے اپنے شاگردوں کو املاء کروایا ہے' جس نے بالکل روشن حق بیان کیا تھا، اور اب وہ ایک قیدی کی طرح حق کہنے کی پاداش میں گرفتار ہے اور اللہ تعالیٰ سے جو عالم وقدیر ہے اس سے اپنی رہائی کا منتظر ہے)۔

(از حاشیہ:

امام سرخسی رحمہ اللہ نے یہ بات اس لئے فرمائی تھی کہ مبسوط کی تالیف کے وقت وہ اوزجند کے ایک کنویں میں قید تھے اور وہیں سے انہوں نے یہ کتاب اپنے شاگردوں کو بغیر کسی کتاب کے مراجعت کے املاء کروائی تھی جیسا کہ مشہور ہے)۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ نے اس کتاب کو تحقیق کے بعد مختلف قلمی نسخوں کی بنیاد پر شائع کیا تھا اور انگریزی میں اس کی شرح بھی لکھی تھی اور مقدمہ بھی تحریر کیا تھا جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

یہ کتاب ادارہ بحوث اسلامی، اسلام آباد سے شائع ہوئی تھی۔

السیر الکبیر

السیر الکبیر

یہ کتاب ظاہر الروایۃ کی چھ کتابوں میں سے تصنیف کے اعتبار سے آخری کتاب ہے جیسا کہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ جب "السیر الصغیر" اہلِ شام کے ایک بڑے عالم امام عبد الرحمن بن عمر واوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ لگی تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟ کسی نے جواب دیا یہ محمد عراقی کی کتاب ہے۔ اس پر امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

وما لاهل العراق والتصنيف فى هذا الباب؟...

''بھلا اہل عراق کو اس باب (یعنی سیر و مغازی) میں تصنیف کا کیا حق پہنچتا ہے'' (ان کے پاس تو سِیَر کا علم ہی نہیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے معرکے تو شام اور حجاز کی طرف ہوئے نہ کہ عراق کی طرف۔ عراق تو ابھی نیا نیا فتح ہوا ہے''۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات جب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچی تو انہیں اس پر غصہ آیا اور اُنہوں نے اپنے آپ کو فارغ کر کے یہ کتاب ''السیر الکبیر'' تصنیف کی۔ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ دوسری کتاب دیکھی تو فرمایا: اگر یہ کتاب بہت سی احادیث پر مشتمل نہ ہوتی تو میں کہتا یہ شخص تو اپنے پاس علم گھڑتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کی رائے میں جواب کی درستگی کو متعین طور پر رکھ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بالکل سچا ہے:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ " (یوسف ۷۶)

(اور جتنے علم والے ہیں ان سب کے اوپر ایک بڑا علم رکھنے والا موجود ہے)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کی تکمیل کے بعد یہ حکم دیا کہ اس کو ساٹھ رجسٹروں میں لکھا جائے اور اس کو ایک گاڑی میں رکھ کر خلیفہ وقت کے دروازے پر پہنچا دیا جائے۔

خلیفہ کو یہ بتایا گیا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے اور وہ کتاب گاڑی پر رکھ کر دروازے پر لائی جا رہی ہے۔ خلیفہ نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور اس کارنامے کو اپنے زمانے کی قابلِ فخر باتوں میں سے قرار دیا۔ جب خلیفہ نے

اس کتاب کو دیکھا تو اس کی مسرت دوبالا ہوگئی۔

پھر خلیفہ نے اپنی اولاد کو امام محمد رحمہ اللہ کی مجلس میں بھیجا تا کہ وہ امام محمد رحمہ اللہ سے اس کتاب کی سماعت کریں۔ اسماعیل بن توبہ قزوینی رحمہ اللہ خلیفہ کی اولاد کے اتالیق تھے اور وہ ان کی حفاظت کے لئے ان کے ساتھ ہی ایک نگران کی طرح امام محمد رحمہ اللہ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے بھی اس کتاب کی سماعت کی، پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اس کتاب کے راویوں میں سے اسماعیل بن توبہ رحمہ اللہ اور ابوسلیمان جوزجانی رحمہ اللہ کے سوا کوئی باقی نہیں رہا اور ان ہی دونوں حضرات نے امام محمد رحمہ اللہ سے اس کتاب کی روایت کی۔ (ح.۳۸)

امام سرخسی رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ میں یہ بات ذکر کی ہے کہ اس پوری کتاب میں امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ذکر نہیں کیا اور جہاں کہیں ان کو سندِ حدیث میں ان کا ذکر کرنے کی ضرورت پیش آئی تو وہاں یہ کہا ہے "اخبرنی الثقه" (مجھے قابل اعتماد شخص نے خبر دی ہے) پھر انہوں نے کئی ایسے واقعات بھی ذکر کئے ہیں جن سے ان دونوں آئمہ کے درمیان سخت دوری کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن ہمارے شیخ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ (ت،۱۱۲) نے ان حکایات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے ان کو دشمنوں کی کارستانی قرار دیا ہے کہ ان حضرات کے بدخواہوں نے ان آئمہ کے صحیح اجتہاد پر مبنی اختلاف سے مختلف باطل اور من گھڑت کہانیاں بنالیں تا کہ ان میں سے ہر ایک کی بات کو دوسرے کے خلاف نقل کر کے ان کی شان کو کم کیا جائے۔

اسی طرح جو اسباب ان دونوں حضرات کے درمیان دوری کے مستحکم ہونے کے بارے میں مبسوط سرخسی رحمہ اللہ کے مقدمہ میں ذکر کئے گئے ہیں، وہ بھی سب باطل اور من گھڑت ہیں۔ ان دونوں آئمہ کی شان اس سے بہت بلند اور برتر ہے کہ ان کی طرف ایسی لایعنی باتیں منسوب کی جائیں۔ ہم ان باتوں کے گھڑنے والے کی شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (ح.۳۹)

بہر حال! امام سرخسی رحمہ اللہ نے جو بات ذکر کی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے اس کتاب میں ابو یوسف رحمہ اللہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان کوئی معاملہ تھا، اگر چہ وہ باتیں ہرگز نہیں تھیں، جو ایسی حکایات میں ذکر کی گئی ہیں، جن کا تصور کسی دیندار مسلمان سے بھی نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد رحمہ اللہ جیسی ہستیوں سے۔

ممکن ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ذکر نہ کرنے کی ایک اور وجہ وہ ہو جسے ابن نجیم رحمہ اللہ (ت،۱۱۳) نے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تمام تالیفات جن کے نام میں الصغیر کی صفت لگی ہوئی ہے، وہ شیخین یعنی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی متفقہ ہیں، بخلاف ان کتابوں کے جن کے نام میں الکبیر ہے کہ وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش نہیں کی گئیں''۔ ح،۴۰

بہر حال السیر الکبیر سب سے قدیم ایسی کتاب ہے جس میں بین الاقوامی قانون اور جنگ اور صلح کے قوانین اتنے بسط اور تفصیل کے ساتھ پہلی مرتبہ بیان کئے گئے ہیں اور یہ ایک ایسے زمانہ میں لکھی گئی کہ اس سے پہلے بین الاقوامی تعلقات کے لئے نہ تو کوئی مدون قانون تھا اور نہ ہی اس کو کوئی جانتا تھا۔

یہ چھ کتابیں وہ ہیں جن کو ظاہر الروایۃ کا نام دیا گیا ہے اور چونکہ یہ مذہب حنفی کو سمجھنے کیلئے بنیاد ہیں، اس لئے امام حاکم شہید رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۱۴ نے ان کے مسائل کی تلخیص کر کے اپنی کتاب الکافی میں انہیں جمع کر دیا تھا اور یہی وہ کتاب ہے جس کی شرح شمس الآئمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۱۵ نے المبسوط کے نام سے تیس (۳۰) جلدوں میں تحریر فرمائی تھی اور پھر یہی المبسوط بعد میں آنے والے حضرات کے لئے ماخذ بن گئی۔

علامہ طرسوی رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۱۶ فرماتے ہیں:

''مبسوط سرخسی کے خلاف پر نہ تو عمل کیا جائے گا اور نہ اس کے علاوہ کسی کی طرف میلان رکھا جائے گا اور نہ ہی اس کے خلاف پر فتویٰ دیا جائے گا اور صرف اسی پر اعتماد کیا جائے گا''۔ ح،۴۱

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مزید تین (۳) کتابیں

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مزید تین کتابیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بعض مؤلفین نے یہ لکھا ہے کہ ان کو پہلی قسم یعنی کتب ظاہر الروایۃ کے ساتھ ملحق کرنا ممکن ہے، کیوں کہ یہ تینوں کتابیں مشہور بھی ہیں اور اہم بھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

(۱)... مؤطا الامام محمد رحمۃ اللہ علیہ (۲)... کتاب الآثار اور (۳)...... کتاب الحجة علی اهل المدینه۔ ح،۴۲

ظاہر ہے کہ اگر چہ یہ تینوں کتابیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت کے صحیح ہونے اور اہل علم کے درمیان مشہور ہونے کے اعتبار سے کتب ظاہر الروایۃ کے درجے کی ہیں، لیکن یہ کتابیں مذہب کے بیان اور اس کی فروعات کو بیان کے لئے بنیادی طور پر نہیں لکھی گئیں، ان میں سے پہلی دو کتابیں ان کا موضوع تو احادیث و آثار کی روایت ہے، اور ان میں جو فقہی مسائل آتے ہیں وہ صرف تابع ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں۔ اور تیسری کتاب تو اس کا موضوع اختلاف آئمہ

کے مسائل ہیں۔

جب کہ کتب ظاہر الروایۃ تو بنیادی طور پر ان کی وضع ہی بیانِ مذہب کیلئے ہوئی ہے' لہٰذا یہ کتب ظاہر الروایۃ ہی مذہب حنفی کی معرفت کے لئے قابل اعتماد ہوں گی۔

شاید اسی وجہ سے فقہاءِ حنفیہ نے ان تینوں کتابوں کو نہ تو ظاہر الروایہ میں ذکر کیا ہے اور نہ ہی نوادر میں۔ یہ کتابیں نوادر میں اس لئے نہیں ہیں کہ یہ امام محمد رحمہ اللہ سے درجہ شہرت تک پہنچی ہوئی ہیں اور ظاہر الروایۃ میں سے اس لئے نہیں ہیں کہ ان کی تصنیف بیانِ مذہب کے لئے نہیں ہوئی۔ بظاہر ان تینوں کتابوں کا مرتبہ نوادر سے بلند ہے اور ان میں جو مسائل ہیں ان پر عمل کیا جائے گا' سوائے اس صورت کے کہ جب ظاہر الروایۃ کی چھ کتابوں سے ان کا تعارض آجائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مسائل النوادر

مسائل النوادر

مسائل حنفیہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کا نام النوادر رکھا گیا ہے، یہ وہ مسائل ہیں جو آئمہ مذہب سے منقول ہیں لیکن کتب ظاہر الروایۃ میں نہیں بلکہ دیگر کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔

پھر ان کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) وہ مسائل نوادر جو امام محمد رحمہ اللہ سے ہی منقول ہیں لیکن ظاہر الروایۃ کے علاوہ دیگر کتابوں میں جیسے کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، اور رقیات۔

(حاشیہ سے ان کتب کا مختصر تعارف:

کیسانیات کی نسبت سلیمان بن شعیب الکیسانی رحمہ اللہ کی طرف ہے اور ان کو کیسانی' ان کے آباء واجداد میں سے کسی کی طرف منسوب کر کے کہا گیا ہے جیسا کہ علامہ سمعانی رحمہ اللہ کی کتاب الانساب ج ۵ ص ۱۲۳ پر ہے۔

یہ سلیمان رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے محمد بن مقاتل رحمہ اللہ اور موسیٰ بن نصر رحمہ اللہ کے طبقہ کے فرد ہیں۔ علامہ صیمری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امام محمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ سے بعض نادر مسائل بھی نقل کئے ہیں۔ ابو اسحاق رحمہ اللہ نے بھی الطبقات میں ان کو امام محمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں ذکر کیا ہے۔

اسی طرح حافظ ابو القاسم یحییٰ بن علی رحمہ اللہ نے ذیل الطبقات میں اور تاریخ الغرباء الذین قدموا مصر میں

ان کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۲۷۸ھ میں ہوا۔ امام ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ نے ان سے روایت کی ہے سمعانی کہتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں۔ (طبقات الحنفیہ للقرشی ج ۲ ص ۲۳۴)

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ وہ مسائل ہیں جنہیں امام طحاوی رحمہ اللہ نے سلیمان بن شعیب رحمہ اللہ سے بواسطہ ان کے والد کے امام محمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور انہیں اَلا مالی کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک حصہ حیدر آباد دکن انڈیا کے مکتبہ آصفیہ میں موجود ہے۔

(بلوغ الامانی ص ۶۴، ۶۵)

ان کتابوں کا تذکرہ حاجی خلیفہ رحمہ اللہ نے ایک ساتھ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''مسائل رقیات، جرجانیات، کیسانیات، اور ہارونیات، امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی کتب ہیں، جنہیں انہوں نے اس وقت جمع کیا تھا جب وہ ان شہروں کے عہدہ قضاء پر فائز تھے''۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۶۹)

علامہ کوثری رحمہ اللہ فرماتے ہیں رقیات وہ مسائل ہیں جن کی تفریع امام محمد رحمہ اللہ نے اس وقت کی تھی جب وہ رَقّہ کے قاضی تھے (رقّہ راء کے فتحہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ، یہ دریائے فرات کے کنارے مشہور شہر ہے۔)

(معجم البلدان ج ۳ ص ۵۹)

یہ کتاب امام محمد رحمہ اللہ سے محمد بن سماعہ رحمہ اللہ نے روایت کی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ جب تک رقہ میں رہے، یہ آپ کے ساتھ رہے۔۔۔۔۔۔ ان کتابوں میں سے ایک الجرجانیات جسے علی بن صالح جرجانی رحمہ اللہ نے امام محمد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ ان کتب میں سے ایک ھارونیات ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب النوادر بھی ابرہیم بن رستم کی روایت سے ہے۔ اور ایک کتاب' ابن سماعہ رحمہ اللہ کی روایت سے ہے۔ اور ایک کتاب' ہشام بن عبیداللہ رازی رحمہ اللہ کی روایت سے ہے۔ جیسے ان کتابوں کے مسائل مذہب حنفی کے نوادر میں سے شمار کئے گئے ہیں' اسی طرح اب یہ کتابیں بھی لائبریریوں کے نوادرات میں سے ہیں)۔

ان کتابوں کو غیر ظاہر الروایۃ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کتابیں امام محمد رحمہ اللہ سے پہلی چھ (۶) کتابوں کی طرح واضح ثابت شدہ صحیح روایات سے مروی نہیں ہیں۔

(۲)۔۔۔۔۔۔ نوادر کی دوسری قسم وہ مسائل ہیں جو امام محمد رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر حضرات میں سے کسی کی کتاب میں منقول ہیں جیسے حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی کتاب ''المجرد'' اور دیگر کتابیں (جیسے کتاب ادب القاضی، کتاب الخصال،

کتاب معانی الایمان، کتاب النفقات، کتاب الخراج، کتاب الفرائض اور کتاب الوصایا۔

(الفہرست لابن ابی ندیم ص ۲۵۸)

اسی طرح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الامالی"۔

اسی قسم میں سے وہ الگ الگ روایات بھی ہیں جو بعض اصحاب مذہب سے منقول ہیں جیسے ابن سماعہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت، معلیٰ بن منصور رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کی بعض متعین مسائل میں روایات۔

نوادر کی مثال وہ مسئلہ ہے جس میں حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کی ہے کہ جو شخص بارہویں ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ جانا چاہے تو اس دن زوال سے پہلے بھی "رمی کرنا" اس کیلئے جائز ہے۔ ح،۴۳

اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ابو عصمہ ت،۱۱۷ (نوح بن ابی مریم) نے یہ روایت کی ہے کہ آج کے دور میں بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اگرچہ پہلے زمانے میں یہ ممنوع تھا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ بنی ہاشم کے (مالدار) لوگوں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ بنو ہاشم ہی کے بعض (مستحق) افراد کو دے دیں۔ ح،۴۴

یہ روایت ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ظاہر الروایۃ کا مسئلہ یہ ہے کہ بنو ہاشم کو مطلقاً زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک اصل قاعدہ جس پر عمل کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات ظاہر الروایۃ ہی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور نوادر کی روایات کو اگر ظاہر الروایۃ سے متعارض ہوں تو ان کو نہیں لیتے مگر کبھی کبھی ان پر بھی عمل کرتے ہیں۔ (جیسا کہ آگے مثالیں آ رہی ہیں)

لیکن مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۱۸ اور مولانا احمد رضا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۱۹ نے محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ت،۱۲۰ سے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح بخاری کی درسی تقریر میں ارشاد فرمایا:

> "امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایات میں سے اُس روایت کو اختیار کیا جائے گا جو حدیث پاک کے زیادہ قریب ہو۔ خواہ وہ روایات نادرہ میں سے ہو یا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور روایات کے علاوہ ہو"۔ ح،۴۵

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وہ مسائل جو ایسی کتابوں میں ہیں جنہیں امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور روایات کے ساتھ نقل

کیا گیا ہے تو انہی مسائل پر فتویٰ دیا جائے گا اگرچہ فقہاءِ حنفیہ نے ان کی تصحیح صراحتاً نہ کی ہو۔ ہاں اگر فقہاء حنفیہ نے کتب ظاہر الروایۃ کے علاوہ کسی اور روایت کی تصحیح کر دی تو ان کی تصحیح شدہ روایت کی پیروی کی جائے گی۔ پھر علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے یہ بات علامہ طرسوسی رحمہ اللہ سے بھی نقل فرمائی ہے"۔ ح.٤٦

وہ مسائل جن میں فقہاءِ حنفیہ نے روایت نوادر پر فتویٰ دیا ہے' اُن میں سے ایک بیوی کے مرتد ہونے کا مسئلہ بھی ہے۔ ظاہر الروایۃ میں اس کا حکم یہ تھا کہ ایسی عورت کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا اور اس بات پر بھی مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ ہی نیا نکاح کر لے۔ اس سلسلے میں روایتِ نوادر یہ ہے کہ ایسی عورت کو دارالاسلام میں باندی بنا دیا جائے گا اور یہ مسلمانوں کے لئے مالِ فئی کے حکم میں ہوگی۔ پھر سابقہ شوہر یا تو حکمران سے اس کو خرید لے گا یا اگر وہ مصرَف ہے تو حکمران اس کو بلا معاوضہ ہی اس کی سابقہ بیوی دیدے گا۔

بہت سے مشائخ نے اسی روایت پر فتوی دیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی ہمارے زمانے کی خواتین کے حالات کی تفتیش کرے گا اور اُن کے ارتداد لازم کرنے والے اقوال وافعال کو دیکھے گا' جو روزانہ ہی عورتوں سے کئی مرتبہ پیش آتے ہیں تو وہ روایت نوادر پر فتویٰ دینے میں توقف نہیں کرے گا۔ ح.٤٧

(حضرت مصنف دامت برکاتہم قوسین میں تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن میرے والد (حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ) نے یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ آج نہ تو ظاہر الروایۃ پر عمل کرنا ممکن ہے اور نہ ہی روایتِ نوادر پر۔ کیونکہ مسلمانوں میں ان پر عمل کرنے کی قوت اور طاقت نہیں رہی۔ لہٰذا اب اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں کہ اُس قول پر فتوی دیا جائے جس پر مشائخ سمرقند و بخارا نے فتوی دیا ہے کہ بیوی کے مرتد ہونے سے اس کا نکاح فسخ ہی نہیں ہوگا"۔

ح.٤٨

اسی طرح فقہاءِ حنفیہ نے نذر اللّجاج کے مسئلہ میں بھی روایتِ نادرہ پر فتویٰ دیا ہے۔ نذر اللّجاج یہ ہے کہ نذر ماننے والا شخص اپنی نذر کو ایسے کام کے ساتھ مشروط کر دیتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں نے شراب پی لی تو مجھ پر ایک مہینے کے روزے لازم ہو جائیں گے۔ ظاہر الروایۃ اس بارے میں یہ ہے کہ اگر اس شخص نے اب شراب پی تو اس پر اپنی نذر پوری کرنا ہی ضروری ہے' اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نوادر کی روایت یہ ہے کہ ایسے شخص کو اس بات کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی نذر پوری کرلے (یعنی ایک ماہ کے روزے رکھ لے) یا کفارہ

قسم ادا کردے۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ مسئلہ نوادر میں منقول ہے اور اسی کو محققین نے اختیار کیا ہے۔ ح۴۹

اور اسی قول کو متونِ فقہ کے مصنفین نے بیان کیا ہے۔ ح۵۰

اسی طرح ظاہر الروایۃ میں یہ نقل کیا گیا ہے:

قاضی کے فیصلے نافذ ہونے کے لئے شہر ہونا شرط ہے' اور نوادر کی روایت یہ ہے کہ یہ شرط نہیں۔ پھر فقہاء نے روایت نوادر پر ہی فتویٰ دیا ہے جیسا کہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ بزازیہ سے نقل کیا ہے۔ ح۵۱

اسی طرح ظاہر الروایۃ کے مطابق جو شخص کسی عورت کی کسی چیز پر اقرار کرنے کی گواہی دے تو اُس کے لئے یہ شرط ہے کہ اُس نے تحملِ شہادت (یعنی عورت سے اقرار سنتے وقت) اس عورت کا چہرہ دیکھا ہو اور نوادر کی روایت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں عورت کا چہرہ دیکھنے کی شرط نہیں لگائی جائے گی۔ ح۵۲

اسی روایت پر بہت سے علماء نے فتوی دیا ہے۔

اب اگر کوئی حکم ایسا ہو کہ ظاہر الروایۃ اس کے بارے میں بالکل خاموش ہے اور وہ حکم نوادر میں مذکور ہے تو اس کو لیا جائے گا' سوائے اس کے کہ وہ حکم ظاہر الروایۃ میں ثابت شدہ اصولوں کے خلاف ہو۔ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کوئی مسئلہ جب ظاہر الروایۃ میں مذکور نہ ہو اور وہ مسئلہ کسی دوسری روایت سے ثابت ہو تو اسی کی طرف رجوع کرنا متعین ہو جائے گا''۔ ح۵۳

انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو نوادر میں اس طرح منقول ہے ''جس شخص نے ظہر یا جمعہ کی پہلی چار سنتوں میں سے تیسری رکعت شروع کر دی اور تیسری رکعت کا سجدہ بھی کر لیا' پھر جماعت کھڑی ہو گئی تو وہ اپنی چار رکعتیں پوری کرلے گا اسی کو مشائخ نے اختیار کیا ہے''۔ ح۵۴

اس طرح کے مسائل بہت زیادہ ہیں' جنہیں آپ المحیط البرھانی میں دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ عنقریب (اگلے باب تلخیص قواعد رسم المفتی کے پانچویں قاعدے کے ضمن میں) تفصیل آ رہی ہے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

ابن امیر حاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اگر ہمارے زمانے میں کتب نوادر کے کچھ نسخے مل جائیں تو اس میں لکھے ہوئے مسائل کی نسبت نہ تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کرنا جائز ہے اور نہ ہی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف۔ کیونکہ یہ کتابیں ہمارے زمانے اور ہمارے علاقے میں نہ تو مشہور ہوئی ہیں اور نہ ہی متداوِل ہوئی ہیں۔ ہاں اگر نوادر سے نقل شدہ کوئی مسئلہ کسی مشہور و معروف کتاب جیسے'

ہدایہ و مبسوط میں مل جائے تو پھر اُس کتاب پر اعتماد کیا جائے گا۔ ح ۵۵

مسائل الفتاویٰ والواقعات

مسائل الفتاویٰ والواقعات

حنفیہ کے مسائل میں سے تیسری قسم فتاویٰ اور واقعات ہیں۔ ان کے بارے میں ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ وہ مسائل ہیں مجتہدین متاخرین نے اس وقت ان کا استنباط کیا جب ان مسائل کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا اور انہوں نے متقدمین اہل مذہب سے ان کے بارے میں کوئی روایت نہیں پائی۔ یہ حضرات' امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ ان حضرات کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کے حالات جاننے کے لئے آئمہ حنفیہ پر لکھی ہوئی کتب طبقات اور کتب تاریخ دیکھنی چاہیے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد جیسے عصام بن یوسف رحمہ اللہ ت ۱۲۱، ابن رستم رحمہ اللہ ت ۱۲۲، محمد بن سماعہ رحمہ اللہ، ابوسلیمان جوزجانی رحمہ اللہ، ابوحفص بخاری رحمہ اللہ ہیں۔ اور ان کے بعد میں آنے والے حضرات محمد بن سلمہ رحمہ اللہ ت ۱۲۳، محمد بن مقاتل رحمہ اللہ ت ۱۲۴، نصیب بن یحییٰ رحمہ اللہ ت ۱۲۵، ابو النصر قاسم بن سلام رحمہ اللہ ہیں۔

چونکہ فتاوی اور واقعات ایسے مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جن کے بارے میں اصحاب مذہب نے کوئی تصریح نہیں کی ہوتی (تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں)۔

(۱)...... یا تو یہ اصول حنفیہ کے مطابق قرآن وسنت سے جدید استنباط ہوتا ہے۔

(۲)...... اور کبھی یہ ان بعض مسائل پر تخریج یا قیاس ہوتا ہے جن کی اصحاب مذہب نے تصریح کی ہوتی ہے۔

(۳)...... اور کبھی یہ اصحاب مذہب سے بعض مختلف اقوال منقول ہوتے ہیں تو اُن میں سے کچھ اقوال کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کبھی کبھار ان حضرات کو یہ صورت بھی پیش آتی ہے کہ اصحاب مذہب کی مخالفت کرتے

ہیں' ایسے دلائل اور اسباب کی بناء پر جو اِن کے سامنے واضح ہو چکے ہیں۔ ایسے حضرات کے فتاوی جن کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں' ان میں سے پہلی کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ کی کتاب النوازل ہے۔ پھر ان کے بعد مشائخ نے کئی کتابیں مرتب کیں جیسے علامہ ناطفی رحمہ اللہ (ت ۱۲۶) کی مجموع النوازل والوقعات' صدر الشہید رحمہ اللہ کی الواقعات۔ پھر متاخرین نے یہ مسائل (یعنی تینوں قسمیں ظاہر الروایہ، نوادر اور فتاوی) ملے جلے بغیر کسی امتیاز کے ذکر کئے ہیں جیسے فتاوی قاضی خان رحمہ اللہ، خلاصۃ الفتاوی اور دیگر کتابوں میں ہیں۔ اور بعض متاخرین نے ان مسائل کو جدا جدا لکھا ہے جیسا کہ رضی الدین سرخسی رحمہ اللہ (ت ۱۲۷) کی المحیط میں ہے کہ وہ سب سے پہلے مسائل اصول ذکر کرتے ہیں پھر نوادر پھر فتاویٰ اور ان کی یہ ترتیب بہت ہی خوب ہے''۔ (ح ۵۶)

- (حضرت مصنف دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ) بندہ ضعیف عفا اللہ عنہ کہتا ہے:

''جو بات ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے رضی الدین سرخسی رحمہ اللہ کی محیط کے بارے میں ذکر کی ہے بظاہر ابن عابدین رحمہ اللہ نے بذات خود نہ تو یہ کتاب دیکھی اور نہ ہی وہ المحیط البرھانی پر مطلع ہوئے۔ المحیط البرھانی کی طباعت کے بعد حقیقت حال جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ یہ وصف (مسائل کی تینوں قسموں کو الگ الگ بیان کرنا) المحیط البرھانی پر صادق آتا ہے' نہ کہ رضی الدین سرخسی رحمہ اللہ کی المحیط پر''۔

امام برہان الدین رحمہ اللہ اپنی محیط کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ ''میں نے مبسوط، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر اور الزیادات کے مسائل جمع کر دیئے ہیں اور ان کے ساتھ نوادر' فتاویٰ اور واقعات کے مسائل کو بھی ملحق کر دیا ہے۔ ساتھ ہی میں نے وہ فوائد بھی ملا دیئے ہیں جو میں نے سیدی و مولائی حضرت والد گرامی تغمدہ اللہ تعالیٰ بالرحمۃ سے حاصل کیے ہیں' اور وہ باریک نکات جنہیں میں نے اپنے زمانے کے مشائخ سے یاد کیا تھا وہ بھی ساتھ ملا دیئے ہیں۔ میں نے کتاب کو خوب تفصیل سے لکھا ہے اور ہر جنس کے مسائل کو الگ الگ بیان کیا ہے''۔ (ح ۵۷)

اس کتاب کے محقق میرے بھانجے شیخ نعیم اشرف حفظہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ذکر کی ہے کہ انہوں نے محیط رضوی کا ایک نسخہ دیکھا ہے اور وہ کہتے ہیں میں نے اُس کا بعض مقامات سے مطالعہ کیا تو میں نے اس میں تمام مسائل کو آپس میں

ملا جلا، غیر مرتب پایا۔ اس کے بالکل برخلاف جو میں نے سن رکھا تھا اور میں نے بعض مشائخ کے کلام میں یہ دیکھا تھا کہ انہوں نے یہ بات ذکر کی تھی کہ رضی الدین سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل کو الگ الگ اور ترتیب کے ساتھ لکھا ہے، اس طرح کہ وہ سب سے پہلے ظاہر الروایۃ کے مسائل ذکر کرتے ہیں پھر نوادر اور فتاویٰ اور واقعات بلکہ میں نے تو یہ امتیاز مکمل طور پر المحیط البرھانی میں ہی پایا ہے۔ ح ۵۸

الحمد للہ یہ کتاب ان کی تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکی ہے اور صورت حال ویسے ہی پائی گئی ہے جیسا کہ انہوں نے بتایا ہے۔

مسائل حنفیہ کی ایک تقسیم از شیخ شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ

تقسیم الشیخ ولی اللہ الدھلوی لمسائل الحنفیۃ

شیخ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات مسائل کو چار قسموں پر بیان کیا ہے۔

(۱)......پہلی قسم

وہ مسائل ہیں جو ظاہر الروایۃ میں ثابت ہو چکے ہیں اور ان مسائل کا حکم یہ ہے کہ فقہاء ان کو ہر حال میں قبول کرتے ہیں، خواہ وہ اصول کے موافق ہوں یا مخالف۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس لئے تم دیکھو گے کہ صاحب ہدایہ وغیرہ التجنیس کے مسائل کے درمیان فرق بیان کرنے میں تکلف سے کام لیتے ہیں'' (''التجنیس والمزید'' صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے)

(۲)......دوسری قسم

وہ روایات شاذہ ہیں جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہما (امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ و امام محمد رحمۃ اللہ علیہ) سے منقول ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ فقہاء حنفیہ ایسی روایت کو قبول نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ اصول کے موافق ہوں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہدایہ اور اس جیسی دیگر کتابوں میں کتنے ہی مقامات ایسے ہیں جہاں دلیل کی قوت کی بناء پر بعض روایاتِ شاذہ کی تصحیح کی گئی ہے۔

(۳)......تیسری قسم

متاخرین کی وہ تخریج ہے جس پر جمہور اصحاب حنفیہ متفق ہوں اور اس کا حکم یہ ہے کہ فقہاء حنفیہ ہر حالت میں اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔

(۴)......چوتھی قسم

متاخرین کی وہ تخریج ہے جس پر جمہور اصحاب حنفیہ کا اتفاق نہیں ہوا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ مفتی اس تخریج کو اصول سے اور سَلَف (یہ ''سالف'' کی جمع ہے' اس سے گزشتہ زمانے کے اصحابِ علم وفضل مراد ہوتے ہیں) کے کلام میں سے اس سے ملتے جلتے مسائل سے موازنہ کرے گا' اگر یہ تخریج اُس نے اصول اور نظائر کے موافق پائی تو اس کو لے لے گا ورنہ اس تخریج کو چھوڑ دے گا۔ ج ۵۹

شیخ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی یہ تقسیم نقل کی اور پھر فرمایا:

''شاید کہ آپ اس بحث سے سمجھ چکے ہوں گے کہ ہر وہ بات جو مختلف معتبر فتاویٰ میں ہے وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا قول نہیں ہے (معتبر فتاویٰ کی مثال) جیسے **خلاصة الفتاوى، الفتاوى الظهيرية** اور فتاویٰ قاضی خان اور ان جیسے دیگر فتاوی کی کتابیں' جن کے مصنفین نے اصل مذہب' تخریج متاخرین اور دیگر مسائل کے درمیان تمیز نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کتابوں میں کچھ حصہ وہ ہے جو فقہاء کا تخریج کردہ ہے۔ لہٰذا ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ ان میں موجود ہر بات کی نسبت آئمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کی طرف کرنے کی جسارت نہ کرے۔ بلکہ وہ ان مسائل کے درمیان جو آئمہ ثلاثہ کا قول ہیں اور ان مسائل کے درمیان جو بعد والے حضرات کے تخریج کردہ ہیں' فرق اور تمیز کرے۔

جو شخص ان دونوں قسم کے مسائل میں تمیز نہیں کرے گا تو معاملہ اس کے لئے باعث اشکال ہوگا پانی کے حوض کے بارے میں "**عشر في العشر**" (دس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ جوڑا حوض) کا مسئلہ، کہ فتاوی اس کو معتبر ماننے کی تصریح سے بھرے پڑے ہیں اور فتوی بھی اسی پر ہے حالانکہ یہ صاحب مذہب یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اس بارے میں مذہب جیسا کہ امام محمد رحمہ اللہ نے مؤطا میں اور ہمارے دیگر متقدمین آئمہ نے تصریح کی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر حوض ایسا ہو کہ اس کے ایک کنارے کو حرکت دینے سے دوسرے کنارے میں حرکت نہیں ہوتی تو ایسا حوض نجاست گرنے سے ناپاک نہیں ہوگا۔ اور اگر حوض کی یہ صفت نہ ہو تو یہ ناپاک ہو جائے گا۔ اب جو شخص اس بات کو نہیں سمجھے گا اور یہ گمان کرے گا کہ یہ صاحب مذہب یعنی امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب ہے تو اس کے لئے اس مسئلے کو کسی قابل اعتماد شرعی دلیل کی بنیاد پر بیان کرنا بہت مشکل ہو جائے گا"۔ (ج،۱۰)

حوض کی پیمائش کا مسئلہ تفصیل سے "تشریحات نمبر (۱۴) میں دیکھیں

پھر علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے مسائل حنفیہ کی قوتِ دلیل کے اعتبار سے ایک اور تقسیم بھی ذکر کی ہے اور یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ جب کسی عالم کے سامنے کسی مسئلہ میں یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کے امام کا مذہب، حدیثِ صحیح کے معارض ہے تو وہ اس پر عمل کرے گا جو حدیث کے موافق ہو اور ایسا کرنے کی وجہ سے وہ تقلید سے نہیں نکلے گا۔

یہ بات صرف اسی عالم کے بارے میں ہے جو دلائل میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے شرائط اور آداب، ہم پہلے ہی تقلید کی بحث میں بیان کر چکے ہیں۔ رہا وہ مفتی جو فقہ حنفی کا مقلد ہو اور خود دلائل میں غور و فکر کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اُن قواعد رسم المفتی کا التزام کرے، جن کو تشریح کے ساتھ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے شرح عقود رسم المفتی میں بیان کر دیا ہے۔

شرح عقود رسم المفتی کا مختصر تعارف اور اہم مباحث کی فہرست "تشریحات نمبر (۱۵)" میں دیکھیں

اب ہم چاہتے ہیں کہ ان قواعد کو کچھ تلخیص سے نیز کچھ دیگر کتابوں سے تشریح اور وضاحت کے ساتھ یہاں ذکر کر دیں۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق

☆......☆......☆

حواشی (۳)

فقہاء کے طبقات اور مراتب
طبقات الفقہاء

(۱) حاشية الطحطاوي على الدر المختار، أواخر المقدمة، الجزء ۱، الصفحة ۵۱۔

(۲) المنخول، الغزالي، الجزء ۱، الصفحة ۶۰۸، طبع دار الفكر دمشق۔

(۳) الجامع الصغير مع النافع الكبير، اللكنوي، الفصل الاول، الصفحة ۱۲، طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية، كراتشي۔

(۴) عمدة الرعاية على شرح الوقاية، اللكنوي، المقدمة، الدراسة الثانية ذكر طبقات اصحابنا الحنفية ودرجاتهم، الجزء ۱، الصفحة ۲۸۔

(۵) المجموع شرح المهذب، النووي، المقدمة، الجزء ۱، الصفحة ۴۳، طبع دار الفكر بيروت۔

(۶) ادب المفتي والمستفتي، ابن الصلاح الشهرزوري، القول في شروط المفتي وصفاته واحكامه وآدابه، الصفحة ۹۱ الى ۹۲، طبع قديمي كتب خانه كراتشي۔

(۷) الرد على من اخلد الى الارض، السيوطي، الصفحة ۱۱۳، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۸) الميزان الكبرى، الشعراني، الجزء ۱، الصفحة ۳۸ الى ۳۹۔

(۹) الانصاف في بيان اسباب الاختلاف، شاه ولي الله الدهلوي، الصفحة ۸۱ الى ۸۲، طبع دار النفائس بيروت۔

(۱۰) فواتح الرحموت، بحث الاجتهاد، الجزء ۲، الصفحة ۴۴۳، طبع دار احياء التراث العربي

بیروت۔

(۱۱) مقدمة عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية، الجزء۱، الصفحة ۹، طبع اليوسفى محمد يوسف الانصارى اللكنوى۔

(۱۲) ناظورة الحق فى فرضية العشاء وان لم يغب الشفق (مخطوط) الصفحة ۶۴، الى ۶۵ موجود فى مكتبة دار العلوم كراتشى۔

(۱۳) شرح عقود رسم المفتى، ابن عابدين، تحت الأشعار ۳۰ الى ۳۵، طبع مكتبة عثمانية۔

البحر الرائق، كتاب القضاء، فصل فى التقليد، الجزء ۶، الصفحة ۴۵۲ الى ۴۵۳، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۱۴) ادب المفتى والمستفتى، ابن الصلاح الشهرزورى، بيان شرف حرمة الفتوى وخطرها وغررها، القول فى شروط المفتى وصفاته واحكامه وآدابه، الصفحة ۱۰۱، طبع قديمى كتب خانه كراتشى۔

(۱۵) شرح عقود رسم المفتى، ابن عابدين، تحت الاشعار ۱۱ الى ۱۶، طبع مكتبة عثمانية۔

(۱۶) كشف الظنون عن اسامى الكتب والفنون، خليفة، باب الميم، المبسوط فى فروع الحنفية، الجزء ۲، الصفحة ۱۵۸۱، طبع مكتبة المثنى بيروت۔

(۱۷) تاريخ بغداد، الخطيب، حرف الحاء، ذكر من اسمه محمد واسم ابيه الحسن، محمد بن الحسن بن فرقد ابو عبد الله الشيبانى مولاهم صاحب ابى حنيفة وامام اهل الرأى، الجزء ۲، الصفحة ۵۶۷، طبع دار الكتاب العربى بيروت۔

(۱۸) حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، مقدمة، الجزء ۱، الصفحة ۱۱، طبع قديمى كتب خانه كراتشى۔

وكشف الظنون عن اسامى الكتب والفنون، خليفة، باب الميم، المبسوط فى فروع الحنفية، الجزء ۲، الصفحة ۱۵۸۱، طبع مكتبة المثنى بيروت۔

(۱۹) بلوغ الأمانى فى سيرة الامام محمد الشيبانى، الكوثرى، الصفحة ۶۲ طبع مكتبة الازهرية للتراث مصر۔

وقال الشيخ محمد تقى العثمانى حفظه الله فى الحاشية : لم يذكر الشيخ الكوثرى رحمه الله مأخذ هذا القول ولعلّه ماخوذ مما رواه الخطيب باسناده الى الامام الشافعي رحمه الله قال: "حملت عن محمد بن الحسن وقر بختى كتباً". (تاريخ بغداد ١٧٦/٢) والله سبحانه اعلم. اما ان يكون الشافعي رحمه الله الف "الأم" محاكاة للأصل ففيه بُعد لا يخفى على من تأمل فى اسلوب الكتابين۔

(٢٠) الجواهر المضيئة فى طبقات الحنفية ،باب من اسمه عبد العزيز ،ترجمة ،عبد العزيز بن احمد بن نصر بن صالح الحلوانى ،الملقب شمس الائمة ،الصفحة ٢٠٧ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(٢١) دیکھیں: كشف الظنون عن أسامى الكتب والفنون ،خليفة ،باب الميم ،المبسوط فى فروع الحنفية ،الجزء ٢ ،الصفحة ١٥٨١ طبع مكتبة المثنى بيروت۔

(٢٢) البحر الرائق شرح كنزالدقائق ، كتاب الصلاة ،باب الوتر والنوافل ،الجزء ٢ ،الصفحة ١٠٧ الى ١٠٨ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت

(٢٣) النافع الكبير شرح الجامع الصغير، اللكنوى ،الصفحة ٢٢ الى ٢٣ طبع ادارة القرآن والعلوم السلامية۔

(٢٤) كشف الظنون عن أسامى الكتب والفنون ،خليفة ،باب الجيم ، الجامع الكبير فى الفروع ،الجزء ١ ،الصفحة ٥٦٩ ،طبع مكتبة المثنى بيروت۔

(٢٥) بلوغ الا مانى فى سيرة الامام محمد الشيبانى الكوثرى ،الصفحة ٥٩ الى ٦٠ طبع المكتبة الازهرية للتراث مصر۔

(٢٦) بلوغ الامانى فى سيرة الامام محمد الشيبانى ،الكوثرى ،الصفحة ٦٣ ،طبع المكتبة الازهرية للتراث مصر۔

(٢٧) بلوغ الامانى فى سيرة الامام محمد الشيبانى ،الكوثرى ،الصفحة ٦٣ طبع المكتبة الازهرية للتراث مصر۔

(٢٨) شرح السير الكبير ،السرخسى ،القسم الاول من الكتاب فى الأدلة الشرعية ،باب امان الحر المسلم والصبى والمرأة والعبد والذمى ، الجزء ١ ،الصفحة ٢٦١ ،طبع الدائرة

النظامیۃ دکن الهند۔

(۲۹) تاج التراجم فی طبقات الحنفیۃ ،ابن قطلوبغا،فصل فیمن عساہ یشتهر بنسب أولقب،الجزء ۱،الصفحۃ ۱۴،طبع ایچ ایم سعید کراتشی۔

(۳۰) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون ،خلیفۃ ،باب الجیم ، الجامع الکبیر فی الفروع،الجزء ۱،الصفحۃ ۵۶۹،

وایضاً فی کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون ،خلیفۃ ،باب المیم ،المحیط البرهانی فی الفقہ النعمانی،الجزء ۲،الصفحۃ ۱۶۱۹،طبع مکتبۃ المثنی بیروت۔

(۳۱) دیکھیں: کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون خلیفۃ ،باب الجیم ،الجامع الکبیر فی الفروع،الجزء ۱،الصفحۃ ۵۶۹،طبع مکتبۃ المثنی بیروت۔

(۳۲) بلوغ الأمانی فی سیرۃ الامام محمد الشیبانی ، الکوثری،الصفحۃ ۶۵،طبع المکتبۃ الازهریۃ الثرات۔

(۳۳) کتاب المبسوط ،السرخسی ، کتاب الصلاۃ ،باب صلاۃ المسافر ،الجزء ۱ الصفحۃ ۲۱۰،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔

(۳۴) الفوائد البهیۃ ،اللکنوی،حرف المیم ،الصفحۃ ۱۷۰ طبع قدیمی کتب خانہ کراتشی۔

(۳۵) الفوائد البهیۃ،اللکنوی،الصفحۃ ۹۸ الی ۹۹،طبع قدیمی کتب خانہ کراتشی۔

(۳۶) کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، خلیفۃ،باب التاء التائیۃ فی التصوف ،الجزء ۱،الصفحۃ ۲۶۶ ،طبع مکتبۃ المثنی بیروت۔

(۳۷) مقدمۃ الرد علی سیر الأوزاعی ، الشیخ أبی الوفاء الافغانی ،الصفحۃ ۲، طبع لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ ، دکن، الهند۔

(۳۸) شرح سیر الکبیر ،السرخسی،مقدمۃ الشارح ،الجزء ۱، الصفحۃ ۱ الی ۳،طبع الدائرۃ النظامیۃ دکن الهند۔

(۳۹) اعلاء السنن ،العثمانی ، کتاب الوقف ،باب اذا خرب المسجد أو الوقف لم یعد الی

ملك الواقف ولا يباع ،رقم الحديث ۳۵۷۱،الجزء ۱۳ الى ۱۴ ،الصفحة ۵۷۹۱،طبع دار الفكر بيروت۔

(۴۰) البحر الرائق،شرح كنز الدقائق، ابن نجيم ، كتاب الصلاة ،باب صفة الصلاة ،بحث التشهد،الجزء۱، الصفحة ۵۷۹،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۴۱) شرح عقود رسم المفتى ،ابن عابدين، تحت الاشعار ۲۰ الى ۲۲،طبع مكتبة عثمانية۔

(۴۲) الامام محمد بن الحسن الشيبانى ،نابغة الفقه الاسلامى'الفصل الرابع : مؤلفات الامام محمد،الدكتور على احمد الندوى، الصفحة ۱۳۵،طبع دار القلم دمشق۔

(۴۳) المبسوط، السرخسى ، كتاب المناسك ،باب رمى الجمار ،الجزء ۳ الى ۴ ،الصفحة ۷۷،دار الكتب العلمية بيروت۔

(۴۴) فتح القدير ابن همام، كتاب الزكاة،باب من يجوز دفع الصدقات اليه ومن لا يجوز ،الجزء ۲،الصفحة ۲۷۷،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۴۵) انوار البارى على صحيح البخارى، كتاب الغسل،باب اذا ذكر فى المسجد انه جنب يخرج كما هو ولا يتيمم ،فائدة جليلة علمية،الجزء ۷ الى ۸ الصفحة ۱۲۹، طبع اداره تاليفات اشرفيه ملتان۔

دیکھیں :فيض البارى على صحيح البخارى ، كتاب الغسل ،باب اذا ذكر فى المسجد انه جنب يخرج كما هو ولا يتيمم ،الجزء ۷ الى ۸ الصفحة ۳۶۵،طبع المكتبة الرشيدية كوئته۔

(۴۶) شرح عقود رسم المفتى،ابن عابدين، تحت الاشعار ۱۰ الى ۱۱،طبع مكتبة عثمانية۔

(۴۷) الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ، كتاب النكاح ،باب نكاح الكافر، الجزء ۴،الصفحة ۲۶۴ الى ۲۶۵،طبع دار المعرفة بيروت۔

(۴۸) جواهر الفقه ،المفتى محمد شفيع ،مختلف المذہب زوجین کے احکام الجزء ۲، الصفحة ۱۳۶،طبع مكتبة دار العلوم كراتشى۔

(۴۹) فتح القدير ،ابن همام، كتاب الايمان ،فصل فى الكفارة ،الجزء ۵، الصفحة ۸۸ ،الى ۸۹،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۵۰) حاشية ابن عابدين ، كتاب الايمان ،مطلب فى احكام النذر ،الجزء ۵،الصفحه

۵۴۲،طبع دار المعرفة بيروت۔

(۵۱) حاشية ابن عابدين، كتاب القضاء،باب كتاب القاضى الى القاضى وغيره،الجزء ۸، الصفحة ۱۵۹،طبع دار المعرفة بيروت۔

(۵۲) قرة عيون الاخيار تكملة ردالمحتار على الدر المختار (حاشية ابن عابدين) كتاب الشهادات ،مطلب ؛مايغفل الناس عنه كثيراًمن الشهادة على المتعاقدين باسمهما ونسبهما باخبارهما ،الجزء ۱۱،الصفحة ۱۱۲ الى ۱۱۳،طبع دار المعرفة بيروت۔

(۵۳) البحر الرائق شرح كنزالدقائق'ابن نجيم'كتاب الصلاة ،باب قضاء الفوائت ،الجزء ۲،الصفحة ۱۳۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۵۴) دیکھیں: حاشية ابن عابدين، كتاب الصلاة،باب ادراك الفريضة،الجزء ۲،الصفحة ۶۱۲،طبع دار المعرفة بيروت۔

(۵۵) التقرير والتحبير ،ابن امير الحاج ،مقالة فى الاجتهاد وما يتبعه من التقليد والافتاء،مسألة (افتاء غير المجتهد بمذهب مجتهد تخريجاً)الجزء ۳،الصفحة ۴۴۲ الى ۴۴۳،طبع المكتبة المعروفية۔

(۵۶) شرح عقود رسم المفتى،ابن عابدين، تحت الاشعار ۱۰ الى ۱۶،طبع مكتبة عثمانية۔

(۵۷) المحيط البرهانى،خطبة الكتاب،الجزء ۱، الصفحة ۱۵۹ ،طبع ادارة القرآن كراتشى۔

(۵۸) مقدمة التحقيق، المحيط البرهانى، الجزء ۱، الصفحة ۹۳ طبع ادارة القرآن، كراتشى۔

(۵۹) عقد الجيد فى أحكام الاجتهاد والتقليد'فصل فى المجتهد فى المذهب،الصفحة ۴۱ طبع شركه المطبوعات العلمية مصر۔

(۶۰) الجامع الصغير مع النافع الكبير ،اللكنوى ،ذكر طبقات الفقهاء والكتب ،الصفحة ۶۰،طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية كراتشى۔

☆......☆......☆

مذہبِ حنفی کے مطابق

قواعدِ رسم المفتی کی تلخیص

(تلخیص قواعد رسم المفتی علی مذہب الحنفیۃ)

مباحث

- پہلا قاعدہ: مفتی کی شرائط
- کیا کسی مذہب پر فتویٰ دینے والے کیلئے دلیل سے آگاہ ہونا شرط ہے؟
- وہ مفتی جو مقلد ہو اس کے لیے فتویٰ دینے کی شرائط
- دوسرا قاعدہ: جب مذہب میں ایک ہی منقول قول ہو
- تیسرا قاعدہ: جب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دو یا زیادہ قول ہوں یا ان کے شاگردوں کے مختلف اقوال ہوں
- چوتھا قاعدہ: اصحاب الترجیح نے جن اقوال کو ترجیح دی ہو
- پانچواں قاعدہ: مذہب حنفی کی معتبر اور غیر معتبر کتابیں
- فتویٰ کے لیے کتابوں کے غیر معتبر ہونے کی چھ وجوہات
- چھٹا قاعدہ: ترجیح صریح اور ترجیح التزامی کی تفصیل
- ساتواں قاعدہ: ترجیح صریح کے مختلف الفاظ اور ان کے درجات
- آٹھواں قاعدہ: جب ایک قول مقدم ہو اور دوسرا مؤخر۔ نیز چار کلی قواعد
- نواں قاعدہ: جب اصحاب الترجیح سے کسی قول کی ترجیح منقول نہ ہو تو ترجیح کے کلی قواعد
- دسواں قاعدہ: عموم بلویٰ اور عموم حاجت کی اقسام اور مثالیں
- گیارہواں قاعدہ: ضعیف اور مرجوح روایات پر عمل کرنا یا فتویٰ دینا

پہلا قاعدہ: مفتی کی شرائط

(الاصل الاول: شروط المفتی)

''ایسے شخص کیلئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جس نے ماہر اساتذہ سے علم فقہ حاصل نہ کیا ہو بلکہ از خود ہی فقہی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اسی طرح اس شخص کیلئے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جس نے علم فقہ تو اساتذہ سے پڑھا ہو' جب تک اس کو ایسا ملکہ اور صلاحیت حاصل نہ ہو جائے جس کے ذریعہ وہ احکام شریعت کے اصول وقواعد اور علل کو جاننے لگے اور فتویٰ میں معتبر کتابوں کو غیر معتبر کتابوں سے جدا کر سکے''۔

تشریح: یہ مسئلہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ (ت ۱۲۸۰) کے فتاویٰ سے نقل کر کے لکھا ہے۔ ابن عابدین رحمہ اللہ نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا تعلق مفتی کی اہلیت کے شرائط سے ہے۔ جنہیں دیگر فقہاء نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے' ان شرائط میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱)...... بالغ ہونا (۲)...... عاقل ہونا (۳)...... عالم ہونا (۴)...... تجربہ کار ہونا (۵)...... عادل ہونا (۶)...... علماء کا اس پر اعتماد کرنا۔

آنے والی سطور میں ہم ان شرائط کی کچھ تفاصیل ذکر کریں گے۔

اہلیت مفتی کی شرائط

عقل اور بلوغ تو ان عمومی صفات میں سے ہیں کہ کسی بھی اہم کام کی انجام دہی کیلئے اُن کا پایا جانا ضروری ہے۔ مرد ہونا اور آزاد ہونا، فقہاء کی تصریح کے مطابق مفتی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس لیے اگر عورت اور غلام میں بھی دیگر شرائط پائی جائیں تو ان کیلئے فتوی دینا جائز ہے۔

(چنانچہ تاریخ اسلام میں بہت سے غلام افتاء کے منصب پر فائز ہوئے جیسے عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ۔ خواتین میں سے صاحب بدائع الصنائع کی اہلیہ حضرت فاطمہ رحمہا اللہ بڑی مفتیہ تھیں)

ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مفتی کیلئے آزاد ہونا اور مرد ہونا شرط نہیں ہے''۔ جیسے کہ راوئ حدیث میں یہ شرط نہیں ہے اور مناسب ہے کہ مفتی بھی ان باتوں میں راوئ حدیث کی طرح ہو کہ فتویٰ دینے میں رشتہ داری یا دشمنی اور کسی نفع کا حصول یا نقصان کو دور کرنا' اس پر اثر انداز نہ ہو۔ کیونکہ مفتی بھی ان لوگوں کے حکم میں ہے جو شریعت کے ایسے احکام بتاتے ہیں جو کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں' تو وہ اس بات میں راوئ حدیث کے طرح ہے نہ کہ گواہ کے طرح۔ اور مفتی کے فتویٰ میں دوسرے پر لازم کرنا نہیں پایا جاتا بخلاف قاضی کے'' ح ۱۰

(کہ گواہ کی گواہی اور قاضی کا فیصلہ اپنے اصول وفروع کے حق میں معتبر نہیں ہے' لیکن مفتی کا فتویٰ ایسے مواقع میں درست ہوگا۔ اس عبارت کا مقصد مفتی اور گواہ اور قاضی کے احکام کے درمیان فرق بیان کرنا ہے)۔

(از حاشیہ:

ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات ذکر فرمائی ہے وہ اصل حکم ہے لیکن مفتی کو بھی چاہیے کہ وہ تہمت کی جگہوں (مثلاً قریبی رشتے داروں کے حق میں ایسا فتویٰ دینا، جس سے کسی کا حق متاثر ہوتا ہو) سے جہاں تک ہو سکے بچتا رہے اور جب کوئی ایسا موقع پیش آجائے تو وہ فتوی دینے کی ذمہ داری کسی اور کو سونپ دے (واللہ سبحانہ اعلم)۔

(مفتی اور قاضی کے درمیان دیگر وجوہ فرق اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل سے گزر چکی ہیں)۔

علم کی شرط اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الاعراف:۳۳)

(آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو اُن میں سے جو کھلی ہوئی ہیں وہ بھی اور اُن میں سے جو پوشیدہ ہیں وہ بھی' اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور

اس بات کو بھی کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند (اور دلیل) نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو بھی (حرام کیا ہے) کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات کی نسبت کرو جو تمہیں معلوم ہی نہیں)

اور رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الله لا يقبض العلم انتزاعاً ينتزعه من العباد ولكن يقبض العلم بقبض العلماء حتى اذا لم يبق عالماً اتخذ الناس رؤوساً جهالا فسئلوا فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا (ح ۲)

(اللہ تعالیٰ اس علم کو ایسے نہیں اٹھائیں گے کہ بندوں سے اس کو چھین لیں۔ لیکن علماء کے اٹھ جانے سے علم بھی اٹھتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کسی عالم کو باقی نہیں رکھیں گے، تو لوگ جاہل لوگوں کو اپنا راہنما بنالیں گے، ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ پھر وہ خود بھی گمراہ ہوجائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے)۔

اور اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"من أُفتي بغير علم كان اثمه على من افتاه"۔ (ح ۳)

(جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ اسی شخص کو ملے گا جس نے اُسے فتویٰ دیا ہے)۔

فتویٰ کا کام کرنے کیلئے علم کی شرط ایسی بدیہی بات ہے کہ جس کیلئے کوئی بہت سارے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن علم کا وہ مطلوبہ درجہ کیا ہے جس سے انسان فتویٰ دینے کا اہل بن جاتا ہے؟ اس سلسلے میں اصولیین نے طویل ابحاث کی ہیں۔

متقدمین نے مفتی کیلئے مجتہد ہونے کی شرط عائد کی ہے۔ چنانچہ بہت سے فقہاء نے مفتی کی شرائط میں سے یہ بات ذکر کی ہے کہ وہ خود مجتہد ہو۔ لہٰذا مقلد کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو فتویٰ دے، اس کیلئے صرف اپنی ذات کی حد تک تقلید کے طور پر عمل کرنا جائز ہے۔

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے 'ماوراء النہر میں شافعیہ کے امام حلیمی رحمہ اللہ اور کتاب بحر المذہب کے مصنف قاضی ابوالمحاسن رویانی رحمہ اللہ (ت ۱۲۹) (ح ۴) اور دیگر حضرات سے یہ بات نقل کی ہے کہ مقلد کیلئے اس

مسئلہ میں جس میں وہ تقلید کر رہا ہے، فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

(از حاشیہ:

بحر المذہب کتاب کا پورا نام بحر المذہب فی الفروع ہے اور علامہ رویانی رحمہ اللہ کا سن وفات ۵۰۲ھ ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے یہ کتاب واقعی اپنے نام کی طرح سمندر ہے)۔

پھر فقہاء نے زمانے کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس میں وسعت پیدا کی اور مجتہدین کے کم ملنے اور نایاب ہونے کی بناء پر بھی فقہاء نے غیر مجتہد کیلئے اس طرح فتویٰ دینے کو جائز قرار دیا ہے کہ وہ کسی مجتہد کے مذہب کے مطابق مسائل کی تخریج کرے۔ شیخ ابو محمد الجوینی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے الرسالۃ کے شرح میں اپنے استاد ابو بکر القفال مروزی رحمہ اللہ (ت ۴۳۰ھ) سے یہ بات نقل کی ہے کہ جس شخص نے صاحبِ مذہب کے مذہب اور نصوص کو ذہن نشین کر لیا ہو، تو اس کیلئے ان کے مطابق فتویٰ دینا جائز ہے، اگرچہ وہ مذہب کی باریکیوں اور حقائق سے ناواقف ہو۔

شیخ ابو محمد رحمہ اللہ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی شخص کیلئے اس وقت تک دوسرے کے مذہب پر فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، جب تک وہ اس کا ماہر نہ ہو اور اس کی باریکیوں اور حقائق سے آگاہ نہ ہو۔ جیسا کہ عامی شخص جو مختلف مفتیوں کے فتاویٰ کو جمع کرلے تو اس کیلئے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اس کا ماہر ہو تو پھر اس کیلئے فتویٰ دینا جائز ہوگا۔

اسی طرح ابن قیم رحمہ اللہ نے اختلاف نقل کیا ہے اور پھر اس بات کو ترجیح دی ہے کہ غیر مجتہد کیلئے اس وقت فتویٰ دینا جائز ہے جب اس کی ضرورت ہو اور کوئی مجتہد عالم موجود نہ ہو۔ (ح ۵)

ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اگر فتویٰ کے کام کو کسی مجتہد کے حصول پر ہی موقوف رکھا جائے تو اس سے شدید تنگی لازم آئے گی۔ اور اس کے نتیجہ میں انسانوں کو ان کی خواہشات میں کھلا چھوڑ دینا لازم آئے گا۔ لہٰذا قول مختار یہ ہے کہ آئمہ متقدمین سے کوئی مسئلہ روایت کرنے والا، جب عادل بھی ہو اور اپنے امام کی بات سمجھنے کی قدرت بھی رکھتا ہو، پھر وہ کسی مقلد کیلئے امام کا قول نقل کرے تو اس پر اکتفاء کیا جائے گا، کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے کہ جس سے عامی شخص کو یہ غالب گمان ہو جاتا ہے کہ یہی اللہ کا حکم ہے۔
> اور ہمارے زمانے میں تو فتویٰ کی اس قسم کے درست ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔
> پھر اس کے ساتھ ساتھ بدیہی طور پر یہ بات بھی معلوم ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی خواتین (یعنی

صحابیات رضی اللہ عنہن) حیض وغیرہ کے احکام میں حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کی بتائی ہوئی باتوں کی طرف ہی رجوع کرتی تھیں اور ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذی کا مسئلہ پوچھنے کیلئے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔

ہمارے زیر بحث مسئلہ میں تو ایسا کرنا (دوسرے سے پوچھ کر عمل کر لینا) زیادہ واضح ہے' کیونکہ اُس وقت نبی کریم ﷺ سے براہ راست رجوع کرنا ممکن تو تھا، جب کہ اب مقلد کیلئے گزشتہ آئمہ سے مراجعت کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اور آج تو تمام لوگوں کا قاضیوں کے احکام نافذ کرنے پر اتفاق ہے، حالانکہ اب قاضیوں میں اجتہاد کی شرائط نہیں پائی جاتیں''۔ (ج، ۶)

لیکن مقلد کیلئے افتاء کے جائز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے امام کے فتویٰ کو نقل کر رہا ہے اور وہ بذاتِ خود مفتی نہیں ہے۔ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس طرح فتویٰ دینا جائز نہیں تو ان کی بات کا مطلب یہ ہے (مفتی مقلّد) اس فتویٰ کو ایسی شکل میں ذکر نہ کرے کہ گویا وہ اپنی طرف سے فتویٰ دے رہا ہے، بلکہ اس فتویٰ کی نسبت دوسرے کی طرف کرتے ہوئے اسے اپنے امام سے جن کی وہ تقلید کر رہا ہے' نقل کرے۔ اس بناء پر ہم نے مفتی کی اقسام میں سے جو مقلدین کو شمار کیا ہے تو وہ (مقلدین) حقیقت میں مفتیوں میں سے نہیں ہوتے لیکن چونکہ یہ اصل مفتیوں کے قائم مقام ہو گئے ہیں اور انہی کی طرف سے یہ ذمہ داری ادا کر رہے ہیں، لہٰذا ان کو بھی انہی کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ فتویٰ دینے میں ان مقلد مفتیوں کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ یہ یوں کہہ دیں مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے یا یوں کہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کا مقتضاء یہ ہے یا ایسے دیگر الفاظ استعمال کرے۔

اور جو مقلد مفتی' فتویٰ کی نسبت اپنے امام کی طرف صرف اس وجہ سے چھوڑ دیتا ہے کہ، جو بات ظاہری حالت سے معلوم ہو رہی ہو اُسی پر اکتفاء کرتے ہوئے الفاظ میں اس کی تصریح نہیں کیا کرتے، تو ایسی صورت میں ترکِ نسبت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے''۔ (ج، ۷)

ابن الصلاح رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ جب کوئی مفتی اس بات میں مشہور ہو کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا امام شافعی رحمہ اللہ

کے مذہب پر فتویٰ دیتا ہے تو اب ہر مرتبہ اس بات کو صراحتاً ذکر کرنے کا کوئی داعیہ اور ضرورت نہیں ہے۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے شاگرد ابن امیر حاج رحمۃ اللہ علیہ (ت ۱۳۱) نے اس موضوع پر طویل گفتگو کی ہے اور ابن امیر حاج رحمۃ اللہ علیہ آخر کار جس نتیجہ پر پہنچے ہیں' بعینہٖ وہ ہی ہے جسے ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے۔

ابن امیر حاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں نیز مصنف رحمۃ اللہ علیہ (یعنی ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ) کی شرح ہدایہ میں، انہوں نے یہ بات نقل کرنے کے بعد کہ ''فتویٰ صرف مجتہد شخص ہی دے سکتا ہے'' فرمایا ہے:

''اصولیین کی آراء اس پر متفق ہیں کہ مفتی صرف مجتہد ہی ہوگا۔ وہ غیر مجتہد شخص جس نے مجتہدین کے اقوال یاد کر رکھے ہوں وہ مفتی نہیں ہے۔ اور اس پر یہ لازم ہے کہ جب اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ مجتہد کے قول ہی کو مثلاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو نقل کرتے ہوئے ذکر کر دے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہمارے زمانے میں حقیقی فتویٰ نہیں پایا جاتا بلکہ یہ تو صرف مفتی کے کلام کو نقل کر دینا ہے تا کہ مستفتی اس پر عمل کر لے۔ مفتی مقلد کیلئے مجتہد سے مسئلہ نقل کرنے کا طریقہ کار ان میں سے ایک صورت یقیناً ہوگی۔ یا تو خاص اس مسئلہ کی سند مجتہد تک اس مفتی مقلد کے پاس موجود ہو اور یا مفتی مقلد یہ مسئلہ متداول اور مشہور کتاب سے لے رہا ہو، جیسے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اور اسی طرح مجتہدین کی دیگر مشہور تصنیفات' کیونکہ یہ صورت آئمہ مجتہدین کی طرف نسبت میں خبر متواتر یا خبر مشہور کے درجہ میں ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی ذکر کیا ہے''۔ (ح ۸)

(ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے "التحبیر" میں متواتر کی تعریف یوں کی ہے:

فاالمتواتر خبر جماعة يفيد العلم لا بالقرائن المنفصلة

یعنی متواتر ایسی بڑی جماعت کی خبر کو کہتے ہیں کہ جسے سنتے ہی علم کا فائدہ حاصل ہو جائے اور اس کیلئے دیگر جدا قرائن کو دیکھنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

گویا خود اس خبر کے راوی ہی اتنے زیادہ ہوں کہ ان سب کا غلط بیانی پر اتفاق کر لینا محال ہو...... چند صفحات کے بعد مشہور کی تعریف کرتے ہوئے ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وهو ما كان آحاد الاصل متواتراً في القرن الثاني والثالث

یعنی وہ خبر جو اصل کے اعتبار سے تو خبر واحد ہو اور بعد میں دوسری اور تیسری صدی ہجری میں متواتر

بن جائے ۔

(التحریر مع التقریر والتحبیر، الباب الثالث، السنة، فصل فی حجیة السنة وضرورتها، ۲/۲۹۰، طبع المعروفیہ کوئٹہ)

کیا کسی مذہب پر فتویٰ دینے کیلئے اس کی دلیل کا جاننا بھی ضروری ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر مجتہدین سے یہ بات منقول ہے کہ ان حضرات نے فرمایا:

لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا؛ ح، ۹

(کسی شخص کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کس دلیل کی بنیاد پر یہ قول اختیار کیا ہے)۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس قول کی تفصیل میں دو احتمال ذکر کیے ہیں:

(۱)......اس قول کا مخاطب مجتہد مطلق ہے کہ اس کیلئے کسی امام کی تقلید اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کی دلیل اس پر واضح نہ ہو جائے۔

(۲)......اس بات کا مخاطب مجتہد فی المذہب ہے کہ اس کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے امام کے مذہب پر نئے مسائل کی تخریج کرے، سوائے اس کے کہ اس کے سامنے اصل مسئلہ اور وہ قول جس پر وہ نئے مسئلہ کی تخریج کر رہا ہے، اس میں اپنے امام کی دلیل تحقیق سے اُسے معلوم ہو جائے تو اس کے بعد ہی وہ نئے مسائل کی تخریج کر سکتا ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کیوں کہ تخریج کا کام تو اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ پہلے وہ اصل حکم جس پر تخریج کی جارہی ہے اور اس کی بنیاد جس دلیل اور علت پر رکھی گئی ہے اُس کو جان لیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں احتمالات میں کوئی تعارض نہیں اور ممکن ہے کہ دونوں ہی صورتیں آئمہ مجتہدین کی مراد ہوں۔

صحیح بات یہ ہے کہ افتاء اپنے حقیقی معنی میں صرف مجتہد ہی کا کام ہے خواہ وہ مجتہد مطلق ہو یا مجتہد فی المذہب ہو۔ اور جو شخص مجتہد فی المذہب بھی نہ ہو تو وہ حقیقت میں مفتی نہیں بلکہ صرف اپنے امام کے فتوی کو نقل کرنے والا ہے۔ جیسا کہ ابن الصلاح رحمہ اللہ اور ابن ہمام رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے اس بات کی تصریح کی ہے۔

(ابن الصلاح رحمہ اللہ کی عبارت تو ابھی قریب ہی گزر چکی ہے اور ابن ہمام رحمہ اللہ نے اس بات کی تصریح "التحریر"

میں کی ہے، تفصیل کیلئے دیکھیں "التحریر" کی شرح "التیسیر" (۲۴۹/۴) جو امیر بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ہے)

مفتی مقلد کیلئے اپنے امام کا فتویٰ نقل کرتے وقت کیا شرائط ملحوظ رکھی چاہئیں

جب غیر مجتہد مفتی اپنے امام کا قول نقل کرے گا تو یہ بلا سوچے سمجھے صرف نقل کر دینا نہیں ہے بلکہ یہ کام بڑے علم، انتہاء کی ذہانت اور ملکۂ فقہیہ کا محتاج ہے اور ان کے بغیر فتویٰ کا درست ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسا فتویٰ تب ہی درست ہوگا جب چند امور کا خیال رکھا جائے:

(۱)...... پہلی بات

یہ لازمی ہے کہ مجتہد کے مذہب کی تنقیح اچھے طریقہ سے کر لی جائے اور اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ اس مسئلہ کی نسبت ان کی طرف صحیح ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات امام مجتہد سے نقل کرنے میں بہت سی غلطیاں پائی جاتیں ہیں۔ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی اغلاط کی کئی مثالیں ذکر کی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ متاخرین کی کئی کتابوں میں کوئی قول نقل ہوتا ہوا چلا آتا ہے حالانکہ وہ قول غلط ہوتا ہے۔ اور اصل غلطی اس میں سب سے پہلے لکھنے والے نے کی ہوتی ہے۔ بعد میں جو حضرات آتے ہیں وہ اُن ہی سے نقل کرتے ہیں اور اسی طرح بعض مصنفین، بعض سے نقل کرتے چلے جاتے ہیں''۔

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو متعدد مثالیں بیان فرمائی ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ السراج الوھاج اور قدوری کی شرح الجوھرۃ النیرۃ میں لکھا ہوا ہے کہ مفتی بہ قول یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کیلئے کسی کو اجرت پر لینا صحیح ہے۔

اس بات کو بعد میں آنے والے بہت سے حضرات نے نقل کر دیا حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ دراصل مفتی بہ قول قرآنِ مجید کی ''تعلیم'' پر اجرت کے معاملہ کا صحیح ہونا ہے نہ کہ قرآن مجید کی ''تلاوت'' پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جواز کا فتویٰ ضرورت پر مبنی ہے جو تعلیم قرآن، امامت اور اذان میں پائی جاتی ہے لہٰذا جہاں ضرورت نہ پائی جاتی ہو (جیسے تلاوتِ قرآن) تو وہاں یہ جواز کا فتویٰ بھی جاری نہیں ہوگا۔

ایسی ہی غلطیوں کی ایک اور مثال وہ مسئلہ ہے جو فتاوی بزازیہ میں مذکور ہے کہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والے کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ مسئلہ دراصل ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس عبارت کی بناء پر لکھا گیا ہے جو اُن کی کتاب "الصارم المسلول" میں ہے۔ اُن سے یہ بات ابن ہمام رحمہ اللہ وغیرہ نے یوں ہی نقل کر دی۔ حالانکہ حنفیہ میں سے متقدمین کی کتابوں میں، مثلاً امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب الخراج، شرح الطحاوی اور امام سغدی رحمہ اللہ (ت۴۶۱ھ) کی "النتف" میں جو مسئلہ مذکور ہے وہ یہ ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول کی جائے گی اور "توبہ کا قبول نہ کرنا" تو ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کو حنفیہ کے علاوہ دیگر حضرات کے مذہب کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

انہی غلطیوں میں سے ایک مثال وہ مسئلہ ہے جو الدرر، اور ابن ملک رحمہ اللہ (ت۸۸۵ھ) کی شرح المجمع میں ہے اور تنویر الابصار میں بھی اس کی پیروی کی گئی ہے کہ مرتھن شخص اگر گواہوں کے بغیر رہن کی ہلاکت کا دعویٰ کر دے تو وہ ضامن ہوگا اور اگر وہ اس پر گواہ قائم کر دے تو پھر وہ کسی چیز کا ضامن نہیں ہوگا۔ حالانکہ مذہب حنفی کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ مرتھن، شئی مرھونہ کی قیمت اور دَین میں سے جو کم تر ہو اس کا ضامن ہوگا اور اس میں اس سے کوئی فرق نہیں ہوگا کہ مرتھن، مرہونہ چیز کی ہلاکت کو گواہوں کے ذریعہ ثابت کرے یا نہ کرے۔ ابن عابدین رحمہ اللہ نے اپنے الدر المختار پر تحریر کردہ حاشیہ میں اس پر تنبیہ کی ہے۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس حاشیہ کو لکھتے وقت اس بات کا التزام کیا ہے کہ متقدمین کی اُن اصل کتابوں کی طرف مراجعت کی ہے، جو مذہب حنفی کا مأخذ ہیں۔ اسی لیے یہ حاشیہ فقہ حنفی کے بہترین اور معتبر مآخذ میں سے شمار ہوتا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

(ابن عابدین رحمہ اللہ نے یہ تفاصیل شرح عقود رسم المفتی کے اشعار میں سے شعر نمبر ۹ اور ۱۰ کے ذیل میں ذکر فرمائی ہیں)۔

(۲)......دوسری بات

فقہی کتب کا ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فقہاء کوئی بات بغیر کسی قید کے ذکر کر دیتے ہیں اور اُن کا مقصد ایک مقید صورت ہوتی ہے تو وہ اُن قیودات کے دوسرے مقامات میں مذکور ہونے پر اعتماد کر لیتے ہیں یا کبھی وہ کتاب پڑھنے والے صاحبِ علم کی سمجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ضروری قیودات چھوڑ دیتے ہیں، اب فقہ کی کتاب کا از خود صرف مطالعہ کر لینے سے کبھی انسان

خلافِ مقصود بات سمجھ لیتا ہے۔ ہاں جو شخص فقہی کتب کو ماہر اساتذہ سے پڑھتا ہے تو وہ ایسے مقامات پر متنبہ ہونے کی وجہ سے غلطی کا شکار نہیں ہوتا۔ لہٰذا فتویٰ دینے کیلئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں بلکہ کسی ماہر استاد سے فقہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

(۳)......تیسری بات

کبھی کسی مسئلہ میں مجتہد کی مختلف روایات پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ ترجیح کبھی مجتہد سے نقل کی قوت اور شہرت کے بناء پر ہوتی ہے اور کبھی اصحاب الترجیح دلیل کی قوت کے بناء پر کسی ایک روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان شاء اللہ تفصیل آگے آئے گی۔ تو مفتی اگرچہ وہ صرف ناقل ہی ہو لیکن اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ اس بارے میں خوب تحقیق کرے کہ کون سی روایت راجح ہے۔

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ (ت ۱۰۸۱ھ) سے یہ بات نقل کی ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف فیہ روایات میں سے راجح کو مرجوح سے جدا کرنا اور قوت اور ضعف کے اعتبار سے ان کے مراتب کو پہچاننا، یہ تحصیل علم میں جِدّ و جہد کرنے والوں کی انتہائی چاہت ہوتی ہے۔ لہٰذا مفتی اور قاضی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جواب میں خوب تحقیق کرے اور اٹکل سے کام نہ لے کیونکہ ایسا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کا ڈر ہے''۔

(شرح عقود تحت شعر، ۹۔۱۰)

(۴)......چوتھی بات

مفتی اگرچہ ناقل ہی ہو اس کیلئے یہ کافی نہیں کہ وہ مجتہد سے مروی صحیح اور راجح قول سے آگاہ ہو جائے، بلکہ ساتھ ہی وہ اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اس قول کو اُس جزئی واقعہ پر منطبق کرے، جس کے بارے میں اس سے سوال کیا گیا ہے۔ اور اس کام کیلئے فہم صحیح اور فقہی ملکہ کا پایا جانا لازمی ہے۔ کیوں کہ ایسا مفتی (جو ناقل ہو) اگرچہ وہ احکام شریعت کو جاننے میں مجتہد کا درجہ نہیں رکھتا لیکن اجتہاد کی ایک قسم وہ ہے جس کے بغیر اس کی بھی خلاصی نہیں ہو سکتی۔

یہ اس بارے میں اجتہاد کرنا ہے کہ جس واقعہ کے بارے میں اُس سے سوال کیا گیا ہے، اس کا تعین کرے اور پھر

حکم شرعی اس پر منطبق کرے اور اجتہاد کی اس قسم کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہے گا۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (ت، ۷۹۰ھ) نے اجتہاد کی اس قسم کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے اور چونکہ ان کے کلام میں بہت سے دیگر فوائد بھی آ گئے ہیں، اس لیے ہم اُن کی بات انہی کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''اجتہاد کی دو قسمیں ہیں، اس کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا اُس وقت تک منقطع ہونا ممکن ہی نہیں جب تک خود تکلیف (شرعی ذمہ داری) ختم نہ ہو جائے اور ایسا تو صرف قیامت آنے پر ہی ہو گا۔ اجتہاد کی دوسری قسم وہ ہے جس کے بارے میں ممکن ہے کہ دنیا کے فناء ہونے سے پہلے بھی ختم ہو جائے۔ (تحقیق مناط وغیرہ کا مفہوم ''تشریحات نمبر ۱۶'' پر ملاحظہ فرمائیں)

اجتہاد کی پہلی قسم وہ ہے جو تحقیق مناط (تحقیق علت) سے متعلق ہے اور پوری امت میں اس اجتہاد کو قبول کرنے کی بابت کوئی اختلاف نہیں۔ اور اجتہاد کی اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ حکم اپنے شرعی مفہوم کے ساتھ ثابت ہو لیکن اس بارے میں غور و فکر کرنا باقی ہو کہ اس کے محل (اور مصداق) کی تعیین کی جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب شارع جل شانہ نے یہ فرمایا کہ:

واشهدوا ذوی عدل منکم (طلاق، آیت ۲)

(اور تم میں سے دو عادل شخص گواہی دیں)۔

اب ہمیں عدالت کے شرعی معنی تو معلوم ہیں، لیکن ہم اس بات کے محتاج ہیں کہ یہ تعیین کی جائے کہ کس میں عدالت کی یہ صفت پائی جاتی ہے؟ اور پھر لوگ عدالت اور دیانتداری کے وصف میں سب ایک معیار کے نہیں ہوتے، بلکہ ان میں باہمی بہت واضح فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عادل لوگوں کے حالات پر غور کیا تو ہمیں یہ پتہ چلا کہ عادل لوگوں کے دو انتہائی درجات ہیں (ایک انتہائی بلند اور دوسرا انتہائی پست) اور ایک درمیانہ درجہ ہے...... اور یہ درمیانہ درجہ ہی اپنے اندر پیچیدگی رکھتا ہے تو اسی کو سمجھنے کیلئے لازمی ہے کہ انسان اپنی وسعت کے مطابق حد درجہ کوشش کرے اور یہ ایسا اجتہاد ہے کہ حاکم کو ہر گواہ کے معاملے میں بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔

جیسے کسی شخص نے اپنے مال کی وصیت فقراء کیلئے کی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کے پاس کچھ نہیں ہے، تو ان پر بھی فقر کا لفظ صادق آئے گا اور وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں وصیت کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہوں گے جو

اگر چہ نصاب کے مالک نہیں لیکن انہیں کوئی ضرورت یا فقر درپیش نہیں اور ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان بہت سے درجات ہونگے ......تو اس بارے میں غور کیا جائے گا کہ ان درمیانی درجات پر فقر کا حکم غالب ہے یا غناء کا حکم؟

اسی طرح بیویوں کے نفقات (خرچہ) کی مقدار مقرر کرنے کے بارے میں بھی اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ کیونکہ اس میں جس پر خرچ کیا جارہا ہے اور جو خرچ کرنے والا ہے، دونوں کے حال پر غور کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور حالات زمانہ وغیرہ کو بھی دیکھنا ہوگا۔

ایسے دیگر بہت سے امور ہیں جن کو گنتی کر کے منضبط طور پر نہیں بیان کیا جاسکتا اور نہ ہی اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں پوری بات کرنا ممکن ہے۔ تو ایسی صورتوں میں ممکن ہی نہیں کہ تقلید سے کام چل جائے' کیونکہ تقلید کا تصور تو صرف اس کے بعد ہی ہوسکتا ہے کہ جس حکم میں تقلید کی جارہی ہے پہلے اس حکم کی علت کی تحقیق کی جائے اور یہاں (جزئی واقعات میں) تو ابھی تک علت ہی کا تحقق نہیں ہوا، کیوں کہ نت نئے پیش آنے والے مسائل کی ہر صورت بذات خود ایک الگ ایسا جدا مسئلہ ہوتی ہے کہ پہلے اُس کی نظیر پیش نہیں آئی ہوتی۔ اور اگر کبھی حقیقت میں اُس جیسا واقعہ پیش آیا بھی ہو تو وہ ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر صورتِ مسئلہ میں اجتہاد کے ذریعہ غور و فکر کرنا ضروری ہے اور اسی طرح اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ہمارے سامنے بھی اس جیسا واقعہ پیش آچکا ہے تو پھر بھی اس بات میں غور کرنا پڑے گا کہ یہ موجودہ مسئلہ اُس پہلے مسئلہ جیسا ہے یا نہیں؟ اور یہ غور و فکر بھی تو اجتہادی نوعیت کا ہوگا......

اس سلسلے میں آپ کیلئے یہ بات کافی ہے کہ شریعت نے ہر ہر جزئی واقعہ کے حکم کو الگ الگ صراحت سے بیان نہیں کیا بلکہ شریعت نے تو کچھ ایسے قواعد کلیہ اور مطلق عبارات ذکر کردی ہیں جو نا قابلِ شمار صورتوں پر مشتمل ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ہر معین صورتِ مسئلہ کیلئے کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے واقعہ میں نہیں ہوتی، اگر چہ یہ خصوصیت صرف نفس تعیین میں ہی ہو اور ہر امتیازی خصوصیت مطلق حکم لگانے کیلئے معتبر نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ امتیازی خصوصیت مطلقاً ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اس کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں، جن دونوں کے درمیان ایک ایسی تیسری قسم ہوتی ہے جو پہلے دونوں جانبوں سے کچھ

کچھ حصہ لیتی ہے۔لہٰذا موجودہ اور متعین مسائل کی شکلوں میں سے کوئی ایسی صورت نہیں بچتی کہ جس میں عالم کو آسان یا مشکل غور و فکر نہ کرنا پڑے، یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ صورت کس دلیل کے تحت داخل ہو رہی ہے۔

پس اگر تم دونوں اطراف کی مشابہت کا لحاظ رکھتے ہوئے حکم اخذ کرو گے تو معاملہ بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔اور یہ ساری باتیں ہر اُس شخص کیلئے واضح ہیں جس کو مضبوط علم حاصل ہو......پس خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نگران، حاکم اور مفتی بلکہ ہر مکلف شخص کیلئے اپنی ذات کی حد تک ایسا اجتہاد کرنا ضروری ہے...... اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ اجتہاد بھی ختم ہو چکا ہے تو پھر احکام شریعت مکلف لوگوں کے افعال پر صرف ذہن ہی میں منطبق ہو سکیں گے (اور عملی طور پر اُن پر عمل کرنا بالکل ناممکن ہو جائے گا) کیوں کہ احکام شریعت تو مطلق اور عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں اور جب اسی طرح ان کو افعال مطلقہ پر منطبق کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ بھی صرف یہی ہو گا۔افعال جب (خارجی طور پر) وجود میں آتے ہیں تو مطلق نہیں رہتے بلکہ متعین اور متشخص شکل میں ہوتے ہیں لہٰذا ایسے افعال پر حکم بھی صرف اُسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس متعین فعل اور واقعہ کو کوئی مطلق یا عام شرعی حکم شامل ہے۔ایسا کرنا کبھی تو بالکل آسان ہوتا ہے اور کبھی آسان نہیں ہوتا' بہر صورت یہ بھی اجتہاد ہے'' ۔ ح،۱۰

(۵)......پانچویں بات

فتویٰ کبھی مختلف افراد کے مخصوص حالات کی بناء پر مختلف بھی ہو سکتا ہے اور کبھی عرف اور حالات زمانہ کے لحاظ سے بھی فتویٰ مختلف ہو جاتا ہے، تحقیق مناط (یعنی علت کی تحقیق) کے طور پر۔جیسا کہ آگے چل کر اس کی مستقل بحث آئے گی' ان شاءاللہ۔

(۶)......چھٹی بات

بہت سے مسائل ہر دور میں نئے پیش آتے رہتے ہیں اور بالخصوص ہمارے دور میں تو ایسے مسائل بکثرت پیدا ہوئے ہیں۔چونکہ گزشتہ دور کے فقہاء مجتہدین کے زمانے سے اب زندگی کے طور طریقے بڑی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں' لہٰذا ایسے جدید مسائل کا کوئی صریح تذکرہ کتبِ فقہاء میں موجود نہیں کہ فتاوی میں اُسے بعینہ نقل کر دیا جائے۔اس لیے

موجودہ دور کے مفتی کو ایسے مسائل کا حکم جاننے کیلئے ضرورت پیش آتی ہے کہ یا تو وہ فقہاء کے کلام میں ذکر کردہ عمومی عبارات کو ایسے مسائل پر منطبق کرے یا پھر جدید مسائل کے نظائر اور اشباہ (یعنی ملتے جلتے مسائل) پر قیاس و استنباط سے کام لے۔ یہ ایسا باریک بینی کا کام ہے جس کیلئے پختہ بصیرت اور مبادیٔ شریعت (یعنی قرآن وسنت) کا فہمِ صحیح ہونا ضروری ہے۔

ان چھ امور کو دیکھتے ہوئے مفتی کیلئے یہ ضروری ہے، اگرچہ وہ مقلد ہی ہو کہ وہ ان تمام معاملات میں بصیرت حاصل کرے۔ اور ایسی بصیرت صرف کتابوں کے مطالعہ کر لینے یا فقہی جزئیات کے حفظ کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کیلئے تو ایسے فقہی ملکہ اور تجربہ کی ضرورت پیش آتی ہے جو عام طور پر ماہر اساتذہ کے سامنے طویل عرصے تک فتوی کا کام کرنے اور اس کی مشق کئے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ اسی لیے فقہاء نے فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جس نے فقہی کتابوں کو پڑھ رکھا ہو، وہ فتویٰ دینے کا اہل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مستقل طور پر اس نے اِفتاء کی مہارت حاصل کی ہو اور علماء بھی اس کے حق میں یہ گواہی دیتے ہوں کہ یہ واقعی فتویٰ دینے کا اہل ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''ہر وہ شخص جو پسند کرتا ہو کہ وہ حدیث بیان کرے اور فتویٰ دینے کا کام کرے، تو اس کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ امور سرانجام دے، جب تک کہ وہ اس سلسلے میں صلحاء، اہلِ فضل اور مسجد کے ارباب حل وعقد سے مشورہ نہ کرلے۔ اگر وہ لوگ اس کو ان کاموں کا اہل سمجھیں تو یہ اس کام کیلئے بیٹھے اور میں خود تب تک اس مقصد سے نہیں بیٹھا، جب تک کہ اہلِ علم میں سے ستر مشائخ نے میرے بارے میں یہ گواہی نہیں دی کہ میں اس کام کا اہل ہوں''۔

ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ایک شخص امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مسئلہ پوچھنے آیا تو ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ جلدی سے آگے بڑھے اور اس شخص کو فتوی بتادیا''۔

اس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ غضب ناک ہو کر ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''اے عبدالرحمن! تو نے فتویٰ دینے کی جسارت کیسے کی؟''۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ جملہ بار بار فرما رہے تھے اور پھر کہا کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا تھا جب تک میں نے (اساتذہ ومشائخ سے) یہ نہیں پوچھ لیا کہ کیا میں فتویٰ دینے کا اہل ہوں؟۔

جب امام مالک رحمہ اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ یہ بات آپ نے کس سے پوچھی تھی؟

تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ''امام زہری رحمہ اللہ اور امام ربیعۃ الرائی رحمہ اللہ سے''۔ ح ۱۱

اسی بناء پر ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے' جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے ان کی یہ بات نقل کی ہے:

ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص جو بذات خود فقہی کتابوں کو پڑھتا ہے اور ان کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے کوئی ایسے ماہر استاذ نہیں ہیں جو اس کے سامنے دینی اور دنیاوی مسائل کی وضاحت کرتے ہوں۔ پھر جب ایسے شخص سے دینی اور دنیاوی مسائل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنے مطالعہ کتب پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں کو فتوی دے دیتا ہے اور ان سوالات کے جوابات دینے میں توقف نہیں کرتا، تو اس کیلئے ایسا کرنا جائز ہے؟ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا اس کیلئے جائز نہیں ہے تو وہ شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کس سزا کا مستحق ہے؟

ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ نے اپنے ان الفاظ سے اس سوال کا جواب دیا (اللہ تعالیٰ اس بات سے سب کو نفع پہنچائے)

''ایسے مذکورہ شخص کے لیے کسی صورت میں بھی فتویٰ دینا جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ تو عامی اور جاہل شخص ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ خود بھی اس کی حقیقت کو نہیں جانتا۔ بلکہ ایسا شخص جس نے معتبر مشائخ سے علم حاصل کیا ہو، اس کیلئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ ایک یا دو کتابیں دیکھ کر فتویٰ دے دے' بلکہ امام نووی رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ دس کتابیں دیکھ کر بھی فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھار دس یا بیس مصنفین بھی مذہب کے کسی ضعیف قول پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان کی تقلید جائز نہیں ہے۔

بخلاف ایسے ماہر شخص کے جس نے علم، اہلِ علم سے حاصل کیا ہو اور اُسے علم میں ذاتی ملکہ حاصل ہو چکا ہو تو وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کر سکتا ہے اور وہ ہی شخص مسائل اور متعلقہ باتوں کو قابل اعتماد طریقے سے جانتا ہے۔ ایسے اوصاف کا حامل شخص ہی لوگوں کو فتویٰ دینے کا اہل ہے، وہ اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ بندوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ بن سکتے اس کے علاوہ دیگر لوگوں میں سے اگر کوئی شخص اس عظیم منصب کو اختیار کرنے کی کوشش کرے تو اُسے ایسی سخت تعزیر اور شدید تنبیہ کرنا لازمی ہے جو اُسے اور اُس جیسے دیگر لوگوں کو ایسے قبیح کام سے روک دے، جس کے نتیجہ میں بے شمار مفاسد جنم لیتے ہیں''۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ ح ۱۲

خطیب بغدادی رحمہ اللہ الفقیہ والمتفقہ میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے حکمران کو چاہیے کہ وہ مفتیوں کے حالات کی چھان بین کرتا رہے۔ جو شخص فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اُسے اس کام پر برقرار رکھے اور جو اس کام کے لیے نا اہل ہو اس کو اس سے روک دے...... اور ایسے شخص کو اگر وہ باز نہ آئے تو سخت سزا سنائے...... حکمران جس شخص کو فتویٰ کے منصب پر فائز کرنا چاہتا ہو تو اس کے حالات سے باخبر ہونے کا اس کے لیے یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے اہل علم اور اپنے دور کے مشہور فقہاء سے اس شخص کے بارے میں پوچھے''۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''کسی شخص کیلئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو تب تک کسی کام کا اہل سمجھے، جب تک وہ اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے سے اس بارے میں نہ پوچھ لے''۔ ح ۱۳۰

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات نقل کی ہے کہ (شیخ امام یوسف بن ابی سعید احمد السجستانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۶۳۸ھ نے) منیۃ المفتی کے آخر میں فرمایا ہے:

''اگر کوئی شخص ہمارے علماء کی تمام کتابیں حفظ کر لے تب بھی اس کے لیے فتویٰ میں کسی کی شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ وہ فتوی کی راہنمائی پا سکے۔ کیونکہ بہت سے مسائل میں اہل زمانہ کی اُن عادات کے مطابق جواب دیا جاتا ہے جو شریعت کے مخالف نہ ہوں'' ح ۱۴۰

اسلاف کرام کے ان اقوال کی روشنی میں کسی شخص کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ فتویٰ دینے کا منصب بغیر اپنے مشائخ اور اساتذہ کی اجازت کے اختیار کر لے۔

دوسرا قاعدہ

الاصل الثانی

جب کسی مسئلہ میں تمام فقہاء حنفیہ متقدمین و متاخرین سب کا ایک ہی قول ہو تو اسی قول کو لینا متعین ہوگا۔

تشریح: مسائل کی مختلف طبقات میں تقسیم صرف انہی مسائل میں مؤثر ہوتی ہے، جن کے بارے میں مذہب میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ رہا وہ مسئلہ کہ جس کے بارے میں صرف ایک ہی قول ہو تو اسی قول کو لینا متعین ہوگا، خواہ وہ مسئلہ ظاہر الروایۃ سے مأخوذ ہو یا نوادر سے یا واقعات وفتاویٰ سے۔

ہاں صرف ایک صورت ہے کہ جب بدیہی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسئلہ کسی علت پر مبنی تھا اور وہ علت اب ختم

ہو چکی ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے (تغیر الاحکام بتغیر الزمان کی بحث میں) آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تیسرا قاعدہ

الاصل الثالث

"جب کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دو قول یا دو روایتیں ہوں تو ان دونوں میں سے اُسے لیا جائے گا جو مؤخر ہو اور یا اُسے لیا جائے گا، جس کا اختیار کرنا خود امام صاحب رحمہ اللہ سے ثابت ہو اور اگر امام صاحب رحمہ اللہ سے کسی قول کی ترجیح بھی ثابت نہ ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا جسے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہو۔ پھر وہ قول یا روایت ہے جسے امام محمد رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہو۔ اور پھر وہ جو امام زفر رحمہ اللہ اور حسن بن زیاد رحمہ اللہ کے ہاں مختار ہو۔ رہا یہ کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کی ترجیح کے درمیان اختلاف ہو جائے تو دیکھیں گے اگر مفتی اجتہاد کا اہل ہے تو اسے اختیار دیا جائے گا اور اگر وہ اہل اجتہاد میں سے نہیں ہے تو وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کرے گا"۔

قول اور روایت کا مفہوم تشریحات نمبر ۱۷ میں دیکھیں

تشریح کبھی یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بہت سے اقوال یا روایات منسوب ہوتی ہیں اور بسا اوقات ان میں باہم تعارض بھی ہوتا ہے۔ پھر اس کی کئی حالتیں ہیں:

(۱)......پہلی حالت

یہ ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے شروع میں ایک قول اختیار فرمایا پھر بعد ازاں اس قول سے دوسرے قول کی طرف رجوع فرمالیا۔ جیسے نبیذ سے وضو کرنے کے مسئلہ اور دیگر کئی مسائل میں ان سے مروی ہے، ایسی صورت میں قاعدہ یہی ہے کہ اُس آخری قول کو لیا جائے گا جس کی طرف امام صاحب رحمہ اللہ نے رجوع کیا ہو۔

نبیذ سے وضو کرنے کا مسئلہ تشریحات نمبر ۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں

(۲)......دوسری حالت

وہ ہے جسے ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں قولوں میں سے کسی کو ترجیح نہ ہو اور دونوں کے بارے میں آپ رحمہ اللہ کی رائے برابر ہو۔ ایسی صورت میں آپ فقہاء حنفیہ کو دیکھیں گے کہ وہ

کسی مسئلہ میں دو قول اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جس سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں قولوں کے مساوی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ (ح،۱۵)

ایسے موقع پر فقہاء یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں "وفی المسئلة عنه روایتان او قولان"

لہٰذا اگر ایسی صورتوں میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں قولوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا اور ترجیح دینا ثابت نہ ہو تو وہ قاعدہ جس پر فقہاء حنفیہ نے عمل کیا ہے اور ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے رسم المفتی کے اشعار میں ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ اس قول کو لیا جائے گا، جسے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہو۔ اور اگر ان سے بھی کسی قول کو اختیار کرنا ثابت نہ ہو تو اس قول کو لیا جائے گا جسے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہو۔ پھر وہ قول ہے جو امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے ہاں مختار ہو۔ یہ آخری دونوں آئمہ ہم مرتبہ ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ، امام حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ پر مقدم ہیں۔

(۳)......تیسری حالت

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور امام حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ کوئی قول بھی نہیں کہتے تھے، مگر یہ کہ درحقیقت وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ایک روایت ہوتی تھی۔

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے الحاوی القدسی سے نقل کیا ہے:

> ''امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تمام بڑے شاگردوں جیسے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، محمد رحمۃ اللہ علیہ، زفر رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہم نے کسی مسئلہ میں بھی کوئی بات نہیں کہی مگر یہ کہ وہ ہماری امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت تھی۔ اس بات پر انہوں نے شدید قسمیں بھی اٹھائیں۔ لہٰذا اب فقہ (حنفی) میں کوئی جواب اور کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی نسبت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نہ ہو' خواہ وہ کیسا ہی مسئلہ ہو اور دیگر آئمہ کی طرف جو بات بھی منسوب کی گئی ہے وہ صرف بطور مجاز کے ہے کہ انہوں نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی موافقت کی تھی''۔ (ح،۱۶)

علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق اس بات کا مطلب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کے سامنے کسی ایک مسئلہ کی بابت مختلف احتمالات کا اظہار کرتے تھے اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد انہی احتمالات میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے' تو ان کے اقوال میں سے ہر ایک درحقیقت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔ کیونکہ وہ ہی ان احتمالات کو ان کے دلائل کے ساتھ سب سے پہلے بیان کرتے تھے۔

یہاں ہم علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی بات انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کیونکہ اس میں چند دیگر فوائد بھی ہیں' وہ فرماتے ہیں:

''یہ دعویٰ کرنا کہ یہ تمام اقوال درحقیقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال ہیں، اس بات کا منشاء اور بنیاد وہ طریقہ کار ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کو فقہ کی مشق اور تربیت دینے کیلئے اختیار کیا تھا کہ وہ کسی ایک مسئلہ میں جتنے احکام کا احتمال پایا جاتا، ان میں سے کسی ایک حکم کی حجت بیان کرتے اور اسے دلائل سے مضبوط فرماتے۔ پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد وہ مسئلہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اس طرح دہراتے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کیے ہوئے دلائل کو رد کرتے ، پھر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ دوسرے احتمال کو دیگر دلائل سے ترجیح دیتے۔ پھر اس دوسرے احتمال کو اس طرح ختم فرماتے کہ کسی تیسرے احتمال کو دلائل سے ترجیح دے دیتے۔

یہ طریقہ کار آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو فقہ کی مرحلہ وار تربیت دینے کیلئے اپناتے تھے۔ بالآخر جب بحث ومباحثہ کے اختتام پر کوئی متعین حکم مقرر ہو جاتا تو اسے ایک خاص رجسٹر میں مدون کر لیا جاتا، جو ایسی ابحاث کے نتیجہ میں طے پانے والے مسائل کیلئے تھا۔ اب شاگردوں میں سے کوئی ایسے صاحب بھی ہوتے کہ جن کے نزدیک اپنے خصوصی اجتہاد کی بناء پر ان احتمالات مذکورہ میں سے وہ احتمال راجح ہوتا جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طے شدہ مسئلے سے مختلف ہوتا' تو یہ شاگرد کا ترجیح دیا ہوا قول ایک اعتبار سے ان کا قول ہوتا (کہ انہوں نے اسے ترجیح دی ہے) اور دوسرے اعتبار سے وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہوتا کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے اس احتمال کو پیدا فرما کر اس پر دلائل بیان کیے تھے' اگرچہ آخر میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس احتمال کو چھوڑ دیا تھا''۔

اس مقولے کا مصداق وہ بات بھی ہے جو ابن ابی العوام رحمۃ اللہ علیہ (ت ۳۳۶ھ) نے محمد بن احمد بن حماد رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے محمد بن شجاع رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بن ابی مالک رحمۃ اللہ علیہ ،عباس بن ولید رحمۃ اللہ علیہ ،

بشر بن ولید رحمہ اللہ اور ابو علی رازی رحمہ اللہ سے یہ بات سنی ہے، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

''میں نے جب بھی کوئی ایسا قول اختیار کیا ہے جس میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے تو درحقیقت وہ ایسا قول ہے کہ جسے پہلے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ارشاد فرما چکے تھے اور پھر انہوں نے اس سے اعراض کر لیا تھا''۔ (ح ۱۷)

علامہ کردری رحمہ اللہ (ت ۸۲۷ھ) نے نیساپوری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

''امام ابو یوسف رحمہ اللہ جب عہدہ قضاء پر فائز ہوئے تو (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پوتے) اسماعیل بن حماد رحمہما اللہ ان کے پاس آئے۔ اسی دوران دو فریقوں نے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ جب فیصلے کا وقت آیا تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے رائے کے مطابق فیصلہ کیا۔ تب اسماعیل رحمہ اللہ نے انہیں کہا کہ آپ تو اس مسئلہ میں امام صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کرتے تھے، اس پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ہم لوگ ان سے اختلاف صرف اس لیے کرتے تھے تاکہ اُن کے پاس جو علم ہے، اُس کا مزید اظہار کروائیں ورنہ جب فیصلہ کا وقت ہو تو ہماری رائے شیخ (امام صاحب رحمہ اللہ) کی رائے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی'' (ح ۱۸)

ایسی ہی بات امام محمد بن حسن رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔

ابنِ ابی عوام رحمہ اللہ نے ابراہیم بن احمد بن سہل رحمہ اللہ سے اور انہوں نے قاسم بن غسان رحمہ اللہ سے، انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے ابو سلیمان جوزجانی رحمہ اللہ سے اور انہوں نے محمد بن حسن رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بغداد تشریف لائے تو اُن کے سارے شاگرد جمع ہو گئے۔ جن میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام زفر رحمہ اللہ، امام اسد بن عمرو رحمہ اللہ اور آپ کے شاگردوں میں سے متقدمین دیگر فقہاء بھی تھے۔ ان سب حضرات نے ایک مسئلہ منتخب کیا اور اُسے دلائل سے خوب مؤید کیا اور اس مسئلے کو بیان کرنے میں خوب مبالغہ سے کام لیا۔ اور آپس میں یوں کہا کہ جب امام ابو حنیفہؒ تشریف لائیں گے، تو ہم سب سے پہلے اُن سے اسی مسئلہ کے بارے میں سوال کریں گے۔ جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ آ گئے تو سب سے پہلے اُن سے یہی مسئلہ پوچھا گیا۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے

اس کا جواب ان سب حضرات کی رائے کے خلاف دیا۔ تب حلقہ کے کناروں سے یہ آواز آنا شروع ہوگئی:

"یا ابا حنفیة بلد تلك الغربة"۔

(اے ابوحنیفہ! اجنبی شہر میں آکر آپ کے ذہن نے کام چھوڑ دیا ہے)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے لوگوں کو کہا: ذرا ٹھہرو! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جیسے آپ نے بتایا۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: تم لوگ دلیل سے بات کر رہے ہو یا بغیر کسی دلیل کے؟ لوگوں نے کہا: ہم دلیل کی بنیاد پر یہ کہہ رہے ہیں۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: اچھا اپنی دلیل بیان کرو۔ پھر امام صاحب رحمہ اللہ نے اُن سے مناظرہ کیا اور دلائل سے اُن پر غلبہ پالیا، یہاں تک کہ اُن سب کو اپنے قول کی طرف لے آئے اور اُنہیں یقین ہوگیا کہ غلطی انہی کی تھی۔ اب امام صاحب رحمہ اللہ نے انہیں فرمایا: کیا اب تم بات سمجھ گئے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! تب امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا تم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہو گے، جو یہ گمان کرے کہ تمہاری بات ہی صحیح تھی اور میرا قول غلط ہے۔ وہ لوگ کہنے لگے "ایسا نہیں ہوسکتا"۔ آپ کی بات کا درست ہونا تو ثابت ہو چکا ہے۔

اب امام صاحب رحمہ اللہ نے ان لوگوں سے دوبارہ مناظرہ کیا، یہاں تک کہ ان کو اپنے قول سے ہٹا دیا۔ وہ لوگ کہنے لگے: اے ابوحنیفہ رحمہ اللہ! آپ نے تو ہمارے ساتھ ظلم کیا، صحیح بات تو ہماری ہی تھی۔ اس پر امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اچھا تم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہو گے جو یہ گمان کرے کہ یہ قول بھی غلط ہے اور پہلا قول بھی غلط تھا اور صحیح جواب ایک تیسرا قول ہے؟"

لوگوں نے عرض کیا ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ تب امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اچھا غور سے سنو! اور امام صاحب رحمہ اللہ نے ایک نیا تیسرا قول پیش کر دیا اور اس پر سب سے مناظرہ کیا۔ یہاں تک کہ اُن کو اسی کی طرف لے گئے، اور سب کو اُس کا یقین ہوگیا۔ تب ان حضرات نے عرض کیا:

اے ابوحنیفہ! ہمیں صحیح بات بتا دیجئے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحیح قول تو وہ ہی پہلا قول ہے، جو میں نے تمہیں جواب میں بتایا تھا، فلاں فلاں دلیل کی بنیاد پر اور یہ مسئلہ ان تین احتمالات سے نہیں نکل سکتا اور تینوں صورتوں کی فقہ میں توجیہ اور گنجائش موجود ہے۔ لیکن صحیح قول ایک ہی ہے لہٰذا تم اس کو لے لو اور اس کے سوا سب کو چھوڑ دو''۔ (ح،۱۹)

امام صاحب رحمہ اللہ اسی طرح اپنے شاگردوں کو فقہ کی مشق کرواتے تھے اور ان کو تفقہ کے مراتب طے کرنے کی تمرین کرواتے تھے۔ اس طرح امام صاحب رحمہ اللہ مسائل میں بہت سارے احتمالات ذکر کر دیتے تھے اور کبھی اُن کے ایک شاگرد کے نزدیک جو قول راجح ہوتا، وہ دوسرے کے نزدیک راجح نہیں ہوتا' البتہ زیادہ تر احتمالات کو ترجیح دینے والے خود امام صاحب رحمہ اللہ ہی تھے۔ لہٰذا اُن اختلافی مسائل میں سے ایک بڑا حصہ وہ ہے جس کی خود امام صاحب رحمہ اللہ نے اپنے شاگردوں کو تذکیر کی۔ (ح،۲۰)

خلاصہ یہ ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہر مسئلہ میں انہی احتمالات میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار فرماتے تھے، جنہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ابتدائی طور پر پیش فرمایا تھا۔ پھر جس قول پر امام صاحب رحمہ اللہ کی رائے پختہ ہوگئی تو وہ ان کا مذہب بن گیا اور جس قول پر ان کے شاگردوں میں سے کسی کی رائے بن گئی تو وہ انہی کی طرف منسوب ہو گیا۔

ایسی حالت میں جب امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں کی رائے امام صاحب رحمہ اللہ کی طے شدہ رائے سے مختلف ہو تو اس بارے میں تین قول ہیں:

(۱)......ایسی صورت میں صرف امام صاحب رحمہ اللہ ہی کے قول کو لیا جائے گا۔

(۲)......مفتی کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس قول کو چاہے اختیار کرلے۔

(۳)......اگر مفتی اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے تو اُسے یہ اختیار دیا جائے گا اور اگر وہ اہلِ اجتہاد میں سے نہیں ہے تو وہ بہرحال امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کی ہی پیروی کرے گا، یہی بات صحیح ہے۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے علامہ بیری رحمہ اللہ (ت،۱۳۸۰) سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد کی دو قسموں میں سے ایک یعنی ''مجتہد فی المذہب'' ہے۔ جس کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے امام کے منصوص مسائل پر دیگر صورتوں کی تخریج کرنے پر قادر ہے، یا وہ شخص جو اپنے امام کے مذہب کا ایسا ماہر ہو کہ اپنے امام کے ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتا ہو''۔ (ح،۲۱)

چوتھا قاعدہ

الاصل الرابع

وہ مفتی جو مقلّد ہو، وہ صرف انہی اقوال پر فتویٰ دے گا، جنہیں مشائخ حنفیہ میں سے اصحاب الترجیح نے ترجیح دی ہو اور وہ مرجوح اقوال کو نہیں لے گا۔

تشریح اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب حنفی میں اصل یہی ہے کہ فتویٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہو۔ جیسا کہ ہم تیسرے قاعدے میں تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف کبھی مذہب کے اصحابِ ترجیح کچھ مسائل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ایسا کرنے کی وجہ جیسا کہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، یہ ہے:

''یہ حضرات امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل سے آگاہ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات کس بناء پر کہی ہے؟ اسی طرح یہ فقہاء امام صاحب کے شاگردوں کی دلیل بھی جانتے تھے ۔ تو کبھی انہوں نے شاگردوں کی دلیل کو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ ان فقہاء کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو صرف اس لیے چھوڑ دیا ہوگا کہ یہ اُن کی دلیل سے ناواقف تھے۔ کیوں کہ ہم دیکھ رہیں ہیں کہ انہوں نے اپنی کتابوں کو دلائل کے بیان سے لبریز کر دیا ہے اور پھر وہ فرماتے ہیں مثلاً ''فتوی یہاں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے'' (تو اُن کی یہ بات بے بنیاد نہیں ہوسکتی)۔

جب کہ ہم لوگ دلیل میں غور وفکر کرنے کی اہل نہیں ہیں اور نہ ہی ہم لوگ تفریعات قائم کرنے میں اور اصول کی معرفت میں اُن حضرات کے مرتبہ تک پہنچ سکتے ہیں' تو ہم پر لازم ہے کہ جو مسئلہ جیسے انہوں نے لکھ دیا ہے، ویسے ہی اس کو نقل کر دیں، کیوں کہ یہ حضرات مذہب کے ایسے پیروکار تھے جنہوں نے اجتہاد کے ذریعے مذہب کی تائید اور تہذیب کی خاطر خوب مشقت اٹھائی تھی۔ (ج۲۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ اصحاب ترجیح کی دو صفات ہوتی ہیں:

(۱)......ان حضرات نے اپنے آپ کو مذہب حنفی کی تنقیح اور تحریر کے لیے کھپا دیا تھا۔

(۲)......یہ حضرات اُن اہل اجتہاد میں سے تھے، جو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کی اس بات کے مخاطب تھے:

"لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا؟"

(کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتوی دے، جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے یہ قول کس دلیل کی بنیاد پر اختیار کیا ہے)۔

اور اس بنیاد پر کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں کے تمام اقوال امام صاحب رحمہ اللہ سے بھی روایت ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل ابھی تیسرے قاعدہ میں گزر چکی ہے، تو یہ اہل ترجیح ان اقوال میں سے اُس قول کو لے لیتے ہیں، جس کی دلیل اُن کے نزدیک راجح ہوتی ہے۔ تو وہ مسئلہ جسے یہ فقہاء ترجیح دے دیں، مفتی مقلد پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اُسی کی پیروی کرے۔ خواہ جس قول کو ترجیح دی گئی ہے وہ امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہو یا اُن کے شاگردوں میں سے کسی کا قول ہو۔ یہ حضرات کبھی تو صاحبین رحمہما اللہ کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں، کبھی صاحبین رحمہما اللہ میں سے ایک کے مذہب کو دوسرے کے مذہب پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ بعض مسائل میں تو ان فقہاء نے امام زفر رحمہ اللہ کے قول کو بیس (۲۰) مسائل میں ترجیح دی ہے، جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے ان مسائل کو ذکر کر کے اشعار کی شکل میں ردالمحتار کے "باب النفقہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ (ان بیس مسائل کی وضاحت بندہ نے "تشریحات نمبر۱۹" میں کر دی ہے)

جس مسئلہ کو اصحاب الترجیح نے ترجیح دی ہو وہ بقیہ تمام اقوال پر مقدم ہوگا۔ کیوں کہ ان فقہاء نے باوجود انتہائی تقویٰ اور مذہب حنفی کے التزام کے، جب اس قول کو ایسے اسباب کی بناء پر جو ان کے سامنے واضح ہو چکے تھے ترجیح دی ہے، تو ان کی ترجیح پر ہی عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ اسباب ترجیح، دلیل کی قوت، لوگوں کی ضرورت، زمانے کی تبدیلی اور عرف وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

اس بناء پر مرجوح قول کے مطابق عمل کرنا یا فتوی دینا جائز نہیں ہے سوائے چند مقامات کے، جن کی تفصیل ان شاء اللہ (گیارہویں قاعدہ میں) آجائے گی۔

پانچواں قاعدہ

(الاصل الخامس)

مفتی پر لازم ہے کہ وہ صرف انہی کتابوں پر اعتماد کرے جو نقلِ مذہب میں معتبر ہوں اور غیر معتبر کتابوں میں لکھے ہوئے اقوال پر اعتماد نہ کرے۔

تشریح مفتی کے لئے جو اہم ترین شرائط ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قابل اعتماد اور نا قابل اعتماد کتابوں کو پہچان لے۔ مذہب کی قابل اعتماد کتابیں وہ ہیں جن پر اصحاب مذہب میں سے ماہرین اور محققین اعتماد کرتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے ان کتابوں کو یقین واعتماد کے ساتھ لیا ہے اور اُن کے مطابق فتاویٰ دیئے ہیں۔ یہی بات بتانے کیلئے فقہاء نے متعدد ایسی کتابوں کے نام لکھے ہیں کہ جن کے مسائل پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، جب تک ان مسائل کا مأخذ یا اُن کی دلیل معلوم نہ ہو۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے ان غیر معتبر کتابوں کے یہ نام تحریر فرمائے ہیں:

شرح النقایه للقهستانی، جو جامع الرموز کے نام سے بھی مشہور ہے۔

نیز الدر المختار

الاشباہ والنظائر

شرح الکنز للملا مسکین رحمہ اللہ

القنیة للزاهدی رحمہ اللہ

النهر الفائق لابن نجیم رحمہ اللہ ت ۱۰۰۵ھ

شرح الکنز للعینی رحمہ اللہ

بعض حضرات نے مزید یہ نام بھی لکھے ہیں:

السراج الوهاج، الجوهرة النیرة، جو قدوری کی شرح ہے، کنز العباد فی شرح الاوراد، جو علی بن احمد غوری رحمہ اللہ کی شرح ہے، خزانة الروایات، خلاصة الکیدانی، الحاوی للزاهدی، الفتاوی الصوفیة، فتاوی الطوری وغیرها۔

مندرجہ بالا کتب کے غیر معتبر ہونے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں، جن کو جاننا ضروری ہے۔

(۱)...... پہلی صورت

کتاب کے مؤلف کا حال معلوم نہ ہونا

بسا اوقات کوئی کتاب اس وجہ سے غیر معتبر ہوتی ہے کہ اس کے مؤلف کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قابل اعتماد فقیہ تھے یا صحیح وضعیف ہر قسم کی باتیں جمع کرنے والے۔ "خلاصة الکیدانی" اگر چہ یہ کتاب ماوراء النهر میں حفظ

اور تدریس کے لئے مشہور ہے، لیکن اس کے مؤلف کا حال معلوم نہیں اور تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انہوں نے اس میں بہت سی غلط روایات جمع کر دی ہیں۔ اسی طرح خزانۃ الروایات کے مؤلف بھی غیر معلوم ہیں، اگرچہ صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کو قاضی جکن ہندی گجراتی کی طرف منسوب کیا ہے۔ ح۲۲۷

لیکن ان کے حالات معلوم نہیں اور اس کتاب میں بھی غلط اور غیر معتمد روایات موجود ہیں۔ اسی طرح قہستانی رحمہ اللہ کی کتابیں اگرچہ وہ بھی لوگوں میں متداول ہیں لیکن ان کے حالات بھی معلوم نہیں۔

کشف الظنون میں ملا عصام الدین رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یہ قہستانی رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ہروی رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے نہیں تھے بلکہ یہ اپنے زمانے میں کتابوں کے تاجر اور ایجنٹ تھے۔ نیز یہ اپنے ہم عصر علماء میں فقہ کے اعتبار سے کوئی شہرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اس شرح میں قوی اور ضعیف اقوال بغیر کسی تصحیح اور تحقیق کے جمع کر دیئے ہیں۔

(از حاشیہ:

علامہ قہستانی رحمہ اللہ (جن کا انتقال ۹۵۰ یا ۹۶۰ کے قریب ہوا) کے دور کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہاں شیخ الاسلام ہروی رحمہ اللہ سے مراد احمد بن یحییٰ بن محمد بن سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی رحمہ اللہ مراد ہیں، جو علامہ سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ کے پوتے مشہور تھے۔ صاحب ھدیۃ العارفین نے ان کو حنفی لکھا ہے جب کہ علامہ زرکلی رحمہ اللہ ان کو فقہاءِ شافعیہ میں سے بتاتے ہیں لیکن آگے آنے والی ان کی تصانیف جس کے ذریعہ انہوں نے کتب حنفیہ کی خدمت کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا قول ہی درست ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

یہاں شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے مصداق کے بارے میں یہ خیال اس لیے ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ کیوں کہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا سنہ شہادت ۹۱۶ھ یا ایک قول کے مطابق ۹۰۶ھ تھا۔ یہ ہرات کے بڑے علماء میں سے تھے اور تیس سال تک وہاں قاضی رہے۔ جب مشہور ظالم بادشاہ اسماعیل بن حیدر صفوی، ہرات میں داخل ہوا تو یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے دارِ امارت میں اس کا استقبال کیا تھا۔ لیکن چغل خوروں نے بادشاہ کو ان کے تعصب کی شکایت کی، جس پر اس نے ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا اور یہ ہرات کے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ شہید کر دیے گئے حالانکہ ان کا جرم کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے ان کا وصف ''شہید'' بیان کیا جاتا ہے۔ ان کی فقہی تصانیف میں سے ھدایہ کے ابتدائی حصے پر ان کی تعلیقات، شرح وقایہ پر ان کا حاشیہ اور سراجی کی شرح بھی ہے)

اسی طرح ملا مسکین رحمہ اللہ کی شرح کنز کہ ان کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ ہرات کے علماءِ حنفیہ میں سے ایک فقیہ تھے، سمرقند میں رہائش پذیر رہے اور سن ۸۱۱ھ میں اپنی اس کتاب کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ح:۲۴

(۲)......دوسری وجہ

مؤلف کا روایات ضعیفہ کو جمع کر دینا

کسی کتاب کے غیر معتبر ہونے کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے مؤلف نے ضعیف روایات کو جمع کر دیا ہو۔ مختصر یہ کہ ان کتابوں کے مؤلفین اگرچہ علم اور فقہ میں مشہور تھے لیکن انہوں نے ان کتابوں میں صحیح روایات پر اکتفاء کرنے کو اپنے اوپر لازم نہیں کیا بلکہ جو قول یا روایت بھی انہیں ملی، انہوں نے بغیر تحقیق یا تنقیح کے اُسے آگے نقل کر دیا۔

ان کتابوں میں سے ایک علامہ زاہدی رحمہ اللہ کی "القنية" ہے اس کے مؤلف مختار بن محمود بن محمد ابوالرجاء، نجم الدین زاہدی ایک عالم ہونے کی حیثیت سے معروف ہیں۔ یہ عقیدہ کے اعتبار سے معتزلی اور فروعی مسائل کے اعتبار سے حنفی تھے۔ ان کا تعلق خوارزم کے قصبہ غزمین سے تھا۔ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "یہ بڑے آئمہ اور اہم فقہاء میں سے تھے...... یہ اپنی جلالت شان کے باوجود نقل روایات میں سہل پسند تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ہر مسئلہ سے پہلے اُس مسئلہ کے ماخذ کیلئے ایک اشارہ لکھا ہے اور انہوں نے اُن اشارات کی تفصیل اپنی کتاب کے مقدمہ میں بیان کی ہے۔ اس فہرست میں انہوں نے ایسی نامعلوم کتابوں کے نام بھی ذکر کئے ہیں، جن کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں سن رکھا۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ "القنية" میں معتبر ماخذ سے منقول شدہ ہو تو اس پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
>
> علامہ زاہدی نے جو ضعیف روایات نقل کی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یوم عاشوراء یعنی دس محرّم کے دن سرمہ نہ لگانا واجب ہے۔ یہ بات علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے اپنے "الدر المختار" کے حاشیہ میں "باب مایفسد الصوم" میں ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس بات پر اعتماد نہیں کیا جائے گا کیوں کہ "القنیہ" معتبر کتابوں میں سے نہیں ہے۔" ح:۲۵

اسی طرح علامہ زاہدی رحمہ اللہ کی کتاب "الحاوی" بھی ضعیف روایات کو نقل کرنے میں معروف ہے۔

(از حاشیہ:

فقہ حنفی کی ایک دوسری کتاب "الحاوی القدسی" ہے۔ یہ معتبر کتابوں میں سے ہے اور قاضی جمال الدین غزی حنفی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے اس کو القدسی اس لیے کہا جاتا ہے کہ مصنفؒ نے اسے القدس شریف میں لکھا تھا)۔

اسی لیے ابن وہب رحمہ اللہ (ت ۱۴۰) وغیرہ نے فرمایا ہے کہ علامہ زاہدی جو بات دیگر فقہاء کے خلاف کہیں اُس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ بات ابن عابدین رحمہ اللہ نے تنقیح الفتاوی الحامدیه کی کتاب الاجارۃ میں ذکر کی ہے۔ (ح ۲۶)

پھر مزید یہ بات بھی ہے کہ بعض مسائل میں انہوں نے اپنے اعتزالی افکار کا اظہار بھی کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ایصال ثواب کے مسئلے میں صاحب ہدایہ رحمہ اللہ پر رد کرتے ہوئے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ کسی شخص کے لیے اپنے کسی عمل کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچانا جائز نہیں ہے۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ (ت ۱۷۱) نے "اهداء الثواب" کا مسئلہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "علامہ زاہدی نے اس مقام پر اپنے معتزلی ہونے کو ظاہر کر دیا ہے"۔

ابن عابدین رحمہ اللہ اس کے تحت لکھتے ہیں "زاہدی نے المجتبیٰ میں هدایه کی عبارت ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "میں کہتا ہوں کہ "اہل عدل وتوحید" کا مذہب یہ ہے کہ کسی کو ایصال ثواب درست نہیں (الیٰ آخرہ) سو اس طرح زاہدی نے ہدایت سے اعراض کیا ہے اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو "اہل عدل وتوحید" کا نام اس لیے دیا کہ اُن کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ پر اصلح (یعنی زیادہ درست کام) کو اختیار کرنا واجب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہ کیا تو (العیاذ باللہ) یہ اللہ کی طرف سے ظلم شمار ہوگا۔ (ح ۲۷)

مسئلہ ایصالِ ثواب کی تفصیل "تشریحات نمبر ۲۰" میں دیکھیں

متاخرین علماء نے "المحیط البرهانی" کو بھی غیر معتبر کتابوں کی اسی قسم میں سے شمار کیا ہے۔ اس کے مؤلف اگرچہ نمایاں علماء حنفیہ میں سے تھے، یہاں تک کہ انہیں مجتہدین فی المسائل میں سے شمار کیا گیا ہے لیکن ابن نجیم رحمہ اللہ اور ابن ھمام رحمہ اللہ جیسے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس کتاب کے مسائل پر فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ پھر بعض حضرات نے اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی کہ المحیط البرهانی رطب و یابس (صحیح اور ضعیف) کی جامع ہے۔ لیکن علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے ان علماء کا کلام نقل کرنے کے بعد اپنے حاشیہ النافع الکبیر، ص ۱۹، پر یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اس رسالے کے لکھنے کے بعد "المحیط البرهانی" کے مطالعہ کی توفیق عطاء فرمائی تو میں نے دیکھا کہ وہ رطب و یابس کی جامع نہیں ہے بلکہ اس میں تو تنقیح شدہ مسائل

اور مضبوط تفریعات ہیں۔ پھر میں نے فتح القدیر اور ابن نجیم رحمہ اللہ کی عبارت پر غور کیا تو پتہ
یہ چلا کہ المحیط البرھانی سے فتویٰ دینے کی ممانعت اس بناء پر نہیں تھی کہ وہ راجح اور مرجوح
مسائل کا مجموعہ ہے بلکہ ممانعت اس وجہ سے تھی کہ اُس زمانہ میں یہ کتاب نایاب اور نادر تھی۔ اور
یہ ایسی بات ہے جس میں زمانہ کے اختلاف سے فرق ہوجاتا ہے''

(کہ کبھی کوئی کتاب نادر ہوتی ہے لیکن پھر دوسرے زمانے میں وہی کتاب عام دستیاب ہوتی ہے)۔

اس بناء پر جن فقہاءِ متاخرین نے المحیط البرھانی کو اُن کتابوں میں ذکر کیا ہے جن سے فتویٰ نہیں دیا جاسکتا ،تو وہ (اُن کے زمانہ میں) اس کتاب کا اُس چوتھی قسم میں سے ہونا ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے نہ کہ اس قسم کی کتب میں سے (جو صحیح اور ضعیف کی جامع ہیں)۔

اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ کتاب پچیس (۲۵) جلدوں میں شائع ہوچکی ہے اور میرے بھانجے شیخ نعیم اشرف حفظہ اللہ نے متفرق لائبریریوں سے اس کے کئی مخطوطہ نسخے حاصل کر کے، اُن کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو مرتب کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کا معتدبہ حصہ مطالعہ کیا ہے اور اس کے مصنف رحمہ اللہ نے تمام ابواب میں بہترین ترتیب کے ساتھ پہلے مسائل ظاہر الروایۃ کو ذکر کیا' پھر مسائل نوادر کو، پھر نوازل اور فتاویٰ کو۔ لہٰذا یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ انہوں نے رطب و یابس کو باہم ملا دیا ہے۔ ہاں اس کتاب میں روایاتِ نادرہ موجود ہیں لیکن وہ ظاہر الروایۃ سے بالکل ممتاز اور جدا ہیں اس لیے اُن پر نوادر کے وہ احکام جو ہم (گزشتہ باب طبقات الفقھاء میں مسائل النوادر کے ضمن میں) ذکر کر چکے ہیں' اُن کو بغیر کسی التباس اور اشتباہ میں پڑے اِن پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اب اس کتاب کو اہم کتب معتبرہ میں سے ہی شمار کرنا چاہیے۔

ایسی ہی غیر معتبر کتابوں میں سے ایک "کنز العباد فی شرح الاوراد" (ح ۲۸) ہے جو علی بن احمد غوری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔

(از حاشیہ:

کشف الظنون میں ہے کہ یہ شیخ شہاب الدین رحمہ اللہ سہروردی کے اوراد کا مجموعہ ہے اور اس کی شرح ایک جلد میں بعض مشائخ نے لکھی ہیں جو مختلف کتب فتاوی و واقعات سے ماخوذ ہے اور یہ شرح فارسی زبان میں علی بن احمد غوری رحمہ اللہ کی تحریر کردہ ہے)

یہ کتاب ایسے بے بنیاد مسائل اور موضوع احادیث سے بھری ہوئی ہے جن کا فقہاء کے ہاں کوئی اعتبار ہے نہ ہی

محدثین کے ہاں۔

نیز اسی قسم میں یہ کتابیں بھی شامل ہیں:

مطالب المؤمنین، الفتاوی الصوفیة، فتاویٰ الطوری اور فتاوی ابن نجیم رحمہ اللہ، جیسا کہ علامہ لکھنوی رحمہ اللہ نے **النافع الکبیر** میں ذکر کیا ہے۔

غیر معتبر کتابوں کی ان دونوں قسموں کا حکم یہ ہے کہ ان سے ایسا کوئی مسئلہ نہیں لیا جائے گا جو معتبر کتابوں کے خلاف ہو۔ البتہ جو مسئلہ ان کتابوں میں موجود ہو اور دیگر کتابوں میں نہ ہو تو اس کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا۔ اگر وہ مسئلہ کسی شرعی ضابطہ میں داخل ہوتا ہے اور کسی فقہی قاعدے کے خلاف نہیں ہے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ مسئلہ کسی شرعی ضابطہ کے تحت نہیں آتا تو اس کو اختیار کرنا یا اس کے مطابق فتوی دینا جائز نہیں ہے۔

(۳)..... تیسری وجہ

ایسا اختصار جس سے بات سمجھنا مشکل ہو

کتبِ فقہ میں کئی کتابیں ایسی ہے کہ جن کی جلالت شان اور اُن کے مؤلفین پر اعتماد میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کتابوں میں ایسا اختصار پایا جاتا ہے جس سے بات سمجھنے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ ان کتابوں سے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

جیسے **الدر المختار، الاشباہ والنظائر** اور دیگر مختصر کتابیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ کتابیں بذاتِ خود غیر معتبر ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں بہت زیادہ اختصار ہے تو اگر کوئی مفتی صرف انہی کتابوں پر اکتفاء کرے گا تو وہ غلطی کا شکار ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی کتابوں کا حکم یہ ہے کہ اُن سے اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جائے گا جب تک گہری نظر اور خوب غور و خوض سے کام لیتے ہوئے ان کی شروحات اور حواشی کی مراجعت نہ کرلی جائے۔

اگر مفتی کو اس کے بعد ان کتابوں کی مراد یقینی طور پر سمجھ میں آجائے تو تب ان سے فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے **شرح عقود رسم المفتی** میں ذکر فرمایا ہے:

"**الدر المختار** اور **الأشباہ والنظائر** بہت سے مقامات پر مسائل نقل کرنے میں غلطیوں پر مشتمل ہیں اور ان میں بعض مرجوح اقوال کو ترجیح دی گئی ہے بلکہ بعض جگہ تو دیگر مذاہب کے ایسے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ مذہبِ

حنفی والوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ ح،۲۹

اس بناء پر یہ کتابیں، کتبِ غیر معتبرہ کی دوسری قسم میں بھی شامل ہوں گی۔

(۴)...... چوتھی وجہ

''کتاب کا نادر اور نایاب ہونا''

بہت سی کتبِ فقہ ایسی ہیں جو اپنے زمانے میں تو قابل اعتماد اور متداوِل تھیں لیکن بعد ازاں اُن کے نسخے ایسے ختم ہوئے کہ اب کہیں شاذ و نادر بھی ان کا نسخہ موجود نہیں۔

اس قسم کا حکم یہ ہے کہ مفتی کو ایسی کتاب پر اعتماد کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، جب تک مضبوط دلائل سے یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ کتاب کا یہ نسخہ ہم تک تحریف اور تبدیلی سے محفوظ پہنچا ہے۔ اگر واضح قرائن اور مضبوط شواہد سے یہ پتہ چل جائے تو پھر اس پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ہمارے زمانے میں بہت سی ایسی قدیم کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جو ایک زمانے سے نایاب تھیں اور ناشرینِ کتب، دستیاب مخطوطہ نسخوں کی مدد سے یہ کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ اب اگر شائع شدہ کتاب کی بنیاد صرف ایک نسخہ ہو، جس کی سند بھی مؤلفِ کتاب تک متصل نہ ہو تو اس پر اعتماد کرنے میں خوب احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

البتہ ایسی کئی کتابیں ہیں جنہیں علماء نے متعدد ایسے مخطوطات جو اُنہیں مختلف علاقوں سے دستیاب ہوئے، اُن سے موازنہ کرنے کے بعد تحقیق اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، ایسے مطبوعہ نسخوں پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(از حاشیہ: ''یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں جو بات ہم نے ذکر کی ہیں وہ کتب فقہ کے بارے میں ہے۔ باقی کتب حدیث کا جہاں تک تعلق ہے تو محدثین کرام کے ہاں معروف یہی ہے کہ " وِجادۃ" کی شکل میں پایا جانے والا نسخہ غیر معتبر ہے، لہٰذا تب کتاب کے معتبر ہونے کے لیے دو باتوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ یا تو اس کتاب کی نسبت مؤلف کی طرف تواتر یا شہرت کے درجہ میں ہو اور یا اُس کتاب کی کوئی قابلِ اعتماد سند موجود ہو'' واللہ سبحانہ اعلم)۔

(تدریب الرّاوی للسیوطی رحمہ اللہ کے متن "التقریب" میں ہے: الوجادہ... وھی ان یقف علی احادیث بخط راویھا لا یرویھا الواجد فلہ ان یقول وجدت او قراءت بخط فلان او فی کتابہ

بخطه حدثنا فلان... وهذا كله اذا اوثق بأنه خطه او كتابه. ۲/ ۶۱ طبع مير محمد، كراتشي)

اس قسم میں وہ کتابیں بھی شامل ہوں گی جو اگرچہ لوگوں کے درمیان متداول ہیں لیکن اُن کے صحیح نسخے موجود نہیں ہیں، کیوں کہ وہ کاتب حضرات اور ناشرین کتب کی اغلاط سے لبریز ہیں۔ جیسے فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ کی "النوازل" اور علامہ عینی رحمہ اللہ کی "البنایہ شرح هدایه"۔ ان دونوں کتابوں کے نسخے (جو ہمارے علاقوں میں پائے جاتے ہیں) اشاعت کی ایسی غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے مؤلف کی مراد کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور بسا اوقات تو بالکل مطلب ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کتابوں پر نسخے کی صحت کی تحقیق کئے بغیر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

(۵)..... پانچویں وجہ

''کتاب کے مؤلف کی طرف نسبت میں شک''

بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو ایسے مؤلفین کی طرف منسوب ہیں، جو علم میں شہرت یافتہ ہیں اور یہ کتابیں متداول بھی ہیں، نادر نہیں ہیں لیکن ان کتابوں کی ان کے مؤلفین کی طرف نسبت کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔

جیسے کتاب المخارج والحیل، جو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ علماء کو اس میں ہمیشہ تردّد رہا ہے کہ یہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی تالیفات میں سے ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کتاب غلط طور پر منسوب کی گئی ہے اور اس کی نسبت قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف درست نہیں ہے، کیوں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے اس کی روایت کرنے والے سب لوگ مجہول ہیں اور بعض ان میں سے کذّاب ہیں۔

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے "مناقب ابی حنیفه للذهبی" پر اپنے حاشیہ کے صفحہ ۵۴ پر لکھا ہے کہ یہ کتاب الکذاب ابن الکذاب ابن الکذاب کی روایت ہے، جو محمد بن الحسین بن الحمید ہے اور وہ اس کتاب کو محمد بن بشر الرقی سے اور وہ خلف بن بیان سے روایت کرتا ہے، جو ایک مجہول شخص کی دوسرے مجہول شخص سے روایت ہے۔ لہٰذا اس پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے۔

ایسی کتابوں میں سے ایک فتاویٰ عزیزی ہے، جو شیخ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ (ت، ۱۲۳۹) کی طرف منسوب ہے۔ یہ کتاب ان کی تالیف نہیں ہے بلکہ ان کے بعد کسی شخص نے ان کے فتاویٰ جمع کر دیئے تھے اور یہ شخص معلوم نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد حضرت مفتی محمد شفیع قدس سرہ سے یہ سنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں کئے گئے بہت سے ایسے اضافے موجود ہیں جن کی نسبت حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک اس کے مضمون

کی تائید کسی اور دلیل سے نہ ہو جائے صرف اس پر اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۶) ...... چھٹی وجہ

''کتاب کا فقہ کے علاوہ کسی اور موضوع کے بارے میں ہونا''

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کتاب فقہ کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر تحریر کی گئی ہوتی ہے جیسے علم تصوف، علم اسرار شریعت، دعائیں، تفسیر اور حدیث اور پھر اس کتاب میں فقہی مسائل کو تبعاً اس طرح ذکر کر دیا جاتا ہے کہ وہ اصل مقصود نہیں ہوتے۔ ایسی کتابوں میں ان کے مؤلفین کی عظمتِ شان کے باوجود ایسے بہت سے مسائل پائے جاتے ہیں جو راجح مذہب کے خلاف ہوتے ہیں۔

میں نے اس کی بہت سی مثالیں علامہ عینی رحمہ اللہ کی کتاب "عمدة القاری" اور ملا علی قاری رحمہ اللہ کی کتاب "المرقاة" اور ابن ملک رحمہ اللہ کی کتاب "مبارق الازھار" میں پائی ہیں، نیز تصوف کی کتابوں میں تو ایسے بہت سے مسائل ہیں۔

اس کی صرف ایک مثال یہ ہے کہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے شافعیہ کا مذہب یہ ذکر کیا ہے کہ اُن کے نزدیک مبہم نیت کے ساتھ احرام باندھ لینا جائز ہے اور اُن کا استدلال حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل ہے کہ اُن دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احرام باندھنے کی طرح ہی احرام باندھا تھا (یعنی حج یا عمرہ کی تعیین نہیں کی تھی) لہٰذا آج بھی یہ جائز ہے کہ کوئی شخص احرام کی نیت یوں کرے کہ ''جیسے زید نے احرام باندھا ہے میں بھی ویسے ہی احرام باندھتا ہوں''۔ اب اگر زید نے حج کا احرام باندھا ہوگا تو اس نیت کرنے والے کا احرام بھی حج کا ہوگا، اور اگر زید نے عمرہ کا احرام باندھا ہوگا تو اس نیت کرنے والے کا احرام بھی عمرہ کا ہوگا، اگر زید نے دونوں کا احرام باندھا ہوگا تو یہ شخص بھی حج و عمرہ دونوں کے احرام میں سمجھا جائے گا۔ اگر زید نے مطلق یعنی بغیر کسی تعیین کے احرام باندھا تو یہ شخص بھی مطلق احرام کے ساتھ مُحرم بن جائے گا کہ بعد میں یہ شخص اپنے احرام کو حج اور عمرہ میں سے جس کیلئے چاہے کرلے۔

پھر علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باقی علماء اور آئمہ کے نزدیک مبہم نیت کے ساتھ احرام باندھنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ:۱۹۶)

(اور تم اللہ کے لیے حج اور عمرہ مکمل کرو)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُبْطِلُوٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد: ۳۳)

(اور تم اپنے اعمال کو باطل نہ کرو)

باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل تو وہ ان دونوں حضرات کی خصوصیت تھا۔ ح:۳۰

علامہ عینی رحمہ اللہ نے باقی آئمہ، جن میں سے حنفیہ بھی ہیں' ان کا مذہب یہ ذکر کیا ہے کہ مبہم نیت کے ساتھ احرام باندھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ بات حنفیہ کے معتمد مذہب کے خلاف ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ مبہم اور معلق نیت کے ساتھ شوافع کی طرح حنفیہ کے ہاں بھی احرام باندھنا جائز ہے۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے اللباب سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نُسك (حج یا عمرہ) کی تعیین شرط نہیں ہے"۔

لہٰذا مبہم احرام بھی درست ہے اور اسی طرح اس نیت سے بھی احرام باندھنا جائز ہے کہ فلاں کا جو احرام ہے، میرا بھی وہ ہی احرام ہے۔ ح:۳۱

یہی بات علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے الدر المختار کے متن میں بغیر حنفیہ کے اختلاف کے لکھی ہے۔ ح:۳۲

(از حاشیہ:

ان کی عبارت یوں ہے:

ثم صحت الاحرام لا تتوقف علی نیت نسكٍ لانه لوابهم الاحرام حتی طاف شوطاً واحداً صرف للعمرة۔

(یعنی احرام کا صحیح ہونا، حج یا عمرہ کی تعیین کی نیت پر موقوف نہیں ہے، کیوں کہ اگر مُحرم نے مبہم احرام باندھ لیا، یہاں تک کہ طواف کا ایک چکر بھی مکمل کر لیا تو اب وہ احرام عمرہ کا ہی سمجھا جائے گا)۔

اس قسم کی کتابوں کا حکم یہ ہے کہ ان کے مسائل اگر اُن معروف قابل اعتماد کتابوں کے خلاف ہوں' جنہیں مذہب کے مسائل بیان کرنے کے لیے تالیف کیا گیا ہے۔ تو ایسی صورت میں ان کے مسائل پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

چھٹا قاعدہ

الاصل السادس

اصحاب الترجیح جب کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ ترجیح کبھی صراحتاً ہوتی ہے اور کبھی التزاماً۔ پس جب ترجیح صریح نہ پائی جائے تو ترجیح التزامی پر عمل کیا جائے گا اور جہاں ترجیح صریح ہو تو وہ ترجیح التزامی پر مقدم ہے۔

پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جب اصحاب مذہب کے اقوال یا ان کی روایات مختلف ہوں تو اس کو لیا جائے گا جس کو اصحاب ترجیح نے ترجیح دی ہو۔ اب یہ ترجیح دو قسموں پر ہے:

صریح: یہ وہ ترجیح ہے جو بالکل واضح اور صریح الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے جیسے فقہاء کہتے ہیں، **هو الصحيح، هو الاصح، به يفتي، عليه الفتوى، هو المعتمد** اور اس جیسے دیگر الفاظ جن کے مراتب کا بیان اگلے قاعدے میں آرہا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

التزامی: جو صریح الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ اس پر مؤلف کتاب یا کسی معروف مفتی کا مخصوص اور مشہور طرز دلالت کرتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

(۱)......پہلی صورت: قولِ راجح کو مقدم کرنا۔

بعض مؤلفین نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ وہ قولِ راجح کو دیگر اقوال مرجوحہ سے پہلے ذکر کرتے ہیں۔ قاضی خان رحمہ اللہ کا اپنے فتاویٰ میں یہی طرز ہے چنانچہ انہوں نے خود اپنے فتاویٰ کے آغاز میں لکھا ہے:

> "جس مسئلے میں متاخرین کے بہت سے اقوال ہیں میں نے ان میں سے صرف ایک یا دو اقوال پر اکتفا کیا ہے اور جو زیادہ ظاہر قول ہے اس کو میں نے مقدم کیا ہے اور جو مشہور ترین قول ہے اسی سے میں نے آغاز کیا ہے تا کہ طلبہ کی ضرورت پوری ہو جائے اور مسائل کی رغبت رکھنے والوں کیلئے سہولت ہو جائے"۔ (ح ۴۲)

یہی حال **ملتقی الابحر** کا ہے کہ اس کے مصنف رحمہ اللہ نے قابلِ اعتماد قول کو دوسرے اقوال سے مقدم کرنے کا التزام کیا ہے۔ (ح ۴۳)

اور صاحبِ بدائع الصنائع کے طرز سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اکثر و بیشتر ایسا ہی کرتے ہیں۔

(۲)......دوسری صورت: قول راجح کی دلیل کومؤخر کرنا۔

وہ کتابیں جن میں دلائل فقہیہ کو بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے جیسے ھدایہ، مبسوط وغیرہ تو ان کا معروف طرز یہی ہے کہ وہ قول راجح کی دلیل کو آخر میں لاتے ہیں اور پھر بقیہ اقوال کے دلائل کا جواب دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی قول یا روایت کی دلیل کا آخر میں بیان ہونا' مؤلف کے نزدیک اس قول کے راجح ہونے کی نشانی ہے۔

(۳)......تیسری صورت: صرف قول راجح کی دلیل ذکر کرنا۔

یہ تب ہے جب صرف ایک ہی قول کی دلیل ذکر کی گئی ہو اور دیگر اقوال کے دلائل کو چھوڑ دیا گیا ہو تو ان کے نزدیک راجح وہ ہی قول ہوگا جس کی دلیل کو ذکر کیا گیا ہے۔

(۴)......چوتھی صورت: دیگر اقوال پر رد کرنا۔

یہ تب ہوتا ہے جب کوئی فقیہ کئی اقوال دلائل کے ساتھ ذکر کرے اور پھر بعض اقوال کے دلائل کو رد کرے اور بعض کے دلائل پر رد نہ کرے تو یہ اس قول کے لیے جس کی دلیل کو رد نہیں کیا گیا' ترجیح التزامی ہوگی۔

(۵)......پانچویں صورت: متونِ معتبرہ میں مذکور ہونا۔

ایک قول متونِ معتبرہ میں مذکور ہو تو اس کا ان متون میں ذکر ہونا ہی یہ بات بتانے کیلئے کافی ہے کہ یہ قول مذہبِ حنفی میں راجح ہے' اگرچہ وہاں اس کی ترجیح کی کوئی صراحت نہ کی گئی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ متون' مذہب کے راجح اقوال کو جمع کرنے کیلئے ہی لکھے گئے ہیں۔

متون معتبرہ میں سے چند یہ ہیں:

(۱)......البدایہ، (ھدایہ کا متن جو مختصر القدوری اور الجامع الصغیر کا جامع ہے)

(۲)......مختصر القدوری

(۳)......المختار (الاختیار کا متن)

(۴)...النقایہ۔

(۵)...الوقایہ۔

(۶)...الکنز۔

(۷)...ملتقی الابحر

یہی نام ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے شرح عقود رسم المفتی میں ذکر فرمائے ہیں۔

علامہ قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ (ت، ۱۴۲۳) نے لکھا ہے کہ:

''جو اقوال' متون میں مذکور ہوں تو یہ ان کے لیے ترجیح التزامی ہے''

اور ایسی بات دیگر کئی مشائخ نے بھی ذکر فرمائی ہے لیکن تصحیح صریح، تصحیح التزامی پر مقدم ہے، اس لیے اگر اصحاب الترجیح نے متون کے خلاف کسی قول کو صراحتاً ترجیح دے دی ہو تو وہ ہی راجح شمار ہوگا (ح، ۳۵) اور اس کی مثال یہ مسئلہ ہے کہ متون میں لکھا ہے کہ عورت کا غیر کفو (جب مرد کا خاندان عورت کے خاندان کے ہم پلہ نہ ہو) میں نکاح' ولی کی اجازت کے بغیر منعقد ہو جاتا ہے لیکن ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ اصحاب الترجیح نے حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی روایت کو ترجیح دی ہے کہ ایسا نکاح بالکل منعقد ہی نہیں ہوتا۔ (ح، ۳۶)

ساتواں قاعدہ

الاصل السابع

صریح ترجیح کیلئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں' وہ تمام درجے اور قوت کے اعتبار سے برابر نہیں بلکہ ان میں سے کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ قوت رکھتے ہیں۔

ان الفاظ میں سب سے قوی "علیه عمل الامة" ہے۔

پھر "علیه الفتویٰ" اور "به یفتیٰ"۔

پھر "الفتویٰ علیه"۔

پھر "هو الصحیح"۔

پھر "هو الاصح"۔

پھر باقی تمام الفاظ قوتِ تصحیح کے اعتبار سے برابر ہیں۔ جیسے "هو المعتمد" اور "هو الاشبه"۔

البتہ ان میں جو اسمِ تفضیل کے صیغے ہوں گے' وہ دیگر صیغوں کی نسبت راجح ہوں گے۔

تشریح اصحابِ ترجیح' مختلف مسائل میں ترجیح کیلئے کئی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے درمیان جو ترتیب ہے' وہ اس قاعدہ میں ذکر کر دی گئی ہے۔

البتہ صحیح اور اصح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ ان میں سے کونسا زیادہ قوی ہے؟

بعض فقہاء نے فرمایا: أصح بنسبت صحیح کے زیادہ قوت رکھتا ہے کیونکہ یہ اسمِ تفضیل ہے (اور اسمِ تفضیل کا مقصد ہی مادہ اشتقاق مثلاً ''تصحیح'' کی زیادتی کو بیان کرنا ہوتا ہے)۔ ابن عبدلرزاق رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۳۸ھ) نے الدر المختار پر اپنی شرح (اس کا نام "مفاتیح الاسرار ولوائح الافکار" ہے) میں اسی مؤقف کو اختیار کیا ہے۔

دیگر حضرات کہتے ہیں: صحیح کا لفظ اصح سے قوی تر ہے۔ کیونکہ صحیح کا مقابل لفظِ خطاء ہے اور اصح کا مقابل صحیح ہے۔ تو جس لفظِ "صحیح" کا مقابل خطاء ہوگا، اس میں زیادہ تاکید ہوگی' بنسبت اُس کے جس کا مقابل صحیح ہے۔

اس بات کو علامہ بیری رحمہ اللہ نے حاشیہ بزدوی سے نقل کر کے' اس کے بعد لکھا ہے:

''مناسب ہے کہ یہاں اس بات کی قید لگائی جائے کہ غالباً ایسا ہوتا ہے' کیونکہ کہیں ہم نے ایسا بھی پایا ہے کہ اصح قول کے مقابلے میں شاذ روایت ہوتی ہے''۔ ج۱، ص۳۷

اس بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اگر تو اصح اور صحیح دونوں کا کہنے والا ایک ہی شخص ہو تو بالاتفاق اصح ہی صحیح پر مقدم ہوگا۔ جب ان دونوں لفظوں کے قائل الگ الگ ہوں تو پھر وہ اختلاف ہوگا' جو ابھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

ابنِ عابدین رحمہ اللہ نے یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ مشہور یہی ہے کہ اصح ہی اس صورت میں بھی صحیح پر مقدم ہوگا۔

(حضرت شیخ الاسلام زید مجدھم فرماتے ہیں کہ) اس عبدِ ضعیف کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو ہر مقام پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ لفظ اصح جیسے صحیح کے مقابلے میں آتا ہے' ویسے کبھی اس کو خطاء کے مقابلے میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں تین قول ہوتے ہیں۔ وہاں صحیح کا لفظ اُس تیسرے قول کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے' جو خطاء ہوتا ہے۔ اور پھر اصح کا لفظ اس قول کے مقابلے میں لایا جاتا ہے' جس کیلئے صحیح کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ اب جس قول کو صحیح کہا گیا وہ تیسرے قول کے مقابلے میں (جو خطاء ہے) تو راجح ہوگا لیکن قولِ اصح کے مقابلے راجح نہیں ہوگا۔

لہٰذا زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ سیاقِ کلام میں غور کیا جائے اور اس کے ذریعے کہنے والے کی مراد تک پہنچا جائے

نہ یہ کہ اصح اور صحیح میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر ہر جگہ اس کو قاعدہ بنا کر لاگو کر دیا جائے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

پھر یہ پوری تفصیل تب ہے، جب یہ الفاظ مختلف اقوال کیلئے استعمال ہوں لیکن جب لفظ اصح ایک تصحیح کو دوسری تصحیح پر ترجیح دینے کیلئے استعمال ہو تو پھر بلاشبہ اصح ہی صحیح پر راجح ہے۔

اس کی مثال یہ بنے گی کہ جب کوئی فقیہ دو آئمہ سے الگ الگ تصحیح نقل کرے اور پھر یہ کہے کہ یہ دوسری تصحیح، پہلی کی نسبت اصح ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مقصد اسی تصحیح کو ترجیح دینا ہے، جس کو اُس نے لفظ اصح سے تعبیر کیا ہے۔

ان کے علاوہ باقی الفاظ ایک ہی مرتبے کے ہیں اور وہ یہ ہیں:

به نأخذ، عليه فتوى مشائخنا، هو المعتمد، هو الاشبه، هو الاوجه۔

یہ الفاظ قوتِ تصحیح میں برابر ہیں، البتہ ان کے اسمِ تفضیل کے صیغوں میں وہ ہی اختلاف ہوگا جو بھی صحیح اور اصح کے بارے میں ذکر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ میں اسمِ تفضیل، دیگر صیغوں پر راجح ہوگا۔

آٹھواں قاعدہ

الاصل الثامن

''اگر دو قول متعارض ہوں اور ان میں سے ہر ایک کو ترجیح دی گئی ہے تو اگر دونوں ترجیحات ایک ہی شخص کی طرف سے ہیں تو ان میں متأخر ترجیح پر عمل ہوگا اور اگر تاریخ معلوم نہ ہو یا دونوں ترجیحات دو الگ الگ شخصوں کی طرف سے ہیں تو مفتی ان میں سے ایک کو ترجیح دے گا، ایسی وجوہ ترجیح کو مدنظر رکھ کر جو اس کے سامنے واضح ہوں۔

پس اگر ان دونوں اقوال کے لیے وجوہ ترجیح میں سے کوئی بھی واضح نہ ہو تو مفتی کو اختیار ہوگا کہ وہ ان میں سے ایک قول کو لے، اپنے دل کی گواہی کے ساتھ، نفسانی خواہشات سے بچتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ''صواب'' یعنی درست بات کو طلب کرتے ہوئے''۔

تشریح یہ قاعدہ کسی شرح کا محتاج نہیں اور اس میں اہم بات ان وجوہ ترجیح کو جاننا ہے جن کے ذریعے ایک

ترجیح کو دوسری ترجیح پر فوقیت دی جاتی ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)......پہلی وجہ

اگر دو تصحیحوں میں سے ایک صریح اور دوسری التزامی ہو تو صریح پر عمل کیا جائے۔

(۲)......دوسری وجہ

اگر دو تصحیحوں میں سے ایک ایسے لفظ کے ساتھ ہو جو دوسری تصحیح کی نسبت زیادہ قوی ہے تو قوی لفظ والی تصحیح کو ترجیح دی جائے گی۔ (اس کی تفصیل گزشتہ قاعدے میں گزر چکی ہے)

(۳)......تیسری وجہ

اگر ان دونوں میں سے ایک متون میں مذکور ہو اور دوسری غیر متون میں تو جو تصحیح متون میں ہو گی وہ راجح ہو گی سوائے اس صورت کہ جب اصحاب الترجیح میں سے کسی فقیہ نے غیر متون کے راجح ہونے کی صراحت کر دی ہو، جیسا کہ پہلے یہ بات ذکر کی جا چکی ہے۔

(۴)......چوتھی وجہ

اگر ان میں سے ایک ظاہر الروایۃ ہو اور دوسری غیر ظاہر الروایۃ ہو تو راجح وہ ہو گی جو ظاہر الروایۃ ہے۔

(۵)......پانچویں وجہ

اگر ان دو میں سے ایک امام صاحب رحمہ اللہ کا قول ہے اور دوسرا صاحبین رحمہما اللہ کا تو راجح امام صاحب کا قول ہو گا۔

(۶)......چھٹی وجہ

اگر ان میں سے ایک قول اکثر مشائخ کا ترجیح یافتہ ہو اور دوسرا بعض مشائخ کا ترجیح یافتہ ہو تو راجح وہ ہو گا جس طرف اکثر مشائخ ہیں۔

(۷)......ساتویں وجہ

اگران دواقوال میں سے ایک قیاس اور دوسرا استحسان ہوتو راجح استحسان ہوگا۔

(۸)......آٹھویں وجہ

اگران میں سے ایک حالات زمانہ کے زیادہ موافق ہوتو وہ دیگراقوال پرراجح ہوگا۔

(۹)......نویں وجہ

اگران میں سے ایک قول کسی ایسے صاحب نظر مفتی کے نزدیک جو دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے' دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہوتو وہ دیگر کی نسبت اولیٰ ہے۔

یہ وہ وجوہِ ترجیح ہیں جن کو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح عقود رسم المفتی میں ذکر فرمایا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے ساتھ بعض دیگر وجوہ ترجیح کو بھی ملالیا جائے۔

(۱)......پہلی وجہ

جب دوقولوں میں سے ایک انفع للفقر یعنی فقراء کے لیے زیادہ نفع مند ہو' تو وہ باب الزکاۃ میں راجح ہوگا۔

(۲)......دوسری وجہ

اگردوقولوں میں سے ایک انفع للوقف یعنی وقف کی اشیاء کیلئے زیادہ فائدے مند ہوتو وہ دیگر کی بنسبت اولیٰ ہوگا۔

(۳)......تیسری وجہ

اگردواقوال میں سے ایک حد (شرعی سزا) کو ساقط کرنے والا ہوتو وہ راجح ہوگا۔

(۴)......چوتھی وجہ

جب تعارض حلت اور حرمت کے درمیان ہوتو راجح وہ قول ہوگا جو حرام قرار دینے والا ہو۔

(ان کے ساتھ مزید دو اور وجوہ ترجیح بھی ملائی جاسکتی ہیں۔

(۱)......: معاملات میں ایسر (زیادہ آسان قول) پر فتویٰ دیا جائے گا۔

(۲)......: عبادات میں احوط (زیادہ احتیاط والا قول) کو ترجیح ہوگی)۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی (متعنا اللہ بدوام بقائہ) فرماتے ہیں:

''یہ تمام وجوہ ترجیح فقہاء نے ذکر کی ہیں اور وہ ایک قول کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے ان کو استعمال کرتے ہیں لیکن یہ سب ایسے قواعدِ کلیہ نہیں ہیں کہ جن پر تمام حالات میں عمل کیا جاسکے۔ بلکہ بسا اوقات ان مرجّحات کے درمیان بھی تعارض اور ٹکراؤ ہوتا ہے کہ ایک مرجّح ایک قول کی ترجیح چاہتا ہے اور دوسرا مرجح دوسرے قول کی ترجیح کا تقاضا کرتا ہے۔ تب ان کے درمیان کوئی ایسا قاعدہ کلیہ بیان کرنا ممکن نہیں جس پر ہر جگہ عمل کیا جاسکے۔

تو ایسی مثالوں میں معاملہ مفتی کے ذوق صحیح اور ملکۂ فقہیہ کے سپرد کردیا جاتا ہے جو اِن متعارض وجوہِ ترجیح میں سے کسی ایک کو منتخب کرلیتا ہے۔

بسا اوقات مفتی یہ سمجھتا ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سدِّ ذرائع ہو تو وہ قولِ احوط (مبنی بر احتیاط) کو لے لیتا ہے اور کبھی مفتی کے سامنے ایسا مسئلہ آتا ہے جس میں ابتلاء عام ہوتا ہے وہ اس قول کو لے لیتا ہے جو لوگوں کیلئے زیادہ آسان ہو۔

اور ان تمام صورتوں میں اعتماد اس فقہی استعداد پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے تقوی کے ساتھ روبہ کار ہو اور مفتی کا مقصد خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ ہو اور عام طور پر یہ چیز بغیر ایسی استعداد رکھنے والوں کی صحبت اختیار کیے حاصل نہیں ہوتی''۔

نواں قاعدہ

الاصل التاسع

''جب اصحاب الترجیح سے مختلف اقوال میں سے کسی کی تصحیح نہ پائی جائے تب ظاہر الروایۃ کی

پیروی کرنا ہی لازم ہے اور جب دو روایتوں میں اختلاف ہو جائے اور ان میں سے ہر ایک ظاہر الروایۃ ہو تو اس روایت پر عمل کیا جائے گا جو زمانے کے لحاظ سے مؤخر ہو"۔

تشریح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کتب ظاہر الروایۃ کے درمیان اختلاف واقع ہو جاتا ہے پس اس وقت اس کتاب کو لیا جائے گا جس کی تالیف بعد میں ہوئی اور اس کے مخالف روایت ایسے ہو جائے گی گویا اس سے رجوع کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا ان (ظاہر الروایۃ کی) چھ کتب کی تاریخ جاننا لازمی ہے۔

پس جان لیا جائے کہ ان کتابوں میں پہلی کتاب تالیف کے اعتبار سے مبسوط ہے پھر الجامع الصغیر پھر الکبیر پھر الزیادات پھر السیر الصغیر اور پھر الکبیر ہے۔ مثلاً اگر مبسوط اور زیادات کے درمیان تعارض واقع ہو تو اس روایت کو لیا جائے گا جو زیادات میں ہے' کیونکہ یہ مؤخر ہے۔

مناسب ہے کہ یہ بھی جان لیا جائے کہ جن کتابوں کے ناموں کے آخر میں لفظ صغیر آتا ہے وہ سب امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی جانب سے بھی تصدیق و توثیق شدہ ہیں، وہ کتب جن کے نام میں کبیر آتا ہے تو وہ امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے سامنے پیش نہیں کی تھیں' لہٰذا وہ ان کی طرف سے توثیق شدہ نہیں ہیں جیسے الجامع الکبیر، السیر الکبیر، المزارعۃ الکبیر، الماذون الکبیر۔

امام محمد رحمہ اللہ کی تمام کتب میں سے جس کتاب کو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا سب سے زیادہ اعتماد حاصل تھا وہ الجامع الصغیر ہے' یہ کتاب امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حکم پر لکھی تھی اور ہم اس کتاب کے تعارف (طبقات مسائل الحنفیۃ کی بحث) میں یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس کتاب کو سفر و حضر میں ساتھ رکھتے تھے اور انہوں نے اس کتاب میں سے کسی چیز سے ناواقفیت کا اظہار نہیں کیا' سوائے چھ مسائل کے جن کو وہ امام محمد رحمہ اللہ کی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی غلطی قرار دیتے تھے۔

اور یہ چھ (٦) مسائل' ابن نجیم رحمہ اللہ نے البحر الرائق کے باب الوتر والنوافل میں نقل فرمائے ہیں۔

مشائخ حنفیہ کا اس بارے میں اختلاف ہوا کہ ان چھ (٦) مسائل میں دو قولوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟

بعض امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض ان کی مخالفت کر کے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں' ان کی دلیل یہ ہے کہ:

امام محمد رحمہ اللہ نے یہ اقوال امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے روایت کیے ہیں لہٰذا جب امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے انکار کر دیا تو ان کی روایت باطل ہو گئی۔

لیکن اکثر حضرات امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں جس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱)......پہلی وجہ

اصول حدیث میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مروی عنہ (استاذ) کا اپنی روایت کو بھول جانا اس روایت کو باطل نہیں کرتا' جب راوی (شاگرد) ثقہ ہو۔

لیکن اس قاعدے کا زیر بحث مسئلہ میں جاری ہونا مشکل ہے کیونکہ یہ قاعدہ تب جاری ہوتا ہے جب مروی عنہ (استاذ) بھول جائے۔ مگر جب مروی عنہ (استاذ) یہ تصریح کر دے کہ اس نے اس کے برخلاف روایت کی ہے۔ اور اس پر اظہار یقین بھی کرے تو تب یہ قاعدہ نہیں چلتا اور ان چھ مسائل میں یہی صورتحال ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنے بھولنے کا اعتراف نہیں کیا اور امام محمد رحمہ اللہ کی روایت کے برخلاف روایت پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

(۲)......دوسری وجہ

امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ پر انکار کیا اور فرمایا "**حفظتها و نسی**" (یعنی میں نے یاد رکھا اور وہ بھول گئے ہیں) تو ان کا یہ پختہ یقین دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہ مسائل امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بلا واسطہ بھی سنے ہیں' تو اگر ان کی روایت بواسطہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ باطل ہو گئی تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بلا واسطہ روایت ثابت ہو گئی۔

(۳)......تیسری وجہ

یہ ممکن ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے ان مسائل کی تخریج امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصول پر کی ہو اور تب امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا انکار اس پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ (کیونکہ اب یہ روایت نہیں' تخریج ہے)

(۴)......چوتھی وجہ

مشائخ حنفیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کی روایت استحسان اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی روایت قیاس پر مبنی ہے اور استحسان قیاس پر راجح ہے۔

چند مزید وجوہِ ترجیح

اب تک جو کچھ ذکر کیا گیا، اس کے برخلاف اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو، جس میں اصحاب ترجیح کی طرف سے کسی قول کی ترجیح نہ ہو تو ظاہر الروایہ پر فتویٰ دیا جائے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے اپنی نظم ''رسم المفتی'' میں چند دیگر ضابطے بھی ذکر کیے ہیں، جن سے فتویٰ دیتے وقت مدد لی جائے گی۔ وہ ضابطے یہ ہیں:

(۱)......عبادات میں مطلقاً حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو لیا جائے گا۔

(۲)......قضاء کے مسائل میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو لیا جائے گا۔

(۳)......ذوی الارحام رشتے داروں کو وارث بنانے کے مسئلے میں امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو لیا جائے گا۔

(۴)......جب روایت (نقل) درایت (عقل) کے موافق ہو تو اُس سے نہیں ہٹا جائے گا۔ (یعنی ایسی صورت میں فتویٰ اُسی قول پر ہوگا، جس کی عقلی توجیہ زیادہ مضبوط ہوگی)۔

(۵)......جب تک کسی مسلمان کے کلام کو صحیح معنیٰ پر محمول کرنا ممکن ہوگا، اُس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی کے کفر میں اختلاف ہو تو بھی اُس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اگرچہ عدمِ تکفیر والی روایت ضعیف ہی ہو۔

(۶)......جو روایت متونِ معتبرہ میں ہو، وہ شروح پر مقدم کی جائے گی اور جو شروح میں ہو، اُس کو فتاویٰ (کی روایت) پر مقدم کیا جائے گا۔

متونِ معتبرہ یہ ہیں:

مختصر القدوری

المختار

النقایة

الوقایة

کنزالدقائق

المنتقیٰ

بخلاف ملاخسرو رحمہ اللہ (ت، ۱۴۴) کے متن "الغرر" اور علامہ تمرتاشی الغزی رحمہ اللہ (ت، ۱۴۵) کے متن "التنویر"

کے' کیونکہ ان دونوں میں بکثرت فتاویٰ کے مسائل بھی ہیں۔

(متون سمیت مذاہب اربعہ کی اہم کتابوں کا تعارف ''تشریحات میں دیکھیں)

لیکن یہ ضوابط بھی قواعدِ کلیہ نہیں ہیں' جو ہر حال میں لاگو ہوں۔ یہ بات کسی ایسے شخص پر پوشیدہ نہیں ہوسکتی' جس نے مسائل کو دیکھا ہو۔ اِن کو صرف اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ورنہ اصل بات جسے ایسی صورت میں اختیار کیا جائے گا' جیسا کہ ہم آٹھویں قاعدے میں بھی بتا چکے ہیں' ایسے ملکۂ فقہیہ اور ذوقِ صحیح کی طرف رجوع کرنا ہی ہے' جو ماہر فقہاء اور مفتیانِ کرام کے پاس طویل مشق اور اُن کے پاس رہے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

دسواں قاعدہ

الاصل العاشر

''بے شک مفہومِ مخالف' جو نصوص شرعیہ (کتاب وسنت) میں تو غیر معتبر ہوتا ہے، لیکن فقہ کی کتابوں کی عبارات میں اُس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کتبِ فقہ کی عبارات کا جو مفہومِ مخالف بنتا ہو' اُس پر عمل کرنا درست ہوگا' بشرطیکہ یہ مفہوم مخالف' دیگر صریح عبارات کے خلاف نہ ہو''۔

تشریح: یہاں یہ جاننا چاہیے کہ جس معنی پر عبارت کے الفاظ میں سے کوئی لفظ دلالت کر رہا ہو' اسے اس عبارت کا ''منطوق'' کہتے ہیں۔

جس معنی پر عبارت میں ذکر کردہ الفاظ کے علاوہ کوئی اور چیز دلالت کرے' اُس کا نام ''مفہوم'' رکھا جاتا ہے۔

پھر اس ''مفہوم'' کی دو قسمیں ہیں:

(۱)...مفهوم الموافقة:

یہ اس کو کہتے ہیں کہ (نص کی) عبارت میں جس حکم کو بیان کیا گیا ہے' اُسی حکم کو اُس مسئلہ کیلئے ثابت کرنا' جس سے عبارت میں خاموشی اختیار کرلی گئی ہے اور یہ ثبوت صرف لغت کو سمجھنے سے ہی ہو جائے یعنی اس کے ثبوت کیلئے کسی رائے اور اجتہاد کی ضرورت پیش نہ آئے، مثلاً اللہ کریم کا ارشاد ہے:

فلا تقل لهما أفٍ (الاسراء۔۲۳)

(تم ماں باپ کو اُف بھی نہ کہو)

اس جملے کی دلالت ماں باپ کو مارنے اور گالی دینے کی حرمت پر (صرف لغت کے اعتبار سے ہی ثابت ہو رہی ہے اور اسے دلالۃ النص بھی کہتے ہیں)

(۲)...مفھوم المخالفۃ:

(قرآن وسنت وغیرہ کی نصوص کی) عبارت (جب اصل عبارت میں) بیان کردہ حکم کے بالکل برخلاف حکم کو اُس کیلئے ثابت کریں جس سے یہ نص خاموش ہے تو یہی مفہوم مخالف ہے۔ جیسے ہماری یہ بات:

فی الابل السائمۃ زکوٰۃ

''باہر چرنے والے جانوروں میں زکوٰۃ فرض ہے''۔

اب اس عبارت کا مفہوم مخالف یہ ہوا کہ زکوٰۃ اُن جانوروں پر فرض نہیں، جن کو گھر میں رکھ کر چارہ کھلایا جائے۔

مفہوم مخالف کی کئی اقسام ہیں:

(۱)...مفھوم الصفۃ:

جس پر وہ لفظ دلالت کرے جو کسی موصوف کی صفت بن رہا ہو جیسے ہماری یہ بات:

"فی الابل السائمۃ زکوٰۃ"۔

(۲)...مفھوم الشرط:

جو بتائے کہ جب شرط نہیں پائی گئی تو حکم بھی نہیں پایا جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وان کن اولٰت حمل فأنفقوا علیھن حتی یضعن حملھن (الطلاق ٦)

(اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کو اس وقت تک نفقہ دیتے رہو جب تک وہ اپنے پیٹ کا بچہ جن لیں)۔

اس آیت کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ وہ مطلقہ بائنہ، جو حاملہ نہ ہو اُس کیلئے نفقہ دینا شوہر پر لازم نہیں ہے۔

(۳)...مفھوم الغایۃ:

جو یہ بتائے کہ ذکر کردہ حکم (بس اس غایت تک کیلئے ہے اور) غایت کے بعد یہ حکم نہیں ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وارجلکم الی الکعبین (المائدۃ ٦)

ترجمہ: ''اور اپنے پاؤں (بھی) ٹخنوں تک (دھولیا کرو'')۔

اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ٹخنوں سے اوپر دھونا فرض نہیں ہے۔

(۴)...مفهوم العدد:

وہ ہے جو یہ بتائے کہ ذکر کردہ مسئلہ کا حکم صرف اُس عدد کیلئے ہے' جو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اس حکم کی نقیض' اس عدد کے بعد ثابت ہو جائے گی' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فاجلدوهم ثمٰنين جلدة (النور،۴)

(ان کو اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ)۔

اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اسی سے زائد کوڑے نہ لگائے جائیں۔

(۵)...مفهوم اللّقب:

جو یہ بتائے کہ ذکر کردہ مسئلہ کا حکم صرف اُسی اسمِ جامد کیلئے ہے' جو عبارت میں مذکور ہے اور اس حکم کی نقیض اس مذکورہ اسمِ جامد کے علاوہ کیلئے ثابت ہے۔ جیسے ہم یہ کہیں "في الغنم زكوٰة"، (بکریوں میں زکوٰۃ فرض ہے) تو اس کا مفہوم مخالف یہ بنا کہ بکریوں یعنی "غنم" کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

اب ''مفہوم موافقت'' تو بالاتفاق' قرآن مجید' احادیث مبارکہ اور کتب فقہ سب میں معتبر ہے اور مفہوم مخالف (کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ) قرآن وسنت میں اس کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرات شوافع آخری قسم "مفهوم لقب" کے علاوہ باقی تمام اقسام کو قرآن وسنت کی عبارات میں معتبر مانتے ہیں۔

جب کہ حنفیہ کے ہاں یہ مفہوم مخالف اس معنی میں غیر معتبر ہیں کہ نص' عبارت میں ذکر کردہ حکم کے علاوہ کیلئے اصل حکم کی نقیض کو ثابت نہیں کرتی۔ لہٰذا ایسا مفہوم "مسكوت عنه" کے درجہ میں ہوتا ہے (کہ عبارتِ نص' اُس سے خاموش ہے) لہٰذا اگر کوئی دلیل اس پر آجائے کہ اُس کا حکم' اصل ذکر کردہ مسئلہ کے حکم والا ہی ہے تو اُس پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی دلیل اس پر آجائے کہ اس کا حکم اصل ذکر کردہ مسئلہ کے حکم کے برخلاف ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

اس بات کی تفصیل کہ مسكوت یعنی جس سے نص خاموش ہو (اُس کا حکم) اپنی اصل پر باقی رہتا ہے' یہ ہے کہ اگر اصل (حکم) ہی (منطوق) ذکر کردہ مسئلے کے برخلاف ہو تو مسکوت (غیر ذکر کردہ مسئلہ) سے اُس حکم کا ختم ہونا ثابت ہو جائے گا، یہ اس لیے نہیں کہ (حنفیہ کے ہاں) "مفہومِ مخالف معتبر ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ مسکوت (غیر ذکر کردہ مسئلہ) اپنی اصل پر ہی باقی ہے۔

اس کی مثال یہ حدیث ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

"لا يحل لا مراءة تؤمن بالله واليوم الاخر، تحدّ علىٰ ميت فوق ثلاث، الا

علی زوج اربعۃ اشھر و عشرًا"۔ ح۳۸۰

(کسی عورت کیلئے جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتی ہو‘ یہ حلال نہیں کہ وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے‘ سوائے اپنے شوہر کے کہ اس پر چار ماہ دس دن سوگ منائے گی)۔

اب شوہر پر سوگ کا حکم حدیث پاک میں صرف مسلمان خاتون کیلئے ہے۔ اسی لیے حنفیہ کے ہاں نابالغہ بچی اور ذمیہ خاتون (وہ کافرہ خاتون، جو کسی اسلامی ملک کی باقاعدہ شہری بن کر رہ رہی ہو) پر یہ سوگ واجب نہیں ہے۔ برخلاف شوافع کے کہ وہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو یہاں یہ گمان ہوا کہ حنفیہ کا اس حدیث سے استدلال تو اُن کے اپنے اصول کے خلاف استدلال ہے (کہ حنفیہ مفہوم مخالف کو غیر معتبر کہتے ہیں اور اس حدیث میں اُسی سے استدلال کر رہے ہیں)۔

جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مفہوم مخالف سے استدلال نہیں‘ بلکہ اس حدیث میں حکم صرف مسلمان خاتون کیلئے ہی بیان کیا گیا ہے۔ رہی نابالغہ بچی اور ذمیہ خاتون تو حدیث اُن کے بارے میں خاموش ہے، لہٰذا وہ اپنی اصل پر باقی رہیں گی‘ جو سوگ کا واجب نہ ہونا ہے۔ کیونکہ سوگ کے وجوب کیلئے تو دلیل چاہیے اور وہ ان دونوں کیلئے نہیں ہے۔

مفہوم مخالف کتب فقہ میں

رہی کتبِ فقہ‘ تو ان میں حنفیہ کے ہاں بھی مفہوم مخالف معتبر ہے اور اسی طرح لوگوں کے درمیان عام معاملات میں اس کا اعتبار ہے۔

نصوصِ شریعت یعنی قرآن وسنت اور فقہی کتب کی عبارتوں کے درمیان فرق کی وجہ یہ ہے کہ نصوصِ قرآن وسنت تو انتہائی بلیغ اور پر حکمت عبارات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اُن میں کبھی کوئی لفظ تاکید، توبیخ و تشنیع (ڈانٹ ڈپٹ اور برائی کے اظہار) یا وعظ و نصیحت کیلئے بھی ذکر کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے سے پہلے حکم کیلئے بطور قید کے نہیں ہوتا۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تشتروا بآیٰتی ثمنًا قلیلاً (البقرۃ۔۴۱)

(اور تم میری آیات کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو)۔

اب یہاں ''قلیل'' (تھوڑے) کے لفظ کا اضافہ اس کام کی برائی کے اظہار کیلئے ہے اور اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو زیادہ قیمت کے بدلے بیچنا جائز ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لا تأكلوا الربٰا اضعافاً مضٰعفة (آل عمران۔ ۱۳۰)

(کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود مت کھاؤ)۔

اب اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ''ربا'' اصل رقم سے دوگنا نہ ہو تو وہ جائز ہے۔

ہاں کتب فقہ تو اُن کا مقصد ہی احکام کو قانونی طریقے پر مدون کرنا ہوتا ہے اور ان کتب میں تاکید و تشنیع وغیرہ نہیں ہوتی' لہٰذا ان کتب میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جانا ضروری ہے اور جو حکم اس مفہومِ مخالف سے ثابت ہوگا، اسے لیا جائے گا۔ البتہ اگر یہ مفہوم مخالف کسی دوسری عبارت میں واضح طور پر ذکر کردہ حکم کے خلاف ہو تو پھر اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

گیارہواں قاعدہ

الاصل الحادی عشر

ضعیف اور مرجوح روایات پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا جائز نہیں ہے' سوائے اس کے کہ کسی ماہر فن مفتی کے سامنے کوئی ضرورت ثابت ہو جائے (اس بناء پر اُس کیلئے ضعیف اور مرجوح روایات پر عمل یا افتاء کی گنجائش ہے)۔

تشریح: یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جو مفتی مقلد ہو' اُس پر واجب ہے کہ وہ اقوال اور روایات میں سے صرف انہی کو لے' جن کی تصحیح اصحابِ ترجیح کر چکے ہیں۔ باقی رہے کتبِ فقہ میں پائے جانے والے وہ ضعیف اقوال اور روایات' جن کے ضعیف ہونے کے بارے میں اصحاب ترجیح تصریح کر چکے ہیں یا اُن کا ضعیف ہونا' ان فقہاء کی عبارتوں سے ضمناً اور التزاماً ثابت ہو رہا ہے' تو ایسی روایات اور اقوال پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

علامہ قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بے شک مرجوح قول پر حکم صادر کرنا یا فتویٰ دینا' خلافِ اجماع ہے۔ اور مرجوح قول' راجح کے مقابلے میں ایسا ہوتا ہے گویا کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ اور بغیر کسی وجہ' ترجیح کے' آپس میں متعارض اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دے ڈالنا ممنوع ہے۔ اور جو شخص اس پر اکتفاء کر لیتا ہے کہ اُس کا فتویٰ یا اُس کا عمل' اُس مسئلہ میں کسی بھی قول یا صورت کے موافق ہو جائے (بغیر ترجیح راجح کے) اور وہ مختلف اقوال اور صورتوں کے درمیان ترجیح پر نظر کیے بغیر ہی اُن

میں سے جس پر چاہے عمل پیرا ہو جائے تو اُس نے جہالت کا ارتکاب کیا اور اجماع کی خلاف ورزی کی"۔ (ح،۳۹)

یہاں بہت سے فقہاء کرام نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ کبھی کسی ایسی ضرورت کی بناء پر جو کسی ضعیف روایت یا مرجوح قول پر عمل کرنے کا تقاضا کرے' ایسا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ ان حضرات کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف خواہشاتِ نفسانی کی بناء پر تو ضعیف اقوال کو لینا جائز نہیں ہے لیکن جب کسی شخص کو کوئی شدید حاجت پیش آ جائے تو اُس کیلئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ اپنی ذات کی حد تک کسی ضعیف قول یا مرجوح روایت پر عمل کر لے۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح عقود رسم المفتی" میں ایسی شدید حاجت کی کئی مثالیں پیش فرمائی ہیں:

(۱)...... حنفیہ کے ہاں مفتیٰ بہ مسئلہ یہ ہے کہ جب منی اپنے اصل مقام سے شہوت کے ساتھ جدا ہو تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ عضو سے خروجِ منی کے وقت شہوت ختم ہو چکی ہو یا نہیں دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو احتلام کا احساس ہوا اور اس نے اپنے ذکر کو پکڑ لیا' یہاں تک کہ شہوت ختم ہو گئی' پھر اُس نے اسے چھوڑ دیا اور منی' شہوت کے ٹھنڈے پڑ جانے کے بعد نکلی تو بھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غسل واجب ہو جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غسل صرف اُسی صورت میں لازم ہو گا' جب شہوت' منی نکلتے وقت بھی باقی ہو۔

اصحابِ ترجیح نے اس مسئلے میں طرفین رحمہما اللہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے' لہٰذا اب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مسافر ہو یا ایسے لوگوں کے ہاں مہمان ہو' جن سے اُسے شک وشبہ میں پڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اُس کیلئے گنجائش ہے کہ وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل کر لے۔

(۲)...... حنفیہ کے ہاں مفتیٰ بہ مسئلہ یہ ہے کہ خون جب کسی دانے کے چھلکے پر ظاہر ہو جائے' پھر اگر تو وہ زخم کے منہ سے نکل کر بہہ جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر نہ بہے تو وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور بہنے کی حقیقت یہ ہے کہ خون' زخم کے منہ سے آگے بڑھ جائے۔ اس لیے اگر خون' زخم کے منہ سے اوپر اٹھا اور پھول گیا لیکن آگے نہیں بڑھا تو یہ بہنے والا خون نہیں ہو گا اگر چہ یہ خون، زخم کے منہ سے زیادہ ہو (اور وضو نہیں ٹوٹے گا) اس حالت میں اگر وہ شخص کسی کپڑے وغیرہ سے خون پونچھ لے' حالانکہ وہ اتنا خون تھا کہ اگر یہ اُسے چھوڑ دیتا اور صاف نہ کرتا تو خون بہہ جاتا' تو ایسی صورت میں بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔ (ح،۴۰)

لیکن اس مسئلہ میں ایک ضعیف قول بھی ہے' جسے صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ ایسی صورت میں وضو

شيأ من الدنيا، الجزء ۴، الصفحة ۱۶، طبع دار المعرفة، بيروت -

(۲۸) كشف الظنون عن أسامی الكتب والفنون، خليفة، كتاب الكاف كنز العباد فی شرح الأوراد، الجزء ۲ الصفحة ۱۵۱۷-

وفيه أنه مجموعة "أوراد الشيخ شهاب الدين السهروردی رحمه الله تعالی، والشرح

www.besturdubooks.wordpress.com

سے غیر فطری عمل کے بارے میں بھی ان کے قول کو اختیار کر لے۔ متعہ اور بیع صرف میں اہل مکہ کے قول کو لے اور نشہ آور چیز کے بارے میں اہل کوفہ کی بات اختیار کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سب سے برا ہوگا''۔

(یہ قول مناھج الفتوی فی السلف کے تحت مسئلة التقليد والتمذهب کے ضمن میں بھی گزر چکا ہے)۔

حضرت سلیمان تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر تم ہر عالم کی رخصت (آسان مسئلے) کو لے لو گے' یا یہ فرمایا کہ ہر عالم کی غلطی کو لے لو گے' تو ساری برائی تم میں جمع ہو جائے گی''۔ [ح ۱۱]

حضرت عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص شاذ اقوال کو اختیار کرے' وہ علم میں امامت کے مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتا' نہ ہی وہ شخص علم میں امام بن سکتا ہے جو ہر ایک سے روایت حدیث کر لے' اسی طرح وہ شخص بھی علم میں مقتداء اور راہنما نہیں بن سکتا' جو ہر سنی سنائی بات نقل کر دے''۔ [ح ۱۲]

یہ اِن حضرات کی رائے ہے اُن شاذ اقوال کے بارے میں جو ایسے بڑے فقہاء کرام سے صادر ہوئے جو قابل اعتماد بھی تھے اور اہلِ علم نے اُن کے تفقہ اور تقویٰ کی گواہی بھی دی ہے۔ اب تمہارا کیا خیال ہے اُن شاذ اقوال کے بارے میں جو ایسے چند لوگوں سے صادر ہوئے' جن کو علم اور فقہ سے کوئی تعلق نہیں اور انہوں نے جو کچھ کہا محض اپنی غیر معتدل آراء یا نفسانی جذبات کی بنیاد پر کہا۔ یا ایسی اجنبی ثقافتوں کی بناء پر کہا' جن کا اسلام سے کوئی ربط و تعلق نہیں۔

لہٰذا (ہر مسئلے میں) اُسی بات کو لینا لازم ہوگا' جو شریعت اسلامیہ کے بنیادی مآخذ (قرآن وسنت) شریعت کے عظیم مقاصد اور جمہور فقہاء کرام کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے' سب اقوال سے دلیل کے اعتبار سے راجح اور حجت کے اعتبار سے مضبوط ہو۔

(۵)...... مفتی کیلئے لازم ہے کہ وہ اس دوسرے مذہب کو اُن تمام شرائط سمیت لے' جو اُس میں معتبر ہیں تاکہ وہ ایک ہی مسئلہ میں "تلفیق" کا مرتکب نہ ہو جائے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسئلہ تلفیق کی کچھ تفصیل ذکر کر دیں۔ واللہ سبحانہ ولیّ التوفیق۔

تلفیق کا حکم

حکم التلفیق

(اس بحث میں حضرت مصنف دامت برکاتہم العالیہ پہلے علامہ قرافیؒ کے حوالے سے تلفیق ممنوع کا مفہوم بتائیں گے۔ پھر حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ اور دیگر بعض اہل علم نے ابنِ ہمام رحمہ اللہ، ابنِ امیر حاج رحمہ اللہ، علامہ نوح آفندی رحمہ اللہ اور مفتی ابوسعود مصری رحمہ اللہ کی طرف جو تلفیق کے جائز ہونے کی نسبت کی ہے' اُس کی تحقیق اور تفصیل بیان فرمائیں گے نیز بحث کے آخر میں جائز اور ممنوع تلفیق کا فرق مثالوں کے ذریعے واضح فرمائیں گے۔ مجمع الفقہ الاسلامی نے اپنے آٹھویں اجلاس میں تلفیق کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی' اُسے بھی قارئین آخری سطور میں پڑھیں گے)

تلفیق کے موضوع پر' میرے سامنے پوری بحث کا جو خلاصہ آیا' وہ یہ ہے کہ اس اصطلاح سے عام طور پر فقہاء کے کلام میں یہ مراد لیا جاتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ میں دو مذہب اس طرح اختیار کر لئے جائیں کہ اُن سے ایک ایسی مرکب حالت وجود میں آجائے کہ وہ ان دونوں مذاہب میں سے کسی میں بھی جائز نہ ہو۔

مثلاً کوئی شخص اس بات میں کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، حنفیہ کے قول کو اختیار کر لے اور مذہب شافعیہ کو اس مسئلے میں اختیار کر لے کہ بہتے ہوئے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور پھر وہ (وضو کر کے) اس کے بعد نماز پڑھے کہ وہ عورت کو بھی چھو چکا ہے اور اُس کا خون بھی بہہ چکا ہے۔ اب اُس کی یہ نماز دونوں میں سے کسی ایک مذہب کے مطابق بھی درست نہیں ہوگی۔

علامہ قرافی رحمہ اللہ (ت ۶۸۴ھ) مالکی فرماتے ہیں:

"مفتی جب ایک مسئلہ میں دوسرے مذاہب کی طرف منتقل ہونے کو جائز سمجھتا ہو تو اُس پر لازم ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ جس حکم پر وہ فتویٰ دے رہا ہے' کہیں ایسا تو نہیں کہ جس مذہب سے وہ منتقل ہو رہا ہو' اُس میں کوئی ایسا حکم ہو' جو اس کے خلاف جاتا ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ شافعی مفتی جب مثلاً مالکی مذہب سے شافعی مذہب میں منتقل ہونے کو جائز قرار دیتا ہو اور اس سے کسی مالکی شخص کے غسل کے بارے میں یہ مسئلہ پوچھا جائے کہ اگر اُس نے "تدلیک" (غسل

میں جسم کو ملنا) نہیں کی تو کیا حکم ہے؟ تو اب مفتی پر لازم ہے وہ اس کو جائز قرار نہ دے، وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو اس مالکی شخص کی نماز دونوں کے اتفاق سے باطل قرار پائے گی۔ کیونکہ مالکی (غسل سے پہلے) بسم اللہ نہیں پڑھتے۔ تو اُس کی نماز امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں باطل ہوگی اس لیے کہ اُس نے غسل میں "تدلیک" نہیں کی اور امام شافعیؒ کے نزدیک باطل ہوگی کیونکہ اس نے غسل سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھی۔

خود مجھ سے ایک مرتبہ اُن موزوں کے بارے میں جو خنزیر کے بالوں سے سی لئے گئے ہوں، یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا کہ وہ پانی جو سلائی کی جگہ سے لگ کر آئے گا تو کیا اُس کے اثر سے نماز جائز ہوگی۔ یہ مسئلہ پوچھنے والے صاحب شافعی تھے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ امام مالکؒ کا مذہب تو یہ ہے کہ خنزیر کا بال پاک ہے لیکن آپ شافعی ہیں اور اسی بناء پر (وضو میں) سر کے صرف کچھ حصے کا مسح کرتے ہیں۔ آپ کی نماز کے باطل ہونے پر تو دونوں آئمہ متفق ہو جائیں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ اس لیے کہ آپ نے پورے سر کا مسح نہیں کیا (جو اُن کے ہاں فرض ہے) اور امام شافعی رحمہ اللہ اس لیے کہ اُن کے نزدیک خنزیر کا بال نجس ہے۔ اس جیسے مسائل کو خوب سمجھ لینا چاہیے کیونکہ یہ بکثرت پیش آتے ہیں"۔ ح ۱۳۷

علامہ قرافی رحمہ اللہ کی اس بات پر حاشیہ میں ہمارے شیخ، عظیم محدث علامہ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ ت ۱۴۸ نے تحریر فرمایا ہے:

"مؤلف (علامہ قرافی رحمہ اللہ) نے بھی اس بات میں اُسی مشہور و معروف مؤقف کو اختیار کیا ہے کہ "تلفیق باطل ہے"۔ جب کہ امام ابن ہمام رحمہ اللہ نے "التحریر" میں اور اُن کے شاگرد ابن امیر حاج رحمہ اللہ نے اُس کی شرح (۳/ ۳۵۰ تا ۳۵۳) میں تلفیق کے جائز ہونے کو تحقیق سے ثابت کیا ہے اور اس پر واضح دلائل لائے ہیں۔ انہوں نے علامہ قرافی رحمہ اللہ کی یہ مذکورہ بات نقل کی اور اس کی تشریح اپنے اس قول سے کی:

"بعد میں آنے والے (قرافی رحمہ اللہ) نے اس میں یہ قید لگادی کہ تلفیق پر کوئی ایسی صورت مرتب نہیں ہونی چاہیے، جس کو دونوں آئمہ رد کرتے ہوں"......

اور انہوں نے "متأخر" (بعد میں آنے والا) کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ متقدمین علماء میں سے کسی سے اس بارے میں ممانعت ثابت نہیں ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ کی طرح دیگر کئی اہل علم کی کتابوں میں بھی تلفیق کے جائز ہونے کی نسبت ابنِ ہمامؒ اور ابن امیر حاج رحمہ اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن "التحریر" اور اس کی شرح میں، ان دونوں حضرات کی عبارات دیکھنے

کے بعد واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے تلفیق کے جواز کی تائید نہیں کی۔انہوں نے تو دوسرے مذہب کی تقلید کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز کہا ہے کہ تلفیق نہ ہونے پائے۔ابن امیر حاج رحمہ اللہ نے تو مختلف مذاہب کی رخصتیں تلاش کرنے والے کو فاسق قرار دینا' اسی پر محمول کیا ہے کہ جب وہ تلفیق کا مرتکب ہو۔انہوں نے تلفیق سے روکنے کی تائید علامہ رویانی رحمہ اللہ کے قول سے کی ہے اور ان کی بات کے بعد اُس کی تردید نہیں کی' جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ (ابن امیر حاج رحمہ اللہ) علامہ رویانی رحمہ اللہ کے ساتھ متفق ہیں۔

لہٰذا ظاہر یہی ہوتا ہے کہ تلفیق کو جائز قرار دینے کی نسبت ان دونوں حضرات (ابن ہمام رحمہ اللہ وابن امیر حاج رحمہ اللہ) کی طرف کرنا واضح نہیں ہے۔

(بندہ مرتب عفا اللہ عنہ' عرض کرتا ہے کہ ابن ہمام رحمہ اللہ کی طرف اس نسبت کی شہرت کی ایک وجہ التحریر کی دوسری شرح تیسیر التحریر بھی ہوسکتی ہے' جو امیر بادشاہ رحمہ اللہ کے قلم سے ہے اور انہوں نے واضح طور پر تلفیق کو جائز کہا ہے بلکہ اس پر دلائل بھی قائم فرمائے ہیں۔عام طور پر تلفیق کے مسئلہ پر علماء نے التحریر کے بجائے تیسیر التحریر کی عبارات ہی پیش کی ہیں مثلاً دیکھیں الفقہ الاسلامی وادلتہ اور قاموس الفقہ)

رہا ابن ہمام رحمہ اللہ کی عبارت میں "متاخر" سے یہ استدلال کرنا کہ متقدمین میں سے کسی سے بھی تلفیق کی ممانعت ثابت نہیں ہے تو اس سے انتہائی بات جو ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی سے پہلے اس کی ممانعت کی تصریح نہیں پائی جاتی ہو۔اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ متقدمین نے تلفیق سے منع نہیں کیا تھا' کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ بعض سے یہ ممانعت منقول ہو' لیکن ہمیں اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔یا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُن کے زمانے میں چونکہ اس ممانعت کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لیے انہوں نے صراحتاً اس تلفیق سے نہیں روکا۔پھر (آخری بات یہ ہے کہ) جیسے ان متقدمین سے تلفیق کی ممانعت منقول نہیں' اسی طرح اس کا جواز بھی تو منقول نہیں (لہٰذا صرف "متاخر" کے لفظ سے استدلال مکمل نہیں ہوتا)۔

پھر ہمارے شیخ (عبدالفتاح ابوغدۃ رحمہ اللہ) نے یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ تلفیق کے جواز میں کئی کتابیں تالیف کی گئی ہیں' جن میں سب سے اچھی کتاب "القول السدید فی بعض مسائل الاجتھاد و التقلید" ہے' جو گیارہویں صدی کے ایک عالم شیخ محمد عبدالعظیم ابن ملا فروخ المکی رحمہ اللہ (ت ۱۰۶۱ھ) کی تصنیف ہے۔ (ح ۱۴۷)

یہ رسالہ شیخ محمد بن عبدالعظیم مکی، رومی، مورتی، حنفی رحمہ اللہ، نے جن کا لقب ابن ملا فروخ رحمہ اللہ تھا، لکھا ہے اور اس میں انہوں نے بہت سے علماء حنفیہ اور غیر حنفیہ سے تلفیق کے جائز ہونے کا قول نقل کیا ہے۔

ایسے حضرات میں سے ایک علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ انہوں نے رسائل زینیہ میں ۳۲ ویں رسالے میں "بیع الوقف لاعلی وجہ الاستبدال" کی صورت میں تحریر فرمایا ہے:

''ممکن ہے کہ وقف میں استبدال کے صحیح ہونے کو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے لے لیا جائے اور غبن فاحش کے ساتھ بیع کی درستگی کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے لے لیا جائے، اس طرح کہ یہ مسئلہ دو قولوں سے ایک حکم میں تلفیق کے جائز ہونے پر مبنی ہوگا''۔

پھر ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ بزازیہ سے وہ عبارت نقل کی ہے، جو تلفیق کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور فرمایا:

> ''ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی التحریر کے آخر میں جو تلفیق سے ممانعت کی بات آئی ہے تو اس کو انہوں نے بعض متاخرین کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ مذہب (مختار) نہیں ہے'' ح ۱۵

ابن ملا فروخ رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی دلیل، وہ واقعہ ہے جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی، پھر انہیں بتایا گیا کہ غسل خانے میں جس کنویں سے پانی آتا ہے، اُس کنویں میں ایک چوہا پایا گیا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اُسی غسل خانے میں غسل کیا تھا۔ یہ اطلاع بھی انہیں لوگوں کے چلے جانے کے بعد ملی۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

> ''ہم اپنے بھائی، اہل مدینہ کے قول کو لے لیتے ہیں کہ جب پانی دو مٹکے ہو جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا''۔ (قلتین کے مسئلہ کی تفصیل ''تشریحات نمبر ۲۴'' میں دیکھیں)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قصہ بہت مشہور ہوا ہے اور فقہاء حنفیہ میں سے کئی حضرات نے اس کو ذکر کیا ہے۔ محیط برہانی میں اس واقعے کو احمد الکشی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۵۰ھ) کی کتاب "مجموع النوازل" سے نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ کشف الظنون میں ہے۔ ح ۱۶

اس واقعہ کی سند معلوم نہیں، پھر یہ بات بھی ہے کہ اہلِ مدینہ نے "قلتین"، یعنی دو مٹکوں پر پانی کی طہارت کو منحصر نہیں کیا، یہ تو صرف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اگر یہ واقعہ ثابت بھی ہو جائے تو اس سے صرف دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کرنے کا جواز ہی ثابت ہوتا ہے (اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، جیسا کہ "الافتاء بمذھب آخر" کی بحث میں ہے) اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے دو قولوں کے درمیان تلفیق

اختیار فرمائی تھی۔ کیونکہ اس قصے میں یہ بات تو نہیں ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے (پہلے) غسل کے مسائل میں مالکی مذہب یا شافعی مذہب کی مخالفت بھی کی تھی۔ بظاہر تو جمعہ کی امامت کے وقت انہوں نے اختلاف فقہاء کی رعایت ہی کی ہوگی۔ لہٰذا اس واقعے سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تلفیق کا جائز ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

پھر ہمارے شیخ (عبدالفتاح ابو غدۃ رحمۃ اللہ علیہ) نے علامہ احمد طحطاوی رحمہ اللہ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ تلفیق کے مسئلہ میں انہوں نے مفتی ابو سعود رحمہ اللہ کی پیروی کرتے ہوئے علامہ ابن فروخ رحمہ اللہ (ت:۱۵۰) کے کلام کو پسند کیا ہے اور اُسے سراہا ہے۔

لیکن الدر المختار پر علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کے حاشیہ کی عبارت یوں ہے:

> ''جان لیں کہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر (زیر بحث مسئلہ میں) فتویٰ دینا عین تقلید ہے۔ اور اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ تلفیق نہ ہو۔ جیسا کہ شیخ حسن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور اس بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اس کے برخلاف علامہ ابن ملا فروخ رحمہ اللہ نے تلفیق پر عمل کرنے کے جواز کی تصریح کی ہے۔ انہوں نے اس پر طویل تحقیقی گفتگو کی ہے اور مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ انہوں نے تلفیق کے جائز ہونے کو ابن ہمام رحمہ اللہ کی طرف التحریر کے حوالے سے اور ابن نجیم رحمہ اللہ کی طرف اُن کے ایک رسالے کے حوالے سے منسوب کیا ہے۔
>
> صاحب بحر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تلفیق پر عمل کرنے سے روکنا مذہب کے خلاف ہے۔ اسی طرح ابن ملا فروخ رحمہ اللہ نے جوازِ تلفیق کی نسبت صاحبِ بحر رحمہ اللہ کے علاوہ علماء خوارزم کی طرف بھی کی ہے بلکہ انہوں نے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف تلفیق پر عمل پیرا ہونے کو منسوب کیا ہے''۔

لیکن علامہ نوح آفندی رحمہ اللہ (ح:۱۷) کی ''مسائلِ مسبوق'' سے متعلق اپنے رسالے میں گفتگو تو اُس بات (عدمِ جوازِ تلفیق) کی تائید کرتی ہے جو شیخ حسن ابو السعود رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ (بحوالہ ابو سعود)

(ح:۱۸)

اس عبارت سے واضح ہو رہا ہے کہ علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے ابن ملا فروخ رحمہ اللہ کا مؤقف نقل کرنے کے بعد اس کے مقابلہ میں علامہ نوح رحمہ اللہ آفندی کا کلام اور اُن کی طرف سے تلفیق کی ممانعت کی تائید بھی نقل کی ہے اور اسی طرح یہی تائید انہوں نے مفتی ابو السعود رحمہ اللہ سے بھی نقل کی ہے۔ اب اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی ابو السعود رحمہ اللہ نے تلفیق کی ممانعت کی تائید کی ہے نہ کہ اجازت کی۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

ان تمام عبارات کا خلاصہ یہ ہوا کہ ابن نجیم رحمہ اللہ اور ابن ملا فروخ رحمہ اللہ نے واضح طور پر تلفیق کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن ھمام رحمہ اللہ کی بات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تلفیق کی ممانعت متأخرین نے کی ہے۔ چاروں مذاہب کے جمہور متأخرین فقہاء نے تلفیق سے منع کیا ہے' جیسا کہ آپ علامہ قرافی مالکی رحمہ اللہ کی عبارت پہلے پڑھ چکے ہیں اور شوافع میں سے ابن العطار رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کو پسند کیا ہے۔

میرے سامنے جو بات واضح ہوئی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم - یہ ہے کہ تلفیق سے روکنا ہی راجح ہے۔ کیونکہ اس پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مذاہب کے ساتھ ذاتی لذتوں کی غرض سے کھلواڑ کرنا' خواہشات نفس کی پیروی کرنا ہے۔ اس کی ممانعت تو واضح طور پر قرآن مجید کی اس آیت میں موجود ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ

(ص۔ ٢٦)

(لہٰذا تم لوگوں کے درمیان برحق فیصلے کرو اور نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ یقین رکھو کہ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا تھا)۔

اگر تلفیق کے دروازے کا چوپٹ کھول دیا جائے تو اس کا نتیجہ خواہش نفسانی کی پیروی اور شرعی پابندیوں سے بالکل آزادی کی شکل میں ہی سامنے آئے گا۔ البتہ وہ تلفیق جو ممنوع ہے' اس کی صورت یہ ہے کہ انسان کسی ایک مسئلہ میں دو مذاہب کو ایسے اختیار کرلے کہ جس سے ایک ایسی شکل وجود میں آجائے کہ کوئی بھی خاص اُس مسئلے میں' اس صورت کے جائز ہونے کا قائل نہ ہو۔

اب اگر کسی شخص نے کسی ایک مسئلے میں کوئی قول اپنے مذہب کے خلاف اختیار کرلیا تو یہ لازم نہیں کہ وہ دیگر تمام مسائل میں بھی اُسی مذہب کو اختیار کرے۔

اس کی مثال (کہ اگر دو مسئلے الگ الگ باب کے ہوں تو وہاں تلفیق یعنی الگ الگ مذہب اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے) وہ مسئلہ ہے جس سے علامہ ابن فروخ رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ متأخرین حنفیہ میں سے بہت سے حضرات نے' آئمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہم کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر قاضی کے سامنے کوئی مصلحت واضح ہو جائے تو وہ غائب شخص کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے (جب کہ اصل مذہب حنفیہ میں قضاء علی الغائب جائز نہیں ہے)۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے جامع الفصولین سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس جیسی صورتوں میں (یعنی جب غائب کو قاضی کے ہاں حاضر کرنے میں سخت دشواری ہو تو) اگر غائب شخص کے خلاف گواہ آ جائیں اور قاضی کا غالب گمان بھی یہ ہو کہ سائل حق پر ہے اور اس میں کوئی دھوکہ بازی یا حیلہ سازی نہیں ہے تو قاضی کیلئے مناسب یہ ہے کہ وہ غائب کے حق میں بھی اور اس کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ مفتی کیلئے بھی مناسب ہے کہ حرج کو دور کرنے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اسی پر فتویٰ دے، تاکہ لوگوں کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے''۔

پھر یہ مسئلہ (قضاء علی الغائب) اجتہادی مسئلہ ہے۔ آئمہ ثلاثہؒ اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔ ہمارے آئمہ سے اس سلسلے میں دو روایات ہیں۔ قاضی کیلئے یہ بھی مناسب ہے کہ وہ غائب شخص کی طرف سے کسی ایسے شخص کو وکیل مقرر کر دے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ غائب کی طرف داری کرے گا اور اُس کے حق میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ اسی قول کو نور العین میں برقرار رکھا ہے۔ میں (ابن عابدین شامیؒ) کہتا ہوں کہ اس بات کی تائید اُس بحث سے بھی ہو گی جو جلد ہی مسخّر (جسے قاضی غائب کی طرف سے وکیل مقرر کر دے) کے بارے میں آ رہی ہے۔

اس (قضاء علی الغائب کے جواز) کی تائید اُس عبارت سے بھی ہوتی ہے، جو فتح القدیر کے 'باب المفقود' میں ہے:

''غائب شخص پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ قاضی اُس کے حق میں یا اس کے برخلاف فیصلہ کرنے میں مصلحت سمجھے اور پھر فیصلہ کر دے تو یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے۔ (متفقہ اور قطعی مسئلہ نہیں ہے)''۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل ''تشریحات نمبر ۲۶'' میں ملاحظہ فرمائیں

میں (ابن عابدین شامیؒ) کہتا ہوں کہ اس عبارت کا ظاہری تقاضا یہ ہے کہ اگرچہ حنفی قاضی بھی ایسا فیصلہ کر دے اور وہ قاضی بھی ''ہمارے زمانے'' کا ہو، تو بھی یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ یہ بات گزشتہ بحث کے خلاف نہیں کیونکہ یہاں قضاء علی الغائب کو جائز قرار دینا مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے ہے۔ ح۱۹

''علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے بارے میں خاص طور پر تصریح اس لیے کی ہے کہ وہ پہلے بتا چکے ہیں کہ اُن کے زمانے میں قاضی کو امیر کی طرف سے پابند کر دیا جاتا تھا کہ وہ مذہب حنفیہ کے خلاف فیصلہ نہیں دے گا اور اگر اُس نے ایسا کیا تو اُس کا فیصلہ نافذ نہیں ہو گا، کیونکہ غیر مذہب

حنفیہ پر فیصلہ کرنے سے وہ معزول سمجھا جائے گا''۔

اب ان تصریحات کی بنیاد پر اگر کوئی قاضی قضاء علی الغائب میں جمہور فقہاء کے مذہب کو اختیار کر لیتا ہے تو اُس پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ وہ اپنے تمام فیصلوں میں اُن کے مذہب کو ہی لازم پکڑ لے۔

لہٰذا اگر قاضی نے پڑوسی کے حق میں شفعہ کا فیصلہ کر دیا (جو مذہب حنفی ہے) اور مدعیٰ علیہ غائب تھا' تو اس کا نتیجہ تلفیقِ ممنوع نہیں نکلے گا۔ کیونکہ قضاء علی الغائب کا مسئلہ اور پڑوسی کیلئے شفعہ کا حق ثابت ہونے کا مسئلہ' دونوں دو الگ الگ ابواب کے مستقل مسائل ہیں (جب کہ ممنوع وہ تلفیق ہے' جو ایک باب کے مسئلہ میں ہو) اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر اُس نے ایک بابَ (قضاء) میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول اختیار کر لیا تو اب وہ دوسرے باب (شفعہ) میں مذہب حنفیہ اختیار نہ کرے۔

اس مؤقف کی تائید اُس عبارت سے بھی ہوتی ہے' جو فتاویٰ ھندیہ میں "ذخیرۃ" کے حوالے سے نقل کی گئی ہے:

''اس کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو ہم نے بتا دیا کہ جو قاضی' فاسق گواہوں کی بناء پر غائب کے بارے میں فیصلہ کر دے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کی بناء پر غائب کے نکاح کے بارے میں فیصلہ کر دے تو اُس کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ حالانکہ جو (امام شافعی رحمہ اللہ) قضاء علی الغائب کو جائز کہتے ہیں' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نکاح میں عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں اور فاسق کی بھی گواہی بالکل غیر معتبر ہے۔ لیکن یہاں (اس ظاہری شبہ کے جواب میں) یہ کہا گیا ہے کہ ان دونوں مسائل میں سے ہر ایک مجتہد فیہ ہے۔ لہٰذا اگر قاضی ان میں اپنے اجتہاد کے ذریعے فیصلہ کرے گا تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا''۔ (ح ۲۰)

(یہاں تک تو اُس تلفیق کی بات ہوگئی' جو دو الگ الگ باب کے مسائل میں ہو تو یہ جائز ہے)

اس کے برخلاف جو شخص اس مسئلہ میں مذہب شافعیہ کو اختیار کر لیتا ہے کہ بہنے والے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور اس مسئلے میں مذہب حنفیہ کو لے لیتا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا (تو یہ تلفیق درست نہیں) کیونکہ یہ دونوں مسائل ایک ہی باب کے ہیں۔ ایسا کرنے کی صورت میں تو وہ دونوں مذاہب میں سے کسی مذہب پر بھی باوضو نہیں سمجھا جائے گا۔

یہی مؤقف ہے جس کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے مسئلہ تلفیق میں معتدل ترین قول قرار دیا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''ہمارے نزدیک ان اقوال مختلفہ میں سے یہ قول ''اعدل الاقوال'' (معتدل ترین بات) ہے کہ عمل واحد میں تلفیق خارق للاجماع (اجماع کے مخالف) کی اجازت نہ ہو اور دو عمل جدا گانہ ہوں تو ان میں تلفیق کی اجازت دی جائے' گو ظاہراً خلاف اجماع لازم آتا ہو مثلاً کوئی شخص بے ترتیب وضو کرے تو شافعیہ کے نزدیک وضو صحیح نہیں اور کوئی شخص رُبع رأس (چوتھائی سر) سے کم کا مسح کرے تو حنفیہ کے نزدیک وضو نہیں ہوتا۔ پس اگر کوئی شخص اس طرح وضو کرے کہ ترتیب کی رعایت نہ ہو اور مسح کرے ربع رأس سے کم کا، تو کسی کے نزدیک بھی وضو نہیں ہوا اور یہ تلفیق خارقِ اجماع ہے اور اگر کسی نے وضو میں چوتھائی سر سے کم کا مسح کیا اور نماز میں فاتحہ خلف الامام نہ پڑھی تو ظاہراً اس صورت میں بھی ''خرقِ اجماع'' لازم آتا ہے کہ وضو شافعیہ کے مذہب پر ہے اور نماز حنفیہ کے مذہب پر' مگر وضو جدا عمل ہے اور نماز جدا' اس واسطے یہ تلفیق منع نہیں''۔ (ح ۲۱۰)

اسی طرح حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے حرمتِ مصاہرت (سسرالی رشتوں کی بناء پر ثابت ہونے والی حرمت' تفصیل کتب فقہ میں دیکھیں) کے ثبوت میں حنفیہ کے مذہب پر فتویٰ دیا' اور مسلمانوں کی ایک جماعت (پنچایت) کے سامنے فسخ نکاح کے جائز ہونے میں مالکیہ کے مذہب پر فتویٰ دیا۔ کیونکہ یہ دونوں الگ الگ معاملے ہیں' لہٰذا ان سے وہ تلفیق لازم نہیں آتی جو ممنوع ہو۔ (ح ۲۲۰) واللہ سبحانہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

تلفیق کے موضوع پر ایسی ہی ایک قرارداد مجمع الفقه الاسلامی (اسلامی فقہ اکیڈمی) نے اپنے آٹھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ' برونائی دارالسلام) میں بھی منظور کی تھی۔

(حضرت دامت برکاتہم نے یہاں صرف قرارداد کے فقرہ نمبر ۵ اور ۶ کو نقل فرمایا ہے۔ بندہ تکمیلِ فائدہ کیلئے اس سے پہلے فقرہ نمبر ۴ کا ترجمہ بھی نقل کر رہا ہے' کیونکہ فقرہ نمبر ۶ میں اُسی کی طرف اشارہ ہے)۔

فقرہ نمبر ۴

فقہی مذاہب کی سہولتوں کو محض خواہشِ نفسانی کی خاطر اختیار کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ شرعی احکام کی پابندی سے آزادی ہے۔ البتہ مندرجہ ذیل ضوابط کی رعایت رکھتے ہوئے کسی فقہی مذہب میں دی گئی سہولت کو اختیار کیا جا سکتا ہے:

(الف)...... جن فقہاء کا قول اختیار کیا جا رہا ہے وہ قول معتبر ہو اور اقوال شاذہ میں سے نہ ہو۔ اس قول کو اختیار کرنا کسی حقیقی مشقت کو دور کرنے کے لئے واقعۃً ضروری ہو گیا ہو۔

(ب)...... خواہ یہ ضرورت معاشرے کی حاجت عامہ یا خاصہ کی شکل میں ہو یا انفرادی ضرورت کی صورت میں۔

(ج)...... ایسے قول کو اختیار کرنے والا ایسے اہل علم میں سے ہو جو اقوال فقہاء میں انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہو، یا ایسا شخص ہو جو کسی ایسے اہل شخص پر اعتماد کر رہا ہو۔

(د)...... سہولت پر مبنی قول کو اختیار کرنے سے وہ تلفیق لازم نہ آئے جو ممنوع ہے اور جس کا ذکر فقرہ نمبر ۶ میں آ رہا ہے۔

(ہ)...... سہولت پر مبنی قول کو اختیار کرنے سے کوئی غیر مشروع مقصد پورا کرنا مطلوب نہ ہو۔

(و)...... اس سہولت کو اختیار کرنے پر متعلقہ شخص کا ضمیر مطمئن ہو۔

فقرہ نمبر ۵

مختلف مذاہب کی تقلید میں تلفیق کی حقیقت یہ ہے کہ تقلید کرنے والا کسی ایک ایسے مسئلہ میں، جس کی دو یا زیادہ باہم ربط رکھنے والی فروع و جزئیات ہوں، کسی ایسی کیفیت کو اپنا لے کہ اُس مسئلہ میں، اُس نے جن فقہاء کی تقلید کی ہے، کوئی بھی اُس کا قائل نہ ہو۔

فقرہ نمبر ۶

تلفیق کرنا مندرجہ ذیل حالات میں ممنوع ہے:

(الف)...... جب اس کا نتیجہ محض خواہش نفسانی کی خاطر سہولت حاصل کرنا ہو یا فقہی مذاہب کی سہولتوں سے استفادہ کے جو قواعد فقرہ نمبر ۴ میں ذکر ہوئے، اُن میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

(ب)...... جب اس سے کسی قاضی کے فیصلے کو مسترد کرنا لازم آئے۔

(ج)...... جب کسی معاملے میں کسی مجتہد کی تقلید کرتے ہوئے ایک عمل کر چکا ہو اور اب دوسرے مجتہد کا قول لے کر اسے توڑنا چاہتا ہو۔

(د)...... جب تلفیق کے نتیجے میں اجماع کی مخالفت کی جائے، یا کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو اجماع کی مخالفت کو مستلزم ہو۔

(ہ)...... جب تلفیق کے نتیجے میں کوئی ایسی مرکب حالت وجود میں آ جائے، جو مجتہدین میں سے کسی کے نزدیک بھی معتبر نہ ہو۔ ج ۲۳

(۲)...... دوسرے مذہب پر اس کی دلیل راجح ہونے کی بناء پر فتویٰ دینا

الافتاء بمذهب آخر لرجحان دليله

دوسری حالت جس میں اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا جائز ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ مفتی اپنے مذہب کا ماہر ہو' دلائل کی خوب معرفت رکھتا ہو' قرآن وسنت پر اُس کی گہری نظر ہو' اگر چہ وہ درجۂ اجتہاد پر فائز نہ ہو لیکن اگر وہ کسی ایسی حدیث صحیح کی واقفیت حاصل کرلے جس کی اپنے معنی پر دلالت بھی بالکل واضح ہو اور اُسے اس حدیث کے مقابلے میں کوئی اور مضبوط دلیل بھی سوائے اپنے امام کے قول کے نہ ملے' تب ایسے عالم کیلئے گنجائش ہے کہ وہ اُس مجتہد کے قول کو اختیار کرلے' جس کا عمل اس حدیث پاک کے مطابق ہے۔ یہ بات ہم تقلید اور مذہب متعین کی پیروی کے سلسلے میں بھی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ہم نے ابھی جو بات تفصیل سے بتائی' یہ اُس گفتگو کے بالکل موافق ہے جو علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے شرح عقود رسم المفتی میں' علامہ بیری رحمہ اللہ کی شرح اشباہ سے اور انہوں نے ابن شحنہ کبیر رحمہ اللہ (ت ۸۱۵ھ) کی شرح ہدایہ سے نقل کی ہے:

> ''جب حدیث پاک پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے اور وہ مذہب کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کیا جائے گا اور وہ ہی امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب ہوگا۔ حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے' امام صاحب رحمہ اللہ کا مقلد حنفیت سے نہیں نکلے گا' کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ ارشاد ثابت ہو چکا ہے کہ ''جب حدیث پاک کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو وہ ہی میرا مذہب ہے''۔
>
> علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ نے یہ بات امام ابوحنیفہ اور دیگر آئمہ کرام رحمہم اللہ سے نقل کی ہے اور یہی بات امام شعرانی رحمہ اللہ نے بھی چاروں آئمہ رحمۃ اللہ علیہم سے منقول بتائی ہے۔
>
> ''میں (علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کو چھوڑ کر حدیث شریف پر عمل کرنے کا حق اس شخص کو ہے' جو نصوص میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور محکم ومنسوخ نصوص کو پہچان سکتا ہے۔
>
> لہٰذا جب اس غور وفکر کی اہلیت رکھنے والے کسی دلیل کو خوب سمجھ لیں اور اپنے امام کے قول کو چھوڑ

کر نص کے مطابق عمل کریں تو اس عمل کی نسبت مذہب کی طرف کرنا درست ہے۔ کیونکہ یہ صاحبِ مذہب کی اجازت سے ہی تو صادر ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر صاحبِ مذہب کو اپنی دلیل کی کمزوری معلوم ہو جاتی تو وہ ضرور اپنے قول سے رجوع کر لیتے اور اُس دلیل کی پیروی کرتے 'جو زیادہ مضبوط ہوتی''۔ (ح:۲۴)

عجیب بات وہ ہے جو اس مندرجہ بالا گفتگو کے بعد علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ:

''میں یہ بھی کہتا ہوں کہ مذکورہ بات کو اس شرط کے ساتھ مقید کیا جانا چاہیے کہ وہ حدیث' مسلک کے کسی قول کے موافق ہو (تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے) کیونکہ علماء نے ایسے اجتہاد کی اجازت نہیں دی ہے کہ جس سے ہمارے آئمہ کے متفق علیہ مذہب سے مکمل طور پر نکلنا لازم آتا ہو۔ اس لیے کہ آئمہ مجتہدین کا اجتہاد' اس بعد میں آنے والے کے اجتہاد سے مضبوط ہے۔ لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ آئمہ کے علم میں اس کی دلیل سے زیادہ راجح کوئی دلیل ضرور آئی ہوگی' جس کی بناء پر ان حضرات نے اس شخص کی دلیل پر عمل نہیں کیا''۔

اسی شرط کی بناء پر علامہ قاسمؒ نے اپنے استاذ خاتم المحققین کمال ابن الہمام رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

''ہمارے شیخ کی ان تحقیقات پر عمل نہیں کیا جائے گا' جو مذہب کے خلاف ہیں''۔

علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التصحیح والترجیح علی القدوری" میں فرمایا ہے کہ امام علامہ حسن بن منصور بن محمود اوزجندی رحمہ اللہ، جو قاضی خان کے لقب سے معروف ہیں' نے اپنے فتاویٰ میں تحریر کیا ہے کہ:

''ہمارے زمانے میں فتویٰ دینے کا ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ جب ہمارے یعنی حنفی علماء میں سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے' تو اگر وہ مسئلہ ہمارے آئمہ سے ظاہر الروایۃ میں بغیر کسی اختلاف کے منقول ہے تو وہ اُن کے قول کی طرف ہی مائل ہو اور ان کے قول کے مطابق فتویٰ دے۔ ان کے خلاف اپنی رائے نہ چلائے' اگرچہ وہ ماہر مفتی ہو کیونکہ بظاہر حق ہمارے آئمہ کے ساتھ ہی ہوگا' ان سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اس مفتی کا اجتہاد' آئمہ کے اجتہاد کو نہیں پہنچ سکتا اور ان لوگوں کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا' جو آئمہ کے خلاف کہتے ہیں' نہ ہی اُن کی دلیل قبول کی جائے گی۔ کیونکہ ہمارے آئمہ تمام دلائل جان چکے تھے اور انہوں نے صحیح و ثابت مسائل کو ان کے برعکس (غیر صحیح اور غیر ثابت شدہ) مسائل سے الگ کر دیا تھا''۔ (ح:۲۵)

علامہ ابن قاضی سماوہ حنفی رحمہ اللہ (ت،۱۵۲) نے "جامع الفصولین" (۱۵/۱) میں اس بات کی تردید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ صرف خوش اعتقادی ہے۔ ورنہ امام مالک رحمہ اللہ بھی تو ان سے زمانے میں مقدم ہیں اور اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں کہ یہ فقہاء احادیث وآثار کو ضبط کرنے، محفوظ رکھنے اور تلاش کرنے میں امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ سے بڑھ کر تھے۔ (پھر تو قاضی خان رحمہ اللہ کی دلیل کے مطابق ان فقہاء کو ان آئمہ سے اختلاف کرنے کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہیے) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کے دور میں احادیث ویسے مدوّن نہیں تھیں، جیسے اُن کے بعد ہوئیں۔ حدیث کی مشہور چھ کتابیں ان آئمہ کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ نیز مجتہد کی رائے، اگر ان (متقدمین) کی رائے کے خلاف ہوگئی تو ان کی رائے نہ قرآن ہے نہ حدیث، نہ اجماع ہے نہ ہی کسی صحابی رضی اللہ عنہ یا تابعی رحمہ اللہ کی بات۔ مجتہد کے فتویٰ کو تو دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی قبول کیا گیا، جیسے قاضی شریح رحمہ اللہ (جو خود تابعی تھے لیکن دورِ صحابہ میں طویل عرصے تک قاضی رہے)۔

مجتہد پر لازم ہے کہ وہ اپنی رائے پر عمل کرے اور دوسرے کی رائے پر عمل پیرا نہ ہو۔ اگر وہ اپنی رائے کو دیگر آراء پر راجح سمجھتا ہے تو اُس کیلئے کسی دوسری بات پر عمل کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ المحیط میں یہ مذکور ہے کہ "مجتہد پر واجب ہے کہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے اور اُس پر کسی دوسرے کی تقلید حرام ہے"۔ (ح،۲۶)

قاضی خان رحمہ اللہ کا وہ قول جس پر ابن قاضی سماوہ حنفی رحمہ اللہ کی تردید ابھی گزری اس کو نقل کرنے کے بعد خود ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لیکن کبھی ہمارے فقہاء نے اُس قول کو بھی ضرورت وغیرہ کی بناء پر چھوڑ دیا، جس پر ہمارے تمام آئمہ متفق تھے۔ پہلے یہ بات تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے مسئلہ میں بیان ہو چکی ہے..... تو ایسے وقت ان آئمہ کے قول کے برخلاف فتویٰ دینا بھی جائز ہے، جیسا کہ ہم عنقریب حاوی قدسی سے ذکر کریں گے"۔

پھر ضعیف قول پر فتویٰ دینے کے مسئلے میں ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ جو عالم نصوص اور اقوالِ آئمہ کے معانی سے خوب آگاہ ہو اور خود بھی اہلِ درایت میں سے ہو، تو ایسی صورت میں اُس کیلئے جائز ہے کہ

وہ اپنی ذات کی حد تک اپنے امام کے علاوہ کسی اور کے قول پر عمل کر لے۔ لیکن ان تمام صورتوں میں کسی دوسرے کے قول پر فتویٰ دینا اس مفتی کیلئے جائز نہیں ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اُس سے فتویٰ لینے آتا ہے تو وہ اُس سے آئمہ حنفیہ کی رائے پوچھتا ہے' اُس کی ذاتی رائے نہیں۔ ممانعت کی یہ وجہ بیان کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ مستفتی کو صراحتاً بتا دے کہ اس مسئلے میں وہ مذہبِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر فتویٰ نہیں دیتا بلکہ کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دیتا ہے تو پھر یہ جائز ہونا چاہیے۔

ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے آئمہ شافعیہ میں سے قفال رحمہ اللہ کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی "بیع صبرۃ" کا حکم پوچھنے آتا تو وہ اُس مستفتی کو کہتے:

"آپ اس بارے میں میرا مذہب پوچھنے آئے ہیں یا امام شافعی رحمہ اللہ کا؟"۔

قفیز اور بیع صبرۃ کا مفہوم "تشریحات نمبر ۲۵" میں دیکھیں

کبھی یہ بھی فرماتے:

"اگر میں اجتہاد کروں اور میرے اجتہاد کا نتیجہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مطابق نکلے تو میں وہ مسئلہ یوں بیان کرتا ہوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے' لیکن میں اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کا قائل ہوں"۔ ح،۲۷

(۳)...... جب قاضی اپنے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب پر فیصلہ دیدے

اذا قضی القاضی بغیر مذہبہ

جب کوئی حکمران' قاضی کو عہدۂ قضاء پر فائز کر دے اور اُس کو کسی متعین مذہب کی پیروی کا پابند نہ کرے اور قاضی خود مجتہد ہو' پھر وہ ایسا فیصلہ کرے جو کسی بھی دوسرے کے مذہب کے خلاف ہو تو اُس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا' بشرطیکہ وہ مسئلہ مجتہد فیہا ہو۔

مفتی سے اگر اس بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ ایسے فیصلوں کے نافذ ہونے کا ہی فتویٰ دے گا۔

اگر قاضی نے خود اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ دے دیا تو یہ ہی وہ تیسری صورت ہے' اُن صورتوں میں سے' جس میں مفتی اپنے مذہب کے برخلاف فتویٰ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حاکم کا

حکم اور قاضی کا فیصلہ' اختلاف کو ختم کر دیتا ہے (یعنی مسئلہ مجتہد فیہا ہو تو اُس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے)۔

اس سلسلے کی بنیاد وہ واقعہ ہے' جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے قضاء کا کام جب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تو دو افراد اپنا مسئلہ لے کر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انہوں نے ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پھر جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوا تھا' اس کی ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو انہوں نے اس سے حال احوال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ نے تو میرے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لو كنت انا مكانه لقضيت لك"۔

(اگر میں اُن کی جگہ ہوتا تو فیصلہ تمہارے حق میں کرتا)۔

اس شخص نے عرض کیا کہ آپ کو فیصلہ دینے سے کیا رکاوٹ ہے؟ (آپ ابھی میرے حق میں فیصلہ دے دیں)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا:

"ليس هنا نص والرأي مشترك"۔

(اس مسئلہ میں کوئی صریح نص تو ہے نہیں اور رائے میں تو دونوں برابر ہیں)۔ ح ۲۸۰

(حضرت دامت برکاتہم حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ اثر مجھے کتب حدیث میں باوجود تلاش کے نہیں مل سکا لیکن امام زیلعی رحمہ اللہ کی یہ تصریح کہ یہ واقعہ صحت کے ساتھ ثابت ہے' ایسی بات ہے جس پر اعتماد کیا جائے گا'')۔

اسی طرح ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے حکم بن مسعود رحمہ اللہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا کہ آپ نے حقیقی یعنی ماں باپ شریک بھائیوں کو (میراث کے کسی مسئلہ میں) ثلث میں شریک بنا دیا''۔

اس پر ایک شخص نے کہا:

قد قضيت في هذه عام الاول بغير هذا

(آپ نے گزشتہ سال تو ایسے ہی مسئلہ میں' اس سے مختلف فیصلہ کیا تھا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ تو اُس نے کہا: آپ نے ماں شریک یعنی اخیافی بھائیوں کو تو حصہ دلوایا تھا لیکن حقیقی بھائیوں کو کچھ بھی نہیں دلوایا تھا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ذلك على ما قضينا، وهذا على ما نقضي

(وہ فیصلہ ویسے ہی نافذ رہے گا، جیسے ہم کر چکے ہیں اور اس فیصلے پر ویسے ہی عمل کیا جائے گا، جیسے ابھی ہم نے فیصلہ کیا ہے)۔ ج ۲۹:

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنی رائے بدل جانے کے باوجود اپنے سابقہ فیصلے کو نہیں بدلا کہ وہ مسئلہ مجتہد فیہا تھا تو پھر نئے قاضی کا پرانے قاضی کے فیصلے کو نہ بدلنا زیادہ واضح اور سمجھ میں آنے والا ہے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ شریعت چاہتی ہے کہ قاضی کے فیصلے سے جھگڑا ختم ہو جائے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہوگا نزاع کو مٹایا جائے گا۔ اب جب کوئی مسئلہ ایسا ہو کہ اُس میں مجتہدین کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اگر ہم مختلف آراء کی بنیاد پر فیصلے ختم کرنے کا دروازہ کھول دیں گے تو یہ جھگڑے ہمیشہ چلتے رہیں گے۔ پھر تو ہر نئے قاضی کیلئے ممکن ہوگا کہ وہ اپنی رائے کی بناء پر گزشتہ فیصلوں کو ختم کر دے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ مختلف مذاہبِ فقہیہ میں سے کسی ایک کو قطعی طور پر بالکل باطل قرار نہیں دیا جا سکتا تو جس رائے پر فیصلہ ہو گیا ہے، اُسے (خود بخود دوسری آراء کے مقابلے میں) قاضی کے فیصلے کے ذریعے، جس کا مقصد ہی جھگڑے ختم کرنا ہے، ترجیح حاصل ہو گئی۔ لہٰذا وہ فیصلہ برقرار رہے گا۔

ہاں اگر قاضی کا فیصلہ قطعی نصوص یا اجماع کے خلاف ہوا تو پھر اس کو برقرار رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اب وہ فیصلہ حکم "بغير ما انزل الله" (اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف فیصلے کرنا) کی زد میں آجائے گا۔

لیکن اس مسئلہ میں کچھ تفصیل ہے جو اپنی مختلف جزئیات کے ساتھ کتبِ فقہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس میں سے کچھ باتوں کو وضاحت سے ذکر کرتے ہیں۔ والله سبحانه هو الموفق للصواب۔

ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ ت، ۵۸۷ نے اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پہلے ہم ان کی عبارت مکمل نقل کریں گے، پھر ہم اس سے تلخیص شدہ نکات کی کچھ وضاحت اور تفصیل۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ذکر کریں گے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ "البدائع" میں فرماتے ہیں:

''جب ایک قاضی کا فیصلہ دوسرے قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو کن فیصلوں کو نافذ کرے گا اور کن فیصلوں کو ختم کر دیا جائے گا، اس کی تفصیل کو ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیان کرتے ہیں: (اس کی کل چار صورتیں بنتی ہیں)

قاضیٔ اول کا فیصلہ یا تو ایسے مسئلے میں ہوگا، جس میں قرآن مجید، حدیث متواتر یا اجماع کی کوئی نص صریح

موجود ہے (یعنی قطعی مسئلہ ہے) یا وہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں ظاہر نصوص اور قیاس کی روشنی میں اجتہاد کیا گیا ہے (یعنی اجتہادی ہے)''۔

(١)......اب اگر پہلی صورت ہے کہ اُس مسئلہ میں قرآن مجید' حدیث متواتر یا اجماع کی نص مفسر موجود ہے تو (دوسرے قاضی کیلئے حکم یہ ہوگا کہ) اگر قاضیٔ اول کا فیصلہ نص کے موافق ہے تو نافذ ہوجائے گا اور قاضیٔ دوم کیلئے اُس کو ختم کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ یہ فیصلہ قطعی طور پر صحیح ہے۔

اگر قاضیٔ اول کا فیصلہ ایسی نص کے خلاف ہو تو قاضیٔ دوم اُسے رد کردے گا کیونکہ یہ یقینی طور پر باطل ہے۔

پھر اگر (نص صریح نہیں) مسئلہ مجتہد فیہا ہے' جس میں قاضیٔ اول نے فیصلہ کیا ہے' تو پھر دو صورتیں ہیں۔ یا تو اُس مسئلے کا مجتہد فیہا ہونا اتفاقی ہوگا یا اختلافی۔

پھر اگر اس مسئلے کا محل اجتہاد ہونا متفقہ ہو تو پھر دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مسئلہ جس کا فیصلہ ہوا ہے، وہ اجتہادی ہوگا یا پھر نفس قضاء (فیصلہ کرنے کا عمل) ہی مجتہد فیہ ہوگا۔

(٢)......اگر اصل مسئلہ جس پر فیصلہ ہوا ہے' وہ اجتہادی ہے اور وہ فیصلہ دوسرے قاضی کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اس فیصلے کو رد نہیں کرے گا بلکہ نافذ کردے گا کیونکہ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کے درست ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ تمام فقہاء کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود' اس بات پر متفق ہیں کہ قاضی کا اپنے اجتہاد سے جس قول کی طرف بھی رجحان ہوجائے، وہ اُسی کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ متفقہ طور پر درست قرار پائے گا۔

اگر دوسرا قاضی' قاضیٔ اول کے فیصلے کو ایسے مسئلہ میں ختم کرے گا تو اپنی رائے اور اپنے قول کی بناء پر ایسا کرے گا' جس کے صحیح ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ لہٰذا ایسا فیصلہ جو بالاتفاق درست ہے' اُس کو ایسے فیصلے سے ختم کرنا' جس کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے' جائز نہیں ہوگا۔ (یہ اس بات پر ایک دلیل مکمل ہوگئی کہ مسئلہ جب مجتہد فیہا ہو تو قاضیٔ اول کی قضاء کو ختم کرنا جائز نہیں ہے)۔

(دوسری دلیل یہ ہے کہ) اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے قاضی کے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے' بلکہ صرف اجتہادی دلیل ہے۔ جبکہ قاضیٔ اول کا فیصلہ تو دلیل قطعی سے ثابت ہوچکا ہے اور وہ دلیل قطعی (جیسا کہ پہلے گزرا) فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قاضی کیلئے اُس قول پر فیصلہ کرنا جائز ہے' جس کا حق ہونا اُس کے سامنے واضح ہوجائے۔ لہٰذا دلیل قطعی کی بناء پر ثابت شدہ فیصلے کو ایسے فیصلے سے ختم کرنا جائز نہیں جس میں شبہ پایا جاتا ہے۔

(تیسری دلیل یہ ہے کہ) ضرورت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ مبنی بر اجتہاد فیصلے کو لازم قرار دیا جائے اور اُس کو ختم کرنا

جائز نہ ہو۔ کیونکہ اگر اس کو ختم کرنا جائز قرار دیا جائے تو (صورت حال کچھ یوں ہوگی کہ جس کے خلاف فیصلہ ہوا تو) وہ اس فیصلے کو کسی دوسرے ایسے قاضی کے پاس لے جائے گا' جس کی رائے (اس مسئلے میں) قاضیٔ اول کے خلاف ہوگی' وہ قاضیٔ اول کے فیصلے کو ختم کر دے گا تو مدعی پھر تیسرے ایسے قاضی کے پاس مسئلہ لے جائے گا' جس کی رائے دوسرے قاضی کے خلاف ہوگی تو وہ اس کے فیصلے (جس نے قاضیٔ اول کے فیصلے کو کالعدم کیا تھا) کو ختم کر دے گا اور قاضیٔ اول کے مطابق فیصلہ جاری کر دے گا۔

اس کا نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ کبھی بھی جھگڑا اور اختلاف ختم نہیں ہوگا۔ یہی باہمی اختلاف' فساد کا سبب بنتا ہے اور جو بات (قاضی اول کے فیصلے کو مسئلہ مجتہد فیہا میں کالعدم قرار دینا) کہ جس کا نتیجہ فساد ہی نکلے' وہ خود فساد ہے۔

لہٰذا اگر دوسرے قاضی نے قاضیٔ اول کے فیصلے کو رد بھی کر دیا تو مدعی اس کو تیسرے قاضی کے سامنے پیش کرے گا جو قاضیٔ اول کے فیصلے کو نافذ قرار دے کر' دوسرے قاضی کے فیصلے کو باطل قرار دیدے گا۔ کیونکہ قاضی اول کا فیصلہ صحیح ہے اور دوسرے قاضی کا فیصلہ جس نے پہلے کو رد کیا تھا' باطل ہے......

(۳)......اگر اصل قضاء ہی مجتہد فیہ ہو کہ یہ فیصلہ کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ جیسے کسی آزاد شخص پر (مالی معاملات میں' مخصوص حالات میں) پابندی عائد کر دینا یا کسی غائب کے خلاف فیصلہ دینا' تو ایسی صورت میں دوسرے قاضی کیلئے جائز ہے کہ اگر اُس کے اجتہاد کا میلان' قاضیٔ اول کے اجتہاد کے خلاف ہو تو وہ اُس کے فیصلے کو کالعدم کر دے۔

اس لئے کہ اس صورت میں قاضی اول کا فیصلہ تمام فقہاء کے قول کے مطابق جائز نہیں تھا، بلکہ یہ بعض فقہاء کے قول پر مبنی تھا (جو اس قضاء کو جائز اور معتبر کہتے ہیں) لہٰذا اس فیصلے کا جائز ہونا متفق علیہ نہیں ہے، تو اس بات کا احتمال ہے کہ اس (اختلافی) قضاء کو اسی جیسے (اختلافی) قضاء کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔ بخلاف پہلی صورت کے (جو ابھی نمبر ۲ میں گزری) کیونکہ وہاں تو قضاء کا جائز ہونا' تمام فقہاء کے قول سے ثابت تھا۔ لہٰذا وہ قضاء اتفاقی تھا' اسی لیے اُس کو بعض کے قول سے ختم کرنے کا احتمال بھی نہیں تھا۔

اس کی (دوسری وجہ) یہ بھی ہے کہ جب کوئی مسئلہ (جس پر فیصلہ ہوا ہے) اختلافی ہو تو قاضی اپنے فیصلے سے ایک اختلاف کو روک دیتا ہے اور اُس مسئلہ کو اپنے متفقہ طور پر جائز فیصلے کے ذریعے' اتفاقی مسئلہ بنا دیتا ہے (کہ پھر اُس فیصلے کی خلاف ورزی جائز نہیں رہتی) اور اگر خود قضاء (فیصلہ کرنے کا عمل) ہی مختلف فیہ ہو تو پھر قاضی اختلاف کو اختلاف کے ذریعے دور کر رہا ہے (حالانکہ اختلاف تو اتفاق سے ختم ہوسکتا ہے' اختلاف سے نہیں)۔

(۴)......یہ (نمبر ۲ میں جو صورت حال تفصیل سے بیان ہوئی) تب ہے' جب قضاءِ قاضی کسی ایسے مسئلے میں ہو'

جس کا اجتہادی مسئلہ ہونا اجماعی اور اتفاقی ہو۔ اگر فیصلہ ایسے مسئلے میں ہو کہ جس میں فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہو کہ یہ مسئلہ محلِ اجتہاد ہے یا نہیں؟ جیسے **ام ولد** (وہ باندی جس سے آقا کی اولاد ہو) کی بیع۔ تو کیا قاضی کا فیصلہ ایسی صورت میں نافذ ہوگا یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ فیصلہ نافذ ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک ام ولد کی بیع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلاف کی وجہ سے یہ مسئلہ محلِ اجتہاد ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا' کیونکہ ابتدائی اختلاف کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ **ام ولد** کی بیع جائز نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ محل اجتہاد ہونے سے نکل گیا (اور اب اجتہادی نہیں' اجماعی مسئلہ بن گیا ہے)۔

یہ اختلاف درحقیقت اس نکتے پر مبنی ہے کہ بعد میں ہونے والا اجماع' پہلے ہونے والے اختلاف کو ختم کر دیتا ہے (اور مسئلہ کو اجماعی بنا دیتا ہے) یا نہیں؟ شیخین رحمہما اللہ کے نزدیک اجماع متأخر، اختلاف متقدم کو ختم نہیں کرتا (اور مسئلہ محل اجتہاد ہی رہتا ہے) اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ختم کر دیتا ہے (اور مسئلہ اجماعی بن جاتا ہے) لہٰذا ایسے مسائل کے مجتہد فیہ ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اب (قضاء کی صورت میں) دیکھا جائے گا کہ اگر دوسرے قاضی کی رائے (شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے مطابق) یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے تو اُس (قاضیٔ اول) کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور اس کو دوسرا قاضی رد نہیں کرے گا' جیسا کہ ہم (نمبر ۲ میں) تمام متفقہ اجتہادی مسائل کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور اگر دوسرے قاضی کی رائے میں وہ مسئلہ اجتہاد کی حد سے نکل چکا ہے اور (امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق) متفقہ مسئلہ بن چکا ہے تو قاضیٔ اول کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ بلکہ دوسرا قاضی اس کو رد کر دے گا کیونکہ اس دوسرے قاضی کے مطابق تو قاضی اول کا فیصلہ خلافِ اجماع ہوا ہے' لہٰذا وہ باطل ہے۔

ہمارے (حنفیہ کے) مشائخ میں سے بعض حضرات نے مجتہد فیہ مسائل کے بارے میں کچھ مزید تفصیل بھی بیان کی ہے اور فرمایا ہے:

> ''اگر اجتہاد قبیح اور ناواقفیت پر مبنی ہو تو دوسرے قاضی کیلئے جائز ہے کہ وہ قاضیٔ اول کے فیصلے کو کالعدم قرار دیدے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ جب کسی مسئلہ کا محل اجتہاد ہونا صحیح طریقے سے ثابت ہو گیا تو اب ایک مجتہد اور دوسرے مجتہد کے درمیان فرق کرنے کا کوئی معنیٰ نہیں رہتا

(کہ ایک کے اجتہاد کو قابلِ نقص اور دوسرے کے اجتہاد کو نا قابلِ تقض قرار دیدیں) کیونکہ ہم نے جو دلائل ذکر کیے وہ ان دونوں کے درمیان فرق کو ثابت نہیں کرتے' لہٰذا مناسب یہی ہے کہ دوسرے قاضی کیلئے' پہلے قاضی کے فیصلے (مسائل مجتہد فیہا میں) ختم کرنا جائز نہ ہو۔ کیونکہ قاضیٔ اول کا فیصلہ' ایسے مسائل ہی میں پایا جا رہا ہے' جو محل اجتہاد ہیں''۔ (ج۷،ص۳۰)

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے' اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

۱......اگر فیصلہ اجماعی مسئلہ میں ہو تو جو فیصلہ اجماع کے موافق ہوگا' وہ نافذ ہوگا اور جو اجماع کے خلاف ہوگا' وہ باطل ہوگا۔

۲......اگر فیصلہ اجتہادی مسئلہ میں ہو اور اس مسئلہ کے مجتہد فیہ ہونے میں کوئی اختلاف نہ ہو تو بالاتفاق فیصلہ نافذ ہوگا۔

۳......اگر اس بات میں اختلاف ہو کہ جس مسئلہ کا فیصلہ کیا گیا ہے' وہ مجتہد فیہ ہے یا نہیں؟ تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک فیصلہ نافذ ہوگا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نافذ نہیں ہوگا۔

۴......اگر خود فیصلہ کرنے کا عمل (نفسِ قضاء) ہی مجتہد فیہ ہو جیسے غائب کے خلاف فیصلہ اور آزاد شخص پر پابندی' تو جو حضرات ایسے فیصلے کو جائز نہیں قرار دیتے' اُن کے نزدیک یہ نافذ بھی نہیں ہوگا۔

ان چار میں سے پہلی دو صورتوں کی شرح اور تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں' جیسا کہ ظاہر ہے۔

کیا بعد میں ہونے والا اجماع' گزشتہ اختلاف کو ختم کر دیتا ہے؟

(هل يرتفع الخلاف المتقدم بالاجماع اللاحق؟)

(علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ بحث کا) تیسرا نکتہ' اس کا تعلق اس صورت سے ہے کہ جب کسی مسئلہ میں عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم میں اختلاف ہو' دو میں سے پھر کسی ایک مذہب پر بعد میں اجماع منعقد ہو جائے' جیسے ام ولد کی بیع' عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ اختلاف تھا کہ اس کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی بیع کو جائز قرار دیتے تھے۔ پھر تابعین کے دور میں ام ولد کی بیع کے جائز نہ ہونے پر اجماع ہو گیا۔

اب امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بعد میں ہونے والا اجماع' پہلے والے اختلاف

کو ختم نہیں کرے گا۔ لہٰذا بعد میں ہونے والے اجماع کے باوجود یہ مسئلہ اجتہادی ہی رہے گا۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ تابعین کے اجماع میں یہ قوت نہیں کہ وہ اس اختلاف کو ختم کر دے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پایا جاتا تھا۔ لہٰذا اگر قاضی نے بیع ام ولد کے جائز ہونے کا فیصلہ کر دیا تو شیخین رحمہما اللہ (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ و امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک یہ نافذ ہو جائے گا کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ میں فیصلہ ہے۔ ح،۳۱

(حضرت مصنف دامت برکاتہم حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اس بات پر متنبہ رہنا چاہیے کہ بعض فقہاء نے ام ولد کی بیع کے فیصلہ میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ ایسا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ بعض دیگر فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ فیصلہ دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف رہے گا۔ کیونکہ جب اس مسئلہ کے اجتہادی ہونے کی بابت اختلاف ہو گیا تو (پہلے قاضی کا) یہ فیصلہ بھی مختلف فیہ ہو گیا' اب اگر دوسرا قاضی اس فیصلے کو باقی رکھتا ہے تو یہ دوسرا فیصلہ' مجتہد فیہا مسئلے میں ہے' لہٰذا یہ دوسرا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ اس کی تفصیل کیلئے **ردالمحتار باب الاستیلاد، مطلب فی قضاء القاضی بغیر مذہبہ اور کتاب القضاء، فصل فی الحبس** دیکھیں۔

لیکن اگر اس (آخری قول) کو شیخین رحمہما اللہ کے قول پر مبنی تسلیم کر لیں تو چار قسموں میں سے تیسری قسم بھی ہمیشہ اُس چوتھی قسم میں ہی شامل ہو جائے گی' جس میں ایک قاضی کا فیصلہ دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف رہتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آنے والے فقرے میں آئے گا' حالانکہ یہ تو خلافِ مفروض ہے۔ (پھر تیسری قسم کو الگ قسم بنانے کا کوئی مقصد نہیں رہتا)۔

شاید یہ قول بھی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر مبنی ہے' کیونکہ وہ پہلے فیصلے کے نفاذ کے قائل نہیں ہیں کہ وہ ان کے نزدیک خلافِ اجماع ہوا ہے۔ لیکن جب اُس کا نافذ نہ ہونا' اختلافِ شیخین رحمہما اللہ کی وجہ سے مجتہد فیہ ہو گیا اور دوسرے قاضی نے اُس فیصلے کو شیخین رحمہما اللہ کے مذہب کے مطابق نافذ کرنے کا فیصلہ دیدیا' تو اب یہ دوسرا فیصلہ (بلا شک وشبہ) مسئلہ مجتہد فیہا میں ہو رہا ہے' لہٰذا یہ دوسرے قاضی کا فیصلہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نافذ ہو جائے گا۔

رہا اس سلسلے میں مذہب شیخین رحمہما اللہ، جو راجح بھی ہے جیسا کہ ابھی اُس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تو پہلا فیصلہ' دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف نہیں رہے گا۔ اسی لئے علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے (اپنی اس عبارت میں جو تفصیل سے ابھی گزری ہے) اس فیصلے کے از خود نافذ ہونے کا ذکر کیا ہے اور دوسرے قاضی پر موقوف رہنے کا ذکر نہیں کیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ایسی صورت میں شیخین رحمہما اللہ کے ہاں تو فیصلہ فوری نافذ ہو جائے گا اور امام محمدؒ کے نزدیک دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف رہے گا۔ جیسا کہ یہ فیصلہ چوتھی قسم میں بھی دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف رہتا ہے' اس چوتھی قسم کا ذکر (اصل کتاب کے) "نقطۂ رابعہ" میں آرہا ہے۔ (فلیتامل' واللہ سبحانہ اعلم)

(حاشیہ کا ترجمہ ختم ہونے کے بعد اب پھر متن کا ترجمہ شروع ہو رہا ہے)

رہے امام محمد رحمہ اللہ تو وہ کہتے ہیں کہ بعد میں ہونے والا اجماع' پہلے اختلاف کو ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب دونوں مذہبوں میں سے ایک پر اجماع ہو گیا تو اب یہ مسئلہ (بیع ام ولد) مجتہد فیہ نہ رہا۔ اسی لیے اگر قاضی نے بیع ام ولد کے جائز ہونے کا فیصلہ دے دیا تو یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا' کیونکہ یہ خلافِ اجماع ہے۔

بہت سے فقہاء حنفیہ نے حدود و قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول کرنے کے معاملے میں قاضی شریح رحمہ اللہ کے قول پر دیئے جانے والے فیصلے کے نافذ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ جیسا کہ عنقریب آئے گا۔ حالانکہ عورتوں کی گواہی کے ان مسائل میں قبول نہ کیے جانے پر اجماع ہو چکا ہے، تو اس بناء پر بظاہر یہ مستلزم ہے' اس بات کو یہاں فتویٰ شیخین رحمہما اللہ کے قول پر ہونا چاہیے (کہ ایسی صورت میں فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے)۔

حضرات شیخین رحمہما اللہ کا قول دلیل کے اعتبار سے بھی راجح ہے۔ کیونکہ بہت سے فقہاء نے' جن میں خود امام محمد رحمہ اللہ بھی ہیں' یہ بات ذکر کی ہے کہ کسی مسئلہ کے اجتہادی ہونے میں اعتبار دلیل کے اشتباہ کا ہے' حقیقتِ اختلاف کا نہیں۔ **فتاوی هندية** میں ہے کہ **المنتقٰی** میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعتبار دلیل کے اشتباہ کا ہے' نہ کہ حقیقتِ اختلاف کا۔ امام محمد رحمہ اللہ نے یہ بات اسی طرح **الجامع الکبیر** اور **السیر الکبیر** میں ذکر فرمائی ہے اور اسی طرح **صاحب الاقضية** نے بھی ذکر کیا ہے۔

السیر الکبیر میں امام محمد رحمہ اللہ نے جو مسئلہ لکھا ہے:

> "اس کی صورت یہ ہے کہ اگر آئمہ مسلمین میں سے کسی امام کی یہ رائے ہو کہ مشرکین عرب سے جزیہ قبول کر لے اور اُس نے عملاً جزیہ قبول بھی کر لیا تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ ایسا کرنا تمام آئمہ کے نزدیک غلط ہے۔ لیکن یہ مسئلہ محلِ اجتہاد ہے' جیسا کہ **الذخيرة** میں ہے"۔ (ح ٣٢)

ہم (زیر بحث مسئلہ میں) یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ جس موقف کو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم نے اس اجماع کے خلاف اختیار کیا تھا' جو بعد میں منعقد ہوا ہے' تو اُن کا ایسا کرنا کسی دلیل پر مبنی نہیں تھا یا یہ اشتباہِ دلیل کا مقام نہیں ہے۔ کیونکہ بلا دلیل کوئی قول اختیار کر لینا یا مقامِ اشتباہ کے بغیر اختلاف کرنا تو گمراہی ہے' جس کا میں خیر

القرون (صحابہ اور تابعین کے بہترین زمانہ) میں نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

جب خود قضاء ہی اجتہاد پر مبنی ہو

اذا کان القضاء نفسہ مجتھدا فیہ

چوتھا نکتہ، جسے علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر خود قضاء ہی اجتہاد پر مبنی ہو جیسے قضاء علی الغائب اور ''آزاد شخص پر پابندی کا فیصلہ'' تو جو حضرات ان مسائل میں قضاء کو جائز نہیں مانتے، اُن کے نزدیک ایسا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ آزاد شخص پر پابندی کے مسئلہ کی تفصیل ''تشریحات نمبر۲۷'' میں دیکھیں

علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی ذکر کردہ بات پر یہاں دو ملاحظات ہیں، جن پر متنبہ رہنا لازمی ہے:۔

پہلا ملاحظہ (نوٹ)

ہم تلفیق کی بحث میں ابن عابدین رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کر چکے ہیں کہ متأخرین حنفیہ نے ضرورت اور مصلحت کی بناء پر قضاء علی الغائب کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہاں مثال میں اس کو پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ متأخرین کے اس قول کے مطابق یہ مسئلہ قضاء علی الغائب ضرورت و مصلحت کی وجہ سے اب اتفاقی مسئلہ بن چکا ہے۔

شاید اس قسم کے مناسب وہ مثالیں ہیں، جو ابن عابدین رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جیسے قاضی اپنے بیٹے کے حق میں اجنبی کے خلاف فیصلہ کردے یا اسی طرح وہ اپنی بیوی کے حق میں فیصلہ دیدے۔ یا قاضی کو حدِ تہمت لگی ہوئی ہو، تو ان صورتوں میں خود قضاء ہی مختلف فیہ ہے۔

دوسرا ملاحظہ (نوٹ)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے اس قسم کا حکم ایسے بیان کیا ہے، گویا یہ حکم حنفیہ کے درمیان متفقہ ہے اور وہ اس پر متفق ہیں کہ اگر خود قضاء مجتہد فیہ ہے تو ایسی صورت میں فیصلہ اُن کے نزدیک نافذ نہیں ہوگا، جو اس قضاء کو معتبر نہیں مانتے۔ لہٰذا اگر قاضیٔ ثانی اُن میں سے ہے جو اس قضاء کو معتبر نہیں مانتے تو اس کیلئے پہلے قاضی کے ایسے فیصلے کو ختم کرنا جائز ہے۔

لیکن فقہ حنفی کی دیگر کتابوں کی مراجعت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم خود حنفیہ کے ہاں متفقہ نہیں ہے۔ اسی لیے ابن

عابدین رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک قسم وہ ہے جس میں فقہا کا اختلاف ہوا ہے۔ وہ تب ہے جب حکم ہی مجتہد فیہ ہو، یہ وہ قسم ہے جس میں حکم کے پائے جانے کے بعد اختلاف واقع ہوا ہو، پس یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم نافذ ہو جائے گا''۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اس قسم کا حکم خود حنفیہ کے درمیان بھی مختلف فیہ ہے۔ اگرچہ خانیہ اور زیلعی وغیرہ میں ایسے فیصلے کے عدمِ نفاذ کے قول کی تصحیح کی گئی ہے، لیکن یہ تصحیح اس مسئلہ کو مختلف فیہ ہونے سے نہیں نکالتی، کیونکہ بعض حنفیہ نے اس صورت میں بھی فیصلہ نافذ ہونے کو ہی ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے ابن الشحنہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے اُن کے دادا کا قول نقل کیا ہے۔

اب دونوں اقوال میں فرق یہ ہوا کہ علامہ کاسانی، قاضی خان اور زیلعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق (ایسی صورت میں) دوسرا قاضی، پہلے قاضی کے فیصلے کو نافذ نہیں کرے گا، لیکن اگر وہ نافذ کر دے گا تو یہ نافذ ہو جائے گا کیونکہ قاضیٔ ثانی نے مسئلہ مجتہد فیہا میں ہی فیصلہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ قاضیٔ اول کے فیصلے کا صحیح ہونا، قاضیٔ ثانی کے فیصلے پر موقوف رہے گا۔

جب کہ ابن الشحنہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق پہلے قاضی کا فیصلہ فوری طور پر نافذ ہو جائے گا اور کسی دوسرے قاضی کی منظوری پر موقوف نہیں رہے گا۔ (ح ۳۴)

کیا یہ شرط لگائی جائے گی کہ مسئلہ پہلے دور (عہد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ) میں مجتہد فیہا ہو؟

هل يشترط ان تكون المسئلة مجتهدا فيها في الصدر الاول؟

بعض فقہاءِ حنفیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قضاء (مجتہد فیہا مسئلہ میں) تب نافذ ہوگی، جب اُس کی بابت دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ میں اختلاف رہا ہو۔ اگر اختلاف اس کے بعد پیدا ہوا تو اس مسئلہ کو اجتہادی نہیں سمجھا جائے گا (بلکہ یہ مسائلِ قطعیہ میں سے شمار ہوگا) چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ:

''ہمارے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کا اختلاف معتبر نہیں ہے۔ معتبر اختلاف تو صرف متقدمین کا ہے۔ متقدمین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اُن کے ساتھ کے لوگ (تابعین رحمہم اللہ) اور ان کے بعد آنے

والے اسلاف ہیں''۔ ح ۴۴

لیکن متاخرین حنفیہ نے اس قول کو نہیں لیا۔ چنانچہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے الدر المختار میں تحریر فرمایا ہے:

''اور کیا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف معتبر ہے؟ اصح قول یہ ہے کہ جی ہاں معتبر ہے' صدر الشریعۃ کا یہی قول ہے''۔

ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس عبارت کے تحت فرماتے ہیں:

''کہا گیا ہے کہ معتبر اختلاف صرف وہ ہی ہے جو پہلے دور میں تھا۔ فتح میں فرمایا ہے کہ میرے نزدیک اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مجتہد ہیں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ (جس مسئلہ میں وہ اختلاف کریں گے) وہ محلِ اجتہاد ہوگا' ورنہ نہیں (یعنی اگر ان کو مجتہد ہی نہیں مانتا تو اور بات ہے)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اہلِ اجتہاد اور بڑے مرتبے والے تھے۔ ذخیرۃ کی عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: نابالغ لڑکی کے والد نے اُس کے مہر کے بدلے خلع لے لیا اور وہ لڑکی کیلئے اسی کو بہتر سمجھتا ہے تو یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح ہے اور شوہر مہر سے بری ہو جائے گا۔ اب اگر کسی قاضی نے اس کے مطابق فیصلہ کر دیا تو وہ نافذ ہو جائے گا''۔ ح ۴۵

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بعض متونِ حنفیہ' جن میں الدر المختار بھی شامل ہے' میں آئمہ اربعہ کے درمیان کئی مختلف فیہا مسائل کے بارے میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر دیا جانے والا فیصلہ' حنفیہ کے مذہب کے مطابق نافذ نہیں ہوگا۔ جیسے اُس جانور کے حلال ہونے کا فیصلہ دینا جس پر جان بوجھ کر بسم اللہ کو نہ پڑھا گیا ہو اور ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دینا' اسی طرح دیگر اور مسائل۔ لیکن ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اصحاب فتویٰ جو ایسے آگے آنے والے مسائل ذکر کرتے ہیں' جن میں قاضی کا فیصلہ نافذ نہیں ہوتا تو اُن کا یہ کہنا قدوری کی عبارت پر مبنی ہے' نہ کہ اُس عبارت پر جو الجامع (الصغیر) میں ہے۔ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے تو انہوں نے قدوری کے قول پر اعتماد کیا ہے اور جنہوں نے ان کے اختلاف کو معتبر جانا ہے' انہوں نے الجامع (الصغیر) کی عبارت پر اعتماد کیا ہے۔ الواقعات

الحسامية میں فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ہم اسے یعنی الجامع (الصغیر) کی عبارت کو لیتے ہیں' لیکن شرح ادب القضاء میں ہے کہ فتویٰ اُس قول پر ہے جو قدوری میں ہے (یہ تلخیص شدہ عبارت ہے)۔ اور سابقہ تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ یہ دونوں قول ہی تصحیح شدہ ہیں۔ متون تو اُس کے مطابق ہیں جو قدوری میں ہے اور زیادہ مدلل وہ ہے جو الجامع (الصغیر) میں ہے' اسی لیے اُس کو الفتح میں ترجیح دی گئی ہے''۔ ح ۳۶۰

(حضرت مصنف دامت برکاتہم فرماتے ہیں):

یہ عبد ضعیف عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ بظاہر قدوری کے قول اور الجامع الصغیر کی عبارت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ الجامع الصغیر کی عبارت (جس کا حوالہ علامہ شامی نے دیا ہے) یہ ہے:

''جس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہو جائے اور قاضی اُس میں کوئی فیصلہ کر دے' پھر دوسرا قاضی آ جائے جس کی رائے اس مسئلہ میں مختلف ہو تو وہ اسی پہلے فیصلے کو نافذ کرے گا''۔

قدوری کی عبارت یہ ہے:

''اور جب قاضی کے سامنے کسی حاکم کا حکم پیش کیا جائے تو وہ اُسے نافذ کر دے گا' سوائے اس کے کہ وہ قرآن مجید یا سنت یا اجماع کے خلاف ایسا قول ہو' جس پر کوئی دلیل نہ ہو''۔ ح ۳۶۱

(دیکھیں الھدایۃ، کتاب القضاء، باب کتاب القاضی الی القاضی، اس میں دونوں عبارتیں مذکور ہیں)۔

یہاں ان دونوں عبارتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ امام قدوری رحمہ اللہ نے اس عبارت میں صرف مشہور شرط زائد کی ہے کہ قاضی کا فیصلہ کتاب اللہ یا سنت یا اجماع کے خلاف نہ ہو۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ شرط تو سب کے نزدیک ہی ملحوظ ہے۔ لیکن امام قدوری رحمہ اللہ نے کوئی جزئی مسئلہ ذکر نہیں فرمایا جس میں فیصلہ نافذ نہ ہوتا ہو' نہ ہی انہوں نے متروک التسمیۃ عمداً (جس جانور پر بوقت ذبح جان بوجھ کر بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو) یا ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کرنے یا اس جیسے کسی اور مسئلہ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

انہوں نے صرف مشہور ضابطے کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ قاضی کا اجتہاد وغیرہ مقامِ اجتہاد میں نہ ہو یا کوئی ایسا شاذ قول ہو' جس پر تمام فقہاء نے نکیر کی ہے (تو ایسے مسائل میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا) جیسے متعہ کا جواز یا اموالِ ربویہ (جن کے باہمی تبادلے کے وقت فوری لین دین اور برابری لازمی ہے) میں بغیر قرض کے ایک طرف سے تفاضل (زیادتی) کا جواز اور ان جیسے دیگر مسائل۔ (جس کی تفصیل تقلید کی بحث میں گزر چکی ہے)

ظاہر یہی ہے کہ امام قدوری رحمہ اللہ کی مراد معتبر فقہاء کے اقوال نہیں تھے، لیکن اُن کے بعد میں آنے والے بعض حضرات نے متروك التسمية عمداً (مطلب پہلے گزر چکا ہے) کے حلال ہونے اور ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کرنے کو بھی ان مسائل میں شامل کر دیا جو قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ پھر امام قدوری رحمہ اللہ کے قول کو ان مسائل پر چسپاں کر دیا اور اس بات کی نسبت امام قدوری رحمہ اللہ کی طرف کر دی گئی۔

نیز ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ مسائل ایسی نصوص کے خلاف ہیں جو قطعی الدلالت ہیں اور نہ ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نصوصِ قطعیہ کی مخالفت کریں گے۔ یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہو چکی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان مسائل میں احادیث مبارکہ سے استدلال کیا ہے، اگرچہ اُن احادیث مبارکہ کی تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔

اس کی کچھ وضاحت ''تشریحات نمبر ۲۸'' میں ملاحظہ فرمائیں

لہٰذا ان مسائل میں فیصلہ نافذ نہ ہونے والی بات کی نسبت امام قدوری رحمہ اللہ کی طرف کرنا مناسب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم۔

مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی دوسرے قول پر فیصلہ کرنا

القضاء بغير المذاهب الأربعة

پھر اگر قاضی کوئی ایسا فیصلہ کر دے، جس میں وہ مذاہبِ اربعہ سے ہی نکل جائے تو کیا اس کا فیصلہ منعقد ہو جائے گا؟

الاشباہ والنظائر میں ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''وہ مواقع جن میں فیصلہ نافذ نہیں ہوتا، ایک صورت یہ ہے کہ جب قاضی کوئی فیصلہ خلافِ اجماع کر دے۔ اگرچہ اُس مسئلہ میں آئمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کے علاوہ کسی کا اختلاف بھی ہو (تو بھی فیصلہ نافذ نہیں ہوگا)۔ التحریر میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ اب اس بات پر اجماع ہو گیا ہے کہ آئمہ اربعہؒ کے مذاہبِ کے خلاف کسی مذہب پر عمل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ آئمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کے مذاہب ہی منضبط ہیں، اُن کی خوب اشاعت ہو چکی ہے اور انہی کے پیروکار بکثرت پائے جاتے ہیں''۔ ح ۳۸۰

لیکن ابن نجیم رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں کئی اعتبار سے اشکال ہے:

۱.....ابن نجیم ؒ کی یہ بات، شیخین (امام ابوحنیفہ ؒ، امام ابو یوسف ؒ) کی اس بات کے خلاف ہے کہ بعد میں آنے والا اجماع، سابقہ اختلاف کو ختم نہیں کرتا (اور وہ مسئلہ اجتہادی ہی رہتا ہے) ظاہر یہی ہے کہ شیخین ؒ کے قول پر ہی عمل ہوگا، جیسا کہ گزشتہ بحث میں گزر چکا ہے۔

۲.....ابن نجیم ؒ نے اپنے اس قول میں، ابن ہمام ؒ کی کتاب **التحریر** پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن ابن ہمام ؒ نے تو یہ نہیں کہا کہ مذاہبِ اربعہ کے علاوہ پر دیا گیا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ وہ تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ آئمہ اربعہ ؒ کے علاوہ کسی کی تقلید، عمومی طور پر آج جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے علاوہ دیگر حضرات کے مذاہب مدون نہیں ہیں۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آئمہ اربعہ ؒ کے علاوہ کسی اور امام کا قول اس بارے میں بھی مؤثر نہ ہو کہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ ابن ہمام ؒ کی عبارت کتاب **التحریر** کے آخر میں یوں ہے:

"امام نے **البرھان** میں محققین کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ عوام کو اکابرِ صحابہ ؓ کی تقلید سے روکا جائے گا بلکہ اُن حضرات کی تقلید کا حکم دیا جائے گا جو ان کے بعد آئے اور انہوں نے تمام مسائل کو مرتب اور مدوّن طور پر بیان کیا"۔

"اسی پر وہ بات مبنی ہے جو بعض متاخرین نے ذکر کی ہے کہ آئمہ اربعہ ؒ کے علاوہ دیگر حضرات کی تقلید سے منع کیا جائے گا کیونکہ آئمہ اربعہ ؒ کے مذاہب ہی منضبط ہیں اور انہی کے مسائل کی تقیید اور عام مسائل کی تخصیص ہو چکی ہے، جب کہ اُن کے علاوہ کسی اور کے بارے میں اب ایسا معلوم نہیں (کہ اُن کے مذاہب مرتب و مدون موجود ہوں) کیونکہ ان دیگر حضرات کے پیروکار ختم ہو چکے ہیں اور یہ بات صحیح ہے"۔

شارح ابن امیر حاج ؒ اس عبارت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن ہمام ؒ نے ان (چاروں) آئمہ کے علاوہ کی تقلید سے روکا ہے کیونکہ دیگر حضرات کے مذہب کی حقیقت کو نقل کرنا ناممکن ہے اور اُن کے مذاہب صحیح طور پر ثابت بھی نہیں ہو سکتے۔ اس منع کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ دیگر حضرات تقلید کیے جانے کے اہل نہیں تھے"۔

اسی بناء پر شیخ عزالدین بن عبدالسلام ؒ (ت ۶۶۰ھ) نے فرمایا:

”دونوں فریقوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، اگر آئمہ میں سے کسی سے بھی اُن کا مذہب تحقیقی طور پر ثابت ہو جائے تو بالاتفاق اُس کی تقلید جائز ہوگی۔ اور اگر ایسا نہیں ہے (کہ ان کا مذہب ثابت ہو) تو پھر اُن کی تقلید بھی جائز نہیں ہوگی“۔ ح ۳۹

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ابن ھمام رحمہ اللہ نے جو بات ذکر کی ہے (اور ابن نجیم رحمہ اللہ نے اس کی بنیاد پر مذاہبِ اربعہ کے علاوہ پر دیئے گئے فیصلے کو غیر نافذ کہا ہے) اُس کا ہمارے زیرِ بحث ”فیصلہ نافذ ہونے کے مسئلہ“ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۳)......کئی فقہاءِ حنفیہ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب قاضی کا فیصلہ پہلے مجتہدین میں سے کسی بھی مجتہد کے قول کے موافق ہوگا، تو وہ نافذ ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ فیصلہ مذاہبِ اربعہ کے خلاف ہو۔

آئمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدود (شرعی متعینہ سزائیں) میں عورت کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ جب کہ قاضی شریح رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ گواہی کے نصاب (ایک مرد اور دو عورت) کے ساتھ عورت کی گواہی مقبول ہوگی۔

شیخ ابوالمعین نسفی رحمہ اللہ (ت ۵۰۸) شرح الجامع الکبیر میں فرماتے ہیں:

”اور اگر قاضی نے حدود میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کر دیا تو یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ کسی دوسرے کو یہ فیصلہ باطل قرار دینے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک مجتہد فیہا مسئلہ میں فیصلہ ہے“۔ ح ۴۰

اسی پر متاخرینِ حنفیہ نے فتویٰ دیا ہے۔ فتاویٰ ھندیہ میں ہے:

”وہ قاضی مطلق (جسے کسی ایک مذہب پر فیصلہ کرنے کا پابند نہ کیا گیا ہو، بلکہ اُسے اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت ہو) جب حدود و قصاص میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کر دے اور وہ اس کو جائز سمجھتا ہو تو یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ کیونکہ اختلاف حجتِ قضاء میں ہے (کہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے) اور فقہاء میں سے قاضی شریح رحمہ اللہ نے اسے جائز قرار دیا ہے“۔ جیسا کہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے۔

فتاویٰ قاضی ظہیر الدین رحمہ اللہ میں ہے:

”اور اگر قاضی نے حدود و قصاص میں عورتوں کی گواہی پر فیصلہ دے دیا تو اُس کا فیصلہ نافذ ہو جائے

گا اور اگر کسی دوسرے قاضی سے اس فیصلے کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو اُس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس فیصلے کو باطل قرار دیدے۔ بے شک قاضی شریح ؒ اور تابعین ؒ کی ایک جماعت سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ الفصول العمادیۃ میں ہے"۔ (ح:۴۱)

الدر المختار میں ہے:

"اگر خاتون قاضی نے حد یا قصاص میں کوئی فیصلہ دے دیا' پھر وہ فیصلہ کسی دوسرے قاضی کے سامنے پیش کیا گیا' جو اسے جائز سمجھتا تھا اور اُس نے یہ فیصلہ برقرار رکھا' تو اب کسی اور کو یہ فیصلہ باطل قرار دینے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ اس مسئلہ میں قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے "عینی" (ح:۴۲)

یہ تمام مسائل اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ قاضی کے فیصلے کا نافذ ہونا صرف مذاہبِ اربعہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے' بلکہ اگر وہ فیصلہ معتبر مجتہدین میں سے کسی ایک کے بھی موافق ہو تو وہ نافذ ہو جائے گا بشرطیکہ اُن مجتہدین سے اُن کا یہ قول' قابل اعتماد طریقے سے ثابت ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

کیا یہ شرط ہے کہ قاضی اختلاف سے آگاہ ہو؟

هل يشترط ان يكون القاضي عالماً بالخلاف؟

کیا قاضی کے فیصلہ نافذ ہونے کیلئے یہ شرط لگائی جائے گی کہ وہ اختلاف کو جانتا ہو؟ اس بارے میں دو روایات ہیں۔ فتاویٰ ھندیۃ میں ہے:

"قاضی کا فیصلہ مجتہد فیہا مسائل میں نافذ ہوتا ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ قاضی' فقہاء کے اختلاف کے مواقع کو جاننے والا ہو اور وہ مخالف کو چھوڑ کر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرے تا کہ تمام علماء کے قول کے مطابق اُس کا فیصلہ صحیح ہو جائے اور اگر وہ اجتہاد و اختلاف کے مواقع سے آگاہ نہیں ہے تو اُس کا فیصلہ نافذ ہونے کے بارے میں دو روایات ہیں۔ اصح روایت یہ ہے کہ اُس کا فیصلہ نافذ ہوگا۔ جیسا کہ خزانۃ المفتین میں ہے"۔ (ح:۴۳)

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی تشریح میں بہت طویل گفتگو کی ہے۔ انہوں نے یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک رسالہ لکھا ہے' خود علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالے کا خلاصہ ذکر کر کے

اُس کی تائید کرتے ہوئے علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو انتہائی تحقیقی قرار دیا ہے۔

لیکن اس مسئلہ کے بیان میں علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ زیادہ مختصر اور زیادہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے اسے دیکھ لینا چاہیے۔ یہ مقام اس مسئلہ کی مزید تفصیل کا نہیں ہے۔ (ح ۴۴)

مقلد قاضی کا اپنے امام کے مذہب کے خلاف فیصلہ کرنا

قضاء القاضی المقلد بخلاف مذهب امامه

اب تک مجتہد فیہا مسائل میں قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے کی بابت جو تفصیل گزر چکی وہ بالاتفاق دو صورتوں کے بارے میں ہے:

(۱)......پہلی صورت یہ ہے کہ قاضی مجتہد ہو اور اُس نے فیصلہ اپنے اجتہاد کے مطابق دیا ہو۔

(۲)......دوسری صورت یہ ہے کہ قاضی مقلد ہو اور اُس نے اپنے امام کے مذہب کے مطابق فیصلہ دیا ہو۔ تو ایسی صورتوں میں اُس کا فیصلہ سب پر نافذ ہوگا، جن کے خلاف فیصلہ ہوا ہے خواہ وہ خود مجتہد ہی ہوں اور اُن کی رائے قاضی کے امام کی رائے کے خلاف ہی ہو یا جن کے خلاف فیصلہ ہوا ہے وہ کسی دوسرے امام کے مقلد ہوں۔ (بہرحال قاضی کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا)۔

رہی (تیسری صورت) کہ کسی متعین امام کا مقلد ہو پھر وہ اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ دے دے تو فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

(یہ فیصلہ کیوں نافذ نہیں ہوگا؟) اس کی علت بیان کرنے میں فقہاء کی عبارات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ فتح القدیر میں اس کی علت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

> ''رہا قاضی مقلد تو اُس کو عہدۂ قضاء پر فائز ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مثلاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فیصلے کرے لہٰذا وہ اس کی مخالفت کا اختیار نہیں رکھتا۔ تو وہ ایسے کسی حکم (جو اُس نے مذهب ابی حنیفه رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دیدیا ہو) کے حوالے سے معزول ہو جائے گا''۔

اس عبارت کی بناء پر ایسے قاضی کے فیصلے کا نافذ نہ ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ امام نے اُس کو اس شرط پر قاضی بنایا

ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے۔ اب اگر وہ اُن کے مذہب سے نکلے گا تو اُس فیصلے میں وہ عہدۂ قضاء سے معزول ہو جائے گا اور اُس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

اس تعلیل (علت بیان کرنے) کا تقاضا یہ ہے کہ امام (حاکم) نے اگر اُس کو کسی مذہب معین کے ساتھ پابند نہ کیا ہو تو مجتہد فیہا مسائل میں اُس کا فیصلہ بہرحال نافذ ہو جائے گا' اگرچہ اُس کے امام کے مذہب کے خلاف ہی ہو۔

لیکن ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (ایسے قاضی کا فیصلہ نافذ نہ ہونے کی علت بیان کرتے ہوئے) فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہ قید لگانا کہ حاکم نے اُسے مذہب معین کا پابند کیا ہو' یہ کوئی ضروری قید نہیں کیونکہ علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصحیح میں فرمایا ہے کہ مرجوح قول پر فتویٰ یا حکم دینا خلافِ اجماع ہے اور علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا ہے' قاضئ مقلد کو ضعیف قول پر فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ یہ اہل ترجیح میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا صحیح قول کو چھوڑنا کسی نا مناسب ارادے سے ہی ہوگا۔ اور اگر اُس نے ایسا حکم دیدیا تو وہ نافذ نہیں ہوگا' کیونکہ اس کا یہ فیصلہ' ناحق پر مبنی فیصلہ ہے۔ حق تو یہاں صحیح قول ہے اور فقہاء کے کلام میں جو یہ بات مذکور ہے کہ قولِ ضعیف' قضاء سے مضبوط ہو جاتا ہے تو اس سے مراد قاضئ مجتہد کا فیصلہ ہے (نہ کہ قاضئ مقلد کا فیصلہ) جیسا کہ اپنے مقام پر بیان کر دیا گیا ہے''۔ (ج۵، ص۴۰۵)

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ قاضئ مقلد کے ایسے فیصلے کا نافذ نہ ہونا، اس بناء پر نہیں کہ وہ سلطان کی طرف سے متعین مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور کیا گیا ہے، بلکہ (ایسی صورت میں فیصلہ نافذ نہ ہونے کا) حکم تب بھی یہی ہوگا، اگرچہ سلطان نے قاضی کو اس کا پابند نہ کیا ہو اور (اصل) علت اُس کے فیصلے کے نافذ نہ ہونے کی یہ ہے کہ وہ مقلد ہونے کی وجہ سے اس بات پر مامور ہے کہ وہ اپنے مذہب کے صحیح قول کے مطابق ہی فیصلہ کرے۔

لیکن ایسا تب ہوگا' جب قاضی نے اپنے لیے کسی متعین مذہب کی پیروی کو لازم کر رکھا ہو اور وہ اس کو حق سمجھتا ہو، پھر وہ جسے حق سمجھتا ہے اُس کے برخلاف کسی دوسرے کے مذہب پر جان بوجھ کر فیصلہ کر دے تو یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا باوجودیکہ یہ فیصلہ ایسے مسئلے میں ہے جو مجتہد فیہا ہے۔ کیونکہ اب یہ قاضی ایسے مجتہد کے حکم میں ہے جو خود اپنی رائے کے خلاف فیصلہ دے اور ہمارے آئمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک ایسا فیصلہ نافذ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تو ایسے قول پر فیصلہ کرنا ہے جو خود قاضی کے نزدیک حق نہیں ہے' لہٰذا اس فیصلے میں وہ اپنی خواہشات نفس کا پیروکار بن گیا ہے۔ یہی صورت حال اُس قاضی کیلئے بھی ہے' جس نے مذہب معین کی تقلید اختیار کی ہوتی ہے۔

(اب یہاں مزید تین صورتیں قابلِ غور ہیں)

(۱)......رہا یہ کہ اگر وہ (قاضی مقلد) کسی دوسرے کے مذہب پر بھول کر فیصلہ کر دے تو یہ فیصلہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نافذ ہو جائے گا اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نافذ نہیں ہوگا کیونکہ یہ فیصلہ تو خود قاضی کے نزدیک بھی غلط ہے۔ صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر ہے اور الفتاوی الصغریٰ میں ہے کہ فتویٰ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

''اس دور میں مناسب یہ ہے کہ صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے کیونکہ اپنے مذہب کو چھوڑنے والا، کسی غلط خواہش سے ہی ایسا کرے گا، کسی اچھے ارادے سے نہیں''۔

(۲)......رہا وہ قاضی جو خود بھی مجتہد نہیں ہے اور سلطان نے بھی اس کو کسی متعین مذہب پر فیصلہ کرنے کا پابند نہیں کیا، نہ ہی خود اُس نے اپنے لئے کسی متعین مذہب کی پیروی کو لازم کیا ہے تو ایسے قاضی نے اگر کسی مسئلہ میں کسی معتبر فقیہ کی تقلید کرتے ہوئے فیصلہ دیدیا تو ظاہر یہی ہے کہ اُس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔

اس بات کی بنیاد، فتاوی هندیه کی یہ عبارت ہے:

''شرح طحاوی اور جامع الفتاوی میں مذکور ہے کہ قاضی جب مجتہد نہ ہو لیکن کسی فقیہ کی تقلید کرتے ہوئے فیصلہ کر دے، پھر اُسے پتہ چلے کہ یہ تو اُس کے اپنے مذہب کے خلاف ہے، تو یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور کسی دوسرے کو یہ فیصلہ ختم کرنے کا اختیار نہیں، البتہ وہ خود اپنا فیصلہ ختم کر سکتا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ سے یوں ہی منقول ہے، جب کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس فیصلے کو کوئی دوسرا قاضی ختم نہیں کر سکتا، اُس کو خود فیصلہ دینے والا قاضی بھی ختم نہیں کر سکتا''۔

اسی طرح متأخرین حنفیہ نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ کسی جاہل کو اس طور پر قاضی بنا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے سے فتویٰ لے کر اُس کے مطابق فیصلے کرے، جیسا کہ هدایه میں ہے، فقہاءؒ نے اس مسئلہ میں یہ قید نہیں لگائی کہ اس (جاہل) قاضی نے کسی متعین مذہب کی پیروی کو اپنے لیے لازم بھی کیا ہو۔

(از حاشیہ: علامہ ابن ھمام رحمہ اللہ نے ہدایہ کی اس عبارت کے تحت طویل کلام کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ ایسے

قاضی پر کسی متعین مذہب کی پیروی اپنے اوپر لازم کرنا' ضروری نہیں ہے)۔

(۳)......اسی طرح اگر قاضی مقلد ہو اور کسی متعین مذہب کو لازمی طور پر اختیار کرنے والا ہو' لیکن وہ خود بھی ماہر عالم ہو' تو اس کے بارے میں وہ ہی تفصیلی بحث لاگو ہوگی' جو ہم اس بارے میں بیان کر چکے ہیں کہ مفتی مقلد بعض حالات میں چند شرائط کے ساتھ دوسرے مذہب پر فتویٰ دے سکتا ہے' ان شرائط کی تفصیل ''دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے مسئلہ'' میں گزر چکی ہے۔ اس طرح فتویٰ دینا یا فیصلہ کرنا' اس کے مقلد ہونے کے منافی نہیں ہے۔

ظاہر یہی ہے کہ اگر یہ قاضی کسی متعین مسئلہ میں اپنے امام کے قول کے خلاف' کسی دوسرے فقیہ کی رائے پر' جس کو وہ اس مسئلہ میں برحق سمجھتا ہے' اُن شرائط کی رعایت کرتے ہوئے جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' فیصلہ کر دیتا ہے تو اُس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کی یہ بات اُس پر صادق نہیں آئے گی کہ ''اپنے مذہب کو چھوڑنے والے کا مقصد صرف ناجائز خواہشات ہی ہوتی ہیں''۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

مسئلہ مجتہد فیہا میں سلطان یا امیر کا حکم

امر السلطان او الامیر فی مسئلۃ مجتہد فیہا

ہم نے یہ بات جو پہلے ذکر کی کہ مجتہد فیہا مسائل میں قاضی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے' تو یہ حکم اس پر مبنی ہے کہ اُسے سلطان کی طرف سے عہدۂ قضاء پر فائز کیا گیا ہے اور سلطان کی اطاعت ہر اُس کام میں واجب ہے جو معصیت نہ ہو۔ لہٰذا اگر سلطان امورِ مجتہد فیہا میں کوئی حکم جاری کرے تو اُس کی اطاعت واجب ہے۔

اسی لئے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے عید کی نماز میں' پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں چھ زائد تکبیرات کہیں' جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ باوجودیکہ خود ان دونوں حضرات کا مذہب اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے موافق ہے کہ نمازِ عید میں کُل چھ تکبیراتِ زائدہ ہیں۔ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "**ظہیریہ** میں ہے: یہی حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول بات کی تاویل ہے، کہ ان دونوں نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اُن دونوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اُن کے جدِ امجد (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) کے مذہب کے مطابق

تکبیرات کہیں۔ تو انہوں نے یہ تکبیرات سلطان کا حکم پورا کرنے کیلئے کہیں' اُن کا مذہب اور اعتقاد یہ نہیں تھا۔ "معراج" میں ہے اس لیے کہ امام کی اطاعت اُن کاموں میں جو معصیت نہ ہوں' واجب ہے"۔ ح۴۹

اس سے ظاہر یہی ہے کہ اگر کسی "مجتہد فیہا مسئلہ" میں مسلمان حکمران کوئی حکم یا قانون جاری کرے تو عوام کیلئے اُس پر عمل پیرا ہونا واجب ہے، اگرچہ وہ عوام کے فقہی مذہب کے برخلاف ہو۔ لہٰذا مفتی بھی عوام کو اس حکم اور قانون پر عمل کرنے کا فتویٰ دے گا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وہ امیر جس کا سلطان نے کسی خاص علاقے یا مسلمانوں کے لشکروں میں سے کسی لشکر پر تقرر کیا ہو تو اُس کا حکم بھی اپنے ماتحتوں کیلئے یہ حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ الدر المختار میں فرماتے ہیں:

"رہا امیر تو وہ جب کسی مجتہد فیہا مسئلے میں حکم جاری کرے تو اُس کا حکم نافذ ہوگا' جیسا کہ ہم پہلے فتاویٰ تاتار خانیہ کی کتاب السیر سے نقل کر چکے ہیں"۔

ابن عابدین رحمہ اللہ اس عبارت کے تحت لکھتے ہیں:

"فتاویٰ تاتار خانیہ کی کتاب السیر میں' میں نے یہ بات دیکھی ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب امیرِ لشکر' لشکر والوں کو کسی بات کا حکم دے تو اُن پر اُس کی اطاعت کرنا لازم ہے' سوائے اس صورت کے کہ جس کام کا حکم دیا گیا ہے' وہ معصیت ہو۔ لہٰذا شارح (علامہ حصکفی رحمہ اللہ) کے الفاظ "نفذ امرہ" (امیر کا حکم نافذ ہوگا) کا مطلب یہ ہے کہ اُس کا حکم بجالانا واجب ہوگا، تأمل"۔ ح۵۰

☆......☆......☆

حواشی (۵)

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا
الافتاء بمذہب آخر

(۱) دیکھیں: حاشیة ابن عابدین، کتاب المفقود، مطلب فی الافتاء بمذهب مالك فی زوجة المفقود، الجزء ۶، الصفحة ۴۵۲ الی ۴۵۳، طبع دار المعرفة بیروت۔

(۲) حاشیة ابن عابدین، کتاب الحجر قبیل مطلب: تصرفات المحجور بالدین کالمریض، الجزء ۹، الصفحة ۲۵۵، طبع دار المعرفة بیروت۔

(۳) حاشیة ابن عابدین، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، مطلب فی الکلام علی الرد بالغبن الفاحش، الجزء ۷، الصفحة ۳۷۷، طبع دار المعرفة بیروت۔

(۴) الاشباه والنظائر، ابن نجیم، الفن الاول، القاعدة الرابعة من النوع الأول: المشقة تجلب التیسیر، الصفحة ۸۱، طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۵) التقریر والتحبیر، ابن امیر الحاج، المقالة الثانیة فی أحوال الموضوع باب فی الاحکام، الفصل الثالث فی المحکوم فیه (مسالة: الاداء فعل الواجب فی وقتة المقید به شرعاً) الجزء ۲، الصفحة ۱۶۸، طبع المکتبة المعروفیة۔

(۶) دیکھیں: امداد الفتاوی: حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ، طبع مکتبة دار العلوم کراتشی۔
الف: کتاب البیوع، "گنا پیدا ہونے سے پہلے اس کی خریداری کا حکم"، ۱۰۶/۳۔

ب: کتاب البیوع، قصاب کو پیشگی روپیہ دے کر گوشت کا نرخ مقرر کرنا، ۲۱۲/۳،

ج: کتاب الاجارة، دفع بقرة بر نصف نماء، ۳۴۳/۳۔

د: کتاب الشرکة: القصص السنی فی حکم حصص کمپنی، ۴۹۵/۳،

(۷) سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، رقم الحدیث ۲۱۶۸، الصفحة ۵۲۳، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

وقال: هذا حدیث غریب من هذا الوجه، وسلیمان المدینی هو عندی سلیمان بن سفیان، وفی الباب عن ابن عباس»۔ (سابقہ نسخہ نیز ہمارے سامنے موجودہ ترمذی کے پاکستانی نسخہ مطبوعہ سعید کراچی میں بھی یہ عبارت یہاں تک ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت ہمیں صرف المکتبة الشاملة کے نسخے میں مل سکی ہے۔

"وقد روی عنه ابو داود الطیالسی وأبو عامر العقدی، وغیر واحد من أهل العلم وتفسیر الجماعة عند أهل العلم أهل الفقه والعلم والحدیث»۔

(۸) سنن ابن ماجة، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، رقم الحدیث ۳۹۵۰، الصفحة ۶۳۵، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

"وقال البوصیری: هذا اسناد ضعیف لضعف أبی خلف الأعمی... وقد روی هذا الحدیث من حدیث أبی ذر وأبی مالک الأشعری وابن عمر وأبی نضرة وقدامة بن عبد الله الکلابی، وفی کلها نظر، قاله شیخنا العراقی رحمه الله تعالیٰ (مصباح الزجاجة، باب السواد الاعظم، الجزء ۴، الصفحة ۲۶۹) طبع دار المعرفة بیروت۔

(۹) تذکرة الحفاظ۔ الذهبی، ترجمة الامام أبی عمرو عبد الرحمن بن عمرو الأوزاعی، الجزء ۱، الصفحة ۱۸۰، طبع احیاء التراث العربی بیروت۔

(۱۰) سیر اعلام النبلاء، الذهبی، ترجمة الامام مالک بن انس بن مالک المدنی، الجزء ۸، الصفحة ۹۰، طبع مؤسسة الرسالة بیروت۔

(۱۱) دیکھیں: لوامع الأنوار البهیة وسواطع الأسرار الأثریة لشرح الدرة المضیة فی عقد الفرقة المرضیة، السفارینی (الخاتمة)، تقلید أحد الائمة الاربعة، الجزء ۲، الصفحة ۴۶۶، طبع الشیخ علی آل شامی قطر۔

(١٢) جامع بيان العلم وفضله ـ ابن عبد البر ،باب من يستحق أن يسمى فقيها أو عالما حقيقة لا مجازا ،من يجوز له الفتيا عند العلماء ،الجزء ٣ ،الصفحة ٣٥ طبع دار الكتب العلمية بيروت ـ

(١٣) الاحكام القرافی رحمه الله تعالىٰ، السوال الاربعون، التنبيه الرابع، الصفحة ٢٢٣ الى ٢٣٥، طبع: مكتب المطبوعات الاسلامية حلب ـ

(١٤) الاعلام الزركلی، ابن ملا فروخ، الجزء ٦، الصفحة ٢١٠ ـ

قال الزركلی "محمد بن عبد العظيم الملقب بابن ملا فروخ: فقيه حنفی من اهل مكة ،كان مفتيا بها له (القول السديد فی بعض مسائل الاجتهاد والتقليد، رسالة فرغ من كتابتها سنة ١٠٥٢ھ ـ

(١٥) رسائل ابن نجيم (الرسائل الزينية) مسئلة ١٠٣١، الجزء ١٠٣٣ ،الصفحة ٣٣٦ الى ٣٣٧ ،طبع دار السلام القاهره ـ

(١٦) كشف الظنون عن أسامی الكتب والفنون ،خليفة ،باب الميم ،مجموع النوازل والحوادث والواقعات، الجزء ٢ ،الصفحة ١٦٠٦، طبع مكتبة المثنى بيروت ـ

(١٧) كشف الظنون عن أسامی الكتب والفنون ،خليفة، باب الميم ،الملل والنحل ،الجزء ٢ ،الصفحة ١٨٢١ طبع مكتبة المثنى بيروت ـ

ترجمة الملل والنحل ،للشهرستانی :لنوح أفندی بن مصطفى الرومی المصری الحنفی سنة ١٠٧٠، سبعين وألف ـ

(١٨) حاشية الطحطاوی على الدر المختار باب العدة، الجزء ٢ ،الصفحة ٢١٧ ـ

(١٩) حاشية ابن عابدين، كتاب القضاء ،قبيل مطلب: فی القضاء على المسخر ،الجزء ٨ ،الصفحة ١٢٠، طبع دار المعرفة بيروت ـ

(٢٠) الفتاوی، الهندية المعروفة بالفتاوی العالمگيرية، كتاب ادب القاضی ،الباب التاسع عشر فی القضاء فی المجتهدات، الجزء ٣ ،الصفحة ٣٤٠، طبع دار الكتب العلمية بيروت ـ

(٢١) الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة ،حكيم الامت تهانوی رحمه الله، الصفحة ١٥ الى ١٦

،حاشیه،طبع دارالاشاعت کراتشی۔
(۲۲)الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة ،حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ،المختارات فی مهمات التفریق والخیارات،۸۸،طبع دارالاشاعت کراتشی۔
(۲۳)مجلة مجمع الفقه الاسلامی محرم ۱۴۱۴ھ،قرار رقم، ۷۴/۱/۸۷"بشأن الأخذ بالرخصة وحکمه"۔
(۲۴)شرح عقود رسم المفتی ،ابن عابدین ،تحت الأشعار رقم ، ۲۳الی ۲۵ ،طبع مکتبة عثمانیة۔
(۲۵) شرح عقود رسم المفتی ،ابن عابدین ،تحت الأشعار رقم ،۳۳ الی ۲۵،طبع مکتبة عثمانیة۔
(۲۶) جامع الفصولین ،الفصل الاول فی مسائل القضاء ،مطلب :القضاء قد یفترض ،الصفحة ۱۲ ،طبع اسلامی کتب خانه کراتشی۔
(۲۷)شرح عقود رسم المفتی ،ابن عابدین، تحت الأشعار، رقم ۷۰ الی ۷۳،طبع مکتبه عثمانیه۔
(۲۸) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ،کتاب القضاء ۔باب کتاب القاضی الی القاضی وغیره،الجزء ۵،الصفحة ۱۰۸ ،طبع دارالکتب العلمیة بیروت۔
وقال :"وقد صح أن عمر رضی الله عنه لما کثر اشتغاله قلد القضاء أبا الدرداء ..."فذکره،ولم أجده فی تتبعی القاصر فی کتب الحدیث ،ولکن جزم الزیلعی بأنه صح عنه مما یوثق به۔
(۲۹)المصنف ،ابن أبی شیبة بتحقیق الشیخ محمد عوامه ، کتاب الفرائض باب :فی زوج وام واخوة وأخوات لاب وأم ،واخوات واخوة لام من شرك بینهم ،رقم الحدیث ۳۱۷۴۴ ،الجزء ۱۶ ،الصفحة ۲۳۲ ،طبع المجلس العلمی۔
"وقد توقف البخاری رحمه الله تعالیٰ فی سماع وهب من الحکم، کما نبه علیه محققه۔
(۳۰) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ،الکاسانی ، کتاب آداب القاضی ،فصل :واما بیان ما ینفذ من القضایا ،الجزء ۷،الصفحة ۲۰ الی ۲۲ ،طبع دارالفکر بیروت۔

(۳۱) کتاب المبسوط ،السرخسی ،کتاب البیوع ،باب البیوع ،الفاسدة،الجزء ۱۳، الصفحة ۶،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۳۲) الفتاوی الهندیة المعروفة بالفتاوی العالمکیریة، کتاب أدب القاضی، الباب التاسع عشر فی القضاء فی المجتهدات ،الجزء ۳ ،الصفحة ۳۳۸الی ۳۳۹ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۳۳) دیکھیں : حاشیة ابن عابدین، کتاب القضاء ،فصل فی الحبس مطلب: ماینفذ من القضاء ومالاینفذ۔ الجزء ۸، الصفحة ۸۸ دار المعرفة بیروت۔

(۳۴) الفتاوی الهندیة المعروف بالفتاوی العالمکیریة ، کتاب أدب القاضی ،الباب التاسع عشر فی المجتهدات، الجزء ۳، الصفحة ۳۳۸، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۳۵) حاشیة ابن عابدین، کتاب القضاء ،فصل فی الحبس ،مطلب ،فی الحکم بما خالف الکتاب او السنة او الاجماع، الجزء ۸، الصفحة ۱۰۱ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۳۶) حاشیة ابن عابدین، کتاب القضاء ،فصل فی الحبس ،مطلب ،فی الحکم بما خالف الکتاب او السنة او الاجماع، الجزء ۸، الصفحة ۹۷ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۳۷) الهدایة شرح بدایة المبتدی المرغینانی رحمہ اللہ، کتاب أدب القاضی ،باب کتاب القاضی الی القاضی، الجزء ۳، الصفحة ۱۰۷۸ ،طبع دار السلام۔

(۳۸) الأشباه والنظائر ،ابن نجیم ،الفن الأول ،النوع الثانی من القواعد ،القاعدة الأولی: الاجتهاد لاینقض بالاجتهاد، الصفحة ۱۰۸ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۳۹) التقریر والتحبیر ،ابن امیر الحاج ،مقالة فی الاجتهاد وما یتبعه من التقلید والافتاء ،مسألة لا یرجع المقلد فیما قلد المجتهد فیه أی عمل به اتفاقا ، الجزء ۳، الصفحة ۴۵۰ الی ۴۵۱ ،طبع المکتبة المعروفیة، کوئته۔

(۴۰) حاشیة ابن عابدین ، کتاب القضاء فصل فی الحبس ،باب کتاب القاضی الی القاضی وغیره، مطلب فی توجیه الوظائف للابن ولو صغیراً، الجزء ۸، الصفحة ۱۶۱ الی ۱۶۲ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۴۱) الفتاوی الهندیة ،المعروفة بالفتاوی العالمگیریة ، کتاب ادب القاضی ،الباب التاسع عشر فی القضاء فی المجتهدات،الجزء۳،الصفحة ۳۴۲،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴۲) الدر المختار ،الحصکفی ، کتاب القضاء ،باب کتاب القاضی الی القاضی وغیره ،الجزء۸،الصفحة ۱۶۱ الی ۱۶۲،طبع دار المعرفة بیروت،

(۴۳) الفتاویٰ الهندیة ،المعروفة بالفتاوی العالمگیریة ، کتاب ادب القاضی ،الباب التاسع عشر فی القضاء فی المجتهدات،الجزء۳،الصفحة ۳۳۹،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴۴) دیکھیں:حاشیة ابن عابدین ، کتاب القضاء فصل فی الحبس ، مطلب مهم فی قولهم :یشرط کون القاضی عالماً باختلاف الفقهاء الجزء ۸، الصفحة ۸۹ الی ۹۰ ، طبع دار المعرفة بیروت۔

وکلام الرفعی تحت قوله "وهذا غایة التحقیق"

(۴۵) حاشیة ابن عابدین ، کتاب القضاء فصل فی الحبس ،مطلب :الحکم والفتویٰ بما هو مرجوع حلاف الاجماع،الجزء۸،الصفحة ۱۰۹ الی ۱۱۰،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۴۶) فتح القدیر ، کتاب أدب القاضی،باب کتاب القاضی الی القاضی،الجزء۷،الصفحة ۲۷۵،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴۷) الفتاوی الهندیة المعروفة بالفتاویٰ العالمکیریة ، کتاب أدب القاضی الباب التاسع عشر فی القضاء فی المجتهدات،الجزء۳،الصفحة ۳۳۹،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴۸) الهدایة مع فتح القدیر، کتاب ادب القاضی ،الجزء ۷ ،الصفحة ۲۳۷ الی ۲۳۹،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۴۹) حاشیة ابن عابدین، کتاب الصلاة،باب العیدین،مطلب: تحت طاعة الامام فیما لیس بمعصیة، الجزء۳،الصفحة ۶۱ الی ۶۲،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۵۰) الدر المختار مع حاشیة ابن عابدین، کتاب القضاء،فصل فی الحبس،مطلب فی أمر الامیر وقضائه،الجزء۸،الصفحة ۱۱۰ الی ۱۱۱،طبع دار المعرفة بیروت۔

★ ★ ★

6

زمانہ کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی

تغیر الاحکام بتغیر الزمان

مباحث

- زمانے کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی
- علت کی تبدیلی سے حکم کی تبدیلی
- علت اور حکمت کے درمیان فرق
- شریعت کے مقاصد
- علت کی اقسام
- عرف کی تبدیلی سے حکمِ شرعی کی تبدیلی
- عموم بلویٰ
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

زمانہ کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی

تغیر الاحکام بتغیر الزمان

فقہاء کی عبارات میں یہ بات مشہور ہے کہ احکامِ زمانے کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ ح ۱۰

(از حاشیہ:

فقہاء نے یہ بات متعدد مقامات پر ذکر کی ہے مثلاً ابن عابدین رحمہ اللہ نے باب الوتر والنوافل میں ذکر فرمایا ہے کہ "زمانے کی اختلاف کی وجہ سے بہت سے مسائل میں، مصلحتوں کے مطابق احکام بدل جاتے ہیں"

(ردالمحتار)

(المجلة کی شروع میں بیان کردہ قواعدِ فقہیہ میں سے نمبر ۳۹ کے الفاظ بھی یہ ہیں:

"لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان"۔

شیخ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ نے اپنی شرح المجلہ میں اس کی امثلہ اور قیودات بھی ذکر فرمائی ہیں)

یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ زمانہ کے ساتھ تمام احکامِ شریعت ہی تبدیل ہو جائیں جیسا کہ ہمارے دور کے کچھ اباحت پسند (وہ طبقہ جو مختلف حیلوں بہانوں سے شریعتِ اسلامیہ کی عائد کردہ پابندیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے) لوگوں کا خیال ہے۔ اس قاعدہ سے مراد صرف یہ ہے کہ چند احکام زمانے کی تبدیلی سے بدلتے ہیں اور یہ تبدیلی مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ہوتی ہے:

(۱) کوئی حکم کسی علت پر مبنی تھا۔ پس جب زمانے کی تبدیلی سے وہ علت ختم ہوگئی تو اس کے ختم ہوجانے کے بناء پر حکم بھی تبدیل ہوگیا۔

(۲) حکمِ شریعت، عرف اور عادت پر مبنی تھا۔ اب اگر عرف تبدیل ہوگیا تو حکم بھی بدل جائے گا اور درحقیقت یہ قسم بھی پہلی صورت ہی کی طرف لوٹتی ہے کیوں کہ عرف کی تبدیلی سے حکم کی تبدیلی تب ہی ہوگی جب گزشتہ حکم کی علت عرف پر مبنی ہو۔

(۳) کبھی حکم کسی سخت ضرورت یا عام ابتلاء (عمومِ بلویٰ) کی وجہ سے تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ تبدیلی صرف بقدرِ ضرورت ہی ہوتی ہے۔

(۴) کبھی حکمِ شریعت، سدّ ذرائع کی وجہ سے تبدیل ہوجاتا ہے۔ (اس طرح کے کوئی کام بذاتِ خود تو جائز اور مباح تھا لیکن اس سے اس لئے روک دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ممنوع کام تک پہنچنے کا ذریعہ بن رہا ہوتا ہے، اسے کہتے ہیں سدّ ذرائع)۔

یہاں ہم ان چاروں صورتوں کو کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ الموفق للصواب

(۱) علت کی تبدیلی سے حکم کی تبدیلی

تغير الحكم بتغير العلة

فقہاء کے ہاں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ حکم کا دارومدار وجود اور عدم کے اعتبار سے علت پر ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر علت پائی جائے تو حکم ثابت ہوتا ہے اور علت ختم ہوجائے تو حکم بھی ختم ہوجاتا ہے۔

پھر کبھی حکم کی علت ایسی دائمی ہوتی ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتی، تو ایسی صورت میں اس کا حکم بھی کسی زمانے میں تبدیل نہیں ہوگا۔ جیسے زنا، چوری، اور شراب پینے، اور حالتِ اضطرار کے علاوہ خنزیر کھانے کی حرمت، ان احکام کی علتیں ایسی دائمی ہیں جو کبھی منقطع نہیں ہوں گی۔ ہاں! کبھی حکم کی علت، تبدیلی اور خاتمے کے قابل ہوتی ہے، تو تب حکم بھی علت کی تبدیلی سے بدل جائے گا۔

علت اور حکمت کے درمیان فرق

الفرق بين العلة والحكمة

یہاں ایک اہم قاعدے کو جان لینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ شرعی حکم کا دارومدار اپنی شرعی علت پر ہوتا ہے نہ کہ اپنی حکمت پر، اور چونکہ بسا اوقات بعض لوگوں پر یہ معاملہ مشتبہ ہو گیا تو انہوں نے حکمت ہی کو علت گمان کر لیا۔ اور یوں سمجھنے لگے کہ حکمت کا نہ پایا جانا حکم کے تبدیلی میں مؤثر ہوتا ہے، حالانکہ علت اور حکمت کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جس کو ذھن میں رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

علت ایسا وصف ہوتا ہے کہ جو حکم کے پائے جانے کے لئے بطورِ علامت کے ہو اور حکمت وہ فائدہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے کی صورت میں اس کے حاصل ہونے کی امید اور توقع کی جاتی ہو۔ اس کی مثال شراب پینے کی حرمت سے سمجھیں، شراب پینے کی حرمت ایک حکم ہے اور مشروب کا خمر (شراب) ہونا یہ علت ہے اور انسان کو ایسی چیز سے بچانا کہ جو اس کی عقل کو ختم کر دے، یہ حکمت ہے۔

اب حرمت کے حکم کا دارومدار اپنی علت پر ہوگا۔ یعنی اس بات پر کہ مشروب خمر ہے۔ لہٰذا اب جہاں کہیں بھی "خمر" پائی گئی تو حرمت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔ اس حکم کا دارومدار حکمت پر نہیں ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایسا مل جائے کہ شراب پینے سے اس کی عقل ختم نہ ہوتی ہو، تو حرمت کا حکم اس کے حق میں بھی ختم نہیں ہوگا کیوں کہ حکم کی علت یعنی مشروب کا خمر ہونا اس صورت میں بھی باقی ہے۔

اسی طرح نماز میں قصر کی علت سفر ہے اور اس کی حکمت مشقت سے بچنا ہے۔ اب حکم کا دارومدار اپنی علت پر ہوگا جو کہ سفر ہے نہ کہ اپنی حکمت پر جو مشقت ہے۔ لہٰذا اگر ایسا مسافر پایا جائے کہ اس کو سفر میں ذرا بھی مشقت نہ ہوئی ہو، جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہوائی جہازوں اور تیز رفتار گاڑیوں کے سفر میں اکثر پیش آتا ہے تو بھی قصر کا حکم ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ علت باقی ہے جو کہ سفر ہے اور اس کے برعکس اگر کسی شخص کو اپنے ہی شہر یا وطنِ اصلی میں کوئی سخت مشقت پیش آ جائے تو اس کے لئے نماز میں قصر کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہاں علت نہیں پائی جاتی جو کہ سفر ہے۔

یہ بات ایک حسّی مثال سے بھی واضح ہوتی ہے۔ آج کل ہم چوکوں چوراہوں پر بجلی سے چلنے والے اشارات (ٹریفک سگنلز) دیکھتے ہیں جو کبھی سرخ ہوتے ہیں اور کبھی سبز ہو جاتے ہیں اور ان کا مقصد ٹریفک کے نظام کو

درست رکھنا ہوتا ہے۔قانون ہر گاڑی پر یہ لازم کرتا ہے کہ وہ جب اشارے کو سرخ دیکھے تو رُک جائے اور جب سبز دیکھے تو روانہ ہوجائے۔

اب اشارے کو سرخ دیکھتے وقت رُک جانا، یہ تو حکم ہے اور اشارے کا سرخ ہونا علت ہے اور اس حکم کی حکمت ٹریفک کو ایکسیڈنٹ کے حادثات سے بچانا ہے۔رُک جانے کا حکم' اس کا دارومدار اپنی علت پر ہوگا جو اشارے کا سرخ ہونا ہے، نہ کہ اپنی حکمت پر، جو تصادم اور ایکسیڈنٹ سے حفاظت ہے۔اب اگر کوئی گاڑی آئے اور سڑک پر اس کے علاوہ کوئی گاڑی نہ ہو لیکن اس نے اشارے کو سُرخ دیکھا ہو تو اس پر رُکنا لازم ہوجائے گا۔اگرچہ خاص اس صورت میں حکمت نہیں پائی جاتی۔

ہم نے جو تفصیل ذکر کی اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حکم بعض خاص جزئیات میں حکمت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے تبدیل نہیں ہوتا بلکہ حکم صرف علت کے نہ پائے جانے کی صورت میں تبدیل ہوتا ہے۔اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جو فقہاء رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی کی بیع ممنوع ہے۔اس ممانعت کی علت انہوں نے یہ بیان فرمائی کہ پانی کی مقدار کو ضبط نہیں کیا جاسکتا۔(اس طرح بیع مجہول لازم آتی ہے)

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس تقدیر پر کہ وہ (پانی کی باری) پانی کے ایک حصے کا نام ہے اور یہ حصہ مقدار کی اعتبار سے مجہول ہے۔لہٰذا اس کی بیع جائز نہیں ہے۔مشائخ بخارا رحمہم اللہ نے پانی کی باری کو الگ سے فروخت کرنے سے جو منع کیا ہے تو اس کی یہی وجہ ہے"۔ (ح ۲)

اس سلسلے میں علامہ بابرتی رحمہ اللہ کی عبارت زیادہ صریح ہے، وہ فرماتے ہیں:

"پانی کی باری کو الگ سے بیچنا ظاہر الروایۃ کے مطابق صرف اس وجہ سے ممنوع ہے کہ (پانی کی مقدار میں) جہالت پائی جاتی ہے۔اس وجہ سے نہیں کہ پانی مال نہیں ہے" (ح ۳)

آج کل ایسے میٹر موجود ہیں جن سے پانی کی مقدار کو ضبط کرنا ممکن ہے۔تو جب یہ میٹر موجود ہوں تو ممانعت کی علت ختم ہوگئی، لہٰذا پانی کی خرید و فروخت اس صورت میں جائز ہوگی جب اس کی مقدار کو میٹروں کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہو۔(کیونکہ اب بیع مجہول نہ رہی)

پھر اگرچہ حکم کا دارومدار حکمت پر نہیں ہوتا لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسی علت کے استخراج اور تعیین کے لئے حکمت سے مدد لی جاتی ہے جس پر شارع (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے کوئی نص نہ آئی ہو۔اس کی مثال

ربا الفضل کا حرام ہونا ہے، اس حکم کی علت شارع علیہ السلام کی جانب سے منصوص نہیں تھی، اس لئے علت کے استخراج میں فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کی آراء مختلف ہوگئیں۔

مالکیہ نے یہ کہا کہ اس حکم کی علت اقتیات وادّخار، ثمنیّت کے ساتھ ہے (یعنی چیز کا خوراک میں استعمال ہونے والی اشیاء میں سے ہونا، قابل ذخیرہ ہونا اور بطور ثمن کے استعمال ہونا۔ یاد رہے کہ شوافع کے ہاں علت "طعمیت" ہے جو "اقتیات" سے خاص ہے۔ وہ چیزیں جو صرف بطور دوا کے کھائی جاتی ہیں، "طعمیت" ان میں نہیں پائی جاتی لیکن "اقتیات" ان کو بھی شامل ہے)

اس بات پر (مالکیہ کی طرف سے) جو دلائل قائم کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ربا الفضل" کو سدّ ذریعہ کے طور پر (یعنی راستہ روکنے کے لئے) حرام قرار دیا گیا ہے تاکہ لوگ اس میں پڑ کر، پھر آگے چل کر اس ربا کو نہ اختیار کرلیں جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے (یعنی ربا النسیئہ)۔ اور یہ بات صرف انہی چیزوں میں متحقق ہوسکتی ہے جو خود ثمن ہوں جیسے سونا اور چاندی یا ثمن کے قائم مقام ہوں۔ جیسے گندم، جَو، کھجور اور نمک۔ کیوں کہ گاؤں دیہات کے لوگ عام طور پر صرف سونا اور چاندی کے ذریعہ خرید و فروخت نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو جو بھی کھانے پینے کی اشیاء میں سے آسانی سے مل جاتیں، ان ہی کے ذریعہ وہ آپس میں تبادلہ کرلیتے تھے۔

اب کسی چیز کا ثمن کے قائم مقام کے طور پر استعمال ہونا صرف انہی خوراک کی چیزوں میں ثابت ہوسکتا ہے، جن کو ذخیرہ کرنا ممکن ہو اور یہی ایسا وصف ہے جو ان چاروں چیزوں کے درمیان مشترک ہے جنہیں سونا اور چاندی کے علاوہ حدیث پاک میں ذکر کیا گیا ہے۔ اب ربا کے راستے کو روکنا تو ربا الفضل کو حرام قرار دینے کی حکمت ہوئی اور مالکیہ نے اسی سے حکم کی علت کے استخراج میں مدد لی ہے۔ لیکن جب اقتیات وادّخار علت متعین ہوگئی تو ان کے نزدیک حکم یعنی ربا الفضل کا دارومدار اسی علت پر ہوگا، نہ کہ حکمت پر۔

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک علت "کیل (ناپنا)' وزن اور دونوں چیزوں کا ایک جنس کا ہونا" ہے۔ اس سلسلے میں حنفیہ کی دلیل بعض احادیث کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ربا الفضل کی حکمت ربا کا راستہ بند کرنا ہے اور جب علت (قرآن وسنت میں) منصوص نہیں ہے تو زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ حکم کا تعلق ایسی علت کے ساتھ جوڑا جائے جو تمام ایسی علتوں سے، جن کا یہاں احتمال ہوسکتا ہے، زیادہ چیزوں کو شامل ہو تا کہ احتیاط پر عمل کیا جاسکے۔

اب "کیل اور وزن" کی علت "اقتیات اور ادخار" کے مقابلہ میں زیادہ عام اور زیادہ چیزوں کو شامل ہے کیوں کہ اس میں حرام قرار دی ہوئی چیزوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ جب اس ربا کے حرمت کی حکمت' راستہ کو بند کرنا

اور احتیاط پر عمل کرنا ہے تو جس علت میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

حدیث پاک میں جو چھ (٦) چیزیں ذکر کی گئی ہیں ان سب کے درمیان ایسا وصف جو سب میں مشترک ہو اور زیادہ چیزوں کو شامل ہو وہ ''کیل اور وزن'' ہی ہے اور یہی ایسا وصف ہے کہ جس میں تفاضل (یعنی بڑھوتری) بالکل واضح شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ برخلاف عددیات یعنی ان چیزوں کے جن کو شمار کر کے بیچا جاتا ہے کہ ان کی جسامت میں فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا گنتی کے ذریعہ فضل (یعنی بڑھوتری) متعین نہیں ہوگی۔ اسی طرح برخلاف ان چیزوں کے جنہیں ذراع (فُٹ، گز اور میٹر جیسے پیمانے) وغیرہ سے پیمائش کر کے بیچا جاتا ہے کہ ان کے اوصاف میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، لہٰذا پیمائش سے بھی تفاضل ظاہر نہیں ہوگا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ کیل اور وزن کو اس حکم کے علت بنایا جائے۔

اب حنفیہ نے بھی اس حکم کے علت کے استخراج میں حکمت سے مدد لی، لیکن جب کیل اور وزن علت کے طور پر متعین ہو گئے تو اب حکم کا مدار اسی علت پر ہی ہوگا نہ کہ حکمت پر۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حکمِ شرعی کو علت ہی کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے نہ کہ حکمت اور مصلحت کے ساتھ۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب علت، شارع (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ) کے کلام میں منصوص نہ ہو تو مصلحت اور حکمت، حکم کی علت کو پہچاننے میں فائدہ دیتی ہے۔

اس تفصیل سے اس زمانہ کے بہت سے تجدّد پسندوں کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا، جو احکامِ شریعت میں تبدیلی کا دعویٰ اس لئے کرتے ہیں کہ ان احکام کی بعض مصلحتیں تبدیل ہو چکی ہیں، یہ طرزِ فکر بہت خطرناک ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ تو تمام احکامِ شریعت ہی معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر تو کسی شخص کے لئے یہ کہنا بھی ممکن ہوگا کہ نماز کی حکمت تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے، اور چونکہ مجھے یہ قلبی رجوع حاصل ہو چکا ہے، اس لئے اب نماز مجھ پر فرض نہیں رہی جیسا کہ کچھ ایسے جاہل لوگوں نے بھی کہا ہے، جو اپنے آپ کو صوفیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نیز کسی شخص کے لئے یہ کہنا بھی ممکن ہوگا کہ نماز میں جماعت کی مشروعیت اس بناء پر تھی کہ مسلمانوں کے درمیان وحدت اور نظم وضبط پیدا کیا جائے، اور جب یہ مصلحت کسی دوسرے راستے سے حاصل ہو چکی ہو تو نماز باجماعت کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

(العیاذ باللہ تعالیٰ)

اسی طرح کوئی تیسرا شخص یہ بھی کہہ سکے گا کہ پہلے دور میں خنزیر کی حرمت اس کی گندگی کی وجہ سے تھی اور اب جب کہ خنزیر صاف ستھرے پائے جاتے ہیں اور صحت افزاء، صاف ستھری فضاء میں ان کی پرورش ہوتی ہے، تو ان کی حرمت بھی باقی نہیں رہی۔ اسی پر آپ دیگر احکامِ شریعت کو قیاس کرتے چلے جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی تمام باتیں

گمراہی پر مبنی ہیں اور ہم ایسی گمراہیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

شریعت کے مقاصد

مقاصد الشريعة

علماء کی ایک جماعت نے احکامِ شریعت کی مصلحتوں اور ان کے مقاصد پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں، لیکن ان کی غرض اس سے یہ نہیں تھی کہ یہ مقاصد اور مصلحتیں ہی ہمیشہ کے لئے شرعی احکام کی بنیاد ہیں، اس طرح کہ نصوصِ شریعت سے بالکل آنکھیں بند کرلی جائیں۔

بلکہ ان کا مقصد نصوصِ شریعت میں آنے والے احکام کی مصلحتیں اس لئے بیان کرنا تھا کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ شریعت نے کوئی حکم بھی ایسا نہیں دیا، جس کے پیچھے بندوں کے لئے دنیا و آخرت کی کوئی مصلحت نہ ہو۔ نیز ان کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مباح کاموں میں اور ان معاملات میں جن میں کوئی نصِ شرعی نہیں ہے، ان مقاصد کا اعتبار کیا جائے۔ لیکن کسی بات کی شرعی مصلحت ہونے کا فیصلہ خود شریعت اور اس کی نصوص ہی کریں گی، نہ کہ خالی خولی عقل یا خواہشاتِ نفسانی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقاصد مثلاً جان مال اور عزت کی حفاظت یہ مطلقاً مطلوب نہیں ہیں اور نہ ہی تمام حالات میں ان کا اعتبار ہوتا ہے، بلکہ حق بات وہ ہے جو علامہ شاطبیؒ نے فرمائی ہے:

> ''اکثر منافع اور ضرر، اضافی یعنی (بنسبتِ دیگر کے) ہوتے ہیں۔ نہ کہ حقیقی اور ان کے اضافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک حال میں تو یہ منافع یا ضرر ہوں گے لیکن دوسرے حال میں یہی منافع اور ضرر نہیں ہوں گے۔ اسی طرح کسی شخص کے لئے تو یہ منافع اور ضرر ہوں گے اور کسی کے لئے نہیں ہوں گے، اور اسی طرح ایک وقت میں تو یہ منافع اور ضرر سمجھے جائیں گے، لیکن دوسرے وقت میں انہیں ایسا نہیں سمجھا جائے گا''۔

تو کسی چیز کے بارے میں اس بات کا فیصلہ کرنے والی، کہ وہ منفعت ہے یا ضرر، وہ اللہ عزوجل کی شریعت ہی ہے۔ تو ایسی ظاہری مصلحت جو نصوص شریعت میں سے کسی نص کے معارض ہو وہ حقیقت میں نہ تو مصلحت ہے اور نہ ہی کوئی منفعت، وہ صرف خواہشات نفسانی کی پیداوار ایسے خیالات ہیں، جن کی پیروی سے روکنے ہی کیلئے شریعتِ مطہرہ آئی تھی۔

ہمارے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو مقاصدِ شریعت کے لفظ سے استدلال کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کو نصوصِ شریعت کے مقابلہ میں کھڑا کردیں۔ یہ لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ احکامِ منصوصہ کا مقصود تو بعض مصلحتوں کو قائم کرنا اور بعض مقاصد کو حاصل کرنا ہے، اور چونکہ ظاہری طور پر (قرآن وسنت کے) منصوص واضح احکام پر عمل کرنے سے ان کے (مزعومہ) مصالح اور مقاصد میں خلل پڑ رہا ہے، تو ہم دراصل انہیں مقاصد اور مصالح کی اتباع کرنے کے (اللہ کی طرف سے) مامور ہیں، نہ یہ کہ نصوص کی ظاہری عبارتوں کی پیروی کرتے رہیں۔

یہ عقلی فلسفہ اگر مان لیا جائے تو اس کا انجام بعض وہمی مصلحتوں اور ظنی مقاصد کی بنیاد پر پوری شریعت کو منہدم کرنے اور شرعی ذمہ داریوں سے ہی آزادی حاصل کرلینے کے سوا کچھ نہیں۔

حق بات یہ ہے کہ اس میں تو کسی کو شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دین میں جو بھی حکم دیا ہے وہ مصالح اور مقاصد پر ہی مبنی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے کوئی ایسا حکم شریعت میں نہیں رکھا جو بے کار ہو یا اس میں مخلوق کا نقصان ہو، لیکن مصالح، منافع اور مقاصد تو ایسے مبہم کلمات ہیں جو بہت وسیع معنیٰ رکھتے ہیں۔

ہر وہ شخص جو زندگی کے معاملات میں صرف اپنی عقل سے غور وفکر کرے گا، تو وہ کسی چیز کے بارے میں یہ گمان کرلے گا کہ یہ مصالح اور مقاصد میں سے ہے، لیکن اسی دوران کوئی دوسرا شخص غور کرے گا تو اس کا گمان یہ ٹھہرے گا کہ یہ نہ تو کوئی مصلحت ہے اور نہ زندگی کی مقاصد میں سے ہے۔ تو ایسی نری عقل جس کی بنیاد وحی الٰہی پر نہ ہو وہ کبھی بھی ایسے معیار تک نہیں پہنچ سکتی کہ جس پر عالمی طور پر مصالح اور مقاصد کی حد بندی اور تعیین کے لئے اعتبار کیا جاسکے۔

پھر مزید یہ ہے کہ جن امور کو مقاصدِ شرعیہ میں سے معتبر مانا گیا ہے تو وہ بھی مطلقاً نہیں ہیں۔ (کہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر شخص میں ان کا اعتبار کیا جائے) بلکہ ان کے لئے بھی کچھ حدود اور ضابطے ہیں۔ مثلاً انسانی جان کی حفاظت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ اہم مقاصدِ شریعت میں سے ہے، لیکن وہ شخص جو کسی کو ناحق قتل کرچکا ہو، وہ اس مقصدِ شریعت کو استعمال نہیں کرسکتا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو قصاص سے بچانے کے لئے اس مقصد سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تمام مقاصدِ شریعت کی یہی حالت ہے۔

ان سب مقاصد کے بارے میں جو بنیادی سوال ہے وہ یہ ہے کہ وہ کون شخص ہوگا، جو ان مقاصد کی تعیین کرے گا اور وہ کون شخص ہوگا جو ایسی حدود مقرر کرے گا، کہ یہ مقاصد ان کے چوکھٹے کے اندر ہی کارآمد ہوں۔ اب اگر ہم اس تعیین کو نری عقل کو سونپ دیں تو ساری شریعت بدنظمی کی شکل اختیار کرجائے گی، کیونکہ بہت سے معاملات میں شریعت ایسے منضبط احکام عطا کرتی ہے کہ نری عقل ان امور میں صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اگر مقاصد کی تعیین کے لئے انسانی عقل کافی

ہوتی، تو پھر انبیاء ورُسل علیہم السلام کو مبعوث کرنے اور آسمانی کتبِ الٰہیہ نازل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لہٰذا حق اور واضح بات یہی ہے کہ ان مقاصدِ شریعت کی تعیین اور حد بندی کا راستہ بھی سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ قرآنِ کریم اور سنتِ رسول ﷺ کی نصوصِ شریعت کی طرف رجوع کیا جائے۔ تب ہم نہ تو بعض ڈھیلے ڈھالے مقاصد کو صریح اور ثابت شدہ نصوص کے مقابلہ میں کھڑا کر سکتے ہیں، خواہ وہ نصوص کتاب اللہ شریف کی ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ نصوص ہوں۔ اور نہ ہی ہم مقاصد اور مصالح کو شرعی قانون وضع کرنے کے لئے بنیادی مأخذ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی نصوص کو مصلحتوں کی بنیاد پر اِدھر اُدھر موڑ سکتے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ مصالح اور مقاصد صرف نصوص سے ہی اخذ کیئے جائیں گے، پس جن کو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے مصلحت قرار دیا ہو تو وہ ہی مصلحت ہوگی، نہ کہ وہ جسے ہم اپنی ذاتی آراء کے مطابق مصلحت گمان کرنے لگیں۔

مقاصدِ شرعیہ کو بیان کرنے والے اہلِ علم مثلاً علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، اور شیخ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ سب حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ احکام کا دارومدار علتوں پر ہوتا ہے، حکمتوں پر نہیں ہوتا اور وہ حکمتیں اور مصلحتیں جو نصوصِ شریعت سے معارض ہوں، ان کو تو قرآن مجید نے صرف "اَھوا" (یعنی گمراہ کن خواہشاتِ نفسانی) کا نام دیا ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ مقاصدِ شریعت کو بہت جستجو سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شریعت تو آتی ہی اس لئے ہے کہ وہ مکلّفین (وہ جن پر شرعی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں) کو ان کی خواہشاتِ نفسانی کے بہکانے سے نکال دے، یہاں تک کہ وہ خاص اللہ کے بندے بن جائیں اور یہ بات جب ثابت ہوگئی، تو یہ اس مفروضے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کہ شریعت کو لوگوں کی خواہشات کے مطابق اور لوگوں کے فوری منافع، جیسے کیسے بھی ہوں، ان کی طلب کے مطابق ڈھال دیا جائے۔

ہمارے رب جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔

(المؤمنون۔۷۱)

(اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا تو آسمان اور زمین اور ان میں بسنے والے سب برباد ہو جاتے)۔ ج،م

شیخ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جی! جیسے سنت نے اس بات کو لازم کیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہوا ہے تو سنت نے اس بات کو بھی ثابت کیا ہے کہ قطع نظر ان تمام مصلحتوں کے، کسی کام کے واجب ہونے یا حرام ہونے کا فیصلہ نازل ہونا بذاتِ خود ایک بڑا سبب ہے، اس بات کا کہ اطاعت کرنے والے کو ثواب دیا جائے اور نافرمانی کرنے والا کو عذاب ہو...... سنت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ احکامِ شریعت کو، جب وہ صحیح روایات سے ثابت ہو جائیں، ان کو بجالانے میں، ان مصلحتوں کی پہچان پر رُک کے رہنا جائز نہیں ہے'' (یعنی بغیر مصلحتوں کے جانے بھی احکامِ شریعت پر عمل لازمی ہے) ح،۵

علت کی اقسام

انواع العلة

وہ علت جس پر احکام شریعت کا دارومدار ہوتا ہے، پھر اس کی بہت سی اقسام ہیں، جو تفصیل سے اصولِ فقہ میں بیان کی گئی ہیں، لیکن ہمارا مقصد یہاں ان علت کی اقسام کو بیان کرنا ہے، جو علت کے ثبوت کی حیثیت سے ہیں:

(۱) کبھی تو علت قرآن مجید میں منصوص ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفرٍ فعدۃ من ایام اُخر (البقرہ ۱۸۴)

(پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر (روزوں کی) گنتی ہے اور دنوں سے)۔

روزے کو قضاء کرنا یہ حکم ہے اور اس کی علت نص میں بیان کردی گئی کہ وہ بیماری یا سفر ہے۔ اس حکم کی حکمت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمائی ہے:

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرہ:۱۸۵)

(اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا)۔

یہاں علت اللہ تعالیٰ کے کلام میں منصوص ہے اور اسی طرح حکمت بھی نص میں بیان ہوئی ہے اور علت کی یہ قسم جو قرآن کریم میں منصوص ہو ثبوت کے اعتبار سے علت کی تمام اقسام سے قوی تر ہوتی ہے۔ لہٰذا حکمِ شریعت کا قطعی اور یقینی طور پر دارومدار اسی علت پر ہوگا۔

(۲) کبھی علت حدیث مبارکہ میں بیان کی گئی ہوتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلّی کے جھوٹے پانی

کے ناپاک نہ ہونے کی علت اپنے اس ارشاد میں بیان فرمائی:

انہا من الطوافین علیکم والطوافات (ح۲)

''بیشک یہ بلی تمہارے پاس بار بار آنے جانے والوں میں سے ہے۔''

(از حاشیہ: امام سرخسیؒ فرماتے ہیں: ''اسی قسم میں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بلی کے بارے میں کہ (انہا من الطوافین علیکم والطوافات) یہ ایسی علت ہے جو اس حکم کے لئے مؤثر ہے کیوں کہ اس کا نتیجہ آسانی اور تخفیف ہے اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ بلی کے جھوٹے میں عموم بلوٰی اور ضرورت ہے''۔ اصول السرخسی رحمہ اللہ، بحث رکن القیاس)

یہ علت جو حدیث میں منصوص ہو، وہ ثبوت کے اعتبار سے دوسرے درجے میں ہے۔ لہٰذا اس پر بھی حکم کا دارومدار تو وجوبا ہوگا لیکن چونکہ خبرِ واحد ظنّی ہوتی ہے، لہٰذا ایسی حدیث پاک سے ثابت ہونے والی علت بھی ظنّی ہوگی (قطعی نہیں ہوگی)۔

(۳) کبھی علت قرآن وسنت میں منصوص نہیں ہوتی، لیکن فقہاء کرام دلائل شرعیہ سے اسے مستنبط کرتے ہیں اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم

وہ علت ہے جسے فقہاء نے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہو۔ جیسے حنفیہ کہتے ہیں کہ ''ربا الفضل'' کو حرام قرار دینے کی علت قدر اور جنس ہے۔ یا شافعیہ کہتے ہیں کہ علتِ حرمت طُعم (کھانے پینے کی اشیاء ہونا) اور ثمن ہونا ہے۔

اب ان آئمہ کے مقلدین پر لازم ہوگا کہ وہ ایسی علت کو مضبوطی سے تھام لیں جس کی تصریح ان کے فقہاء نے اپنی عبارتوں میں کی ہے۔

علت کی اسی قسم میں سے وہ بھی ہے جسے فقہاءِ حنفیہ نے اس مسئلے میں بیان کیا ہے کہ خط (یعنی لکھی ہوئی تحریر) پر حکم نہیں دیا جائے گا۔ جیسا کہ یہ مسئلہ متون میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً تنویر الابصار میں ہے:

''سرکاری ریکارڈ کے رجسٹر اور دستاویزات حجت نہیں ہیں۔ لہٰذا مکتوب میں جو مضمون لکھا ہوا ہے اس پر گواہوں کا ہونا لازمی ہے''۔ (ح۷)

''یہاں تک کہ کسی وقف کو ثابت کرنے کیلئے عادل لوگوں کے خطوط اور سابقہ قاضیوں کے خطوط بھی

قبول نہیں کئے جائیں گے"۔ (ح ۸)

لیکن فقہاء نے اس حکم کی علت یہ بیان کی ہے کہ ایک لکھنے والے کا خط دوسرے لکھنے والے کے خط کے مشابہ ہو سکتا ہے' لہٰذا جعل سازی سے مطمئن نہیں ہوا جا سکتا۔ یہ علت صراحتاً فقہاء کی کلام میں بیان ہوئی ہے، تو جہاں کہیں یہ علت ختم ہو جائے اور جعل سازی سے بچنے کا اطمینان ہو جائے تو وہاں خط یعنی تحریر، پر عمل جائز ہوگا۔ اسی لئے فقہاء نے بھی اس حکم سے کئی صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ **سمسار** (کمیشن ایجنٹ)، تاجر اور خزانچی (یا سکّوں کا لین دین کرنے والے) کی تحریروں کے مطابق حکم دیا جائے گا۔ (اور ان کا "خط" معتبر ہوگا)

اسی طرح فقہاءِ متاخرین نے ذکر کیا ہے کہ کچھ حکومتی دستاویزات مثال کے طور پر شاہی رجسٹر' یہ بھی حجت ہیں، اور ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ ان کو بغیر سلطان کی اجازت کے نہیں لکھا جاتا۔ پھر جو کچھ ان میں نقل کیا جاتا ہے، اس پر ایک بڑے مجمع کے اتفاق کے بعد کہ اس میں کمی بیشی کی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے، ان رجسٹروں کو اسی کام کے لئے مقررہ معین (سیکرٹری) کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اس پر اپنی تحریر لکھتا ہے۔ پھر ان رجسٹروں کو ان کی حفاظت پر مامور نگران کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس پر (دستخط اور تاریخ وغیرہ) لکھ دیتا ہے۔ پھر ان رجسٹروں کی اصل تحریروں پر مہر لگا کر محفوظ جگہوں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اب جعل سازی سے اطمینان، قطعی اور یقینی بات ہے۔ (ح ۹)

دوسری قسم

وہ علت ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کی تصریح تو نہ کی ہو لیکن وہ اشارۃً ان کے کلام سے سمجھ میں آتی ہو۔ اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سجدۂ تلاوت اس شخص پر واجب نہیں ہے جس نے آیتِ سجدہ طوطے سے سنی ہو۔ (ح ۱۰)

فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے اشارۃً یہ بات لی گئی ہے کہ سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے کی علت کسی انسان کا بالفعل آیتِ سجدہ کو تلاوت کرنا ہے اور چونکہ طوطے کی آواز انسان کی تلاوت نہیں، اس لئے اس سے سجدہ واجب نہیں ہوگا، اور اسی طرح صدائے بازگشت بھی بالفعل خود تلاوت نہیں ہے، لہٰذا اس سے بھی سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ اس علت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص آیتِ سجدہ ٹیپ ریکارڈ (یا سی ڈی اور کمپیوٹر) سے سن لے تو سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بالفعل انسان کی تلاوت نہیں (بلکہ اُس کی ریکارڈنگ ہے)۔

لیکن اس قسم کی علت تمام علتوں میں سے ثبوت کے اعتبار سے کمزور تر ہوتی ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔

عُرف کی تبدیلی سے حکم شرعی کی تبدیلی

تغیر الحکم بتغیر العرف

کبھی کسی حکم کی علت' عرف پر مبنی ہوتی ہے تو جب کبھی عرف بدلتا ہے، تو حکم بھی بدل جاتا ہے اس سے یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے:

العادة محكمةٌ

(کہ عادت کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا)۔

(یہ فقہی قاعدہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی "الاشباہ والنظائر" میں "النوع الاول من القواعد" کے تحت چھٹے (۶) نمبر پر اور المجلة کے شروع میں چھتیسویں (۳۶) نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔)

فقہاء علیہم الرحمہ نے عرف کی جو مباحث ذکر کی ہیں وہ ایسی بکھری ہوئی ہیں کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہے، اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر تمام باتوں کا خلاصہ اور لُبّ لباب ذکر کر دیں۔ کیونکہ یہ اُن اہم ترین ابواب میں سے ہے جن کو جاننے کی مفتی کو اشد ضرورت پیش آتی ہے۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق للصواب۔

عرف کا لفظ لغت میں معرفت (جاننا) سے ماخوذ ہے اور یہ معروف عادت کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

امام نسفی رحمہ اللہ "المستصفی" میں فرماتے ہیں:

"عرف اور عادت وہ ہے جو عقلی قضایا کی رُو سے دلوں میں ٹھہر جائے اور سلامتی والی طبیعتیں اس کو قبول کر لیں"

(ح ۱۱۰)

ابن ھمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عادت ایسے کام کو کہتے ہیں جو بغیر کسی عقلی اور منطقی تعلق کے بار بار پیش آئے" (ح ۱۱۲)

عرف اگر تو لوگوں کے مخصوص گروہ یا کسی خاص شہر والوں تک محدود رہے، تو اُسے عرف خاص کہتے ہیں اور اگر یہ عرف تمام لوگوں اور تمام علاقوں کے لئے عام ہو جائے تو اُسے عرفِ عام کا نام دیتے ہیں۔

پھر عرف کی دو قسمیں ہیں، عرفِ لفظی اور عرفِ عملی، اس دوسری قسم کو تعامل بھی کہا جاتا ہے۔ ہم ان دونوں قسموں کے احکام ذکر کرتے ہیں۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق

عرفِ لفظی

العرف اللفظی

عرفِ لفظی سے مراد یہ ہے کہ کسی لفظ یا کلام کو ایسے مخصوص معنیٰ میں استعمال کرنا جو کبھی اس کے لغوی معنیٰ سے مختلف ہوتا ہے اور جب لغت اور عرف کے درمیان تعارض پیش آجائے تو عرف کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اگر کسی نص میں کوئی کلمہ اپنی ایسے عرفی معنیٰ میں وارد ہوا ہو جو نص کے نزول کے وقت معروف تھا تو اب حکم اسی معنیٰ عرفی تک محدود رہے گا۔ لہٰذا اگر بعد میں جا کر اس لفظ کا عرفی معنی تبدیل ہو گیا تو نص اس کو شامل نہیں ہوگی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی فقیہ اس (نئے) معنیٰ عرفی کے مطابق فتویٰ دیتا ہے جو اس کے دور میں تبدیل ہو چکا ہے تو ظاہرِ نص کو دیکھنے والا شخص یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اس نے تو نص کے خلاف فتویٰ دیا ہے یا اس نے تو نص کو عرف کی بناء پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن درحقیقت اس فقیہ نے نہ تو نص کو ترک کیا ہوتا ہے اور نہ ہی نص کے خلاف فتویٰ دیا ہوتا ہے بلکہ اس نے تو صرف ایسی صورت کا حکم بیان کیا ہوتا ہے کہ جس کو نص شامل ہی نہیں تھی۔

(آگے آنے والی مثال سمجھنے کے لئے رُقبیٰ اور عُمریٰ کا مفہوم ذہن میں رکھ لیں:

(۱) رُقبیٰ، ھبہ کی ایک خاص صورت تھی جو زمانۂ جاہلیت میں عام تھی اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص یہ کہتا کہ یہ چیز تمہاری ہے جب تک تم زندہ رہو اگر مجھ سے پہلے تمہاری موت ہوگئی تو یہ چیز میری طرف لوٹ آئے گی۔ رُقبیٰ کے لئے اس طرح کی تعبیر کی جاتی تھی کہ: ھذہ الدار لك رقبیٰ: اصل میں رُقبیٰ کے لفظ میں انتظار کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔ ھبہ کی اس صورت میں چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو دوسرے کی موت کا گویا انتظار رہتا تھا، اس لئے اس کو رُقبیٰ کہتے تھے۔

(۲) عُمریٰ اسلام سے پہلے ھبہ کے طریقوں میں سے ایک یہ طریقہ بھی تھا اور اس میں جس شخص کو کوئی چیز بطور عُمریٰ کے دی جاتی وہ زندگی بھر اس سے فائدہ اٹھاتا اور اس کی موت کے بعد وہ چیز عُمریٰ دینے والے کو اور اگر وہ فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارث کو واپس مل جاتی تھی)

عرف کی اس صورت کی مثال وہ حدیث پاک ہے جو رُقبیٰ کے متعلق حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الرقبیٰ لمن ارقبها
(رُقبیٰ اسی کے لئے ہے جس کو وہ دیدیا گیا ہے)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لایحل الرقبیٰ ولا العمریٰ فمن اعمر شیئا فهوله ومن ارقب شیئا فهوله (ح ۱۳۶)
"رُقبیٰ اور عمریٰ (کا واپس لینا) حلال نہیں ہے۔ پس جس شخص کو کوئی چیز بطور عمریٰ دی گئی تو وہ اسی کی ہوگی اور جس شخص کو کوئی چیز بطور رُقبیٰ دی گئی تو وہ بھی اسی کی ہوگی۔"

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جب کسی شخص نے دوسرے کو یہ کہہ دیا "دَاری لك رُقبیٰ" (کہ میرا گھر تمہارے لئے رُقبیٰ ہے) تو یہ ھبہ فوری طور پر مکمل ہو جائے گا اور یہ گھر ہمیشہ کے لئے اسی کا ہو جائے گا، جسے ھبہ دیا گیا' بشرطیکہ ھبہ کی معروف شرائط پائی جاتی ہوں۔ اسی لئے جمہور فقہاء رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک رُقبیٰ، عمریٰ کی طرح ہے۔ لہٰذا یہ ھبہ درست ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ رُقبیٰ باطل ہوتا ہے یعنی اس کلام کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور وہ گھر رقبیٰ دینے والے کی ملکیت ہی میں رہتا ہے۔

اس فتویٰ کی ظاہری عبارت سے لگتا ہے کہ یہ نص کے مخالف ہے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ رُقبیٰ، جسے امام ابوحنیفہؒ نے باطل قرار دیا ہے، اس رُقبیٰ سے بالکل الگ ہے جسے نبی کریم ﷺ نے بطور ھبہ کے نافذ کیا تھا۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے دورِ مبارک میں رقبیٰ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ ایک فوری عمل میں آنے والا ھبہ ہے۔ صرف اس شرط کے ساتھ کہ اگر موهوب له یعنی جس کو ھبہ دیا گیا ہے وہ واھب سے پہلے مرگیا تو ھبہ میں دیا گیا گھر واھب کو واپس مل جائے گا۔ اس صورت میں یہ واپسی کی شرط باطل ہے' لہٰذا ھبہ درست ہو جائے گا اور شرط باطل ہو جائیگی۔ کیونکہ ھبہ تو شروطِ فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا بلکہ خود شرط باطل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کوئی چیز بطور رُقبیٰ دیدی گئی تو وہ اسی کی ہوگی۔

رہا وہ رُقبیٰ جسے امام ابوحنیفہؒ نے باطل قرار دیا ہے تو وہ ایسا ھبہ ہوتا ہے جسے واھب کی موت کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہو اور ھبہ تو تعلیق کو قبول نہیں کرتا (وہ تو فوری منعقد ہوتا ہے) اس لئے امام ابوحنیفہؒ نے اِسے باطل قرار دیا ہے۔

محدث العصر علامہ انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رقبیٰ کا یہی عرف تھا اور شاید امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں یہ تبدیل ہوگیا اور جب کوئی چیز عرف پر مبنی ہوتو اس کا حکم بھی یقینی طور پر عرف کے بدلنے سے تبدیل ہوجاتا ہے'' (ح ۱۴)

خلاصہ یہ ہوا کہ رُقبیٰ کے عرفی معنیٰ امام ابوحنیفہؒ کے دور میں تبدیل ہوگئے تھے تو انہوں نے جس پر باطل ہونے کا حکم لگایا، نص اس صورت کو شامل ہی نہیں تھی کیوں کہ نص تو دوسرے معنیٰ میں آئی ہے (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

اسی طرح لوگوں کی بات چیت میں بھی عرفِ لفظی کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر عرفِ عام ہوتو اس سے ثابت شدہ حکم بھی تمام علاقوں کے لئے عام ہوگا۔ اور اگر عرفِ خاص ہوتو اس سے ثابت شدہ حکم بھی صرف ان علاقوں تک محدود رہے گا جن میں وہ عرف چلتا ہے اور عرف خاص سے تمام علاقوں میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوگا۔

امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حاصل کلام یہ ہے کہ ہر علاقے میں جو الفاظ جس معنیٰ کے لیے بولے جاتے ہیں اس میں اسی علاقے والوں کے عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور اس کی بنیاد وہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ سوال کیا کہ ہمارے ایک ساتھی نے اپنے اوپر بُدنہ (بڑا جانور بطور نذر کے) واجب کرلیا ہے، تو کیا اب اس کے لئے گائے ذبح کرنا کافی ہے؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ تمہارے ساتھی کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ سائل نے عرض کیا ''بنورِباح سے'' اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بنورِباح نے کب سے گائے پال لی ہیں؟ تمہارے ساتھی کا ارادہ تو صرف اونٹ کا ہی ہے''۔ (ح ۱۵)

(دیکھیں اس واقعہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی نے الفاظ میں عرف کا ہی اعتبار کیا ہے)

اسی بنیاد اور اصول پر نکاح، طلاق، اور ایمان (یمین کی جمع، بمعنیٰ قَسم) جیسے بہت سے احکام کی تخریج کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جیسے شوہر بیوی کو ''سرحتكِ'' کے الفاظ کہدے۔ تو یہ اصل کے اعتبار سے کنایہ ہے، اس لئے اس سے نیت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن اب بہت سے علاقوں میں یہ عرف جاری ہوگیا ہے کہ یہ لفظ صرف طلاق کے لئے ہی بولا جاتا ہے۔ اس لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کو طلاق میں صریح قرار دیا ہے کہ اس سے بغیر نیت کے بھی طلاق ہوجائے گی۔ (ح ۱۶)

پس اگر کوئی ایسا علاقہ ہو کہ جس میں یہ عرف نہ ہو تو اس لفظ کا حکم اپنے اصل پر ہی باقی رہے گا کہ یہ کنایہ ہے۔

(اردو میں اس کی مثال لفظ ''چھوڑ دیا'' ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں فتاویٰ عثمانی ج ۲ ص ۳۶۳ تا ۳۶۵، طبع مکتبہ معارف القرآن)

اسی طرح فقہاء نے اس صورت کے بارے میں بھی کہ جب کوئی شخص تحریف شدہ لفظ کے ذریعہ عقدِ نکاح کر لے تو اس کے بارے میں بھی یہی حکم بیان کیا ہے۔ جیسے کوئی شخص "تزویج" کے بجائے "تجویز" کا لفظ بول دے، بعض فقہاء رحمہم اللہ نے تو اس بات کا فتویٰ دے دیا تھا کہ اس لفظ سے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ اور ان کے فتویٰ کی بنیاد وہ بات تھی جو علامہ تفتازانی نے "التلویح" میں ذکر کی ہے:

''جب کوئی لفظ صحیح ارادہ سے ادا نہ ہوا ہو بلکہ اس میں تحریف اور تبدیلی کر دی گئی ہو تو وہ لفظ نہ حقیقت ہوگا نہ مجاز ہوگا۔ (مجاز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ معنیٰ حقیقی اور معنیٰ مرادی کے درمیان) کوئی تعلق نہیں پایا جاتا ہے بلکہ ایسا لفظ غلط ہوگا۔ اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا''۔

لیکن علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے الدر المختار میں فرمایا ہے:

''اگر کوئی قوم متفقہ طور پر اس لفظ کو یوں ہی بولنے لگ جائے اور قصداً بھی یہ لفظ ان کے یہاں ایسے ہی ادا ہو تو یہ اس لفظ کی جدید وضع ہوگی اور یہ درست ہوگی''۔

اسی پر بہت سے متاخرین نے فتویٰ دیا ہے جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ ح ۱۷

عرف عملی

العرف العملی

عرف عملی وہ ہے جسے کبھی تعامل اور عادت کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یہ بھی بعض احکام کی تبدیلی میں مؤثر ہوتا ہے، لیکن شریعت میں ہر تعامل معتبر نہیں۔

ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب عرف کسی شرعی دلیل کے خلاف ہو تو اگر یہ مخالفت مکمل طور پر ہے، اس طرح کہ اس عرف

سے نص کو ترک کر دینا لازم آتا ہے تو ایسے عرف کے مردود ہونے میں کوئی شک نہیں، جیسے لوگوں کے ہاں بہت سی حرام اشیاء مثلاً سود، شراب نوشی، ریشم اور سونے کا پہننا، اور دیگر ایسے ناجائز کاموں کا عرف بن جاتا ہے، جن کی حرمت صراحتاً نص میں آئی ہے۔

اور اگر عرف تمام وجوہ اور ہر اعتبار سے نص کے مخالف نہ ہو اس طرح کہ دلیل عام آئی ہو اور عرف اس کے بعض افراد میں اس کا مخالف ہو یا دلیل ہی قیاس پر مبنی ہو تو ایسی صورت میں اگر عرف عام ہوگا تو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ کیونکہ عرفِ عام تخصیص کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسا کہ "التحریر" کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے اور ایسے عرف کے بناء پر قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا"۔

جیسا کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے استصناع (آرڈر دے کر چیز بنوانا) اور حمام میں نہانا، اور ماشکی (مشکیزہ سے پانی پلانے والا) سے پانی پینا، کے مسائل میں صراحت کی ہے۔ ح ۱۸۰

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جن مسائل کی بنیاد عرف عملی پر رکھی ہے، ان کو جانچنے کے بعد جو خلاصہ میرے سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے:

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ نص کسی ایسے حکم کے بارے میں آئی ہے جو عرف پر موقوف نہیں تو ایسی صورت میں عرف اور تعامل کی تبدیلی سے حکم میں کم یا زیادہ کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس کی مثال وہ تمام محرمات ہیں جو ابن عابدین رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔

یہ کام جن کا اُس زمانے میں نص کے خلاف تعامل اور رواج تھا اور پھر نص ان کی حرمت کا حکم لے کر نازل ہوئی تو جب نص نے ان کاموں کو باوجود مستقل تعامل کے حرام قرار دیدیا، تو ثابت ہو گیا کہ نص کا حکم عرف پر مبنی نہیں تھا اور وہ عرف جو نص کے خلاف جاری تھا، شریعت نے پہلے اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ لہٰذا آئندہ بھی اس تعامل کو معتبر ماننے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اسی لئے یہ حرام اشیاء، جن کا نص میں بیان آ گیا ہے یہ ہمیشہ کے لئے حرام رہیں گی، اگرچہ ان کا تعامل اور رواج بن جائے۔

(۱) وہ احکام جو تعامل یعنی عرف عملی سے بدل جاتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر مندرجہ ذیل قسموں میں آجاتے ہیں

جب اس دور میں (نزول وحی کے زمانے میں) نص اپنی بعض جزئیات میں، لوگوں کے تعامل کی بنیاد پر ثابت ہوئی

تھی، توان جزئیات میں عُرف اور تعامل کے بدل جانے سے حکم بھی بدل جائے گا کیونکہ حکم کی علت ختم ہو چکی ہے۔

اس کی مثال وہ حدیث پاک ہے جو سنن ابی داؤد اور دیگر کتب حدیث میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا اتی احدکم علی ماشیۃ فان کان فیھا صاحبھا فلیستاذنہ فان اذن لہ فلیحتلب ویشرب وان لم یکن فیھا فلیصوت ثلاثاً فان اجابہ فلیستاذنہ والا فلیحتلب ولیشرب ولا یحمل۔

(تم لوگوں میں سے جب کوئی شخص جانوروں کے پاس سے گزرے تو اگر ان کا مالک موجود ہو تو اس سے اجازت لے۔ پس اگر وہ اجازت دیدے تو دودھ دوہ کر اسے پی لے اور اگر جانور کا مالک موجود نہ ہو تو یہ اس کو تین مرتبہ پکارے۔ اگر مالک جواب دے تو یہ اس سے اجازت مانگ لے ورنہ (اس کی اجازت کے بغیر ہی) دودھ نکال لے اور پی لے لیکن دودھ اپنے ساتھ نہ لے جائے)۔ (ح۱۹)

اسی طرح وہ حدیث پاک بھی ہے جو سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من دخل حائطا فلیاکل ولا یتخذ خبنۃً

"جو شخص کسی باغ میں داخل ہو تو وہاں سے کھالے لیکن اپنے ساتھ نہ لے کے جائے"۔ (ح۲۰)

(خبنہ کے معنی ہر وہ چیز جو انسان گود میں یا بغل میں دبا کر لے جائے)

اسی طرح وہ حدیث پاک جو سنن ابی داؤد میں حضرت ابو رافع بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کے چچا سے مروی ہے کہ:

"میں نوعمر لڑکا تھا اور انصار کے کھجور کے درختوں پر پتھر مارا کرتا تھا۔ مجھے پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے لڑکے تم کھجور کے درختوں پر پتھر کیوں مارتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کھجوریں کھاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پتھر مت مارا کرو اور جو کھجور نیچے گری ہوئی ہو وہ کھالیا کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور یہ دعا دی:

''اے اللہ ان کو شکم سیر فرما''۔ (ح ۲۱۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احادیث مبارکہ میں مالک کی اجازت کے بغیر بھی پھل کھانے اور دودھ پینے کی اجازت دی ہے۔

اب بظاہر یہ اجازت ان نصوص کے خلاف ہے جو کسی دوسرے شخص کی مملوکہ چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے لینے کو حرام قرار دیتی ہیں۔

اور اس بارے میں ایک صریح نص بھی ہے جس سے جانوروں کی مالک کے اجازت کے بغیر ان کا دودھ دھونے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ یہ وہ حدیث پاک ہے جو صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لایحلُبن احد ماشیة امرئٍ بغیر اذنه ایحب احدکم ان تؤتی مشربته فتکسر خزانته فینتقل طعامه؛فانما تخزن لهم ضروع مواشیهم اطعماتهم فلا یحلبن احدٌ ماشیة احد الا بأذنه۔

(کوئی شخص بھی کسی کے جانور کا دودھ بغیر اس کی اجازت کے ہرگز نہ دھوئے۔ تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ کوئی اس کے کھانے پینے کی جگہ پہنچ جائے اور اس کے خزانہ اسٹور یا الماری کو توڑ دیا جائے اور اس کے کھانے پینے کی چیزوں کو وہاں سے منتقل کر دیا جائے؟ تو ان لوگوں کے جانوروں کے تھن بھی ان کے مالکوں کے لئے ان کی خوراک کو جمع کر رکھتے ہیں۔ لہٰذا تم میں سے کوئی بھی شخص کسی کے جانور کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر ہرگز نہ لے)۔ (ح ۲۱۱)

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث پر بہت طویل بحث فرمائی ہے خاص طور پر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے "تہذیب السنن" میں ان نصوص کے درمیان جمع اور تطبیق فرمائی ہے لیکن (دودھ اور کھجور بغیر مالک کی اجازت کے لینے کو) مباح قرار دینے والی احادیث کی توجیہ میں سب سے اچھا قول یہ ہے کہ یہ احادیث مبارکہ اس زمانے کے عرف پر مبنی تھیں جب جانوروں کے مالکان اور باغوں کے مالکان راہ گزر اور مسافر لوگوں سے ایسے کاموں میں چشم پوشی کرتے تھے۔ تو وہاں عرف میں ان کی طرف سے اجازت پائی جاتی تھی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ اس بناء پر جب عرف بدل جائے اور عرف میں اجازت نہ رہے تو حکم بھی بدل جائے گا۔

(محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کی تعبیر میں علماء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف رہا ہے۔اکثر حضرات نے اس حدیث کو حالتِ اضطرار پر محمول کیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ مضطر شخص بقدر ضرورت دودھ پی لے گا اور اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا، تاکہ یہ حدیث ان نصوص کے معارض نہ ہو جو مسلمان کے مال کی حرمت کے بارے میں آئی ہیں۔ لہٰذا اس مضطر شخص پر واجب ہوگا کہ اس نے جو دودھ پی لیا ہے قدرت ملنے پر وہ اس کی قیمت مالک کو ادا کرے۔ جب کہ ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث عرف اور عادت پر محمول ہے لہٰذا جس علاقے کے لوگوں کی طرف سے عادتاً مسافروں اور راہ گزر لوگوں کے لئے اجمالی اجازت پائی جاتی ہو تو وہاں اس طرح پھل کھانا اور دودھ دھونا جائز ہوگا۔ اور ساتھ لے جانا تب تک صحیح نہیں ہوگا جب تک اس کی اجازت نہ ہو۔ ایسی صورت میں کھانے والے پر ضمان بھی نہیں آئے گا'')۔

(بذل المجهود، تحت الحديث السابق (۴۴۶/۳، طبع الهند)

کبھی فقہاء کرام رحمہم اللہ کی آراء میں اس بارے میں اختلاف بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی نص عرف پر مبنی ہے یا ایسا مستقل حکم ہے کہ عرف اور تعامل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس فقیہ کی رائے یہ ہوتی ہے کہ حکم کا دارو مدار عرف پر ہے تو ان کے نزدیک نیا عرف آنے کی بناء پر حکم تبدیل ہو جاتا ہے اور جن کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ حکم مستقل ہے، تو ان کا فتویٰ یہ ہوتا ہے کہ نص کے الفاظ ہی کی پیروی کی جائے گی اور عرف کی تبدیلی سے حکم تبدیل نہیں ہوگا۔

(کیل کہتے ہیں گندم وغیرہ کی مقدار کسی پیمانے سے ناپنا۔ جس چیز کو ناپا جائے' اُسے کیلی یا مکیلی کہتے ہیں)

اس کی مثال یہ ہے کہ گندم، جَو، کھجور، اور نمک' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں کیلی اشیاء میں سے تھیں' اس لئے ان کو پیمانے سے ناپ کر بیچا اور خریدا جاتا تھا، پھر تعامل تبدیل ہو گیا اور یہ اشیاء وزنی چیزوں میں سے بن گئیں اور ان کو اب وزن کے ذریعہ بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو فرض قرار دیا تھا کہ جب ان چیزوں کو انہی کے ہم جنس چیزوں کے بدلے میں بیچا جائے تو دونوں کیل میں برابر ہوں۔ اب جب تعامل تبدیل ہو گیا او یہ چیزیں وزنی اشیاء میں سے ہو گئیں تو کیا اب بھی ان کے درمیان کیل کے اعتبار سے برابری لازم ہوگی، جیسا کہ نص میں وارد ہوا ہے یا اب وزن میں برابری کا اعتبار ہوگا؟ نئے عرف کے مطابق۔

اس میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور طرفین رحمہما اللہ کا اختلاف ہو گیا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعتبار کیل ہی میں برابری کا ہوگا اور وزن میں برابری کا اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ نص' نے کیل میں برابری کی شرط

عائد کی ہے یہی امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مذہب ہے۔ (ح۲۴۷)

متون میں بھی مسئلہ طرفین رحمہما اللہ کے قول کے مطابق ذکر کیا گیا ہے اور انہوں نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ نص عرف سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیونکہ عرف تو ممکن ہے کسی باطل بات کا بھی ہو جائے۔ (ح۲۴۸)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے یہ روایت ہے کہ نئے عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔لہٰذا وزن میں برابری معتبر ہوگی اور جو علت فقہاء رحمہم اللہ نے بیان کی ہے کہ 'نص عرف سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔'' تو ابن الھمام رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس دلیل سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوتا' کیونکہ اس دلیل کا آخری درجہ یہی ہے کہ یہ حدیث ان اشیاء کے کیلی ہونے پر نص ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تو یہ کہتے ہیں کہ نص کے آنے کے بعد جب نیا عرف آ گیا تو اس کی پیروی کی جائے گی' اس بناء پر کہ عرف وعادت کا تبدیل ہو جانا خود نص کی تبدیلی کو مستلزم ہے۔ یہاں تک کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہوتے تو (موجودہ حالات میں) وہ بھی ان اشیاء کے وزنی ہونے پر نص فرما دیتے''۔ (ح۲۵۰)

خلاصہ یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "کیلاً بکیلٍ" کو لفظوں ہی کے اعتبار سے حکم کا مدار قرار دیا ہے اس لیے انہوں نے عرف کی تبدیلی کا اعتبار نہیں کیا۔ رہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ تو ان کی نظر اس بات پر ہے کہ حکم کا اصل دارومدار اس پر تھا کہ جو طریقہ بھی معروف ہو اس کے مطابق برابری ضروری ہے اور حدیث پاک میں کیل کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ اُس زمانہ مبارک میں وہ ہی ان چیزوں کی پیائش کا معیار تھا۔لہٰذا جب ان اجناس میں طریقہ کار تبدیل ہو گیا کہ ان کو وزن ہی کے ذریعہ خریدا اور بیچا جاتا ہے تو اب اس نئے معیار کے مطابق ہی برابری کا اعتبار کیا جائے گا۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نئی تبدیل شدہ عادت کا اعتبار کرنے میں نص کی کوئی مخالفت نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ نص ہی کی پیروی ہے۔ محقق ابن الھمام رحمہ اللہ کے ظاہر کلام سے بھی اسی روایت کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ اس بناء پر اگر لوگوں میں دراہم کو دراہم کے بدلے بیچنے اور قرض لینے کا معاملہ' دراہم کی گنتی (عدد) کے ذریعہ متعارف ہو جائے (نہ کہ وزن کے ذریعہ) جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے تو یہ نص

کے خلاف نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس زمانے کے لوگوں کی طرف سے امام ابو یوسفؒ کو بہترین جزاء عطاء فرمائے کہ انہوں نے ربا کے بہت بڑے دروازے کو بند کر دیا ہے"۔ (ح۲۶)

(۲) وہ احکام جو تعامل کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں ان کی دوسری قسم

"کبھی نص کا حکم کسی علت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ علت عرف یا تعامل کی وجہ سے اس حکم کی تمام جزئیات میں تو نہیں، لیکن بعض جزئیات میں ختم ہو جاتی ہے، تب یہ حکم بھی خاص طور پر صرف انہی جزئیات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال جیسے حمام (یہاں مراد عوامی غسل خانہ ہے) میں اجرت دے کر داخل ہونا، پس قیاس تو اس کے جائز ہونے کے خلاف ہے کیوں کہ حمام میں ٹھہرنے کی مدت اور اس میں استعمال ہونے والے پانی کی مقدار دونوں ہی مجہول ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص پانی پلانے والے کو کہے کہ مجھے ایک پیسے کے بدلے پینے کا پانی دیدو تو یہاں بھی پانی کی مقدار مجہول ہے اور اس میں ایسا "غرر" ہے جس کی حدیث پاک میں ممانعت آئی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب البیوع، سنن ابی داؤد، باب فی بیع الغرر) لیکن فقہاء رحمہم اللہ نے لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے"۔ (ح۲۷)

("غرر" کے لغوی معنی ہیں: دھوکہ دینا، امید دلانا۔ اصطلاحی اعتبار سے اس میں بہت زیادہ تفاصیل ہیں۔ عملی طور پر اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

(۱)......مبیع میں جہالت ہو۔

(۲)......بائع مبیع کو سپرد کرنے پر قادر نہ ہو۔

(۳)......مبیع مبنی بر خطر ہو۔

(تکملة فتح الملهم، البیوع، ۱/۲۰۱ طبع مکتبة دار العلوم کراتشی)

وجہ یہ ہے کہ نہی کی علت، ایسی جہالت کا پایا جانا ہے جو جھگڑے تک پہنچا دے اور ایسی صورتوں میں تعامل کی وجہ سے جھگڑے کا اندیشہ باقی نہیں رہا، لہٰذا یہ جائز ہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے۔ یہ حدیث امام ابو حنیفہؒ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کی ہے۔

(ح۲۸)

حنفیہ نے اس حدیث سے ان شرائط کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو تاجروں کے ہاں معروف ہو جائیں' اس بناء پر فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص نعل (جوتے کا تلہ) اس شرط پر خریدے کہ بائع اس کو جوتے میں لگا کردے یا چمڑے کا ٹکڑا اس شرط پر خریدے کہ بائع اس کو موزے سی کردے گا۔

امام سرخسی رحمہ اللہ "المبسوط" میں فرماتے ہیں:

"اگر بیع میں کوئی ایسی شرط ہو کہ اگر عقد اس کا تقاضا تو نہیں کر رہا لیکن اس میں مشہور عرف پایا جاتا ہے تو یہ شرط بھی جائز ہے جیسے کوئی شخص نعل اور تسمہ اس شرط پر خریدے کہ بائع اس کو جوتے میں لگا کردے گا تو یہ جائز ہے کیوں کہ جو شرط عرف سے ثابت ہو جائے وہ ایسے ہی ہے جیسے دلیل شرعی سے ثابت ہو۔ اسی طرح مشہور عادت کو چھوڑ دینے میں بالکل واضح حرج اور تنگی بھی ہے"۔

ح ٢٩

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان صورتوں کے جائز ہونے کی یہ علت بیان کرنا کہ "اس سے حرج اور تنگی کو دور کرنا مقصد ہے" اگر حکم منصوص اور قطعی الدلالت ہو تو یہ بات وہاں نہیں چل سکتی لیکن اس کی اصل مراد یہ ہے کہ حدیث پاک میں ممانعت ایک علت پر مبنی تھی اور وہ علت تعامل کی وجہ سے ختم ہو گئی اور ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کی یہی علت بیان کی ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

"اگر تم یہ سوال کرو کہ ان صورتوں میں جب متعارف شرط کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ عرف ہی حدیث پاک سے برتر اور فیصلہ کن ہے...... میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ عرف حدیث پر فیصلہ کرنے والا نہیں بلکہ صرف قیاس پر فیصلہ کن ہے۔ کیونکہ ممانعت والی حدیث کی علت یہ تھی کہ ایسی شرائط کی وجہ سے فریقین کے درمیان جھگڑے کی نوبت پیش آتی ہے جو عقد کو اس کے اصل مقصود سے نکال دیتا ہے اور وہ اصل مقصد، فریقین کے درمیان (رضامندی کے ذریعہ) نزاع کا خاتمہ ہے اور (مندرجہ بالا صورتوں میں عرف کی وجہ سے ویسے ہی نزاع ختم ہو چکا ہے) تو یہ عرف حدیث پاک کے معنی کے موافق ہے"۔ ح ٣٠

فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی بیان کردہ اس تفصیل سے بہت سی شرائط کا حکم معلوم ہو جاتا ہے، جن پر ہمارے زمانے میں "بیوع" میں تعامل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر فریج، ایئرکنڈیشنڈ اور گاڑیوں کے بیچنے والے ایک مقررہ مدت تک ان

کی مرمت اپنے ذمہ لے لیتے ہیں (جسے عام طور پر گارنٹی یا وارنٹی کہا جاتا ہے) یا اسی طرح یہ کاروبار کرنے والے ان چیزوں کو خریدار کے گھر تک پہنچانے اور وہاں نصب کرنے کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں۔ (جسے ہوم ڈیلیوری اور فٹنگ کہا جاتا ہے) تو یہ صورتیں جائز ہیں۔ (واللہ سبحانہ اعلم)

(٣)..... وہ احکام جو تعامل کی وجہ سے تبدیل ہو جاتے ہیں ان کی تیسری قسم

کبھی کوئی نص کسی مخصوص جزئی مسئلہ کے بارے میں وارد ہوئی ہوتی ہے اور بعد میں فقہاء رحمۃ اللہ علیہم اس کے حکم کو اس کے نظائر یعنی ملتے جلتے مسائل میں بھی ثابت کر دیتے ہیں، کبھی دلالت النص کے ذریعہ اور کبھی قیاس کے ذریعہ۔ اب اگر ان نظائر میں ایسا نیا عرف آ جائے جو نص پر ان کے قیاس کے خلاف جاتا ہو تو فقہاء رحمۃ اللہ علیہم صرف ان نظائر کے بارے میں تو نئے عرف کا اعتبار کر لیتے ہیں، لیکن خاص اس جزئی مسئلہ کے بارے میں جس میں نص وارد ہوئی ہے نئے عرف کا اعتبار نہیں کرتے۔

اس کی مثال وہ حدیث پاک ہے جو قفیز طحان (جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص دانے پیسنے والے کے پاس مثلاً گندم کے دانے لے جائے اور اس کی اجرت کے طور پر انہی دانوں میں سے کچھ حصہ مثلاً ایک تہائی اس کی اجرت مقرر کر لی جائے تو یہ ممنوع ہے) سے ممانعت کے بارے میں آئی ہے اور اسے امام دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"نھی عن عسب الفحل زاد عبید اللہ و عن قفیز الطحان"

یعنی عسب الفحل (نر جانور کو اجرت پر اس غرض سے لینا کہ مادہ سے جفتی کروائی جائے) سے منع کیا گیا ہے اور عبید اللہ راوی نے ان الفاظ کا بھی اضافہ کیا ہے:

"قفیز الطحان سے بھی منع کیا گیا ہے"۔ (ح، ٣١)

حنفیہ و شوافع نے اس ممانعت کی علت یہ قرار دی ہے کہ اس میں اجیر (محنت کرنے والا، مزدور) ہی کے کئے ہوئے کچھ کام کو اس کے عمل کی اجرت بنا دیا گیا ہے (اس لیے یہ جائز نہیں) اور اسی بناء پر ان فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس ممانعت کو قفیز طحان کے تمام ملتے جلتے مسائل میں بھی جاری کیا ہے اور اس کو ایک اصل (قاعدہ) قرار دیا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اور ان میں سے (یعنی اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے) ایک یہ ہے کہ اجیر (محنت

کرنے والا' مزدور) اپنے عمل سے نفع نہ اٹھائے۔ پس اگر وہ اپنے عمل ہی سے فائدہ اٹھائے گا تو یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ پھر تو وہ اپنے آپ ہی کیلئے عمل کرنے والا بن گیا ہے تو اُسے اجرت کا استحقاق نہیں رہے گا......اسی قاعدے پر اس مسئلے کی تخریج کی گئی ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے اجرت کا معاملہ طے کرلے کہ وہ اسی کو ایک قفیز گندم پیس دے گا اور گندم کا مالک اس بدلے میں اس گندم کے آٹے کا چوتھائی حصہ دے گا یا اسی طرح کوئی شخص دوسرے سے یہ معاملہ کرے کہ وہ ایک قفیز تلوں کو نچوڑ دے اور تلوں کا مالک اس کو بدلے میں اسی تیل کا مقررہ حصہ دے گا، تو یہ دونوں صورتیں جائز نہیں ہیں"۔ (ح۲۴۲)

(قفیز: قدیم زمانے کا ایک پیمانہ ہے جس کی مقدار علاقوں میں مختلف ہوتی رہی ہے)

اسی طرح حنفیہ نے اس معاملے کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی شخص کسی کو سوت کاتنے کیلئے دے اس شرط پر کہ وہ اجرت میں اُسے کاتے ہوئے سوت یا بُنے ہوئے کپڑے میں سے کچھ حصہ اُسے اجرت میں دیدے گا اور اسی طرح کے دیگر مسائل۔ (ح۲۴۳)

ان مسائل میں شوافع کا مذہب بھی حنفیہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ (ح۲۴۴)

لیکن ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مشائخ بلخ رحمہم اللہ اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے کوئی غلہ اٹھواتا ہے اور اجرت میں اسی اٹھائے ہوئے غلہ کا کچھ حصہ دینا طے کرتا ہے تو یہ جائز ہے' اسی طرح اگر کوئی شخص کپڑا بُننے کیلئے دیتا ہے اور اُسی بُنے ہوئے کپڑے کا کچھ حصہ اجرت میں دینا طے کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے" کیونکہ ان حضرات کے علاقے والوں کا تعامل یہی تھا۔

(باوجودیکہ یہ فقہاء صرف آٹا پیسنے کے مسئلے میں جب پسے ہوئے آٹے میں سے کچھ حصہ اجرت میں دینا طے کیا ہو تو اُسے جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ یہ خاص صورت صراحتاً نص کی وجہ سے ممنوع ہے) جو حضرات سابقہ صورتوں کو بھی جائز نہیں قرار دیتے وہ ان کو "قفیز طحان" پر قیاس کرتے ہیں۔ قیاس کو عرف وتعامل کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے......اور اگر ہم یہ کہیں کہ مندرجہ بالا مسائل میں ممانعت بطور قیاس کے نہیں تھی بلکہ دلالت النص کی وجہ سے' وہ ممانعت میں شامل ہیں تو نص میں بھی عرف وتعامل کی بناء پر تخصیص کی جاسکتی ہے......اور ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے مندرجہ بالا مسائل میں بھی اس تخصیص کو جائز نہیں قرار دیا کیونکہ یہ صرف ایک شہر والوں کا تعامل ہے۔ (ح۲۴۵)

بظاہر فقہاء رحمہم اللہ نے جو یہ بات لکھی ہے کہ تعامل کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا اور نص میں تخصیص کی جائے گی، تو یہ مطلقاً ہر جگہ کیلئے جائز نہیں ہے۔

اس بندہ ضعیف عفا اللہ عنہ (حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم) کے سامنے جو بات واضح ہوئی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔ وہ یہ ہے کہ یہ حکم صرف اس نص میں جاری ہوگا جس کی علت قطعی اور یقینی طور پر ثابت نہ ہو اور اسی بناء پر مجتہدین کے درمیان اس نص کی علت بیان کرنے میں اختلاف ہوا ہو۔ چنانچہ بعض فقہاء رحمہم اللہ نے تو تحریم کی جانب کو ترجیح دیتے ہوئے عمومی علت کو اختیار کر لیا ہو۔ پھر اگر ان جزئیات میں سے جنہیں وہ عمومی علت شامل ہے، بعض جزئیات میں تعامل بدل جائے تو اب خاص ان جزئیات میں محلِ تعامل ہونے کی وجہ سے اس احتیاط (یعنی جانب تحریم کی ترجیح) کو ترک کر دیا جائے گا۔

"قفیز طحان" کے مسئلے میں یہی صورت حال پیش آئی ہے کہ حنفیہ اور شوافع نے تو اس مسئلہ کی علت یہ بیان فرمائی کہ "اجرت خود اجیر ہی کے فعل سے حاصل ہوگی یہاں تک کہ یہ اجیر اپنے آپ ہی کیلئے کام کرنے والا بن جائے گا" لیکن مالکیہ اور حنابلہ نے اس تعلیل کو قبول نہیں کیا اور انہوں نے اس کی علت اجرت کی جہالت کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر جہالت نہ ہو تو ان کے نزدیک یہ جائز ہے۔

اب اگر ایک نص دو علتوں کا احتمال رکھتی ہو کہ ان میں سے ایک دوسرے کی نسبت زیادہ عام ہے تو احتیاطاً عمومی علت ہی کو لیا جائے گا کیونکہ جب محرِّم (حرام قرار دینے والی علت) اور مبیح (جائز قرار دینے والی علت) کے درمیان تعارض ہو جائے تو احتیاطاً حرمت کی جانب کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔

(از حاشیہ:

یہاں مراد "عملی احتیاط" نہیں ہے، جس میں دوسری جانب پر عمل کرنا بھی جائز ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد "اجتہادی احتیاط" ہے جس میں دوسری جانب کو اختیار کرنا جائز نہیں ہوتا)۔

اس سب کے باوجود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء بلخ رحمہم اللہ نے اس بات کو دیکھا کہ ہم نے "قفیز طحان" کی ممانعت میں جس تعلیل کو اختیار کیا ہے تو وہ اس مزارعت کے ذریعہ ختم ہو جاتی ہے، جس میں مزارع کا حصہ پیداوار میں فی صد کے حساب سے رکھا گیا ہو۔ پس مزارع کو بھی تو اُجرت میں وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے اپنے عمل کی پیداوار ہے اور مزارعت کے جواز پر تو تعامل ہو چکا ہے۔ لہٰذا مزارعت کا مسئلہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عموم کی تخصیص کرنا تعامل کے ذریعہ ممکن ہے۔ (اور وہ تخصیص مشائخ بلخ رحمہم اللہ نے بعض مسائل میں کر دی ہے جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے)۔

دیگر مشائخ نے اس بات کو دیکھا کہ یہ صرف عرف خاص ہے' عرف عام نہیں ہے اس لیے اس کی وجہ سے نہ تو قیاس کو ترک کیا جائے گا اور نہ ہی نص میں تخصیص کی جائے گی۔ کیونکہ عرفِ خاص، لفظی عرف میں تو مؤثر ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں لیکن عملی عرف میں اس کا اثر نہیں ہوتا' مشائخ بلخ رحمہم اللہ اور ان کے ہمنوا دیگر فقہاء رحمہم اللہ کے قول کی یہی توجیہ میرے سامنے آئی ہے۔(واللہ سبحانہ اعلم)

(۴)...... وہ احکام جو تعامل کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں ان کی چوتھی قسم

کبھی کوئی ایسا عقد یا معاملہ ہوتا ہے کہ جس کی مشروعیت کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہوتی نہ اس کے جواز کے بارے میں اور نہ ہی اس کی حرمت کے بارے میں اور اس عقد میں بعض محظورات (ناجائز امور) کے ساتھ مشابہت بھی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس عقد کے بارے میں **تعامل** ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا فقہاء تعامل کی بناء پر اس میں جانبِ جواز کو ترجیح دے دیتے ہیں۔

اس کی مثال عقد استصناع ہے (آرڈر دے کر کوئی چیز تیار کروانا) کہ اس کے جائز ہونے یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی نص نہیں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو یہ بات منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر آرڈر دے کر بنوایا تھا، تو وہ روایت اس بارے میں صریح نہیں ہے کہ یہ کوئی عقد تھا بلکہ اس بات کا احتمال ہے کہ وہ باہمی عقد نہیں بلکہ آپس میں باہمی وعدہ تھا۔

(البتہ المبسوط للسرخسی رحمہ اللہ میں ہے: " و فی الحدیث اذ النبی صلی اللہ علیہ وسلم استصنع خاتماً واستصنع المنبر"۔ دیکھیں" کتاب البیوع" ۱۲/۱۶۶ طبع دار الکتب العلمیۃ)

عقد استصناع میں اجارہ کی مشابہت بھی ہے کیوں کہ یہ عمل پر کیا جانے والا عقد ہے اور بیع کی مشابہت بھی ہے کیونکہ یہ تیار شدہ چیز کے عین پر ہونے والا عقد ہے۔

پہلی مشابہت کا تقاضا یہ ہے کہ استصناع جائز ہو اور دوسری مشابہت کا تقاضا یہ ہے کہ استصناع جائز نہ ہو کیوں کہ یہ معدوم چیز کی بیع ہو رہی ہے۔

حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہاء رحمہم اللہ نے دوسری مشابہت کو ترجیح دی کیونکہ استصناع میں یہ بھی جائز ہوتا ہے کہ کاریگر مطلوبہ چیز بغیر خود بنائے اپنی طرف سے فراہم کر دے (تو اس نے خود کوئی عمل کیا ہی نہیں) اسی بنا پر حنفیہ کے علاوہ دیگر حضرات نے اس کو منع کیا ہے۔

(از حاشیہ:

علامہ مرداوی رحمہ اللہ الانصاف میں فرماتے ہیں:

''سامان کا استصناع جائز نہیں ہے'' کیوں کہ یہ بائع کا ایسی چیز کا بیچنا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہے اور یہ عقد سلم کے تحت بھی نہیں آتا)۔ ح ۳۷

لیکن فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے تعامل کی بنیاد پر جانبِ جواز کو ترجیح دیتے ہوئے اس کو مستقل عقد قرار دیا ہے۔

امام برہان الدین بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''قیاس اگرچہ استصناع کو جائز قرار نہیں دیتا...... مگر ہم نے یہاں قیاس کو چھوڑ دیا ہے اور لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے آج ہمارے زمانے تک استصناع کا معاملہ کرتے آئے ہیں اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی اُن پر نکیر یا رَد نہیں کیا۔ لوگوں کا ایسا تعامل جس پر کسی دور کے علماء نکیر اور رد نہ کریں تو وہ ایسی حجت ہے جس کے ذریعہ قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اثر یعنی نص میں تخصیص کر لی جاتی ہے''۔ ح ۳۸

اسی طرح شرکت اعمال اور شرکت وجوہ (شرکت اعمال یہ ہے کہ دو آدمی مل کر کسی کام کی انجام دہی کا معاملہ طے کریں، مثلاً یہ کہ ہم دونوں کپڑے سی لیں گے یا دھولیں گے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ رزق دے گا وہ ہم دونوں کے درمیان مقررہ تناسب سے تقسیم ہو جائے گا۔ شرکت وجوہ یہ ہے کہ مال یا عمل میں اشتراک نہ ہو بلکہ دو افراد ایک دوسرے کی شخصی وجاہت اور معاملاتی ساکھ سے استفادہ کریں اور طے پائے کہ ہم ادھار خرید کر نقد فروخت کریں گے اور جو نفع ہوگا اس میں دونوں شریک ہوں گے)۔

یہ دونوں ایسے عقد ہیں کہ نص میں نہ تو ان کی اجازت آئی ہے اور نہ ہی ممانعت...... امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس بناء پر ناجائز قرار دیا ہے کہ شرکت میں تو یہ لازمی ہوتا ہے کہ دو مالوں کو ان سے نفع حاصل کرنے کی غرض سے باہم ملا دیا جائے اور شرکت کی ان دونوں قسموں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ ح ۳۹

لیکن فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے ان دونوں معاملات کو تعامل کی بناء پر جائز قرار دیا ہے چنانچہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور ہماری دلیل یہ ہے کہ لوگ تمام زمانوں میں ان دونوں قسموں کو بغیر کسی کی طرف سے ان پر نکیر کے اختیار کرتے رہے ہیں''۔ ح ۴۰

(۵) وہ احکام جو تعامل کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں ان کی پانچویں قسم

کبھی شریعت کا حکم اس پر مبنی ہوتا ہے کہ شریعت نے اس میں ظاہری حالت کا اعتبار کیا ہوتا ہے اور یہ ظاہر حال کبھی زمانہ کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔

اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جو فقہاء رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اگر ایسی خاتون جو مدخول بہا ہو (یعنی جس کی رخصتی ہو چکی ہو) وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے مہر کے اس حصہ پر قبضہ نہیں کیا جس کی فوری ادائیگی کی شرط لگائی گئی تھی (یعنی مہر معجّل) اور شوہر یہ دعویٰ کرے کہ وہ یہ ادا کر چکا ہے، تو ایسی صورت میں شوہر کا قول معتبر ہوگا۔ حالانکہ یہاں عورت مہر پر قبضہ کرنے کی منکر ہے اور مذہب حنفی کا عمومی قاعدہ یہ ہے کہ قولِ منکر کا معتبر ہوتا ہے۔ (فقہاء رحمہم اللہ کے بیان کردہ اس مسئلہ کی وجہ یہ ہے) کیونکہ عام طور پر عورت مہر معجّل پر قبضہ سے پہلے اپنے آپ کو سپرد نہیں کرتی۔ (ج ۲ ص ۱۷۹)

لہٰذا ظاہر حال شوہر کے حق میں گواہی دے رہا ہے اور بات اُسی فریق کی معتبر ہوتی ہے کہ ظاہری صورت حال جس کے حق میں جائے، لیکن یہ حکم صرف انہی خاندانوں اور اسی عرف میں لاگو ہوگا کہ جہاں یہ ثابت ہو جائے کہ عورت بغیر مہر معجّل پر قبضہ کئے اپنے آپ کو سپرد نہیں کرتی۔ لہٰذا اگر اس کے برخلاف یہ ثابت ہو کہ عورت اس کے بغیر بھی عام طور پر اپنے آپ کو سپرد کر دیتی ہے، جیسا کہ ہمارے علاقے کے اکثر خاندانوں کا عرف ہے، تو حکم تبدیل ہو جائے گا۔ اور اصل حکم واپس آ جائے گا کہ چونکہ عورت قبضہ کا انکار کر رہی ہے تو بات اسی کی معتبر ہوگی۔

اسی قسم میں وہ مسئلہ بھی آ جائے گا جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مؤقف ہے کہ قاضی حدود اور قصاص کے علاوہ دیگر مقدمات میں گواہوں کی ظاہری عدالت (نیکی اور دیانتداری) پر اکتفاء کرے گا اور گواہوں کے تزکیہ (یعنی ان کے بارے میں خفیہ اور اعلانیہ تفتیش) کی کوئی ضرورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ فریق مخالف گواہوں پر جرح کرے۔ جب کہ صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قاضی کیلئے لازمی ہے کہ وہ گواہوں کے بارے میں خفیہ بھی اور اعلانیہ بھی تمام حقوق میں تحقیق کرے۔

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اس بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ صرف وقت اور زمانے کی بناء پر اختلاف ہے اور اس زمانے میں فتوی صاحبین رحمہما اللہ ہی کے قول پر ہے''۔

ابن الھمام رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح میں فرماتے ہیں:

”وہ ظاہری حالت (فسق وفجور کی) جو عمومی طور پر ثابت ہو رہی ہو، وہ اس ظاہری حالت سے زیادہ مضبوط ہے جو (گواہ کے) صرف اسلام کی ظاہری صورت حال سے لگ رہی ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ جب ہم نے یہ یقین کر لیا کہ فسق وفجور عام ہو گئے ہیں تو ہمیں یہ بھی یقین کرنا پڑے گا کہ اکثر وہ لوگ جو اسلام کو اپنائے ہوئے ہیں، وہ اس کی حرام کردہ چیزوں سے نہیں بچتے۔ لہٰذا اب صرف مسلمان ہونے کا اظہار کر دینا اس بات کیلئے کافی نہیں ہے کہ اس شخص کو عادل گمان کر لیا جائے۔ تو وہ ظاہر صورت حال جو غالب اور عام ہے (یعنی فسق وفجور) بغیر کسی مقابل کے رہ گئی (تو اب گواہوں کی تحقیق وتفتیش لازمی ٹھہری)“۔ ح۴۲

(۶) وہ احکام جو تعامل کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں ان کی چھٹی قسم

کبھی حکم لوگوں کے عام حالات پر مبنی ہوتا ہے اور لوگوں کے حالات بدلنے سے وہ حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال وہ مسئلہ ہے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اکراہ اور زبردستی صرف سلطان کی طرف سے ہی ثابت ہو سکتی ہے۔ جب کہ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکراہ سلطان کے علاوہ دیگر لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے (جیسے آج کل چوہدری اور وڈیرے وغیرہ)۔ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”یہ زمانہ اور وقت کا اختلاف ہے نہ کہ دلیل اور برہان کا اختلاف۔ کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ کے زمانے میں جبر واکراہ کی قدرت صرف سلطان ہی کو حاصل ہوتی تھی، بعد میں جا کر زمانہ اور اہل زمانہ تبدیل ہو گئے“۔ ح۴۳

اس کا حاصل یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا دور خیر اور بھلائی کا زمانہ تھا۔ سلطان کے علاوہ کسی کے بارے میں یہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے پر اس کی مرضی کے بغیر، زور وزبردستی کر سکے۔ پھر جب عرف بدل گیا اور فساد پھیل گیا تو سلطان کے علاوہ دیگر افراد سے بھی اکراہ عملی طور پر سامنے آنے لگا تو امام محمد رحمہ اللہ نے اس کا فتویٰ دیا کہ اب اکراہ سلطان کے علاوہ دیگر افراد سے بھی متحقق ہو سکتا ہے اسی کو متاخرین نے اختیار کیا ہے اور موجودہ دور میں فتوی کے لئے یہی قول مختار ہے۔

اسی باب میں سے تضمین ساعی (حکمران کو جھوٹی شکایت لگانے والے کو نقصان کا ضامن بنانا) کا مسئلہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص نے سلطان کو کسی کے خلاف شکایت پہنچائی اور پھر بادشاہ نے اس کی شکایت کی بناء پر

متعلقہ شخص کو کوئی جسمانی یا مالی تکلیف دی اور وہ شکایت غلط تھی' تو اصل مذہب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ساعی (شکایت لگانے والا) ضامن نہ ہو کیونکہ وہ براہ راست تکلیف پہنچانے والا نہیں ہے۔ وہ تو صرف اس کا سبب اور ذریعہ بن رہا ہے' براہ راست ایذاء تو سلطان کی طرف سے پہنچ رہی ہے لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتوی دیا کہ فساد برپا کرنے والوں کی زجرو توبیخ کیلئے اس کو بھی نقصان کا ضامن بنایا جائے گا۔ اس کی مکمل تفصیل ردالمحتار، کتاب الغصب میں ہے۔ (ح:٤٤)

یہاں ایسے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن میں متاخرین حنفیہ نے لوگوں کے حالات کی تبدیلی کی بناء پر اپنے اصل مذہب کے برخلاف فتویٰ دیا ہے۔ جیسے "مسئلہ الظفر" میں یہ فتوی دیا کہ حقدار کیلئے اپنا حق اپنے حق کی جنس کے علاوہ دیگر اشیاء سے وصول کرنا بھی جائز ہے۔

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''اُن حضرات کے زمانے میں خلاف جنس سے اپنا حق وصول کرنے کا عدم جواز اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ خوشی خوشی حقوق ادا کرتے تھے۔ اور آج کل فتوی اس پر ہے کہ جس مال سے بھی ہو سکے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔ خاص طور پر ہمارے علاقوں میں کیونکہ لوگ حقوق ادا نہ کرنے پر جمے رہتے ہیں''۔ (ح:٤٥)

(اس مسئلے کی وضاحت "الافتاء علی المذهب الغیر" کی بحث میں ''پہلی صورت کہ کسی عمومی حاجت کی بناء پر دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا'' کے ذیل میں گزر چکی ہے)۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تالیف فرمایا ہے' جس کا نام "نشر العَرف (خوشبو کو پھیلانا) فی بناء بعض الاحکام علی العُرف" ہے۔

انہوں نے اس رسالے میں بہت سے ایسے مسائل جمع کر دیئے ہیں جن کی بناء عرف اور تعامل پر ہے اور غالباً علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کردہ تمام مسائل اُن چھ (٦) قسموں میں آجاتے ہیں' جو ہم نے ذکر کی ہیں۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ اس رسالے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ تمام اور اس طرح کے دیگر مسائل اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ مفتی کیلئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ زمانہ اور اہل زمانہ کی رعایت کیے بغیر کتب ظاہر الروایہ میں نقل کردہ مسائل پر جمود (اور اصرار) اختیار کرلے ورنہ وہ بہت سے حقوق ضائع کر دے گا اور اس کا نقصان اس کے فائدے سے بڑھ کر ہوگا''۔ (ح:٤٦)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ ''شرح عقود رسم المفتی'' میں فرماتے ہیں:

''اگر آپ کہیں کہ عرف تو بار بار بدلتا ہے تو کیا اگر دوسرا عرف پیدا ہو جائے جو زمانہ سابق میں نہیں تھا تو مفتی کیلئے تصریح شدہ احکام کی مخالفت اور نئے عُرف کی پیروی جائز ہے؟

میں کہتا ہوں: جائز ہے۔ کیوں کہ وہ متاخرین جنہوں نے مذکورہ بالا مسائل میں تصریح شدہ احکام کی مخالفت کی ہے وہ امام صاحب رحمہ اللہ کے زمانہ کے بعد نیا عرف پیدا ہونے کی وجہ ہی سے کی ہے لہٰذا عرف پر مبنی الفاظ میں مفتی نئے عرف کی پیروی کرے گا۔

اسی طرح ان احکام میں جن کا مدار مجتہد نے اپنے زمانہ کے عرف پر رکھا ہے اور وہ عرف بدل گیا ہے اور نیا عرف پیدا ہو گیا ہے تو مفتی انہی حضرات کی پیروی میں نئے عرف کا اعتبار کرے گا۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ مفتی ذی رائے ہو، درست فکر رکھتا ہو اور شریعت کے قواعد سے واقف ہو، تاکہ معتبر عرف، جس پر احکام کا مدار رکھنا درست ہے، اور غیر معتبر عرف میں امتیاز کر سکے کیوں کہ متقدمین نے مفتی کیلئے اجتہاد کو شرط قرار دیا ہے اور یہ بات ہمارے زمانہ میں مفقود ہے اس لئے کم از کم یہ شرط تو ہونی ہی چاہیے کہ مفتی مسائل کو ان کی قیود و شرائط کے ساتھ جانتا ہو کیوں کہ فقہاء، بارہا شرائط و قیود چھوڑ دیتے ہیں اور فقہ کے طالب علم کی سمجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصریح نہیں کرتے۔

اسی طرح مفتی کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا عرف جانتا ہو اور اہل زمانہ کے احوال سے واقف ہو اور اس سلسلہ میں اس نے کسی ماہر استاد کی شاگردی کی ہو اور اسی وجہ سے منیۃ المفتی کے آخر میں لکھا ہے:

''اگر کسی شخص کو ہمارے آئمہ کی تمام کتابیں حفظ ہوں تو بھی فتوی دینے کیلئے شاگردی ضروری ہے تاکہ فتوی دینے کی راہ اس کی سمجھ میں آجائے اس لئے کہ بہت سے مسائل میں اہل زمانہ کی اس عادت کے مطابق جو شریعت کے خلاف نہیں ہے، جواب دیا جاتا ہے''۔ (ج۱، ص۴۷)

(۳)......ضرورت اور حاجت کی بناء پر احکام میں تبدیلی

تغير الاحكام بالضرورة والحاجة

بعض احکامِ شریعت کی تبدیلی کا ایک تیسرا سبب ضرورت اور حاجت بھی ہے۔

شریعت میں اس سبب کو معتبر ماننے کے دلائل اور ماخذ مندرجہ ذیل آیات کریمہ ہیں:

(۱)... اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(بقرہ ۱۷۳)

(اُس نے تو تمہارے لئے بس مردار جانور، خون اور خنزیر کا گوشت حرام کیا ہے، نیز وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، ہاں گر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ حد سے آگے بڑھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے)۔

(۲)... فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(المائدہ ۳)

(ہاں جو شخص شدید بھوک کے عالم میں بالکل مجبور ہو جائے بشرطیکہ گناہ کی رغبت کی بناء پر ایسا نہ کیا ہو، تو بیشک اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے)۔

(۳)... قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(الانعام ۱۴۵)

(کہہ دیجئے کہ جو وحی مجھ پر نازل کی گئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس کا کھانا کسی کھانے والے کیلئے حرام ہو مگر یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ ناپاک ہیں یا ایسا جانور ہو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، ہاں جو شخص انتہائی مجبور ہو جائے جبکہ وہ لذت حاصل کرنے کی غرض سے ایسا نہ کر رہا ہو اور نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھے تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے)۔

(۴)... اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (النحل ۱۱۵)

(اس نے تو تمہارے لیے بس مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا ہے جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ البتہ جو شخص بھوک سے بالکل بے تاب ہو، لذت حاصل کرنے کیلئے نہ کھائے اور حد سے آگے نہ بڑھے تو اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے)۔

(۵)...وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ (الانعام ۱۱۹)۔

(اور تمہارے لیے کونسی رکاوٹ ہے جس کی بناء پر تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو؟ حالانکہ اُس نے وہ چیزیں تمہیں تفصیل سے بتادی ہیں جو اس نے تمہارے لیے حرام قرار دی ہیں، البتہ جن کے کھانے پر تم بالکل مجبور ہی ہو جاؤ اور بہت سے لوگ کسی علم کی بنیاد پر نہیں اپنی خواہشات کی بنیاد پر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، بلاشبہ تمہارا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے)۔

(۶)...وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۷۸)

(اور تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی)۔

(۷)...لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲۸۶)

(اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا)۔

(۸)...فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (التغابن ۱۶)

(لہٰذا جب تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو)۔

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ، شرح عقود رسم المفتی میں فرماتے ہیں:

''ان آیات کی بنیاد پر شریعت مطہرہ نے بہت سے فقہی احکام میں ضرورت اور حاجت کا اعتبار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اسی بناء پر بعض قطعی حرام شدہ چیزوں کو بھی بقدر ضرورت استعمال کرنے کی رخصت دی ہے۔ لیکن یہاں ضرورت اور حاجت کے ان مراتب کا جاننا ضروری ہے جنہیں فقہاء رحمہم اللہ نے اپنی کتابوں میں ذکر فرمایا ہے۔ علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے پانچ درجات نقل کئے ہیں اور انہیں ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول کے الفاظ سے

تعبیر کیا ہے"۔

وہ فرماتے ہیں:

(۱)......ضرورت

کسی شخص کا اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ اگر وہ ممنوع چیز کا استعمال نہیں کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔ یہ ضرورت حرام کے استعمال کو بھی جائز کر دیتی ہے۔

(۲)......حاجت

اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر بھوکے انسان کو کوئی چیز نہ ملے کھانے کیلئے تو وہ مرے گا نہیں لیکن اُسے سخت تکلیف اور مشقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ حاجت حرام کو تو مباح نہیں کرتی مگر اس سے روزے میں افطار کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

(۳)......منفعت

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گندم کی روٹی' بکرے کا گوشت اور تیل میں پکے ہوئے سالن کی خواہش کرے۔

(۴)......زینت

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو میٹھی اور مزیدار چیزوں کی خواہش محسوس ہو۔

(۵)......فضول

یعنی حرام یا جس میں حرمت کا شبہ پایا جاتا ہو اس کو کھانے میں توسع سے کام لینا۔ (ج ۱، ۴۸)

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ زینت، منفعت اور فضول کے مراتب کا احکام کی تبدیلی میں کوئی اثر نہیں ہوتا اور احکام کی تبدیلی میں صرف ضرورت اور حاجت ہی مؤثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم ان دونوں درجات کو کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔(واللہ سبحانہ ھو الموفق)

ضرورت

الضرورۃ

ضرورت کی تعریف امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ نے "مخمصہ" (شدید بھوک) پر کلام کرتے ہوئے ان الفاظ سے کی ہے:

"ضرورت یہ ہے کہ نہ کھانے کی وجہ سے جان چلی جانے کا خوف ہو یا انسان کے اعضاء میں سے کسی عضو کے ضائع ہونے کا ڈر ہو"۔ (ع ۹۰)

اور یہ تعریف اگرچہ (الفاظ کے اعتبار سے) حرام چیزوں کو ضرورت کی بناء پر کھانے کے ساتھ ہی خاص ہے لیکن (معنی کے اعتبار سے) یہ ہر شرعی طور پر ممنوع چیز کو استعمال کرنے کیلئے شامل ہے، بشرطیکہ انسانی جان یا انسانی عضو کے بارے میں خوف لاحق ہو جائے جیسے کہ جھوٹ یا دیگر ممنوعات کا اکراہ ملجئ کے حالت میں ارتکاب کرنا۔

(اکراہ ملجئ وہ ہے جس سے انسان کسی کام پر حد درجہ مجبور ہو جائے مثلاً جان کی ہلاکت یا کسی عضو کی ہلاکت کا اندیشہ ہو۔ اس کے مقابلے میں اکراہ غیر ملجئ اُسے کہتے ہیں جس میں جان یا عضو کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو، البتہ معمولی مار پیٹ یا قید وغیرہ کی دھمکی ہو)۔

ضرورت کے ثابت ہونے کیلئے مندرجہ ذیل امور کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱)...... جان چلی جانے یا عضو کی ہلاکت کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

(۲)...... ضرورت عملی طور پر موجود ہو یہ نہ ہو کہ صرف آئندہ پائے جانے کا احتمال ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجربات کی روشنی میں اس بات کا غالب گمان ہو جائے کہ یہاں ہلاکت یا عضو کے تلف ہونے کا خوف پیدا ہو چکا ہے ورنہ اس بات کا صرف وہم کافی نہیں۔

(۳)...... ضرر کو اپنے آپ سے دور کرنے کیلئے جائز طریقوں میں سے کوئی ذریعہ مہیا نہ ہو اور اس مصیبت میں پھنسے ہوئے شخص (مبتلیٰ بہ) کا غالب گمان یہ ہو کہ بعض محرمات کا ارتکاب کر کے اس ضرر کے دور ہو جانے کی توقع ہے۔

(۴)...... کسی حرام کے ارتکاب کے نتیجہ میں کوئی دوسرا اتنا بڑا ضرر ہی لازم نہ آتا ہو جتنے بڑے ضرر سے بچنے کیلئے اس حرام کا ارتکاب کیا ہے۔ لہٰذا اکراہِ ملجئ میں بھی کسی شخص کا دوسرے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ جب ایسی

ضرورت متحقق ہو جائے تو مبتلیٰ بہ شخص کیلئے اس بات کی رخصت ہوتی ہے کہ وہ بعض منصوص حرام شدہ چیزوں کا ارتکاب ضرورت دور کرنے کے بقدر کرلے۔ جیسے وہ بھوکا شخص جو حالتِ اضطرار میں ہے اور اُسے اپنی جان کی ہلاکت کا ڈر ہے، تو اس کیلئے اتنا مردار یا خنزیر کھانا جس سے وہ اپنے آپ سے ہلاکت کو دور کردے، یہ مباح ہو جائے گا۔

مشہور فقہی قاعدہ ہے:

"الضرورات تبیح المحظورات"

(ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) کا یہی مقصد اور مطلب ہے۔

علامہ خالد اتاسی رحمہ اللہ نے اس قاعدے کے تحت جو کچھ لکھا ہے' اس میں ضرورتوں کے مختلف حالات اور احکام' اختصار کے ساتھ آجاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہم اُنہی کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

پھر یہ رخصت تین قسم کی ہے:

(۱)......وہ قسم ہے جو بھوک یا حلق میں کوئی چیز پھنس جانے یا پیاس یا اکراہ تام جو قتل یا عضو کو کاٹنے کی صورت میں ہو' یہ کام مباح ہو جاتا ہے جیسے مردار کا کھانا، خون، خنزیر کے گوشت کا استعمال اور شراب کا پی لینا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

"الا ما اضطررتم الیه" (الانعام ۱۱۹)

(مگر یہ کہ تم اس کی طرف بالکل مجبور ہو جاؤ)۔

یعنی سخت بھوک تمہیں اس کے کھانے پر مجبور کردے۔ اس میں استثناء حرام قرار دینے سے ہے (جس کا مطلب) اباحت ہے۔ (بدائع الصنائع)

اور اضطرار جیسے بھوک سے ہوتا ہے ویسے ہی اکراہ کی شکل میں بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان حرام چیزوں کو استعمال کرنا مباح ہو جائے گا اور ان سے رکے رہنا جائز نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ شخص پھر بھوکا رہا اور مر گیا یا قتل کر دیا گیا تو اس کی پکڑ ہوگی۔ کیونکہ حالتِ اضطرار میں بھی رُکے رہنے کی وجہ سے وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والا بن گیا ہے' حالانکہ شریعت میں تو اس سے منع کیا گیا ہے اور اگر اکراہ صرف ناقص تھا جیسے قید یا معمولی مار پیٹ جس سے عضو کے تلف کا خوف نہ ہو تو پھر اس کیلئے ان ممنوعات کا ارتکاب جائز نہیں ہے۔

(۲)......دوسری قسم ان محرمات کی ہے جن کی حرمت کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی' لیکن ان کے ارتکاب کی رخصت دی جاتی ہے۔ جیسے اکراہ تام کی صورت میں کسی مسلمان کا مال تلف کرنا یا کسی کی آبرو پر تہمت لگانا یا دلی طور

پر ایمان کے ہوتے ہوئے صرف زبانی طور پر کلمۂ کفر کہہ دینا۔ یہ سب کام اپنی ذات میں تو حرام ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ رخصت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رخصت کا اثر اس فعل کے حکم کی تبدیلی میں ظاہر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذہ اور عذاب ہے۔ اس کا اثر وصف کی تبدیلی میں ظاہر نہیں ہوگا جو حرمت ہے اور حالتِ اضطرار میں بھی اس قسم کے کاموں سے باز رہنا ہی افضل ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کاموں سے باز رہا اور اُسے قتل کر دیا گیا تو اُسے اجر ملے گا۔

(۳)...... اور ایک قسم وہ ہے جو کسی صورت میں مباح نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں رخصت ملتی ہے' نہ اکراہ تام کی صورت میں اور نہ ہی اس کے بغیر جیسے ناحق طور پر کسی مسلمان کو قتل کر دینا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دینا یا زنا یا والدین کو مارنا۔

جب آپ یہ تفصیل جان چکے ہیں تو یہ قاعدہ (یعنی الضرورات تبیح المحظورات) اس آخری قسم کو شامل نہیں ہے کیونکہ یہ قسم کسی حالت میں بھی مباح نہیں ہوتی' لہٰذا یہ قاعدہ محرمات کی پہلی قسم کو اس طرح شامل ہے کہ اس کی اباحت کو ثابت کر دیتا ہے (اور حرمت بالکل ختم ہو جاتی ہے) اور دوسری قسم کو یوں شامل ہے کہ اس کی حرمت تو باقی رہتی ہے لیکن اس کے ارتکاب کی صورت میں گناہ نہ ہونے کی وجہ سے رخصت مل جاتی ہے۔ جیسے طبیب کا مریض یا زخمی کے جسم کے اس حصے کو دیکھنا جس کو کھولنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ تو یہ اجازت اور رخصت صرف گناہ نہ ہونے کی حد تک ہے نہ کہ یہ حرمت ہی ختم ہو جاتی ہے اور اسی طرح سخت بھوک میں کسی دوسرے شخص کا مال کھانے پر مجبور ہو جانا، تو یہ بھی مالِ غیر کی حرمت کو ساقط نہیں کرتا۔ جیسا کہ شق نمبر ۳۳ میں آرہا ہے بلکہ صرف گناہ اس سے ختم ہو جاتا ہے اور اس شخص پر مال کے مالک کو ضمان دینا یا اس سے معاف کروالینا واجب ہے۔ (ح،۵۰)

حاجت

الحاجة

حاجت: ایسے داعیہ اور تقاضے کو کہتے ہیں کہ اگر اس کو پورا نہ کیا جائے تو اس پر تنگی، حرج، تکلیف اور مشکل مرتب ہو۔ اگر چہ یہ حرج' انسانی جان یا مال کے ضائع ہونے تک نہیں پہنچتا۔

پھر حاجت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عام حاجت

وہ ہے کہ تمام لوگوں کو یا اکثر لوگوں کو اس کی ضرورت پیش آئے۔

(۲) خاص حاجت

وہ ہے کہ لوگوں کا کوئی خاص گروہ اس کا محتاج ہو۔ جیسے کسی متعین شہر کے رہنے والے یا کسی متعین پیشہ والے، یا ایک فرد یا کچھ محدود افراد اس کے محتاج ہوں۔ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا ہے کہ حاجت عام ہو یا خاص بسا اوقات وہ احکام کی تبدیلی میں اور آسانی کے حصول میں ویسے ہی مؤثر ہوتی ہے جیسے ضرورت مؤثر ہوتی ہے' میں نے کتب فقہ میں کوئی ایسی تفصیل نہیں دیکھی جس میں ضرورت اور حاجت کے تاثیر کے درمیان کوئی فرق واضح کیا گیا ہو۔ لیکن جو بات اس بندۂ ضعیف عفا اللہ عنہ (حضرت مصنف اطال اللہ بقاءہ علینا) کے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ حاجت بعض احکام کی شرعی حیثیت یا تبدیلی میں' صرف دو حالتوں میں ہی مؤثر ہوتی ہے۔

(ا)...... پہلی حالت یہ ہے کہ خود نصوص قرآن وسنت نے اس حاجت کو معتبر ماننے کی تصریح کر دی ہو۔ اس کی ایک مثال تو بیع سلم (یہ خرید وفروخت کی اس صورت کو کہتے ہیں' جس میں قیمت نقد ادا کر دی جائے اور سامان اُدھار رہے۔ اس کی بہت سی شرائط تفصیل سے کتب فقہ میں مذکور ہیں) کا جواز ہے۔ اب سلم اصل میں تو معدوم چیز کی بیع کا نام ہے جو جائز نہیں ہے۔ لیکن سلم کو لوگوں کی حاجت پوری کرنے کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے اور قرآن وسنت نے خود سلم کے جائز ہونے کی تصریح کر دی ہے۔

(البقرہ ۲۸۳، یعنی آیت مداینہ، كذا في باب سلم من الهداية، و سنن ابي داؤد، كتاب البيوع، باب في السلف)

اسی طرح حالت جنگ اور بیماری میں مردوں کیلئے ریشم کا پہننا مباح قرار دیا گیا ہے اور حدیث پاک نے خود اس کی تصریح کر دی ہے۔

(سنن الترمذی كتاب اللباس باب ما جاء في الرخصة في لبس الحرير في الحرب)

(صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب ما يرخص للرجال من الحرير اللحكة)

حاجت کی اسی حالت کے ساتھ وہ مسائل بھی ملحق ہو جاتے ہیں کہ فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے جن میں حاجت کے معتبر ہونے کی تصریح کی ہے۔

مثال کے طور پر بعض اعذار کی بناء پر اجارہ کا فسخ کرنا یا حاجت کی بناء پر اجارہ کو باقی رکھنا۔ علامہ خالد اتاسی رحمۃ اللہ علیہ نے قاعدہ "المشقة تجلب التيسير" کے تحت اس قسم کی بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں۔

(شرح المجلة، المادة ۱۷، ۱/۴۸، طبع رشیدیہ کوئٹہ)

(٢)......دوسری حالت یہ ہے کہ اصل حکم جہاں محتمل ہو کہ قرآن وسنت میں اس کی تصریح نہ آئی ہو یا وہ حکم مجتہد فیہ ہو، تو اس حالت میں بھی حاجت کے مواقع پر اباحت اور جواز کو ترجیح دی جائے گی۔

اس کی مثال عورت کا اپنے چہرے کو کھولنا ہے۔ اب اصل کے اعتبار سے تو یہ ناجائز ہے۔ لیکن یہ اصل حکم ایسی نصوص پر مبنی ہے جس میں دیگر مطالب کا احتمال بھی موجود ہے اس طرح کہ وہ نصوص اس بارے میں صریح نہیں ہیں۔ اسی لئے یہ مسئلہ مجتہد فیہ بن گیا اور بعض فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی اجازت دی ہے، اب اگرچہ اس کو جائز قرار دینا حقیقت واقعہ کے اعتبار سے مرجوح ہے لیکن جو حاجت کے مواقع ہیں وہاں اس کو ترجیح دی جائے گی۔

اسی لئے فقہائے حنفیہ نے گواہی کی ادائیگی کے وقت عورت کو چہرہ کھولنے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

(نتائج الافکار تکملة فتح القدیر، کتاب الکراهیة فصل فی الوط، والنظر واللمس، ٢٨/١٠ وردالمحتار، کتاب الحظر والاباحة، فصل فی النظر واللمس، ٦١٠/٩)

اسی طرح جب حج کی ادائیگی میں اتنا شدید رش ہو کہ عورت چہرہ ڈھانپ کر راستہ میں چلنے کی بالکل قدرت ہی نہ رکھتی ہو (تو بھی چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے)۔

(اس مسئلہ کی تفصیل کیلئے معارف القرآن' مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ، سورۃ الاحزاب' آیت ٥٣، ج ٧ ص ٢١٧ ملاحظہ فرمائیں)

(دیکھیں تکملة فتح الملهم، کتاب السلام، مسئلة حجاب المراة وحدوده، ١٥٦/٤، طبع دار القلم)

رہے وہ مسائل جو قطعی طور پر منصوص ہیں اس طرح کہ وہ اجتہاد کا محل ہی نہیں ہے تو ظاہر یہی ہے کہ حاجت کا اُن میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ حاجت بڑھ کر ضرورت کے مرتبے تک پہنچ جائے۔ بعض فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامةً كانت او خاصة"

(حاجت عام ہو یا خاص ہو اُس کو ضرورت کی جگہ پر رکھ کر احکام جاری کئے جائیں گے)۔

اس قاعدے کے ظاہری الفاظ بہت عام ہیں یہاں تک کہ بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہو گیا کہ حاجت بعض محرمات قطعیہ کو حلال کرنے میں بھی مؤثر ہوتی ہے جیسے مردار یا خنزیر کو حالت اضطرار میں کھانا۔ لیکن فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس قاعدہ کے تحت جو مثالیں ذکر فرمائی ہیں' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قاعدے سے اُن کی یہ مراد نہیں ہے' ورنہ تو یہ کہہ کر کہ ''یہاں حاجت' اگرچہ وہ صرف خاص حاجت ہی ہو' اس کا تقاضا کر رہی ہے'' ہر قطعی حرام شدہ چیز کو اس استدلال کے ذریعہ جائز

کرلیا جائے گا اور اس کا نتیجہ تمام شرعی پابندیوں سے آزادی کی شکل میں ہی سامنے آئے گا۔ اس قاعدے کا اصل مقصد صرف اُن بعض احکام کی ''حکمت'' کو بیان کرنا ہے جو نصوص یا مسلسل تعامل کے ذریعہ خلافِ قیاس ثابت ہوئے ہیں۔

جیسے بیع سَلم، اجارہ، استصناع وغیرہ کہ یہ معاملات ظاہراً قیاس کے خلاف جائز قرار دیئے گئے ہیں، کیونکہ یہ بیع معدوم پر مشتمل ہیں اور شریعت نے بیع معدوم کے عمومی حکم سے ان ''عقود'' کو لوگوں کی حاجت کی وجہ سے مستثنیٰ کرلیا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شریعت مطہرہ نے اپنے احکام میں لوگوں کی حاجت کی رعایت کی ہے اور بہت سے معاملات کو لوگوں کی حاجات پوری کرنے کیلئے مباح قرار دیا ہے۔ جو بات ہم نے ذکر کی ہے وہ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے جنہیں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس قاعدے کے تحت ذکر کیا ہے۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس قاعدے کے ذیل میں صرف وہ ہی احکام ذکر کئے ہیں جو قرآن وسنت یا تعامل سے ثابت شدہ ہیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کچھ احکام میں حاجت کو ضرورت کا قائم مقام بنانے کیلئے الگ سے کسی دلیل شرعی کا ہونا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کوئی نص اس بارے میں آئی ہو یا وہ حکم عرف اور تعامل سے ثابت ہوا ہو۔ اس قاعدے سے یہ مراد نہیں کہ حاجت کے ذریعہ ایسا حکم ثابت ہوگا' جو نص قطعی کے معارض ہو۔

اس بندۂ ضعیف عفا اللہ عنہ (حضرت مصنف دامت برکاتہم) کے سامنے جو بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ اس ''قاعدہ'' میں کئی وجوہ سے نظر (اشکال) ہے۔

(۱)......اگر ہم اس قاعدے کے ظاہری الفاظ کو لے لیں تو پھر ''ضرورت'' اور ''حاجت'' کے درمیان یہاں کوئی فرق نہیں رہتا، حالانکہ یہ اس بات کے خلاف ہے جس پر تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے (کہ ضرورت اور حاجت دونوں کے الگ درجات ہیں اور دونوں کے الگ احکام ہیں)

(۲)......فقہ کی اصطلاحی ''ضرورت'' میں جب کسی حرام عمل کرنے کی رخصت ملتی ہے تو وہ صرف بقدرِ ضرورت ہی رخصت ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس کی تصریح ہے:

"غیر باغٍ ولا عادٍ (البقرہ ۱۷۳)

(جب کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو)

حالانکہ وہ امور کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جن کی اباحت کو اس طور پر ذکر کیا ہے کہ ان کی ''حاجت'' کو بمنزلہ ''ضرورت'' کے رکھا گیا ہے تو ان میں سے کوئی کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ وہ ایسے دائمی احکام ہیں جن میں کسی وقت کی قید نہیں لگائی گئی ہے جیسے سَلم، استصناع کا جواز اور دیگر ایسے مسائل' تو اب یہ کیسے کہا جا سکتا کہ ''حاجت''

کو تمام احکام میں ''ضرورت'' کے درجہ پر رکھا جائے گا۔ (جب کہ ضرورت کی بناء پر ثابت شدہ احکام وقتی ہیں اور حاجت کی بناء پر ثابت شدہ احکام دائمی ہیں)۔

(۳)...... وہ مثالیں جو اس قاعدے کے تحت ذکر کی گئی ہیں وہ سب کسی نص یا تعامل کی دلیل پر مبنی ہیں اور دیگر ایسی مثالیں جو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ذکر کی ہیں اور وہ کسی صریح نص سے ثابت نہیں ہوتیں' مثلاً کسی ضرورت مند شخص کیلئے سودی قرضہ لینے کا جواز تو یہ بھی صرف اس کیلئے اسی صورت میں مباح ہے کہ جب حالت اضطرار ہو تو یہ مثال اصطلاحی ''ضرورت'' میں شامل ہو جاتی ہے نہ یہ کہ اس کو محض ''حاجت'' قرار دیا جائے۔

اسی طرح ابن نجیم رحمہ اللہ نے ''بیع الوفا'' کے جواز کو بھی اسی قاعدے کے تحت ذکر کیا ہے (جس کا تفصیلی حوالہ ابھی گزر چکا ہے) لیکن پہلی بات یہ ہے کہ بیع وفاء کا جائز ہونا خود اختلافی مسئلہ ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جن حضرات نے ''بیع الوفاء'' کو جائز کہا ہے تو انہوں نے اس بنیاد پر جائز کہا ہے کہ شرط متعارف (ایسی شرط جس کا عرف ہو گیا ہو) عقد کو فاسد نہیں کرتی (نہ کہ محض ''حاجت'' کی بناء پر)۔

(بیع الوفاء: اس کی صورت یہ ہے کہ زید' بکر کے ہاتھ ایک ہزار میں کوئی چیز فروخت کر دے اور یہ طے کر لے کہ بکر جب زید کو ہزار روپے واپس کرے گا تو زید اُس کی چیز ''مبیع'' بکر کو واپس کر دے گا۔ شوافع اس کو ''رھنِ معاد'' کہتے ہیں۔ بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اسے بیع جائز اور بیع معاملہ سے بھی تعبیر کیا ہے)۔

اسی لیے شیخ احمد زرقاء رحمہ اللہ نے اس قاعدے کی شرح میں فرمایا ہے:

''ظاہر یہ ہے کہ جو چیز حاجت کی وجہ سے جائز ہوگی' وہ صرف اسی صورت میں جائز ہوتی ہے کہ جب کوئی نص اس کے جواز کو بیان کرنے کیلئے آئی ہو یا کوئی تعامل اس کو جائز کرنے والا ہو، یا نص اور تعامل دونوں اس کے بارے میں نہ ہوں لیکن کوئی نص بھی خاص طور پر اس سے روکنے کیلئے نہ وارد ہوئی ہو اور شریعت میں اس کی نظیر کوئی اور ایسا مسئلہ موجود ہو جس سے اس کا الحاق کرنا اور اس کی نظیر میں جو نص وارد ہوئی ہے اس کو اس (حاجت والے مسئلہ) میں قرار دینا بھی ممکن ہو''۔ (۵۰)

''حاجت'' کی بناء پر تبدیلی احکام کی تفصیلات تو آپ نے پڑھ لیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ حاجت کے وہ تمام حالات جو بعض احکام کی تبدیلی میں مؤثر ہوتے ہیں، ان سب کو جامع مانع ضابطوں کے ذریعہ بیان کرنا بہت مشکل معاملہ ہے اور اس سلسلے میں تمام تر دارو مدار فقہی ملکہ اور ایسے ذوق سلیم پر ہے کہ جو صرف کتابوں کی مراجعت اور مطالعہ

سے حاصل نہیں ہوسکتا اور اس کیلئے ضرورت پیش آتی ہے کہ کسی ایسے خوب ماہر فقیہ کی طویل صحبت اختیار کی جائے جنہیں ایک طرف تو فقہ میں مہارت حاصل ہو اور دوسری طرف لوگوں کے حالات سے آگاہی ہو۔ اسی لئے ابن عابدین رحمہ اللہ "منیة المفتی" سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لو ان الرجل حفظ جمیع کتب اصحابنا لا بدان یتلمذ للفتوی حتی یھتدی الیہ"۔

(اگر کوئی شخص ہمارے علماء کی تمام کتابیں بھی زبانی یاد کرلے تو پھر بھی اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ فتویٰ کے سلسلے میں کسی کی شاگردی اختیار کرے تاکہ وہ فتویٰ کی راہ پر چل سکے)۔ ح۵۳

(۴)......سدِ ذرائع کیلئے احکام کی تبدیلی

تغیر الاحکام لسد الذرائع

احکام میں تبدیلی کی چوتھی صورت سدِ ذرائع ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام اپنے اصل کے اعتبار سے تو جائز اور مباح ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ کسی ممنوع کام کا ذریعہ اور واسطہ بن رہا ہوتا ہے اس لیے اس سے روک دیا جاتا ہے۔ اب یہ ذریعہ اور واسطہ بننا کبھی ایک زمانے میں زیادہ قوی ہوتا ہے اور دوسرے زمانے میں اس کا اتنا احتمال نہیں ہوتا، لہٰذا اس وجہ سے زمانے کی تبدیلی سے بھی احکام میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔

سدِّ ذرائع کے احکامات میں سے کچھ آنے والی سطور میں آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

واللہ سبحانہ ھو الموفق۔

لغت میں ذریعہ کا معنی وسیلہ کے ہیں جیسا کہ القاموس میں ہے اور وسیلہ اسے کہتے ہیں، جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے۔ فقہاء کی اصطلاح میں ذریعہ کی تعریف علامہ ابن رشد الجدّ (بدایة المجتھد کے مصنف ابن رشد "الحفید" ہیں اور ان کی ولادت اپنے دادا کی وفات سے ایک ماہ پہلے ۵۲۰ھ میں ہوئی) نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"الذرائع ھی الاشیاء التی ظاھرھا الاباحة، ویتوصل بھا الی فعل المحظور"۔

ح۵۴

(ذرائع وہ چیزیں ہیں جس کا ظاہر تو یہ ہے کہ وہ مباح ہوں لیکن اُن کے ذریعہ کسی ممنوع فعل تک رسائی حاصل کی جاتی ہو)۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ذریعہ کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے:

"الذريعة عبادة عن امر غير ممنوع فى نفسه يخاف من ارتكابه الوقوع فى ممنوع"۔

(ذریعہ ایسے کام کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو ممنوع نہ ہو لیکن اس کے ارتکاب سے کسی ممنوع کام میں پڑ جانے کا خوف ہو)۔ ح۵۵

اس مسئلہ کی بنیاد اور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

(الانعام: ۱۰۸)

بلاشبہ بتوں کو برا بھلا کہنا اپنی ذات کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرما دیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مشرکین اپنے خیالی خداؤں کو برا بھلا کہنے کے جواب میں اللہ تعالیٰ پر سب وشتم کریں گے۔

پھر ذرائع کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......وہ ذرائع جنہیں خود شارع نے شریعت کی نصوص میں سے کسی نص کے ذریعہ روک دیا ہو۔ جیسے قرآن مجید نے مذکورہ آیت مبارکہ میں مشرکین کے مزعومہ (خیالی) خداؤں کو برا بھلا کہنے سے روکا ہے یا جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربا الفضل" کو حرام قرار دیا کیونکہ وہ "ربا القرض" کیلئے ذریعہ بن جاتا ہے۔

(اس میں اشارہ ہے اس حدیث پاک کی طرف جس کے یہ الفاظ ہیں:

"الذهب بالذهب مثلاً بمثلٍ الىٰ آخر الحديث"۔

(سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء ان الحنطة بالحنطة مِثلاً بمثلٍ، یہ حدیث مختلف الفاظ سے صحیح مسلم، کتاب البیوع اور سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، میں بھی ہے)۔

تو ایسے ذرائع کو روک دینا تو نص کے ذریعہ واجب قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ کسی خاص جزئی واقعہ میں یہ ذرائع کسی محظور (ممنوع) تک نہ بھی پہنچاتے ہوں، کیوں کہ جب شارع (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اس کے

بارے میں نص فرمادی، تواب یہ احکام اپنی ذات کے اعتبار سے اصل بن گئے اور "سدِّ ذریعہ" اب ان احکام کیلئے صرف بطور حکمت کے ہے اور حکم کا دارومدار حکمت پر نہیں ہوتا۔ (بلکہ علت پر ہوتا ہے) جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

(۲)......وہ ذرائع ہیں کہ جن کو روکنا خود شارع؟ کی طرف سے تو ثابت نہیں لیکن جس ممنوع کام تک یہ ذرائع پہنچاتے ہیں، اس سے روکنا شریعت سے ثابت ہے۔

ذرائع کی اس قسم کے بارے میں ممکن ہے کہ اس کا حکم زمانہ کے حالات کے اعتبار سے مختلف ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کتابیہ (یہودی وعیسائی) خواتین کے ساتھ شادی کی اجازت دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ؗ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (المائدة:۵)

(آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اور جن لوگوں کو (تم سے پہلے) کتاب دی گئی تھی، ان کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ نیز مومنوں میں سے پاک دامن عورتیں بھی اور اہل کتاب سے پاکدامن عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں۔ جبکہ تم نے ان کو نکاح کی حفاظت میں لانے کیلئے ان کے مہر دے دیئے ہوں، نہ تو (بغیر نکاح کے) صرف ہوس نکالنا مقصود ہو، اور نہ خفیہ آشنائی پیدا کرنا)۔

لہذا قرآن مجید کی اس نص کی وجہ سے کتابیہ عورتوں سے شادی کرنا فی نفسہ تو جائز ہے اور قرآن مجید نے اس سلسلے میں کوئی کراہت بھی ذکر نہیں کی۔ لیکن جب سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں دیکھا کہ اس کے نتیجہ میں بہت سے مفاسد پیدا ہو رہے ہیں تو انہوں نے لوگوں کو اس سے روک دیا۔ یہاں تک کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی یہودیہ بیوی کو جدا کر دیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس سند "عن ابی حنیفة عن حمادٍ عن ابراهيم" کے واسطے سے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مدائن میں ایک یہودیہ خاتون سے شادی کر لی تھی۔ جس پر حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا کہ وہ اس کو اپنے نکاح سے آزاد کر دیں' تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا:

"احرام هي يا امير المؤمنين"

(اے امیر المومنین! کیا یہ حرام ہے؟)۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب میں تحریر فرمایا:

" اعزم عليك ان لا تضع كتابي هذا حتى تخلي سبيلها فاني اخاف ان يقتديك المسلمون ، فيختار وانساء اهل الذمة لجمالهن و كفى بذالك فتنة لنساء المسلمين"۔

(میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم میرا یہ خط رکھنے سے پہلے پہلے اپنی بیوی کو جدا کر دو کیونکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ دیگر مسلمان بھی تمہاری پیروی کریں گے اور اہلِ ذمّہ کی خواتین کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے اختیار کر لیں گے' تب یہ بات مسلمان عورتوں کو فتنے میں مبتلا کرنے کیلئے کافی ہوگی)۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اس اثر کی روایت کے بعد فرماتے ہیں:

''ہم بھی اسی کو لیتے ہیں کہ ہم اس کو حرام نہیں سمجھتے' لیکن ہماری رائے میں مسلمان عورتوں کو کتابیہ عورتوں کے مقابلہ میں ترجیح دینی چاہیے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے''۔ ح ۵۶۰

(از حاشیہ:

یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو کہا تھا کہ تم اس خاتون کو طلاق دے دو کیونکہ یہ آگ کا انگارہ ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر طلاق نہیں دی' لیکن بعد میں اس کو طلاق دی تھی'')۔

ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کتابیہ خواتین سے شادی کرنا جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسا نہ کرے اور نہ ہی بغیر ضرورت کے ان کا ذبیحہ کھائے اور ایسی کتابیہ خاتون جس کا تعلق دار الحرب (کفار کے ملک) سے ہو اس سے نکاح کرنا بالاجماع مکروہ ہے کیونکہ اس سے فتنہ کا یہ دروازہ کھل جائے گا کہ ممکن ہے کہ اس

مسلمان کو اس خاتون سے ایسا تعلق ہو جائے جس کے نتیجہ میں وہ اسی کے ساتھ جا کر دار الحرب میں رہنے لگے اور اسی طرح اس شادی کی صورت میں اپنی اولاد کو کفار کے اخلاق میں رنگنے کیلئے پیش کرنا ہے۔ (کیونکہ اولاد عام طور پر ماں کی تربیت کو ہی قبول کرتی ہے) نیز اسی طرح اس میں اپنی اولاد کو غلامی کیلئے پیش کرنا بھی ہے کہ اگر وہ حربیہ خاتون حاملہ ہونے کی حالت میں گرفتار ہو گئی تو اب اولاد مسلمان ہونے کے باوجود غلام ہوگی''۔ (۵۷)

علامہ دردیر رحمۃ اللہ علیہ نے الشرح الکبیر میں ذکر کیا ہے:

''کتابیہ خاتون سے نکاح کرنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ اور یہ کراہت اس وقت زیادہ سخت ہو جاتی ہے جب یہ شادی دار الحرب میں ہو''۔ (۵۸)

علامہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (شافعی) فرماتے ہیں:

''اہل کتاب کی آزاد خواتین سے شادی کرنا مکروہ ہے اور اُن کی باندیوں سے اپنی ملکیت کی بناء پر ہمبستری کرنا بھی مکروہ ہے، کیونکہ ہم اس بات سے مامون نہیں ہو سکتے کہ بالآخر یہ شخص اسی عورت کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اور وہ اسے دین کے بارے میں فتنہ میں مبتلا کر دے گی یا یہ شخص اس کافرہ عورت کے ہم مذہب لوگوں کا متولی و نگران بن جائے گا۔ اور یہ عورت اگر حربیہ بھی ہو تو کراہت زیادہ سخت ہوگی کیونکہ پھر مذکورہ خدشات سے مطمئن نہ ہونے کے ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا شخص پھر اہل حرب (کفار) کی تعداد میں اضافہ کا ذریعہ بنے گا''۔ (۵۹)

ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ (حنبلی) فرماتے ہیں:

''بہتر یہ ہے کہ کتابیہ خاتون سے شادی نہ کرے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے اہل کتاب کی خواتین سے شادی کر لی تھی یہ حکم دیا تھا کہ تم ان کو طلاق دے دو تو ان لوگوں نے طلاق دے دی تھی''۔ (۶۰)

اب جو حکم قرآن مجید کی نص سے بغیر کراہت کی تصریح کے جائز ثابت ہو رہا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چاروں مذاہب جن کی پیروی کی جاتی ہے، سب نے سدّ ذرائع کی بناء پر اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہ اُس زمانہ میں تھا کہ جب اسلام اور مسلمان' قیادت کے مرتبہ پر فائز تھے، تو تمہارا کیا خیال ہے ہمارے اس زمانے کیلئے کہ جب مسلمان سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ اب تو کتابیہ خواتین سے شادی کرنے میں شدید فتنہ ہے اور اس کے نتائج ہمارے

دور میں بہت ہی بدترین ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے بہت سے احکام میں اسی طرح سدّ ذرائع کے قاعدہ پر عمل کیا ہے۔

اس کی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ نمازوں کیلئے مسجدوں میں آئیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ بھی منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ"

''تم لوگ اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے مت روکو''۔

لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں یہ دیکھا کہ اس اجازت کے نتیجہ میں فتنے جنم لے رہے ہیں، تو انہوں نے خواتین کو مسجدوں سے روک دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"لو ادرك النبي صلى الله عليه وسلم ما احدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني اسرائيل". ح ۶۲

''اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نئے طریقوں کو دیکھ لیتے جو عورتوں نے گھڑ لیے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ان کو مسجد سے روک دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کی تصریح فرمائی تھی۔

"لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ ولكن ليخرجن وهن تفلات" ح ۶۳

''تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے مت روکو، لیکن وہ جب نکلیں تو بغیر خوشبو لگائے جائیں''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

"لا تمنعوا نسائكم المساجد، وبيوتهن خير لهن". ح ۶۴

''تم اپنی عورتوں کو مسجدوں سے مت روکو اور ان کے گھر اُن کیلئے زیادہ بہتر ہیں''۔

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"صلاة المراة في بيتها افضل من صلاتها في حجرتها و صلاتها في مخدعها افضل من صلاتها في بيتها". ح ۶۵

''عورت کی نماز کمرہ کے اندر زیادہ بہتر ہے، بنسبت گھر (یعنی صحن میں) نماز پڑھنے کے اور اس

کی نماز گھر کے بالکل اندرونی حصہ میں زیادہ افضل ہے بنسبت کمرے میں نماز پڑھنے کے"۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عورتوں کا مسجدوں میں آنا صرف بطور اجازت اور اباحت کے تھا، اس کو ان کیلئے افضل نہیں قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی اس صورت میں تھا کہ جب اس میں کوئی فتنہ نہ ہو، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی قید لگادی تھی کہ عورتیں بغیر خوشبو اور زینت کے آئیں۔

جب اس بارے میں فتنوں کا خوف پیدا ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کا حکم دیا جو بغیر کسی اختلاف کے افضل تھا (یعنی عورتوں کا گھروں میں نماز پڑھنا) اور انہوں نے ایسا فساد کے راستے کو روکنے کیلئے کیا۔

سدّ ذرائع کی فقہ حنفی میں ایک مثال یہ بھی ہے کہ عورت اگر ولی کی اجازت کے بغیر، غیر کفو (اپنے خاندان سے کم تر خاندان) میں نکاح کرلے تو اصل مذہب کے مطابق یہ نکاح منعقد ہوجاتا ہے لیکن ولی کو اس پر اعتراض کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہ اس نکاح کو قاضی کے ذریعہ فسخ کرواسکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت یہ ہے کہ نکاح بالکل منعقد ہی نہیں ہوگا۔ متاخرین حنفیہ نے سدّ ذریعہ کے طور پر اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"ویفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازہ اصلا، وھو المختار للفتوی لفساد الزمان"۔ (ح:٦٦)

(غیر کفو میں نکاح کی صورت میں اس کے بالکل عدم جواز کا فتویٰ دیا جائے گا' یہی قول فساد زمانہ کی بناء پر فتویٰ کیلئے مختار ہے)۔

اسی طرح اصل مذہب حنفیہ کا یہ ہے کہ عورت اگر مرتد ہوجائے۔ (والعیاذ باللہ العظیم) تو اس عورت کا نکاح اس کے مسلمان شوہر سے فسخ ہوجائے گا اور اُسے اسلام قبول کرنے پر اور تجدیدِ نکاح پر مجبور کردیا جائے گا بشرطیکہ شوہر بھی یہ چاہتا ہو۔ لیکن سمرقند اور بلخ کے مشائخ رحمہم اللہ نے جب یہ دیکھا کہ بعض خواتین اپنے شوہروں سے جان چھڑانے کیلئے ارتداد کو حیلہ اور ذریعہ بنالیتی ہیں (والعیاذ باللہ تعالیٰ) تو انہوں نے سدّ ذریعہ کے طور پر اس بات کا فتویٰ دے دیا کہ مرتد ہونے والی خاتون، اپنے شوہر کے نکاح میں ہی باقی رہے گی (یعنی نکاح فسخ ہی نہیں ہوگا)۔ (ح:[illegible])

(اس مسئلہ کی مزید تفصیل اسی کتاب میں "طبقات الفقھاء" کے تحت "طبقات المسائل" میں سے "مسائل النوادر" کے ذیل میں اصل کتاب کے صفحہ ١٤٤ پر گزر چکی ہے)۔

پھر وہ ذرائع کہ شارع نے جن کو روکنے پر نص فرمائی ہے ان سے منع کرنا ایک اجتہادی معاملہ ہے جس میں کبھی فقہاء کی آراء میں اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ بعض فقہاء کچھ ذرائع کو ممنوع کاموں میں پڑ جانے کا قوی سبب سمجھتے ہیں، اس لئے وہ ایسے ذرائع کو ممنوع کے درجے میں ہی رکھتے ہیں، جس کا انسداد لازمی ہے' جب کہ بعض فقہاء ایسا نہیں سمجھتے (تو وہ ان ذرائع کو اختیار کرنے کی اجازت دیتے ہیں)۔

اس کی مثال "بیع عینہ" ہے۔ (اس کی وضاحت آگے ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں آ رہی ہے)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور ان کا مذہب اس کی مطلقاً ممانعت کا ہے۔ (ح:۶۸)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب تک بیع کی جواز کے تمام شرائط موجود ہوں تو یہ معاملہ جائز ہے کیوں کہ بہر حال یہ بیع ہے' سود نہیں ہے۔ (ح:۶۹)

فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ علیہم کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ بیع میرے دل میں پہاڑ کی طرح وزنی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مذموم طریقہ کار ہے جسے سود کھانے والوں نے گھڑ لیا ہے''۔ (ح:۷۰)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''عینہ کا معاملہ جائز ہے اور اس پر اجر دیا جائے گا اور فرماتے ہیں کہ اس کو اجر اس لیے ملے گا کہ اس نے حرام سے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے''۔ (ح:۷۱)

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں باتوں کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''پھر میرے دل میں یہ آتا ہے کہ جس چیز کو بیچنے والے نے نکالا ہے اگر ایسی صورت اختیار کی گئی کہ وہ پوری چیز یا اس کا کچھ حصہ اسی بیچنے والے کے پاس واپس آ جاتا ہے تو یہ مکروہ ہے جیسے پہلی صورت میں کپڑا یا ریشم کا واپس آنا (پہلی صورت سے مراد یہ ہے کہ جب بائع نے کوئی کپڑا اس کے بازاری نرخ سے زیادہ پر مقررہ مدت کیلئے بیچا اور پھر مشتری سے وہ ہی کپڑا خود بازاری قیمت کے مطابق لے لیا جو پہلے نرخ سے کم تھے اور یہ قیمت بائع نے مشتری کو فوراً ادا کر دی) اور جیسے پندرہ دراہم قرضہ دینے کی صورت میں دس کا واپس ہو جانا (اس سے مراد وہ صورت ہے جو ابن ہمامؒ نے اس عبارت سے پہلے ذکر کی ہے کہ ایک شخص دوسرے کو پندرہ درہم قرضہ دے دے

اور پھر اس کو ایک ایسا کپڑا پندرہ درہم میں بیچ دے، جس کی حقیقی قیمت دس درہم ہے اور بعد میں اس سے اپنے قرض کے پندرہ درہم پورے وصول کر لے، تو اب اس شخص کی ملکیت سے صرف دس درہم نکلے اور دوسرے شخص پر اس کے پندرہ درہم بطور قرض کے ثابت ہو گئے) ورنہ کوئی کراہت نہیں۔ سوائے اس کے کہ بعض احتمالات میں ایسا کرنا خلافِ اولیٰ ہو گا۔ جیسے کوئی محتاج شخص کسی سے قرضہ کا سوال کرے اور جس سے سوال کیا گیا ہے وہ قرض دینے سے انکار کر دے لیکن کوئی چیز جو دس درہم کے برابر ہے، محتاج شخص کو پندرہ درہم کے بدلہ میں مقررہ مدت کے ساتھ بیچ دے۔ یہ محتاج مدیون شخص وہ چیز پندرہ درہم میں خرید کر بازار میں اس چیز کو دس درہم کے بدلہ میں بیچ دے، جو اُسے فوراً وصول ہو جائیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس میں مہلت کے مقابلہ میں ثمن کا ایک حصہ (پانچ درہم) ہے۔ اور قرض دینا اس پر ہمیشہ واجب تو نہیں یہ بلکہ مستحب ہے تو اگر وہ قرض دینا صرف اس وجہ سے چھوڑے گا کہ اُسے دنیا کے اضافے کا شوق ہے تو یہ مکروہ ہو گا اور اگر کسی ایسی مجبوری جو واقعی عذر ہو اس کی وجہ سے قرض نہیں دیتا (بلکہ یہ طریقہ کار اختیار کرتا ہے) تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ تو اس کا پتہ تب چلے گا جب اس معاملہ کی تمام صورتوں کو الگ الگ دیکھا جائے گا اور جب تک عین وہ چیز جو قرض دینے والے نے بیچی ہے اس کے پاس واپس نہیں آتی تو اس کو "بیع عینہ" کا نام نہیں دیا جا سکتا"۔ (ح۲۷)

امام شاطبی رحمہ اللہ نے ایسے اجتہادی مسائل میں سدِّ ذرائع کے مسئلہ کو بڑے سلجھے ہوئے کلام کے ساتھ تحقیقی طور پر بیان کیا ہے۔ ہم ان کی عبارت کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں کیونکہ اس میں دیگر بھی کئی فائدے ہیں۔

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ذرائع کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جس کو بالاتفاق بند کر دیا جائے گا۔ جیسے بتوں کو گالی دینا، یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ پر سب وشتم کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اور اسی طرح دوسرے شخص کے والدین کو گالی دینا، جب اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ دوسرا شخص اس کے والدین کو جواباً گالی دے۔ حدیث پاک میں بھی اس کو خود اپنے والدین کو گالی دینے والا شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے راستوں میں کنویں کھود دینا، جب کہ یقین ہو کہ وہ اس میں گریں گے۔ نیز اُن کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملا دینا، جن اشیاء کے بارے میں معلوم ہو کہ مسلمان اُنہیں

استعمال کریں گے۔

ذرائع کی دوسری قسم وہ ہے جس سے بالاتفاق نہیں روکا جائے گا' جیسے کوئی شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ اپنے غلے کے بدلہ میں اسی جنس کا غلہ اس سے بہتر یا اس سے گھٹیا خرید لے' تو وہ اس کیلئے یہ حیلہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے اپنا سامان یعنی غلہ ثمن (نقد) کے بدلہ بیچ دیتا ہے تا کہ پھر ثمن کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کر لے۔ بلکہ تمام تجارتوں کا یہی حال ہے کیونکہ جائز تجارتوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تاجر اپنے دراہم کو خرچ کر کے سامان خریدتا ہے تا کہ اس حیلہ اور ذریعہ سے وہ پہلے سے زیادہ دراہم حاصل کر سکے۔

ذرائع کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے (کہ ان ذرائع کا دروازہ بند کیا جائے یا نہیں) اور ہمارا مسئلہ (یعنی مقررہ مدت کے معاملات' جس میں سے ایک بیع عینہ بھی ہے) اسی قسم میں سے ہے۔ ہم ابھی تک اس کے حکم کے بیان کرنے سے فارغ نہیں ہوئے اور اس سلسلے میں اختلاف (کی بحث) باقی ہے۔

(امام شاطبی مالکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، لہٰذا بیوع اجال یعنی مقررہ مدت کیلئے کئے گئے سودوں کے مسئلہ کی کراہت میں وہ مالکی مذہب کی تائید کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ اس عبارت سے یہ چاہتے ہیں کہ یہ بتا دیں کہ جن فقہاء یعنی حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم اور شافعیہ رحمۃ اللہ علیہم نے ان معاملات کو جائز قرار دیا ہے تو ان کا مؤقف بھی دلائل پر مبنی ہے۔

لہٰذا اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر ان آئمہ پر ملامت کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ مسئلہ اجتہادی ہے اور ہر فقیہ نے جو رائے اختیار کی ہے ان کے پاس اس کی دلیل موجود ہے۔ از حاشیہ)۔

یہ خلاصہ ہے اس ساری بات کا جو اس مسئلہ میں حیلہ کرنے کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے کہی جا سکتی ہے اور دوسری جانب (یعنی فقہاء مالکیہ رحمۃ اللہ علیہم کا مؤقف) کے دلائل واضح اور مشہور طے شدہ ہیں۔ آپ ان کو ان کے مقامات پر مطالعہ کریں۔ یہاں اصل مقصد صرف یہ تقریر بیان کرنا تھی جو (ہمارے ماحول میں) نئی ہے۔ کیونکہ اس رائے (حنیفہ اور شافعیہ) والوں کی کتابوں سے بہت کم واقفیت ہے کیونکہ حنفیہ کی کتابیں تو گویا مغربی ممالک (افریقہ ممالک) میں بالکل معدوم ہیں۔ اسی طرح شوافع اور دیگر اہل مذاہب کی کتابوں کا حال ہے۔ اور پھر ہر وقت ایک ہی

مذہب پر استدلال کے عادی ہونے سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم کے دل میں دوسرے مذہب کیلئے نفرت اور اجنبیت بیٹھ جاتی ہے، کیونکہ دیگر مذاہب کے مأخذ اور دلیل کی اُسے اطلاع ہی نہیں ہوتی اور یہ چیز اُن ائمہ سے اعتقاد میں بے راہ روی کا ذریعہ بن جاتی ہے جن کی فضیلت اور دین میں برتری اور مقاصد شریعت پر اُن کی دسترس نیز اغراض شارع تک اُن کی رسائی پر تمام لوگوں کا اجماع ہے۔ اور ایسا ہمارے ہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے"۔ ح ۲۴۶

خلاصہ یہ ہوا کہ فقہاء نے سدِّ ذرائع کو ایک معتبر قاعدہ مانتے ہوئے کئی احکام کی بنیاد اس پر رکھی ہے۔ اس قاعدے پر مبنی مسائل کے بارے میں غور وفکر کرنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی جائز کام یقینی طور پر یا غالب گمان کے درجے میں کسی ناجائز کام تک پہنچا دے گا، تو یہ جائز کام بھی ممنوع اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

ہاں اگر ناجائز کام میں مبتلاء ہونے کا صرف احتمال ہو یقین یا غالب گمان نہ ہو، تو پھر جائز کام پر صراحتاً عدم جواز کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ لیکن مفتی ایسی مناسب تعبیر اختیار کرے گا کہ مستفتی اس جائز کام سے بھی رک جائے۔ مثال کے طور پر مفتی یوں کہے: "یہ کام آپ کیلئے مناسب نہیں ہے" یا یہ کہے کہ "اس کام سے بچنا ہی مناسب ہے" یا یہ کہہ دے کہ "میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دیتا" یا اس طرح کہہ دے کہ "میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دیتا" وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس وقت یہی طرز تعبیر اختیار فرمایا تھا جب آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"فلا آذن ثم لا آذن، ثم لا آذن الا ان يريد ابن ابی طالب ان يطلق ابنتي وينكح ابنته، فانما هي بضعة مني يريبني ماأرابها و يؤذيني ما آذاها"۔ ح ۲۴۷

(میں اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر میں اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر میں اس کی اجازت نہیں دیتا، سوائے اس کے کہ ابن ابی طالب یہ چاہے کہ میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ پس بیشک وہ (حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا) میرا جزو ہے۔ مجھے بھی وہ چیز تشویش میں مبتلا کرتی ہے جو اُسے تشویش میں مبتلا کرے۔ اور میرے لیے بھی وہ بات تکلیف دہ ہے جو اُسے تکلیف دے)

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"ان فاطمة مني وانا اتخوف ان تفتن في دينها"۔

(فاطمہ مجھ سے ہے اور مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اسے اُس کے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈال دیا جائے گا)۔

لیکن اسی روایت میں آپ ﷺ نے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا:

وانی لست احرم حلالا ولا احل حراما ولکن والله لا تجتمع بنت رسول الله وبنت عدو الله ابداً۔ ح ۵ ۷

(اور میں کسی حلال کو حرام اور کسی حرام کو حلال نہیں کر رہا لیکن اللہ کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی کبھی بھی جمع نہیں ہوں گی)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرمادی کہ یہ نکاح بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ایک بڑے ممنوع میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ ہے اور وہ یہ کہ جب آپ ﷺ کی صاحبزادی کی سوکن ابوجہل کی بیٹی بنے گی، تو اُن کو تکلیف پہنچے گی' اور اس تکلیف کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے گی (اس لئے اس نکاح سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منع کر دیا گیا) اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ ذرائع پر یہ حکم لگانا کہ ان سے روکا جائے یا نہ روکا جائے، ممکن ہے کہ مختلف اشخاص اور مختلف حالات کی بناء پر الگ الگ ہو۔

اس سلسلے میں بھی اس ملکۂ فقہیہ (فقہی استعداد وصلاحیت) اور ذوقِ سلیم کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا' جو ایسی استعداد رکھنے والے حضرات کی نگرانی میں ایک طویل عرصے تک فتوی کا کام کئے بغیر، عام طور پر حاصل نہیں ہو سکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم۔

☆......☆......☆

حواشی (٦)

زمانہ کی تبدیلی سے احکام کی تبدیلی

تغیر الاحکام بتغیر الزمان

(۱)ذکرہ الفقہاء فی عدۃ مواضع ،فمثلاً ذکرہ ابن عابدین رحمہ اللہ حاشیۃ ابن عابدین ،کتاب الصلاۃ ،باب الوتر والنوافل ،مبحث :صلاۃ التراویح ،الجزء ۲ الصفحۃ ۶۰۱ ،طبع دار المعرفۃ بیروت۔

فقال :" فقد تتغیر الاحکام لاختلاف الزمان فی کثیر من المسائل علی حسب المصالح"۔

(۲) فتح القدیر ابن ھمام رحمہ اللہ ،کتاب البیوع ،باب البیع الفاسد ،الجزء ۶ ، الصفحۃ ۳۹۳ ،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۳) العنایۃ بھامش فتح القدیر ،کتاب البیوع ،باب البیع الفاسد ،الجزء ۶ ،الصفحۃ ۳۹۳ ،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۴) الموافقات ،الشاطبی ،کتاب المقاصد ،القسم الاول :مقاصد الشارح النوع الاول :فی بیان قصد الشارح فی وضع الشریعۃ ،المسألۃ الثامنۃ الجزء ۲ ،الصفحۃ ۶۳ الی ۶۴ ،طبع :المکتبۃ التجاریۃ مصر۔

(۵)حجۃ اللہ البالغۃ ، شاہ ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ ،مقدمۃ :من قال : ان حسن الاعمال وقبحھا عقلیان من کل وجہ ،فقولہ باطل کذلک ،الجزء ۱ ، الصفحۃ ۵۰ الی ۵۱ ،طبع

رشیدیة کوئته۔

(٦) سنن ابی داؤد ، کتاب الطهارة ،باب سور الهرة ،رقم الحدیث ٧٥ الصفحة ٢٨، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

اصول السرخسی،ابوبکر السرخسی،بحث رکن القیاس،الجزء ٢،الصفحة ١٨٧۔

"وقال السرخسی رحمه الله تعالیٰ :فمن ذلك قول رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الهرة : انها من الطوافین علیکم والطوافات،لانها علة مؤثرة فیها یرجع الی التخفیف لانه عبارة عن عموم البلوی والضرورة فی سؤره۔

(٧) حاشیة ابن عابدین ، کتاب الوقف ،فصل :یراعی شرط الواقف فی اجارته ،مطلب :اخضر صکافیه خطوط العدول والقضاة لایقضی به، الجزء ٦ ،الصفحة ٦٣٣ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(٨)حاشیة ابن عابدین مع الدرالمختار ،الحصکفیی ﷬ ،کتاب البیوع ،باب الاستحقاق،الجزء ٧،الصفحة ٤٦٨ ،طبع دار المعرفة بیروت۔

(٩) العقود الدریة فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ،ابن عابدین، کتاب الدعوی،(سئل)فی دار معلومة فی وقف بروالمتولون علی الوقف متصرفون بها ،الجزء ٢، الصفحة ٣٤ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(١٠)الفتاوی الهندیة المعروفة بالفتاوی العالمکیریة، کتاب الصلاة،الباب الثالث عشر فی سجود التلاوة،الجزء ١،الصفحة ١٤٦،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

"ولا تجب (أی السجدة) اذا سمعها من طهر ،هوالمختار ..ومن سمعها من الصدی لا تجب علیه: کذا فی الخلاصة"۔

(١١) المستصفی شرح الفقه النافع ،الامام النسفی(کتاب الصلاة الجزء ١،الصفحة ٤٢٥،حاشیة نشر العرف،تحقیق الشیخ ثناء الله،طبع مرکز البحوث الاسلامیة،مردان۔

(١٢) مجموعة رسائل ابن عابدین ،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف،الجزء ٢، الصفحة: ١١٤ ،طبع مکتبة عثمانیة کوئته۔

(۱۳) دیکھیں: سنن النسائی، کتاب العمری، ذکر اختلاف الناقلین، رقم الحدیث ۳۷۲۶، ۳۷۳۳، ۳۷۳۶، الصفحة ۶۱۰ الی ۶۱۱۔

ذکر اختلاف یحیی بن أبی کثیر ومحمد بن عمر وعلی أبی سلمة فیه، رقم الحدیث ۳۷۵۲۔ الصفحه ۶۱۳، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۱۴) فیض الباری علی صحیح البخاری، الشیخ محمد انور شاہ الکشمیری ﷫، کتاب الهبة، باب ما قیل فی العمری والرقبی، الجزء ۳، الصفحة ۶۸، طبع المکتبة الرشیدیة کوئٹه۔

(۱۵) شرح السیر الکبیر، السرخسی، باب الشروط فی الموادعة وغیرها، الجزء ۵، الصفحة ۶۳، طبع الدائرة النظامیة دکن الهند۔

المصنف ابن أبی شیبة، کتاب الحج، باب: فی البدن من قال لاتکون الا من الابل، رقم الحدیث ۱۳۸۷۷، الجزء ۸، الصفحة ۵۰۶، طبع المجلس العلمی۔

"عن سیلمان بن یعقوب عن ابیه قال: مات رجل من الحی وأوصی ان ینحر عنه، فسألت ابن عباس عن البقرة؟ فقال: تجزی، قال قلت: من أی قوم أنت قال قلت من بنی رباح، قال: وانی لبنی رباح البقر؟ انما البقر للأزد وعبد القیس" والحاصل ان اسم البدنة فی عرف بنی رباح لایتناول الا الابل، لأنهم لیسوا من أصحاب البقر"۔

(۱۶) دیکھیں: حاشیة ابن عابدین، کتاب الطلاق، باب الکنایات، الجزء ۴، الصفحة ۵۶۰، طبع دار المعرفة بیروت۔

(۱۷) مجموعة رسائل ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، الجزء ۲، الصفحة ۱۱۶، طبع مکتبة عثمانیة کوئٹه۔

(۱۹) سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی ابن السبیل یاکل من التمر ویشرب من اللبن اذا مر به، رقم الحدیث ۲۶۱۹، الصفحة ۴۱۷، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

وسنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی احتلاب المواشی بغیر اذن الارباب، رقم الحدیث ۱۲۹۶، الصفحة ۳۳۵، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

"وقال الترمذی "حدیث حسن غریب صحیح، والعمل علی هذا عند بعض أهل العلم"

(۲۰) سنن الترمذی، کتاب البیوع ،باب ماجاء فی الرخصة فی اکل التمرة للمار بها ،رقم الحدیث ۱۲۸۷ ،الصفحة ۳۳۴ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۲۱) سنن ابی داؤد ، کتاب الجهاد ،باب من قال انه یاکل مماسقط ،رقم الحدیث ۲۶۲۲ ،الصفحة ۴۱۷ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

(۲۲) صحیح البخاری، کتاب فی اللقطة ،باب لا تحتلب ماشیة احد بغیر اذن ،رقم الحدیث ۲۴۳۵ ،الصفحة ۴۳۹ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۲۳) المغنی ،ابن قدامة ،کتاب البیوع ،باب الربا والصرف ،فصل:الربا علی ضربین ،مسألة مالا یجوز التفاضل ،الجزء ۷ ،الصفحة ۴۹۵ ،طبع دار الکتاب العربی بیروت۔

(۲۴) حاشیة ابن عابدین، کتاب البیوع ،باب الربا ،مطلب:فی أن النص اقوی من العرف ،الجزء ۷ ،الصفحة ۴۲۸ ،طبع دار المعرفة بیروت

(۲۵) فتح القدیر ، ابن الهمام رحمه الله کتاب الیوع ،باب الربا ،الجزء ۷ ،الصفحة ۱۵، طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

(۲۶) مجموعة رسائل ابن عابدین ،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ،الجزء ۲ ،الصفحة ۱۱۸ ،طبع مکتبة عثمانیة کوئٹه

(۲۷) المحیط البرهانی، کتاب البیوع ،الفصل الرابع والعشرون فی الاستصناع ،الجزء ۱۰، الصفحة ۳۶۳ ،طبع ادارة القران المجلس العلمی

(۲۸) جامع المسانید ،الخوارزمی رحمه الله ،الباب التاسع فی البیوع ،الفصل الثانی فی العقود والمنهی عنها والتی لا بأس بها ،الجزء ۲، الصفحة ۲۲ ،طبع:المکتبة الاسلامیة سمندری (لائل پور)۔

(۲۹) المبسوط ،السرخسی رحمه الله، کتاب البیوع ،باب البیوع اذا کان فیها شرط ،الجزء ۱۳ ،الصفحة ۱۸ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

(۳۰) مجموعة رسائل ابن عابدین ،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ،الجزء ۲، الصفحة ۱۲۱ ،طبع مکتبة عثمانیة کوئٹه

(۳۱)سنن الدارقطنی، کتاب البیوع، رقم الحدیث ۳۰۲۹، الجزء ۷، الصفحة ۲۷۵۔

واخرجه ایضاً والسنن الکبری ،البیهقی (کتاب البیوع باب النهی عن عسب الفحل ،الجزء ۵، الصفحة ۳۳۹) وأعلوه بهشام أبي کلیب کمافی تلخیص الحبیر کتاب الاجارة ، رقم الحدیث ۱۳۱۲ ،الجزء ۳ ،الصفحة ۱ ،ولکن أخرجه الطحاوی فی شرح مشکل الآثار ،باب بیان مشکل ماروی عنه علیه السلام من نهیه عن قفیز الطحان، رقم الحدیث ۴۰۹ ،الجزء ۲ الصفحة ۱۸۶ ،عن طریق الامام أبي یوسف عن عطاء بن السائب وهوسند جید کمافی اعلاء السنن ،(کتاب الاجارة) باب قفیز الطحان، رقم الحدیث ۵۳۵۳ ،الجزء ۱۵ ،الصفحة ۴۳۵۷ ،طبع دار الفکر بیروت۔

(۳۲) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ،الکاسانی، کتاب الاجارة ،فصل فی انواع شرائط رکن الاجارة ،الجزء ۹ ،الصفحة ۳۳۳ الی ۳۴۴ ،طبع دار الفکر بیروت۔

. (۳۳) حاشیة ابن عابدین مع الدر المختار ،کتاب الاجارة ،باب الاجارة الفاسدة ،الجزء ۹ ،الصفحة ۹۷ ،طبع دار المعرفة بیروت،

(۳۴) دیکھیں : روضة الطالبین وعمدة المفتین ،النووی، کتاب القراض الباب الاول فی أرکان صحته ،فرع ،الجزء ۲ ،الصفحة ۱۸۷ ،طبع :المکتب الاسلامی بیروت۔

(۳۵)حاشیة ابن عابدین ،کتاب الاجارة ،باب الاجارة الفاسدة، مطلب : یخص القیاس والاثر بالعرف العام دون الخاص ،الجزء ۹ ،الصفحة ۹۹ ،طبع دار المعرفة بیروت

(۳۶) دیکھیں: الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳:۹ ومواهب الجلیل للحطاب ۵:۳۹۸ ،والمغنی ابن قدامة ،کتاب المضاربة ۱۱۹ : ۵ ،وشرح منتهی الارادت للبهوتی ۲: ۳۵۳ ونقل فی "بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة" ۲۱۹ : ۲ الی ۲۲۰؛

(۳۷) الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف ـ المرداوی، کتاب البیع ،الجزء ۷ ،الصفحة ۲۸۳ ،طبع :دار احیاء التراث العربی بیروت۔

قال المرداوی فی الانصاف : "لا یصح استصناع سلعة لأنه باع مالیس عنده علی غیر وجه السلم"،

(۳۸)المحیط البرهانی، کتاب البیوع،الفصل الرابع والعشرون فی الاستصناع،الجزء۱۰
،الصفحة۳۶۳،طبع ادارة القرآن المجلس العلمی

(۳۹) حاشیتا قلیوبی وعمیرة علیٰ المنهاج ،اول کتاب الشرکة ،الجزء ۸ ،الصفحة
۲۶۰،طبع:دار الفکر بیروت۔

(۴۰)بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ،کتاب الشرکة ،فصل :وأما بیان جواز هذه
الانواع،الجزء۶،الصفحة۸۸،طبع دار الفکر بیروت۔

(۴۱) مجموعة رسائل ابن عابدین،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف،الجزء۲
،الصفحة۱۲۶،طبع مکتبة عثمانیة کوئٹه۔

(۴۲)الهدیة شرح بدایة المبتدی المرغینانی رحمہ اللہ: کتاب الشهادات،الجزء۳،الصفحة
۱۰۹۶،طبع دار السلام مصر۔

وفتح القدیر ابن همام رحمہ اللہ، کتاب الشهادات،الجزء۷،الصفحة ۳۵۳، طبع دار الکتب
العلمیة بیروت۔

(۴۳)الهدایة شرح بدایة المبتدی المرغینانی رحمہ اللہ،اول کتاب الاکراہ،الجزء۳،الصفحة
۱۳۳۵،طبع دار السلام مصر۔

(۴۴) حاشیة ابن عابدین، کتاب الغصب،فصل فی مسائل متفرقة،مطلب :فی ضمان
الساعی،الجزء۹،الصفحة۳۵۵،طبع دار المعرفة بیروت

(۴۵)حاشیة ابن عابدین، کتاب الحجر،الجزء۹،الصفحة۲۵۵،طبع دار المعرفة بیروت۔

(۴۶) مجموعة رسائل ابن عابدین،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف،الجزء۲،
الصفحة۱۳۱،طبع مکتبة عثمانیة کوئٹه۔

(۴۷)شرح عقود رسم المفتی،ابن عابدین، تحت شعر ،رقم:۶۹،طبع مکتبة عثمانیة۔

(۴۸) غمزعیون البصائر فی شرح الأشباه والنظائر ،الحموی، الفن الأول ،القاعدة
الخامسة ،الثانیة :ما ابیح للضرورة یقدر بقدرها ،الجزء ۲ ،الصفحة ۹۱ ،طبع دار الکتب
العلمیة بیروت۔

(۴۹) أحكام القرآن ،الجصاص رحمه الله ، سورة البقرة ،باب مقدار ما ياكل المضطر، الجزء ۱، الصفحة ۱۵۸الى ۱۵۹ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۵۰) شرح مجلة الاحكام العدلية ،محمد خالد الاتاسى ،فى شرح المادة ۲۱ : الضرورات تبيح المحظورات ،الجزء ۱، الصفحة ۵۵الى ۵۶ ،طبع رشيدية كوئته۔

(۵۱) الاشباه والنظائر ،ابن نجيم ،الفن الأول ،القاعدة السادسة فى ضمن الخامسة ،الصفحة ۹۳ ،طبع قديمى كتب خانه كراتشى۔

ومجلة الاحكام العدلية ،المقالة الثانية فى بيان القواعد الفقية ،المادة ۳۲ ،طبع قديمى كتب خانه كراتشى۔

(۵۲) شرح القواعد الفقهية ،القاعدة الحادية والثلاثون ،الحاجة تنزل منزلة الضرورة مصطفى الزرقاء ،الصفحة ۱۵۵ ،طبع :دار الغرب الاسلامى بيروت لبنان۔

(۵۳) شرح عقود رسم المفتى ،ابن عابدين، تحت شعر رقم: ۶۹، طبع مكتبة عثمانية ۔

(۵۴) المقدمات الممهدات ،ابن رشد ،كتاب بيوع الآجال ،الجزء ۲ ،الصفحة ۳۹ ،طبع: دار الغرب الاسلامى بيروت لبنان۔

(۵۵) تفسير القرطبى، تحت آية البقرة ۱۰۴ ،الجزء ۲ ،الصفحة ۵۷ الى ۵۸۔

(۵۶) كتاب الآثار ،امام محمد ،باب من تزوج اليهودية أو النصرانية الخ ،رقم الحديث ۴۱۲ ،الصفحة: ۳۹۴ ،الى ۳۹۵ ،دار النوادر دمشق بيروت۔

والسنن الكبرىٰ ،البيهقى ،باب ما جاء فى تحريم حرائر أهل الشرك دون أهل الكتاب ،الجزء ۷، الصفحة ۱۷۲۔

ومصنف عبد الرزاق ،نكاح نساء اهل الكتاب ،رقم الحديث ۱۰۰۵۷ الجزء ۶، الصفحة ۷۸ ،طبع المكتب الاسلامى بيروت۔

" وفيه ان عمر رضى الله تعالىٰ عنه قال له : طلقها فانها جمرة وأن حذيفة رضى الله عنه لم يطلقها لقوله ،لكن طلقها فيما بعد،

(۵۷) فتح القدير ،ابن الهمام ، كتاب النكاح ،فصل: فى بيان المحرمات ،الجزء ۳ ،الصفحة

۲۱۸، الی ۲۱۹، طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

(۵۸) حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، باب فی النکاح ومایتعلق به موانع النکاح، الجزء ۸، الصفحة ۸۲، طبع: دار الفکر مصر۔

(۵۹) المجموع شرح المهذب، النووی، کتاب النکاح، باب مایحرم من النکاح وما لا یحرم، فصل: ویحرم علی المسلم أن یتزوج ممن لا کتاب له من الکفار، الجزء ۱۶، الصفحة ۲۳۲، طبع: دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۰) المغنی، ابن قدامة، کتاب النکاح، باب ما یحرم نکاحه والجمع بینه وغیر ذلک، مسالة، قال: (وحرائر نساء اهل الکتاب ودبائحهم خلال للمسلمین، الجزء ۱۵، الصفحة ۱۳۶ طبع دار الکتاب العربی بیروت۔

(۶۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب بلا ترجمة، رقم الحدیث ۹۰۰، الصفحة ۱۶۹، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۲) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب انتظار الناس قیام الامام العالم، رقم الحدیث ۸۶۹، الصفحة ۱۶۴، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۳) سنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی خروج النساء الی المسجد، رقم الحدیث ۵۶۵، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۴) سنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی خروج النساء الی المسجد، رقم الحدیث ۵۶۷، الصفحة ۱۰۳ الی ۱۰۴، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۵) سنن ابی داود، کتاب الصلاة باب التشدید فی ذلک، رقم الحدیث ۵۷۰، طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۶۶) حاشیة ابن عابدین مع الدر المختار، الحصکفی، کتاب النکاح، باب الولی، الجزء ۴ الصفحة ۱۵۲، طبع دار المعرفة بیروت۔

(۶۷) دیکھیں: حاشیة ابن عابدین، کتاب النکاح، باب نکاح الکافر مطلب: الصبی والمجنون لیسا باهل لایقاع الطلاق بل للوقوع، الجزء ۴، الصفحة ۳۶۴، طبع

دار المعرفة بیروت۔

وبه أفتى علماء الهند، كما في جواهر الفقه (مختلف المذاہب زوجین کے احکام، الجزء ۲، الصفحة ۱۴۷ الى ۱۴۸، مكتبة دار العلوم كراچی۔

(۶۸) الموطأ، مالك، كتاب البيوع، باب جامع الدين والحول، قال مالك في الذي يشترى السلعة من الرجل على ان يوفيه تلك السلعة الى اجل مسمى، الجزء ۳، الصفحة ۲۱۰۔ طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۶۹) الام، الشافعي، كتاب البيوع، باب بيع الآجال، الجزء ۳، الصفحة ۷۸، طبع دار المعرفة بيروت۔

(۷۰) حاشية ابن عابدين، كتاب الكفالة، مطلب: بيع العينة، الجزء ۷، الصفحة ۶۵۵، طبع دار المعرفة بيروت۔

(۷۱) فتاوى قاضى خان، قاضى خان اوزجندى رحمہ اللہ، كتاب البيع فصل فيما يكون فرارًا عن الربا، الجزء ۲، الصفحة ۱۶۸، طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۷۲) فتح القدير، ابن الهمام، كتاب الكفالة، الجزء ۷، الصفحة ۱۹۹، طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۷۳) الموافقات، الشاطبی، كتاب المقاصد، القسم الثانی: مقاصد المكلف، الجزء ۳، الصفحة ۱۳۱ الى ۱۳۲، طبع المكتبة التجارية مصر۔

(۷۴) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب ذب الرجل عن ابنته فی الغيرة والانصاف، رقم الحديث ۵۲۳۰، الصفحة ۹۸۳، طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۷۵) صحيح البخاری، كتاب فرض الخمس، باب ما ذكر من درع النبی صلى الله عليه وسلم وعصاه وسيفه وقدحه وخاتمه ... رقم الحديث ۳۱۱۰، الصفحة ۵۷۱، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

☆......☆......☆

7

فتویٰ دینے کے احکام اور اس کا طریقہ کار

احکام الافتاء ومنهجه

مباحث

- فتویٰ دینے کے احکام اور اس کا طریقہ کار۔
- فتویٰ دینا کب واجب ہے؟۔
- فتویٰ دینا کب حرام ہے؟۔
- فتویٰ سے [illegible]۔
- فتویٰ سے رجوع کرنا۔
- فتویٰ سے رجوع کرنے کے بعد اس کو ختم کرنے کے احکام۔
- فتوے سے رجوع کرنے کی مستفتی کو اطلاع دینا۔
- مفتی سے غلطی ہونے پر ضمان کا حکم۔
- فتویٰ دینے پر اجرت لینا۔
- فتویٰ دینے کا طریقہ کار۔
- صورت مسئول کا تصور۔
- [illegible]۔
- افتاء کے آداب۔
- فتویٰ لکھنے کے آداب۔
- مفتی کے لئے ذاتی آداب۔
- استفتاء کے احکام۔

فتویٰ دینے کے احکام اور اس کا طریقہ کار

احکام الافتاء و منهجه

افتاء کے بعض قواعد کو بطور تمہید بیان کرنے کے بعد اب ہم فتویٰ کے احکام کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی مفتی پر فتویٰ دینا کب واجب ہوتا ہے۔ اور کب فتویٰ دینا اس کے لیے حرام ہوتا ہے۔ اسی طرح کب مفتی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ فتویٰ دینے سے رک جائے۔ اس کے بعد پھر ہم ان شاء اللہ وہ طریقہ کار ذکر کریں گے جس کو اپنانا مفتی پر اس وقت لازم ہوتا ہے جب اس سے کسی شرعی حکم کے بارے میں پوچھا جائے۔

فتویٰ دینا کب واجب ہے؟

متی یجب الافتاء؟

فتویٰ دینے میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ جب کئی اہل مفتیان موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک اہلیت رکھنے والے مفتی پر فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک بھی فتویٰ دے دے گا تو باقی حضرات سے یہ فرض ختم ہو جائے گا۔

فتویٰ دینا ان حالات میں فرض عین ہو جاتا ہے

(۱)......جب کسی مفتی سے ایسی جگہ سوال پوچھا جائے جہاں کوئی اور اہل مفتی موجود نہ ہو اور یہ مفتی اس حکم کو جانتا

بھی ہو (تو اس پر فتویٰ دینا فرض عین ہو جاتا ہے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرہ ۱۵۹)

''بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کیلئے بیان کر چکے ہیں تو ایسے لوگوں پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں''۔

(۲)...... جب مفتی سے سوال کیا جائے اور سوال کرنے والا اتنی جلدی میں ہو کہ اگر اس کو فتویٰ نہ دیا گیا تو ڈر یہ ہے کہ وہ کسی ناجائز کام میں پڑ جائے گا، جیسے کسی مفتی سے نماز کے احکام میں سے کوئی حکم پوچھا گیا اور وقت اتنا تنگ ہے کہ پوچھنے والے کے لیے کسی دوسرے سے سوال کرنا ممکن ہی نہیں اور وہ مفتی خود اس حکم کو جانتا ہے (تو بھی فتویٰ دینا فرض عین ہو جائے گا) اور اس کی دلیل بھی وہ ہی آیت کریمہ ہے جو ابھی ہم نے تحریر کی۔

(۳)...... جب کسی اہل شخص کو حکمران کی طرف سے مفتی مقرر کر دیا گیا ہو تو اس پر بھی فتویٰ دینا فرض عین ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔

(النساء:۵۹)

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، اُن کی بھی)۔

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''فتویٰ پوچھنے والوں کو فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے۔ پس اگر وہاں ایک شخص کے علاوہ کوئی بھی فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اسی پر فتویٰ دینا فرض عین ہو جاتا ہے اور اگر مفتیان کرام کی ایک جماعت ہو، جو سب فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں پھر ان میں سے کسی ایک سے فتویٰ طلب کیا جائے اور وہ فتویٰ نہ دے تو کیا وہ گناہگار ہوگا؟ اس بارے میں علماء نے مفتی کے لیے دونوں صورتیں ذکر کی ہیں، (بعض حضرات فرماتے ہیں کہ گناہگار ہوگا اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ

گناہگار نہیں ہوگا) علم سکھانے والے کے بارے میں بھی یہی دونوں قول لاگو ہوں گے' بالکل اسی طرح جیسے کئی گواہوں میں سے اگر کوئی ایک گواہ گواہی دینے سے رک جائے تو اس کے بارے میں بھی دو قول ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وہ گناہ گار نہیں ہوگا''۔ (ح، ۱)

فتویٰ دینا کب حرام ہے؟

متی یحرم الافتاء؟

گزشتہ صفحات میں مفتی کی شرائط گزر چکی ہیں اور فتویٰ دینے کے لیے آگے بڑھنا صرف اسی شخص کے لیے جائز ہے جو ان شرائط کا جامع ہو اور اس کام کا اہل ہو۔ پھر اہل مفتی کے لیے بھی ان حالات میں فتویٰ دینا جائز نہیں ہے:

(۱)...... جب کوئی مفتی عام طور پر تو فتویٰ دینے کا اہل ہو لیکن خاص طور پر اس سے جو مسئلہ پوچھا گیا ہے، اس کا حکم اسے معلوم نہ ہو اور وہ اس حکم کے استنباط کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو یا مختلف دلائل کی وجہ سے وہ شبہ میں پڑ گیا ہو اور اس کے لیے کسی ایک دلیل کو ترجیح دینا ممکن نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بنا پر ہے:

"القضاة ثلاثه: واحد في الجنة، واثنان في النار، فما الذي في الجنة، فرجل عرف الحق وقضى به، ورجل عرف الحق، فجار في الحكم، فهو في النار، ورجل قضى للناس على جهل، فهو في النار"۔ (ح، ۲)

(قاضی تین طرح کے ہیں ان میں سے ایک جنت میں اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جنتی تو وہ ہے جس نے حق بات کو پہچانا بھی اور اس کے مطابق فیصلہ بھی کیا۔ اور وہ شخص جس نے حق کو پہچان تو لیا لیکن حکم میں ظلم کیا تو وہ جہنمی ہے اور وہ شخص جو لوگوں کے درمیان جہالت سے فیصلے کرے وہ بھی جہنم میں ہوگا)۔

اس بارے میں قضاء اور افتاء میں کوئی فرق نہیں اس لیے مفتی پر لازم ہے کہ وہ ایسی صورت میں جواب دینے سے رک جائے یہاں تک کہ حکم اس کے سامنے بالکل واضح ہو جائے یا وہ فتویٰ پوچھنے والے کی اپنے علاوہ دیگر مفتیان کرام کی طرف رہنمائی کر دے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ جب (قرآن مجید میں) ان کی برأت نازل ہوگئی تو حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ نے ان کے سر کو بوسہ دیا۔ تب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے میری صفائی کیوں پیش نہیں کی تھی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اتی سماء تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت مالا اعلم ؟۔ (ج،م)

(کون سا آسمان مجھے سایہ دیتا اور کون سی زمین مجھے پناہ دیتی اگر میں وہ بات کہتا جو مجھے معلوم ہی نہیں۔)

حضرت عروہ تمیمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"وابردها علی الکبد! ثلاث مرات. قالو: یا امیر المومنین، وما ذاك؟ قال: ان یسال الرجل عما لا یعلم. فیقول: الله اعلم" (ج،م)

''اس (خوبصورت جملے کی) جگر پر ٹھنڈک بھی کیا خوب ہے! یہ جملہ آپ رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ کہا۔

لوگوں نے پوچھا اے امیر المومنین! اس سے آپ کی مراد کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری مراد یہ ہے کہ کسی شخص سے ایسا مسئلہ پوچھا جائے جس کا اسے علم نہیں، تو وہ کہہ دے کہ اللہ ہی کو خوب علم ہے''۔

خالد بن اسلم جو زید بن اسلم کے بھائی ہیں، وہ کہتے ہیں:

''ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک سفر پر پیدل جا رہے تھے، ہمیں ایک دیہاتی شخص ملا، اس نے پوچھا کہ کیا آپ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ہاں! اس نے کہا: میں نے آپ ہی کے بارے میں پوچھا تھا، تو مجھے آپ کی طرف رہنمائی کر دی گئی۔ مجھے یہ تو بتائیں کہ کیا پھوپھی وارث ہوتی ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا آپ کو بھی معلوم نہیں اور ہمیں بھی معلوم نہیں؟ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں جب تم مدینہ منورہ میں علماء کے پاس جاؤ تو ان سے یہ مسئلہ پوچھ لینا۔ جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے (ساتھیوں کو سمجھانے کے لیے) اپنے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ابوعبدالرحمن نے کیا ہی اچھی بات کہی۔ اس سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تھا جو اسے معلوم نہیں تھا تو اس نے کہہ دیا مجھے معلوم نہیں''۔ پھر راوی نے بقیہ حدیث ذکر کی۔ (ج،د)

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے واسطے سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں نے ابن عجلان رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

"اذا غفل العالم "لا ادری" اصیبت مقاتله" (ح ۲۰)

(جب کوئی عالم "لا ادری" سے غافل ہو جائے تو وہ اپنی ہلاکت کو پہنچ گیا)۔

(مقاتل دراصل عربی میں ان انسانی اعضاء کو کہتے ہیں، جن پر کاری وار لگنے کے بعد انسان کا زندہ بچنا مشکل ہوتا)

اس قول کی سند اہم ترین اسناد میں سے ہے کیونکہ اس میں تین آئمہ یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ ایک دوسرے سے روایت کر رہے ہیں۔

اسی طرح ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ عقبہ بن مسلم رحمہ اللہ کی یہ بات نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ چونتیس (٣٤) مہینے رہا۔ پس اکثر ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ کہہ دیتے مجھے معلوم نہیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے کیا تم جانتے ہو یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری پشتوں کو اپنے لیے جہنم تک جانے کا پل بنالیں"۔ (ح)

اثرم رحمہ اللہ (ت ۲٦۱ھ) جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، وہ کہتے ہیں:

"میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے معلوم نہیں"۔ (ح ۱۰)

ہیثم بن جمیل رحمہ اللہ (ت ۲۱۳ھ) فرماتے ہیں، میں امام مالک رحمہ اللہ کے پاس موجود تھا کہ ان سے اڑتالیس مسئلوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے بتیس کے جواب میں فرمایا: "لا ادری"۔ (مجھے معلوم نہیں) اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان سے پچاس مسئلے پوچھے جاتے تو وہ کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے: جو شخص کسی مسئلے کا جواب دے تو اسے چاہیے کہ جواب دینے سے پہلے اپنے آپ کو جنت اور جہنم پر پیش کرے۔

(یعنی سوچ لے کہ اس جواب کے نتیجے میں اس کا ٹھکانہ کیا ہوگا)۔

امام مالک رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "لا ادری"۔ (مجھے معلوم نہیں) پوچھنے والے نے کہا کہ یہ تو بالکل معمولی اور آسان مسئلہ ہے۔ اس پر امام مالک رحمہ اللہ غضبناک ہوئے اور فرمایا:

لیس فی العلم شئی خفیف (ح ۹)

"علم میں کوئی چیز معمولی نہیں ہوتی"۔

لٰہذا ایسے مسائل میں جو مفتی کو معلوم نہ ہو اسے "لا ادری" کہنے سے جھجکنا جائز نہیں۔

(۲)...... جب فتویٰ دینا کسی خواہش یا فتویٰ لینے والے کے ساتھ تعلق پر مبنی ہو (تو بھی فتویٰ دینا حرام ہے) اس طرح کہ مفتی کو غالب گمان یہی ہو کہ وہ فتویٰ لینے والے کے ساتھ غفلت اور ناحق طور پر آسانی کا معاملہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ۔ (ص:۲۶)

(اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔ جو لوگ خدا کے راستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہوگا' اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے)۔

"الاقناع" میں جو امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب کی کتاب ہے' اس میں لکھا ہے:

''خواہشات پر حکم دینا اور فتویٰ دینا بالاجماع حرام ہے اور مفتی کو اس بات سے بچنا چاہیے کہ وہ اپنے فتوے میں فتویٰ لینے والے یا اس کے مخالف کی طرف جھکے''۔ (ح۱۰۱)

(۳)...... جب مفتی کسی ایسی حالت میں ہو جو اُسے فتوے میں صحیح غور وفکر کی ادائیگی کے کام سے روک دے (تو بھی مفتی کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں)۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے:

لا یقضین حکم بین اثنین وھو غضبان۔ (ح۱۱)

''کسی فیصلہ کرنے والے کو ہرگز دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہیں کرنا چاہیے جب تک وہ غصے کی حالت میں ہو''۔

اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ ان باتوں میں سے جن کی رعایت رکھنا مفتی کے لیے مناسب ہے، یہ بھی ہے کہ وہ ایسی حالت میں فتویٰ نہ دے کہ اس کا دل کسی غصے' خوف یا خواہش میں ایسا مبتلا ہو کہ وہ اُسے مزاج میں اعتدال سے نکال دے اور اسی طرح سخت غم اور انتہائی خوشی وغیرہ کا بھی حکم ہے۔ لٰہذا اگر مفتی کا ان کیفیات سے متاثر ہونا اس کے صحیح غور و

فکر کرنے پر غالب آرہا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ فتویٰ دینے سے رک جائے' یہاں تک کہ اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے اسی طرح اگر مفتی پر اونگھ طاری ہو یا اسے بھوک لگی ہو یا شدید بیماری ہو یا تکلیف دہ گرمی ہو یا تکلیف دہ سردی ہو یا قضاء حاجت کی ضرورت ہو (تو بھی مفتی کے لیے فتویٰ دینا درست نہیں)۔

فتویٰ سے رک جانا

الامتناع عن الفتوی

مفتی پر یہ بات لازم نہیں کہ جو سوال اس کے سامنے آئے وہ ہر حال میں اس کا جواب دے۔ مفتی کو صرف تب ہی جواب دینا چاہیے جب وہ جواب میں کوئی مصلحت دیکھے اور فتنے سے امن میں ہو' لہٰذا مفتی کو چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل حالتوں میں فتویٰ دینے سے رک جائے:

(۱)...... جب مفتی کو یہ ڈر ہو کہ فتویٰ پوچھنے والا جواب حاصل کرنے کے بعد کوئی فتنہ کھڑا کرے گا یا فتویٰ کسی ایسے مسئلے میں ہو جس کے نتیجے میں کوئی ظاہری فساد پیش آتا ہو یا یہ کہ فتویٰ پوچھنے والا فتوے کو غلط طرف پھیر دے گا (یعنی فتوے کا غلط مطلب بیان کرے گا) تو مفتی کو فتویٰ نہیں دینا چاہیے کیونکہ فساد کو دور کرنا مصلحت کو حاصل کرنے پر مقدم ہے۔

اجری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"واذ اسئل عن مسئلة فعلم انها من مسائل الشغب، ومما يورث بين المسلمين الفتنة استعفى منها، وردالسائل الى ماهواولى به على ارفق مايكون"۔ (ح ۱۲۰)

(جب کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور اسے یہ معلوم ہو کہ یہ ان مسائل میں سے ہے جن سے شور شرابہ برپا ہوتا ہے یا ان مسائل میں سے ہے جو مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا کر دیتے ہیں' تو اسے چاہیے کہ اس سے بچ جائے اور سوال کرنے والے کو جتنی نرمی سے ہو سکے اس بات کی طرف متوجہ کر دے جو اس کے لیے بہتر ہو)۔

(۲)...... جب سوال ایسی بات کے بارے میں ہو جس میں غور و خوض نہیں کرنا چاہیے (تو بھی فتویٰ دینے سے رک

جانا چاہیے)۔ کیونکہ یہ بھی لایعنی کاموں میں سے ہے اور اس کا جواب جاننے سے سائل کو کوئی عملی فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

"میں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی لوگ نہیں دیکھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف تیرہ (۱۳) مسئلے پوچھے جو سب کے سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اور وہ صرف انہی باتوں کے بارے میں پوچھتے تھے جو ان کو نفع دے"۔ (ح ۱۴۳)

ایک حدیث مرفوع میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں:

"بے جا تشدد کرنے والے ہلاک ہوگئے"۔ (ح ۱۴۴)

بعض علماء نے اس کی تفسیر ان لوگوں سے کی ہے جو ایسے کاموں میں بہت غور وفکر کرتے ہوں جن کا ان کو کوئی فائدہ نہیں اور وہ ایسے مشکل مسائل میں ضد پر مبنی سوالات کرتے ہوں جو کبھی کبھار ہی پیش آتے ہیں۔ (ح ۱۵۱)

اسلاف امت اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ عام لوگ بکثرت ایسے معاملات میں سوال کریں کہ عملی زندگی میں اُن کو ان کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لہٰذا مفتی کے لیے مناسب یہی ہے کہ ایسے سوالوں پر لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے اور ایسے مسائل کی طرف لوگوں کی رہنمائی کردے جو اُن کو فائدہ دیں۔

احمد بن حبان القطیعی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"میں ابوعبداللہ یعنی امام احمد رحمہ اللہ کے پاس گیا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں چونے کے پانی سے وضو کرسکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا میں اس کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے عرض کیا: کیا میں لوبیا کے پانی سے وضو کرسکتا ہوں؟

انہوں نے فرمایا میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا۔ پھر میں کھڑا ہوا تو امام احمد رحمہ اللہ نے میرے کپڑوں کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ جب تم مسجد میں داخل ہوتے ہو تو کیا کہتے ہو؟ میں خاموش رہا۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ جب تم مسجد سے نکلتے ہو تو تم کیا پڑھتے ہو؟ میں پھر خاموش رہا انہوں نے فرمایا: جاؤ اور یہ باتیں سیکھو"۔

امام احمد رحمہ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ چونے اور لوبیا کے پانی سے وضو کرنا تو ایسا نادر مسئلہ ہے جس کی سوال کرنے والے کو کوئی ضرورت نہیں تو انہوں نے سائل کے لیے اس بات کو عجیب سمجھا کہ وہ ایسے مسئلے میں غور کر رہا ہے، حالانکہ وہ ان باتوں سے جاہل ہے جس کی روزانہ پانچ مرتبہ ضرورت پیش آتی ہے اور وہ مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے نکلنے کی

مسنون دعائیں ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ یاجوج ماجوج کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ مسلمان ہیں؟ آپ نے جواب میں سائل کو فرمایا:

''کیا آپ نے سارا ضروری علم سمجھ لیا ہے کہ آپ کو اس بات کے پوچھنے کی نوبت آئی''؟۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ہی لعان کے ایک مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے پوچھنے والے کو فرمایا:

سل رحمك الله عما ابتليت به (الاداب الشرعيه)

''اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے صرف وہ بات پوچھیں جو آپ کو پیش آئی ہو''۔ ح ۱۶۹

(جب شوہر بیوی پر تہمت زنا لگا دے تو دونوں کے درمیان حلفیہ بیانات ہوتے ہیں۔ جنہیں لعان کہا جاتا ہے اور سورۃ النور میں اس کا تفصیلی ذکر ہے)

ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس بات میں جھگڑنا مکروہ ہے کہ لقمان، ذوالقرنین، وذوالکفل علیہم السلام انبیاء تھے یا نہیں؟ انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا سوال نہ کرے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو۔ جیسے کوئی یہ پوچھتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کیسے اترے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کس شکل میں دیکھا اور جس وقت ان کو انسانی شکل میں دیکھا تو کیا وہ فرشتے تھے یا نہیں؟ جنت وجہنم کہاں ہیں؟ اور قیامت کب آئے گی؟ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کب آسمان سے اتریں گے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام افضل ہیں یا اسحٰق علیہ السلام اور ان دونوں میں سے ذبح کا واقعہ کس کے ساتھ پیش آیا تھا؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہیں یا نہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کس دین پر تھے؟ ابو طالب کا دین کیا تھا؟ اور مہدی علیہ السلام کون تھے؟ اور اس جیسے دیگر سوالات جن کو نہ جاننا ضروری ہے اور نہ ہی ان پر عمل کرنے کا کسی کو مکلف بنایا گیا ہے''۔ ح ۱۷۰

(۳)...... جب کوئی مسئلہ ایسا ہو کہ سوال کرنے والے کی عقل اور سمجھ اس تک نہ پہنچ سکتی ہو اور اس کے ساتھ کوئی عملی ضرورت بھی وابستہ نہ ہو (تو مفتی کو فتویٰ دینے سے گریز کرنا چاہیے) جیسے متشابہات یا علم کلام کی دقیق باتیں یا وہ مسائل جن میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"حدّثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب الله ورسوله؟"۔ ح،۱۸

(لوگوں سے وہ گفتگو کرو جسے وہ سمجھ سکتے ہوں۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے؟)۔

امام قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مفتی کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب اس کے پاس کوئی فتویٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے متعلق یا اللہ کی ربوبیت کے متعلق آئے جس میں ایسے امور پوچھے گئے ہوں جو اس سوال کرنے والے کے لیے درست نہیں یا تو اس وجہ سے کہ بالکل ناواقف عوام میں سے ہے یا اس وجہ سے کہ سوال انتہائی مشکل مسائل یا دینی اصول کی باریکیوں اور متشابہ آیات کے بارے میں ہے یا ایسے امور کے بارے میں ہے کہ جن میں صرف بڑے بڑے علماء ہی غور کر سکتے ہیں تو مفتی بالکل اس کا جواب نہ دے اور ایسے سوالات پر سائل کے سامنے اپنے انکار کا واضح اظہار کر دے اور اُسکو کہہ دے کہ آپ نماز اور ان معاملات کے احکام کے بارے میں سوالات میں مشغول رہیں، جو آپ کو فائدہ دیں"۔ ح،۱۹

امام شافعی رحمہ اللہ کے اُن صاحبزادے نے جو حلب کے قاضی تھے، امام احمد رحمہ اللہ سے مشرکین اور مسلمانوں کی نابالغ اولاد کے انجام کے بارے میں سوال کیا تو امام احمد رحمہ اللہ نے ان کو ڈانٹا اور فرمایا:

"یہ تو گمراہ لوگوں کے مسائل ہیں آپ کو ان مسائل سے کیا غرض"؟۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ پوچھنے والے پر خفا ہوئے اور فرمایا:

اے بچے! تم اس بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟

(یعنی انہوں نے اس سوال ہی کو بچگانہ قرار دیا)۔ ح،۲۰

میرے (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کے) والد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ) سے جب بھی ایسے امور کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک لکھ دیتے تھے۔

"من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه" ح،۲۱

"انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام بے کار کاموں کو چھوڑ دے"۔

پھر مجھے ایسی ہی بات امام مالک رحمہ اللہ کے ایک بڑے شاگرد زیاد بن عبدالرحمن القرطبی رحمہ اللہ جن کا لقب شبطون ہے،

ان کے بارے میں ملی کہ انہوں نے ایک بادشاہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''حبیب کہتے ہیں کہ ہم زیاد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ان کے پاس ایک بادشاہ کا خط آیا تو انہوں نے اپنے قلم کو سیاہی میں ڈبویا اور اس کا جواب لکھ کر مہر لگا دی اور خط قاصد کے حوالے کر دیا۔ پھر زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس خط والے نے کیا پوچھا تھا؟ اس نے پوچھا تھا کہ قیامت کے دن جس ترازو سے اعمال کا وزن کیا جائے گا، اس کے دونوں پلڑے سونے کے ہوں گے یا چاندی کے؟ تو میں نے اس کے جواب میں لکھ دیا کہ ہمیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من حسن اسلام المرأ ترکه مالا یعنیه"۔

''انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بیکار کام چھوڑ دے''

اور بہت جلد تم وہاں جاؤ گے تو (روز محشر) یہ جان لو گے۔ (ح۲۲)

(۴)...... بعض فقہاء سے یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے مفتی کو منع کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے مسائل میں فتویٰ نہ دے جو ان کو پیش نہ آئے ہوں۔

اس کتاب کے شروع میں ہم نے ان اسلاف کے اقوال ذکر کیے تھے کہ جو ایسے مسائل میں گفتگو کو ناپسند کرتے ہیں جو ابھی تک پیش نہ آئے ہوں اور اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر بھی ہم نے بیان کر دیئے تھے۔ وہاں ہم نے یہ بات بھی بتائی تھی کہ ایسے سوالوں کا جواب صرف طلبۂ علم کو دینا مناسب ہے جو فقہ میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ عام لوگوں کی ایسے سوالات پر حوصلہ افزائی کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۵)...... جب کسی مسئلے کا حکم کسی خاص شہر یا قوم کے عرف پر مبنی ہو اور مفتی اس شہر اور قوم کے عرف سے ناواقف ہو (تو بھی فتویٰ دینے سے رک جانا چاہیے)۔

ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مفتی کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ایمان یعنی قسموں، اقراروں اور ان تمام مسائل میں جن کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے، وہ فتویٰ دے دے سوائے اس کے کہ وہ اسی شخص کے شہر کا رہنے والا ہو، جس نے وہ الفاظ کہے ہیں یا کم از کم اس شہر والوں کے ان الفاظ سے جو مراد ہوتی ہے اور ان کا جو

عرف ہے اس سے واقف ہونے میں وہ اس شہر والوں کے برابر ہو۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ مفتی ان لوگوں کو بکثرت غلط فتوے بتائے گا، جیسا کہ تجربہ اس بات کا گواہ ہے''۔ (ح:۲۴۳)

(٦)......جن چیزوں کے بارے میں سوال کرنا ناپسندیدہ ہے' امام شاطبی رحمہ اللہ نے ان میں سے ایک صورت یہ بھی ذکر کی ہے کہ مشکل اور شر پر مبنی سوالات کیے جائیں۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں "الاغلوطات" (ح:۲۴۴) (بلاضرورت صرف دوسرے کے علم کو آزمانے کے لیے سوال کرنے) سے ممانعت آئی ہے۔

(٧)......مفتی سے کسی ایسے حکم کی علت کے بارے میں پوچھا جائے جو ایسی عبادات میں سے ہو جن کی اصل وجہ ہماری عقلیں نہیں سمجھ سکتیں مثلاً یہ سوال کیا جائے کہ مغرب کی تین رکعات کیوں ہیں؟ (تو پھر مفتی کو جواب نہیں دینا چاہیے)

(٨)......امام شاطبی رحمہ اللہ نے ایسے مقامات میں سے اس بات کو بھی شمار کیا ہے کہ سلف صالحین کے درمیان جو اختلافات ہوئے تھے' ان کے بارے میں سوال کیا جائے (جیسے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے جنگ صفین میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

''یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ نے میرے ہاتھوں کو بچائے رکھا لہٰذا میں بھی ان سے اپنی زبان رنگنا نہیں چاہتا''۔ (ح:۲۴۵)

(٩)......علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے انہی مواقع میں سے اس سوال کو بھی ذکر کیا ہے جو ضد پر مبنی ہو یا جس کا مقصد صرف مخاطب کو لاجواب کرنا ہو یا جھگڑے میں دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرنا ہو۔ قرآن مجید میں اس بات کی مذمت آئی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (البقرہ: ۲۰۴)

(اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالانکہ وہ (تمہارے) دشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (الزخرف:۵۸)

(بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو)۔

ایک حدیث شریف میں یہ الفاظ آئیں ہیں:

ابغض الرجال الی الله الالد الخصم۔ ح۲٦

(اللہ کے ہاں لوگوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ وہ شخص ہے، جو سخت جھگڑالو ہو)۔

پھر امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ چند وہ مقامات ہیں جن میں سوال کرنا' ناپسندیدہ ہے اور انہی پر بقیہ صورتوں کو بھی قیاس کر لیا جائے۔ پھر ان سب میں ممانعت برابر درجے کی نہیں۔ بلکہ بعض کی کراہت شدید ہے اور بعض کی ہلکی؛ جبکہ کچھ سوال ایسے ہیں جو بالکل حرام ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن میں اجتہاد و اختلاف ہو سکتا ہے۔'' ح۲۷

فتویٰ سے رجوع کرنا

الرجوع عن الفتوی

مفتی پر واجب ہے کہ اگر اس کے فتوے میں کوئی غلطی ظاہر ہو جائے تو وہ اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کر لے اور اس سلسلے میں ذرا نہ شرمائے۔

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے جو باتیں کہیں تھیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

لا يمنعنك قضاء قضيته بالامس راجعت فيه نفسك وهديت لرشدك ان تراجع الحق، فان الحق قديم، و ان الحق لا يبطله شئى، و مراجعة الحق خير من التمادي في الباطل۔ ح۲۸ (السنن الکبریٰ...)

(آپ اگر گزشتہ کل کوئی فیصلہ کر چکے ہیں اور دوبارہ آپ نے جب اس میں غور کیا اور آپ کو

ہدایت کی راہ دکھادی گئی' تو وہ پہلا فیصلہ آپکو حق کی طرف واپس پلٹ آنے سے ہرگز نہ روکے کیونکہ درحقیقت حق قدیم ہے اور حق کو کوئی چیز ختم نہیں کرسکتی۔حق کی طرف واپس پلٹ آنا یہ اس سے بہتر ہے کہ انسان باطل میں ہی آگے بڑھتا چلا جائے)۔

فتویٰ سے رجوع کرنے کے بعد اس کو ختم کرنے کے احکام

احکام نقض الفتوی بعد الرجوع عنها

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کسی شخص کو کوئی فتویٰ دیا گیا اور پھر اس سے رجوع کرلیا گیا، اس طرح کہ ابھی تک فتویٰ پوچھنے والے نے پہلے فتوے پر عمل ہی نہیں کیا تھا' تو اب اس کے لیے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

اور اگر وہ مفتی کے رجوع سے پہلے ہی عمل کر چکا تھا تو اگر وہ فتویٰ کسی دلیل قطعی کے خلاف ہے، تو فتوی لینے والے پر لازم ہے کہ اس عمل کو اب ختم کردے۔جیسے اگر کسی شخص نے مفتی کے فتویٰ پر نکاح کو جائز سمجھ کر کرلیا اور پھر فتوے ہی کی وجہ سے نکاح کو برقرار رکھا۔لیکن اگر مفتی نے اپنے فتوے سے رجوع کرلیا تو اب اس پر اپنی بیوی سے جدا ہونا لازم ہوجائے گا''۔ (ح:٢٩)

اس کے دلائل میں سے ایک وہ روایت ہے جسے امام بیہقی وغیرہ رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص جن کا تعلق قبیلہ بنو شمخ کی شاخ فزارہ سے تھا' انہوں نے ایک خاتون سے شادی کرلی۔پھر انہوں نے اُس خاتون کی والدہ کو دیکھا تو وہ انہیں بھا گئی۔انہوں نے اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا' تو انہوں نے فرمایا: کہ تم اپنی بیوی کو جدا کردو اور اُس کی والدہ سے شادی کرلو۔اُس نے ایسا ہی کیا اور اُس کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی۔

بعد ازاں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے اور انہوں نے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا تو انہیں یہ بتایا گیا کہ ایسا کرنا تو اُس شخص کے لیے حلال نہیں ہے۔جب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ واپس کوفہ تشریف لے گئے تو اس شخص کو کہا:

"انها عليك حرام، انها لا تنبغي لك، ففارقها"

(یہ خاتون تم پر حرام ہے اور اس کا تمہارے ساتھ رہنا بالکل نامناسب ہے لہٰذا تم اس کو جدا

کردو)۔ ح۳۰

خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

شاید حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے فتوے کی بنیاد اس بات پر رکھی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم" (النساء، ۲۳)

(سو اگر تم نے اُن کے ساتھ ہمبستری نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں)

میں جو استثناء ہے وہ بیویوں کی ماؤں (ساس رخوش دامن) اور الربائب (بیوی کی وہ اولاد جو کسی پہلے شوہر سے ہو اور اب اس کی پرورش میں ہو) دونوں سے ہی متعلق ہے۔ ح۳۱

(حالانکہ مسئلے کی رو سے اس کا تعلق صرف الربائب سے ہے اور بیوی کی ماں بہر صورت حرام ہے۔)

پھر امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اگر وہ فتویٰ جس سے رجوع کیا گیا ہے دلیل قطعی کے خلاف نہیں تھا بلکہ مجتہد فیہ مسئلہ میں تھا تو اب اس کو ختم کرنا لازم نہیں کیونکہ نیا اجتہاد پہلے والے اجتہاد کو ختم نہیں کرتا' یہ تفصیل علامہ صیمری رحمہ اللہ ت ۱۵۸۰ خطیب بغدادی رحمہ اللہ اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے اور وہ سب اس پر متفق ہیں اور مجھے اس بارے میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں اور اس سلسلے میں جو بات امام غزالی رحمہ اللہ اور امام رازی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے' اس میں بھی اس کے خلاف کی تصریح نہیں ہے"۔ ح۳۲

اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حکم بن مسعود رحمہ اللہ سے منقول ہے' وہ فرماتے ہیں:

"میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا۔ آپ نے میراث کے ایک مسئلہ میں حقیقی بھائیوں (ماں باپ شریک) کو ثلث (یعنی تیسرے حصے) میں اخیافی بھائیوں (ماں شریک) کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس پر ایک شخص کہنے لگا کہ گزشتہ سال تو آپ نے ایسے ہی مسئلہ میں اس کے برخلاف فیصلہ دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا پہلے میں نے کیا فیصلہ دیا تھا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ آپ نے ثلث (یعنی تیسرا حصہ) حصہ صرف اخیافی بھائیوں کو دلوایا تھا۔ اور حقیقی بھائیوں کو کچھ بھی نہیں دلوایا تھا"

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ذلك على ما قضينا، وهذا على ما نقضي۔

(وہ فیصلہ ویسا ہی رہے گا جیسے ہم کر چکے ہیں اور اب یہ مسئلہ ویسے ہی ہوگا جیسے اب ہم نے فیصلہ کیا ہے)۔

یہ تو تب ہے جب کوئی مفتی مجتہد ہو اور اس کا اجتہاد بدل جائے لیکن اگر مفتی آئمہ مجتہدین میں سے کسی کا مقلد ہو اور وہ یہ گمان کر کے وہ اپنے امام کے قول پر فتویٰ دے رہا ہے فتویٰ دے دے، پھر پتہ چلے کہ اس کے امام کا مذہب تو اس فتوے کے خلاف ہے اور اس کا جو گزشتہ فتویٰ ہے، وہ کسی نص کے مخالف نہیں بلکہ آئمہ مجتہدین ہی میں سے کسی کے موافق ہے، اگرچہ خاص اس کے امام کے خلاف ہے تو ایسی صورت میں ابن قیم رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو ابھی مفتی مجتہد کے اجتہاد میں تبدیلی کا حکم گزرا، لہٰذا اس مفتی کا گزشتہ فتویٰ جس پر فتویٰ لینے والا عمل کر چکا ہے، ختم نہیں ہوگا۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اگر کسی شخص نے فتوے کی بنا پر نکاح کر لیا اور رخصتی ہوگئی پھر مفتی نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا تو اس شخص پر اپنی بیوی کو روکے رکھنا حرام نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ کوئی ایسی دلیل شرعی موجود ہو جو اس کی حرمت کا تقاضا کرے اور اس شخص پر اپنی بیوی سے علیحدگی صرف مفتی کے رجوع کر لینے سے واجب نہیں ہوگی، خاص طور پر اس صورت میں کہ جب مفتی نے اپنے فتوے سے صرف اس لیے رجوع کیا ہو کہ اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کا فتویٰ اس کے اپنے مذہب کے خلاف ہے، اگرچہ کسی اور کے مذہب کے موافق ہے“۔

لیکن ابن صلاح رحمہ اللہ نے صراحتاً ابن قیم رحمہ اللہ کے بالکل خلاف حکم بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”جب کوئی مفتی کسی امام کے مذہب پر فتویٰ دے چکا اور پھر اس نے اس لیے رجوع کر لیا کہ اسے یقینی طور پر یہ پتہ چل گیا کہ اس نے اپنے امام کی تصریح کے خلاف فتویٰ دیا ہے تو اب اس پر اس فتوے کو ختم کرنا لازم ہے، اگرچہ وہ مسئلہ اجتہادی ہی ہو۔ کیونکہ اس کے امام کے مذہب کی نص کا درجہ اس کے حق میں وہ ہی ہے جیسے شارع کی نص مجتہد مستقل کے لیے۔ ہاں اگر مستفتی کو مفتی کے رجوع کا پتہ ہی نہ چلے تو مستفتی کا حال اس پر عمل کرنے میں ویسا ہی ہوگا جیسے مفتی کے رجوع کرنے سے پہلے تھا (یعنی اس کے لیے اس فتوے پر عمل کرنا جائز قرار پائے گا)“۔

(یہاں علامہ ابن الصلاح رحمہ اللہ کے ارشاد کے آخر میں "اصول الافتاء وآدابہ" میں المجموع شرح المھذب سے "فی علمہ" کے الفاظ منقول ہیں۔ بندہ نے المجموع کے دو متفرق نسخے (کراچی اور مکتبہ شاملۃ

)دیکھئے' اُن میں بھی یہی الفاظ ہیں۔لیکن علامہ ابن الصلاحؒ کی کتاب ادب المفتی و المستفتی میں "فی عمله" کے الفاظ ہیں۔ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے بعد میں المجموع کے دار الکتب العلمیۃ کے نسخے میں بھی "فی عمله" کے الفاظ مل گئے)۔

فتوے سے رجوع کرنے کی مستفتی کو اطلاع دینا

اعلام المستفتی بالرجوع عن الفتوی

مفتی پر لازم ہے کہ وہ مستفتی کو فتوی سے رجوع کے بارے میں باخبر کردے' اگر ابھی تک اس نے فتوے پر عمل نہ کیا ہو اور یہی حکم ہوگا اگر مستفتی فتوی پر عمل کر چکا ہو لیکن اس فتوے کو ختم کرنا واجب ہو' ان تفصیلی احکامات کے مطابق جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ۔

خطیب رحمہ اللہ نے حسن بن زیاد رحمہ اللہ کے بارے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:

ان سے کسی مسئلے کے بارے میں استفتاء کیا گیا تو ان سے فتویٰ دینے میں غلطی ہوگئی۔وہ اس شخص کو نہیں جانتے تھے جس کو انہوں نے فتویٰ دیا تھا اب انہوں نے ایک منادی (اعلان کرنے والا) کو اجرت دی کہ وہ یہ اعلان کرتا رہے کہ حسن بن زیاد سے فلاں دن ایک مسئلہ پوچھا گیا تھا' جس میں ان سے غلطی ہوگئی ہے۔لہٰذا جس شخص کو حسن بن زیاد نے کوئی فتویٰ دیا ہو' اسے چاہیے کہ وہ اُن سے رابطہ کرلے۔پھر کئی دن تک وہ فتویٰ دینے سے رکے رہے' یہاں تک انہیں وہ فتویٰ پوچھنے والا شخص مل گیا تو انہوں نے اس کو بتایا کہ فتویٰ بتانے میں غلطی ہوگئی تھی اور صحیح جواب یوں ہے۔ ج۳۶۰

مفتی سے غلطی ہونے پر ضمان کا حکم

حکم الضمان علی المفتی المخطئ

جب مستفتی کسی چیز کو تلف اور ضائع کرنے کے سلسلے میں کسی فتوے پر عمل کرلے' پھر اس فتوے کا غلط ہونا ظاہر ہو

جائے اور یہ پتہ چلے کہ یہ فتوی قطعی دلائل کے خلاف تھا تو ایسی صورت کے بارے میں حافظ ابوعمرو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے استاد ابواسحاق رحمہ اللہ سے یہ حکم نقل کیا ہے:

''مفتی اگر واقعتاً فتویٰ دینے کا اہل نہیں تھا تو وہ ضامن نہیں ہوگا کیونکہ (اس دوسری صورت میں) مستفتی نے خود ہی فتوی کے لیے نااہل شخص کی طرف رجوع کر کے کوتاہی کی ہے لہٰذا اب اس کا نقصان بھی اس کے اپنے ہی کام کی طرف لوٹے گا۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب مفتی فتویٰ دینے کا اہل ہو کیونکہ ایسی صورت میں مفتی کی طرف رجوع کرنے میں مستفتی کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں پائی گئی تو غلطی صرف مفتی کی ہی ہوئی لہٰذا وہ ضامن بھی ہوگا''۔

لیکن امام نووی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہی بات شیخ ابوعمرو رحمہ اللہ نے بھی نقل کی ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن یہ قابل اشکال ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس مسئلے کا حکم بھی غصب اور نکاح وغیرہ کے باب میں دھوکہ دینے پر ضمان آنے یا نہ آنے کے دونوں مشہور قولوں کے مطابق بیان کیا جائے۔ یا قطعی طور پر مفتی کے ضامن نہ ہونے کا حکم دیا جائے کیونکہ فتویٰ میں لازم کرنا اور مجبور کرنا تو نہیں پایا جاتا''۔ [ح ۳۷]

یہ احکام جو امام نووی شافعی رحمہ اللہ نے فتویٰ سے رجوع کرنے کے مسائل کے ذیل میں لکھے ہیں، ان سب کو ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ نے بھی ''البحر الرائق'' میں باقی رکھا ہے۔ البتہ انہوں نے اس مسئلے میں پر یقین ظاہر کیا ہے کہ اتلاف اور نقصان کی صورت میں مفتی پر ضمان نہیں آئے گا۔ وہ فرماتے ہیں:

''اور اگر مفتی کے فتویٰ کی وجہ سے کوئی چیز تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا اگرچہ وہ فتویٰ دینے کا اہل ہو''۔ [ح ۳۸]

فتویٰ دینے پر اجرت لینا

الاجرة على الافتاء

مفتی پر لازم ہے کہ وہ اپنا فتویٰ دینے پر کسی اجرت کا سوال نہ کرے۔

علامہ علاؤالدین ابن عابدین رحمہ اللہ نے ''شرح الوهبانية'' سے نقل کیا ہے:

"زبانی فتویٰ دینے پر اجرت (معاوضہ) لینا جائز نہیں، اور لکھ کر فتویٰ دینے پر کتابت کی اجرت لینا جائز ہے لیکن اس کے باوجود اجرت لینے سے بچنا ہی بہتر ہے"۔ (ح ۳۹)

امام نووی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فتویٰ دینے والے کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ یہ کام بلا معاوضہ کرے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بیت المال سے اس پر وظیفہ وصول کرے۔ اگر مفتی کیلئے فتویٰ دینا فرض عین ہو جائے (کہ وہاں کوئی اور مفتی موجود نہ ہو) اور اس کے پاس بقدر کفایت روزی بھی ہو تو اس کے لیے اجرت لینا صحیح قول کے مطابق حرام ہے۔ پھر اگر اس کا وظیفہ مقرر ہو تو بھی اجرت لینا بالکل جائز نہیں اور اگر اس کے لیے مقررہ وظیفہ نہ ہو تو بھی اس کے لیے متعین طور پر اس شخص سے اجرت لینا جسکو وہ فتویٰ دے رہا ہے **اصح قول** کے مطابق حکمران کی طرح اس کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے۔

ہمارے علماء میں سے شیخ ابو حاتم القزوینی رحمہ اللہ نے یہ حیلہ بیان کیا ہے کہ مفتی مستفتی کو کہے کہ مجھ پر یہ تو لازم ہے کہ میں آپ کو زبانی فتویٰ دے دوں، باقی رہا فتویٰ لکھ کر دینا تو وہ مجھ پر لازم نہیں۔ اب اگر مستفتی اس کے ساتھ کتابت فتویٰ کے لیے اجرت کا معاملہ کرے تو جائز ہے۔

لیکن ایسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ کتابتِ فتویٰ کی اجرت لکھنے لکھانے کی اُجرتِ مثل (عمومی اجرت) سے بڑھ جائے کیونکہ جو اجرتِ مثل سے زیادہ ہوگی، وہ درحقیقت اصل فتویٰ دینے ہی کی اجرت ہوگی جو کہ ممنوع ہے"۔

الدر المختار میں ہے:

"قاضی دستاویزات لکھنے پر اتنی ہی اجرت کا مستحق ہے جتنی اجرت لینا کسی اور کے لیے جائز ہے، جیسے کہ مفتی کے وہ کتابت فتویٰ پر اجرت مثل کا مستحق ہے۔ کیونکہ مفتی پر صرف زبان سے جواب دینا واجب ہے، ہاتھ سے لکھ کر دینا لازم نہیں لیکن اس کے باوجود اجرت لینے سے باز رہنا ہی بہتر ہے" (واللہ اعلم)۔ (ح ۴۰)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علامہ صیمری رحمہ اللہ اور خطیب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کسی شہر کے لوگ متفق ہو کر اپنے اموال میں سے

مفتیان کرام کے لیے وظیفہ مقرر کر دیں تا کہ مفتیان کرام ان کو فتویٰ دینے کے لیے اپنے آپ کو باقی کاموں سے فارغ رکھیں تو یہ جائز ہے۔

رہا ہدیہ اور تحفہ کا معاملہ تو ابو مظفر سمعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفتی کے لیے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے بخلاف حکمران کے، کیونکہ حکمران تو اپنے حکم کو لازم کرتا ہے۔

ابو عمرو رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مناسب یہ ہے کہ اگر مستفتی اپنے پسند کا فتویٰ لینے کے لیے بطور رشوت کے مفتی کو ہدیہ دے تو اس کا قبول کرنا بھی حرام ہے۔ جیسا کہ حاکم اور ان تمام صورتوں کا حکم ہے جن میں کوئی قابل عوض چیز مقابلے میں نہیں ہوتی''۔

خطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امام (حکمران) پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے لیے جو اپنے آپ کو تدریسِ فقہ اور احکام میں فتویٰ دینے کے لیے مقرر کر لے تو وہ اس کے لیے اتنا وظیفہ طے کر دے کہ وہ کسی اور پیشے کو اپنانے سے بے نیاز ہو جائے اور یہ وظیفہ بیت المال (مسلمانوں کے اجتماعی اموال) میں سے ادا کیا جائے گا۔ پھر خطیب رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ جن حضرات کی بھی یہ حالت ہوتی تھی، وہ اُن کو سال بھر میں سو دینار دیتے تھے''۔ ح ۱۰۲

فتویٰ دینے کا طریقۂ کار

منہج الافتاء

افتاء کسی عمومی شرعی حکم کو کسی جزئی واقعہ پر منطبق کرنا ہے۔ اس بناء پر صحیح جواب تک پہنچنے کے لیے دو مرحلوں کی ضرورت ہوتی ہے:

(۱)...... جس صورتِ مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا ہے اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا۔

(۲)...... پھر اس صورتِ مسئلہ کو کسی کلی حکم کے تحت داخل کرنا اور اسی کو دورِ جدید کی اصطلاح میں ''تکییفِ شرعی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

صورتِ مسئولہ کا تصور

تصور الصورة المسئول عنها

ہر چیز سے پہلے مفتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس جزئی واقعہ کو باریک بینی سے سمجھے جس کے بارے میں اس سے سوال کیا گیا ہے اور اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک تصور قائم کرے کیونکہ کسی چیز پر حکم لگانا یہ تو فرع ہے اس کے تصور کی، تو اگر اس کی صورتِ مسئلہ کا تصور ہی غلط ہوا، تو مفتی یقیناً جواب میں غلطی کرے گا۔ لہٰذا مفتی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اگر سوال میں کسی قسم کا ابہام ہو تو وہ جواب دینے میں جلدی کرے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اس ابہام کو مستفتی سے رابطہ کر کے یا دوسرے ذرائع سے ختم کرے۔ یہاں تک کہ صورتِ مسئلہ مکمل وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے آجائے۔

چونکہ کبھی عام مستفتی کو یہ نہیں پتہ چلتا کہ حکم شرعی کا دار و مدار کس بات پر ہے، تو وہ اپنے سوال میں ایسی تفصیلات ذکر کر دیتا ہے جن کا حکم شرعی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ مستفتی اپنے سوال میں جو واقعات ذکر کرتا ہے، وہ دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱)......وہ واقعات جو حکم شرعی کے بارے میں مؤثر ہوتے ہیں۔

(۲)......اور دیگر وہ واقعات جو ضمنی طور پر آجاتے ہیں، حکم شرعی میں نہ ان کا کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اُس پر ان کا کوئی اثر ہوتا ہے۔

اب مفتی پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں قسم کے واقعات کے درمیان فرق کرے اور اپنی فکر کو صرف ان واقعات پر مرکوز کرے جو حکم شرعی کے بارے میں مؤثر ہوتے ہیں۔

علامہ دبوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے کلام میں وہ باتیں جمع کر دیں جو حکم کے متعلق ہیں اور وہ باتیں بھی جمع کر دیں، جو حکم کے متعلق نہیں ہیں تو جو باتیں حکم سے غیر متعلقہ ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور اعتبار صرف انہی باتوں کا ہے جو حکم سے متعلقہ ہوں گی اور حکم کا تعلق ان سے ہوگا۔ گویا کہ گفتگو کرنے والے نے اپنے کلام میں ان باتوں کے علاوہ جو حکم سے متعلق ہیں، کچھ ذکر ہی نہیں کیا"۔ (ج۲۲)

کبھی مستفتی اپنے سوال میں ایسی بات کو چھوڑ دیتا ہے جس پر صحیح جواب موقوف ہوتا ہے اور دیگر ایسی تفصیلات ذکر کرتا ہے جن کا حکم شرعی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ وہ ضمنی واقعات تو ذکر کر دیتا ہے لیکن وہ بات یا واقعہ جس پر شرعی حکم کا دارومدار ہے' چھوڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسا کہ بہت سے عام لوگ وقوعِ طلاق کے متعلق سوال کے وقت یہ کرتے ہیں کہ وہ ان واقعات کو تو ذکر کر دیتے ہیں جو زوجین (شوہر اور بیوی) کے درمیان جھگڑے کے متعلق ہوتے ہیں اور ان الفاظ کو ذکر نہیں کرتے جو طلاق دیتے وقت استعمال کیے گئے ہوں۔

ایسی صورت میں مفتی پر لازم ہے کہ وہ سوال پر تنقیحات (وضاحت طلب کرنے کے لیے قائم کیے گئے سوالات) قائم کرے اور سوال کرنے والے کو کہے کہ وہ اسی سوال پر ان تنقیحات کا جواب دے، جو اس نے مفتی کے سامنے پیش کیا ہے۔ پھر مفتی اپنے جواب کی بنیاد اس صورت مسئلہ پر رکھے جو تنقیح شدہ اس کے سامنے آئی ہے۔ بسا اوقات مستفتی بعض ضروری تفصیلات مفتی کے سامنے زبانی طور پر بیان کر دیتا ہے، تو مفتی کو صرف اس کی زبانی بات پر اکتفاء کرنا مناسب نہیں بلکہ مفتی اس کا سوال واپس لوٹا دے تاکہ وہ مکمل طور پر سوال لکھ کر دے۔ اگر مستفتی، مفتی ہی سے اس بات کی درخواست کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ مفتی اپنے ہی قلم سے اضافہ کر دے۔ ح،۴۳

(حضرت مصنف دامت برکاتہم فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں:

اگر سوال میں اضافہ کرنے کی وہاں کوئی گنجائش نہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ مفتی اپنے جواب کے آغاز میں یہ بات لکھ دے کہ سائل نے سوال میں زبانی طور پر اس تفصیل کا اضافہ کیا تھا، تو اگر یہ تفصیل درست ہے تو حکم یوں ہوگا۔ میں نے اکثر اپنے والد اور شیخ (حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مستفتی اپنی کم علمی کی بناء پر اُن باتوں کی وضاحت نہیں کر سکتا جن پر حکم شرعی کو سمجھنا موقوف ہوتا ہے' ایسے موقع پر مفتی کو چاہیے کہ وہ ان امور کی دیگر ذرائع سے بھی تحقیق کر لے۔

لوگوں کے درمیان پیش آنے والے تجارتی معاملات میں تو ایسا بہت ہوتا ہے۔ کیونکہ مستفتی تو جیسے خود ان معاملات کو سمجھتا ہے' اُسی کے مطابق سوال کرتا ہے اور اسے یا تو بعض اہم امور کی پرواہ نہیں ہوتی یا پھر وہ اُن کی حقیقت سے ہی ناواقف ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مستفتی دھوکہ دہی کا ارتکاب کرتے ہوئے مفتی کے سامنے مسئلہ کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے' جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق نہیں ہوتی۔

ایسی صورت میں مفتی کا فتویٰ تو صرف اُس صورتِ مسئلہ کے متعلق ہوتا ہے' جس کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے لیکن اُس فتویٰ کی تشہیر تو حقیقی صورت حال کے بارے میں کی جاتی ہے' جو لوگوں کے درمیان معروف ہوتی ہے۔ (اس طرح

یہ فتویٰ غلط استعمال ہو کر گمراہی کا سبب بن جاتا ہے)۔

یہ بات مشہور ہے کہ شیخ محمد عبدہ مرحوم کے سامنے مروجہ انشورنس کے متعلق جو استفتاء پیش کیا گیا تھا، وہ بھی اس طرح کا تھا۔ اُن سے ایک فرانسیسی شخص نے جس کا نام "موسیو ھرسل" تھا' اس نے چالاکی دکھا کر ایسی تعبیر کے ذریعے سوال کیا جو حقیقت کے مطابق نہ تھی۔ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ انشورنس کا طریقہ کار تو مضاربت پر مبنی ہے اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے بھی اسی کے مطابق جواب دیدیا۔ (ح:۴۴)

پھر اس فتویٰ کو بڑے پیمانے پر یہ کہہ کر شائع کیا گیا کہ شیخ نے مروجہ انشورنس کی اجازت دیدی ہے۔

(یہ بات فضیلۃ الشیخ عبدالستار ابوغدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کی ہے' تفصیل کیلئے دیکھیں: **مجلة مجمع الفقه الاسلامي، العدد السابع عشر، ۱/۸۵۵**)

اسی طرح ہندوستان میں بھی یہ ہوا کہ اس مروجہ انشورنس کو غیر حقیقی شکل میں پیش کر کے اس کے بارے میں بعض قابلِ اعتماد علماء سے سوال کیا گیا تو انہوں نے جواز کا فتویٰ دیدیا اور آج تک مسلسل چند انشورنس کمپنیاں اُن فتاویٰ سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

(حالانکہ مروجہ انشورنس میں کئی سنگین شرعی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ انشورنس کی اقسام اور احکام کی تفصیل کیلئے دیکھیں: اسلام اور جدید معیشت و تجارت از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ، صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۳، طبع مکتبہ معارف القرآن' کراچی)

اس لیے ہر زمانے کے مفتی کو چاہیے کہ وہ ایسے معاملات کی حقیقت کو پہچانے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ رنگسازوں کے پاس جاتے تھے اور اُن سے اُن کے معاملات اور باہمی لین دین کے طریقوں کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔ (ح:۴۵)

ظاہر ہے کہ یہ صرف اسی لیے تھا کہ وہ ان کے درمیان مروجہ معاملات کو بصیرت سے سمجھنا چاہتے تھے۔

ہمارے زمانے میں اکثر و بیشتر' مفتی سے لوگوں کے درمیان رائج ایسے معاملات کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہ یہ جائز ہیں یا نہیں؟ جب کہ ان کی بنیاد حکومت کی طرف سے جاری کردہ کسی قانون یا حکم پر ہوتی ہے۔ مستفتی تو جیسے خود ان معاملات کو سمجھتا ہے' ویسے ہی مفتی کے سامنے بھی ذکر کر دیتا ہے اور وہ بہت سے ایسے اہم امور چھوڑ دیتا ہے' جس پر شرعی حکم کا مدار ہوتا ہے' ایسے مسائل میں مفتی کو چاہیے کہ وہ کوئی یقینی جواب دینے سے پہلے اُس قانون یا حکم کو دیکھ لے۔

مثال کے طور پر اگر مفتی سے اُس اضافی رقم (پنشن وغیرہ) کے بارے میں پوچھا جائے جو کسی ملک میں سرکاری ملازمین کو ریٹائرمنٹ یا اُن کے انتقال پر دی جاتی ہے' تو اُس کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دینے سے پہلے اور اس بات کا مسئلہ بتانے سے پہلے کہ ان اضافی پیسوں میں میراث جاری ہوگی یا نہیں' مفتی کیلئے لازم ہے کہ وہ اس قانون یا حکم کو دیکھے جس کی بنیاد پر یہ ادائیگیاں کی جارہی ہیں۔ تاکہ اُسے یہ پتہ چل جائے کہ ان میں سود یا کوئی اور شرعی خرابی تو موجود نہیں اور اگر یہ جائز ہیں تو کیا یہ اُن چیزوں میں سے ہے' جن میں میراث جاری ہوتی ہے یا نہیں؟۔

(کیونکہ بعض مرتبہ حکومت خاص طور پر اپنے مرحوم ملازمین کی صرف بیوہ یا بچوں کیلئے ہی امدادی رقوم جاری کرتی ہے)۔

صریح عبارت کی بنیاد پر جواب

الجواب علی اساس النقل الصریح

جب مفتی نے احتیاط سے صورتِ مسئولہ کو سمجھ لیا تو اب اہم کام یہ ہے کہ اس کو کسی ثابت شدہ حکمِ شرعی کے تحت داخل کرنا ہے۔ اکثر حالات میں تو مسئلہ کتبِ فقہ میں صراحت سے مذکور ہوتا ہے، ایسی صورت میں مفتی کیلئے متعین ہو جاتا ہے کہ سائل کو اپنے مذہب کی کتابوں کے مطابق جواب دے دے۔ اس میں رسم المفتی کے وہ قواعد بھی جاری ہوں گے جو ہم پہلے ابن عابدین رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔

ایسی ہی صورت کے بارے میں ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عام طور پر مفتی کا کسی مسئلہ میں عبارت (نص) کا نہ پانا' اس کی جستجو کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے یا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اُسے اُس مقام کا پتہ ہی نہیں ہوتا جہاں وہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا بہت نادر ہے کہ کوئی واقعہ پیش آئے اور کتبِ مذہب میں اُس کا ذکر موجود نہ ہو۔ ہاں یہ ذکر کبھی تو صراحتاً ہوتا ہے اور کبھی کوئی ایسا قاعدہ کلیہ ذکر ہوتا ہے جو اس صورتِ مسئولہ کو بھی شامل ہوتا ہے"۔ ج۱، ص۴۶

اگر تو مسئلہ بعینہٖ کتبِ فقہ میں مذکور ہو تو مفتی کیلئے جواب دینے کا معاملہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر مسئلہ بعینہٖ ان کتب میں ذکر نہیں کیا گیا تو اب ضرورت پیش آئے گی کہ اسے کسی حکم کے عموم یا کسی فقہی ضابطہ کے تحت داخل کر دیا جائے۔ اگر مفتی اس میں غور و فکر کا اہل نہیں ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ یہ معاملہ اُن اہلِ نظر و استنباط کے حوالے کر دے جو

اس سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

ایسی صورتوں کے بارے میں ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور مفتی اس پر اکتفاء نہیں کرے گا کہ صورتِ مسئولہ کے قریبی نظائر (اس سے ملتے جلتے مسائل) کو پا کر اُن پر فتوی دے دے، کیونکہ یہاں اس بات کا اطمینان نہیں ہو سکے گا کہ پیش آئے ہوئے مسئلہ اور اس نے جو عبارت (اُس کے قریب قریب) تلاش کی ہے' ان میں کوئی ایسا فرق ہو جس تک اس مفتی کا ذہن نہ پہنچ سکا ہو۔ ایسے کتنے ہی مسائل ہیں کہ فقہاء نے ان کے اور اُن کے نظائر کے درمیان فرق کیا ہے' یہاں تک کہ اس مقصد کیلئے انہوں نے "الفروق" کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں' اور اگر یہ معاملہ ہماری سمجھ پر چھوڑ دیا جاتا تو کبھی ان کے درمیان فرق کا ادراک نہ کر سکتے۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے تو "الفوائد الزینیة" میں فرمایا ہے:'' قواعد وضوابط سے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ مفتی کے ذمے لازم ہے کہ وہ صریح عبارت بیان کرے جیسا کہ فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے''۔ (ج۔٧٠)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سوال میں دریافت کی گئی صورتِ مسئلہ' کئی واقعات سے مل کر بنی ہوتی ہے اور ان واقعات میں سے ہر ایک واقعہ مستقل باب کے تحت آتا ہے۔ تب لازمی ہے کہ ان میں سے ہر باب کے احکامِ شریعت کو سوال کے متعلقہ حصے پر منطبق کیا جائے۔

ایسی صورت میں یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ احکام کی ترتیب' اُس کے حقیقی طور پر پیش آنے کے تقاضوں کے مطابق رکھی جائے۔ لہٰذا مفتی پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ سوال کا مضبوط تجزیہ کرے (یعنی اُس کے احکام کے اعتبار سے اُس کے حصے بنائے) جس سے اُس کے سامنے سوال پر غور وفکر اور تحقیق کے مواقع متعین ہو جائیں۔

اس طرح مفتی سوال کو حقیقی اور منطقی ترتیب پر مرتب کرے اور پھر سوال کے ہر حصے پر اسی ترتیب کے مطابق غور کرے اور جس ترتیب سے مستفتی نے سوال ذکر کیا ہے' اُس کو لازمی نہ سمجھے۔

اس کی مثال یہ مسئلہ ہے کہ زید کا انتقال ہوا اور اس نے پیچھے بیوی زینب کو حاملہ چھوڑا' جس کا حمل ایک ماہ بعد ہی گر گیا۔ عمرو نے زینب سے حمل ختم ہوتے ہی فوراً شادی کر لی اور اس نکاح کے نو ماہ بعد عمرو کا بیٹا' بکر زینب کے بطن سے پیدا ہوا۔ پھر عمرو کا بھی انتقال ہو گیا اور اس نے بکر کیلئے اپنے ایک تہائی مال کی وصیت کر دی تھی۔ اسی عمرو کا ایک اور بیٹا بھی تھا' خالد جو زینب کے علاوہ کسی اور بیوی سے تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے ترکے سے بکر کو کچھ بھی دینے سے انکار کر

دیا (نہ میراث‘ نہ وصیت کے مطابق مال)۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس بیٹے پر جبر کیا جائے گا کہ وہ (وصیت کے مطابق) بکر کو ایک تہائی مال دے دے؟

اس سوال کا جواب اس پر موقوف ہے کہ کیا بکر کا نسب عمرو سے ثابت ہے یا نہیں؟

پھر یہ اس پر موقوف ہے کہ زینب کا عمرو سے جو نکاح ہوا تھا‘ اُس کا حکم کیا ہے؟

پھر یہ اس پر موقوف ہے کہ زید کی وفات کے ایک ماہ بعد زینب کا جو حمل ضائع ہو گیا تھا‘ اُس سے زینب کی عدت ختم ہو گئی تھی یا نہیں؟

اب اس پورے سوال کا جواب یوں گا:

حمل ساقط ہونے سے عدت صرف تب ہی ختم ہوتی ہے‘ جب حمل کی کچھ خلقت (ناک‘ کان‘ منہ وغیرہ) ظاہر ہو چکی ہو۔ اگر حمل اس سے پہلے ہی گر جائے (یعنی صرف ابھی گوشت کا لوتھڑا ہی ہو) تو اس سے عدت ختم نہیں ہو گی۔

(از حاشیہ:

ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”حمل سے مراد وہ ہے‘ جس کی پوری یا کچھ خلقت ظاہر ہو چکی ہو۔ اگر اُس کی بعض خلقت بھی ظاہر نہیں ہوئی تو اس سے عدت ختم نہیں ہو گی...... پھر المحیط سے نقل فرمایا ہے کہ یہ خلقت ایک سو بیس دن سے پہلے ظاہر نہیں ہوتی۔ جب کہ البحر سے نقل کیا ہے کہ کبھی چار ماہ سے پہلے بھی خلقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ (ح ۴۸)

اور عام طور پر ایک ماہ میں خلقت ظاہر نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب زینب کا حمل ایک ماہ میں آثارِ تخلیق ظاہر ہونے سے پہلے ساقط ہوا تو اُس سے عدت ختم نہیں ہوئی۔ لہٰذا اُس کا عمرو سے جو نکاح ہوا تھا‘ وہ درحقیقت زید سے اُس کی عدت کے دوران ہی ہو گیا تھا۔

اب ہمیں ضرورت ہو گی کہ ہم اس کا حکم معلوم کریں کہ کسی کی عدت گزارتے ہوئے اگر کوئی دوسرا شخص اُس عورت سے نکاح کر لے تو اُس نکاح کا کیا حکم ہے؟ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ نکاح فاسد ہے‘ لیکن اگر نکاح یا وطی (**علی اختلاف القولین**) کے وقت سے مدتِ حمل (جو کم سے کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال ہے) کے اندر اندر بچے کی پیدائش ہو جائے تو اُس کا نسب نکاح کرنے والے سے ثابت ہو جائے گا“۔ (ح ۴۹)

(صورت مسئولہ میں) اسی بناء پر بکر کا نسب عمرو سے ثابت مانا جائے گا اور جب اس کا نسب ثابت ہو گیا تو اس

کے حق میں کی گئی وصیت باطل ہو جائے گی کیونکہ وارث کیلئے وصیت جائز نہیں ہے۔

لہٰذا بکر وصیت کی بناء پر تو عمرو کے ترکے میں سے کسی چیز کا مستحق نہیں ہے لیکن میراث میں سے اپنے حصے کا وہ مستحق ہوگا۔

عام قواعدِ فقہیہ اور نظائر کی بنیاد پر فتویٰ دینا

الجواب علی اساس العمومات او النظائر

اگر مفتی کو اپنے زمانہ کے اہلِ علم کی یہ گواہی حاصل ہو کہ یہ نصوص میں غور و فکر اور استنباطِ مسائل کا اہل ہے تو اُس کیلئے جائز ہے کہ وہ کسی مسئلہ کا حکم اُن عام قواعدِ فقہیہ سے مستنبط کر لے جو کتبِ فقہیہ میں موجود ہیں اور اسی طرح اُن نظائر (ملتے جلتے مسائل) سے بھی حکم مستنبط کر سکتا ہے جو فقہی کتابوں میں مذکور ہیں۔

لیکن اُس کیلئے بھی اُس باہمی فرق کا خیال رکھنا ضروری ہے، جو ممکن ہے کہ فقہی کتابوں میں مذکور مسئلہ اور اس سے جس مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا ہو، دونوں کے درمیان موجود ہو۔ جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

(گزشتہ عنوان "صریح عبارت کی بنیاد پر جواب" کے تحت اُن کی عبارت گزر چکی ہے)

اس سلسلے میں، ہم دو قاعدے ذکر کرتے ہیں، جن کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے:

(۱)...... فقہی نصوص میں ذکر کردہ مسئلہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذکر کرنے والے فقیہ کے زمانے میں جاری عرف اور عادت پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر یہ عرف اور عادتیں بدل جاتی ہیں تو اس صورت میں کتابوں میں ذکر کیے ہوئے مسئلہ کو (اپنے زمانے میں) پوچھے گئے مسئلہ پر منطبق کرنا جائز نہیں ہے۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے اس طرح کی کئی مثالیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

"یہ تمام اور اس طرح کے دیگر مسائل اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ مفتی کیلئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ زمانہ اور اہلِ زمانہ کی رعایت کیے بغیر، کتبِ ظاہر الروایۃ میں نقل کردہ مسائل پر جمود (اور اصرار) اختیار کر لے ورنہ وہ بہت سے حقوق ضائع کر دے گا اور اُس کا نقصان، اُس کے فائدے سے بڑھ کر ہوگا"۔ ج ۵۰

(۲)......فقہاء نے اپنی کتابوں میں جو عبارتیں تحریر فرمائی ہیں وہ اُن صورتوں پر مبنی ہیں جن کا اُن کے زمانے میں تصور ہو سکتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فقہاء کرام عام الفاظ ذکر کر دیتے ہیں اور وہ بظاہر اُن حالات کو بھی شامل ہوتے ہیں جو اُن کے بعد پیش آئے، لیکن اُن کے زمانے میں ان حالات کا تصور تک نہیں تھا۔

لہٰذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم یہ کہہ دیں کہ فقہاء نے اس نئی صورت حال کا حکم بھی اُن عام الفاظ میں بیان کر دیا ہے، جنہیں وہ (اپنے زمانے کا) حکم بیان کرنے کیلئے استعمال کر چکے ہیں۔ کیونکہ فقہاء کی عبارات، اُن کے دور کی ممکنہ صورتوں اور اُن کے زمانے میں جستجو اور تلاش کے نتائج تک ہی محدود ہوتی ہیں۔

یہ بات ممکن ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ نے تو اپنے زمانے کے حالات کا لحاظ کر کے کوئی لفظ استعمال کیا ہو اور آنے والے زمانوں میں جو کچھ پیش آنا ہے، اُس کا اُنہیں خیال بھی نہ آیا ہو۔ تو اب اُن کی وہ عبارتیں اِن آئندہ پیش آنے والے حالات کا احاطہ نہیں کریں گی۔ پس کبھی اُن کے عمومی الفاظ سے یہ وہم ہو جاتا ہے کہ ان الفاظ میں مستقبل کے حوادثات کا حکم بھی آ گیا ہے، حالانکہ فقہاء نے تو اس بات کا قصد ہی نہیں کیا تھا کہ وہ ان نئے حالات کا حکم بیان کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں تھا۔

اس بات کی طرف علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''مسائل کی وہ صورتیں جو اِن فقہاء کے زمانے میں پیش ہی نہیں آئیں، کوئی لازم نہیں ہے کہ اُن کے دلوں میں اُن کا تصور بھی آیا ہو، کہ اُن پر ان صورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا واجب ہو جاتا۔ اور اِن باتوں کا اُن حضرات کے زمانے میں پیش آنا یا تو بالکل معدوم کے درجے میں تھا یا کم از کم بہت نادر تھا۔ اس باب میں اُن کا کلام بالکل مطلق ہے اور یہ عموم کا ہی فائدہ دے گا بشرطیکہ کوئی ایسی متعین صورت نہ آ جائے جو ایسی وجوہات کے ساتھ مختص ہو، جن کی بناء پر فرق اور اختصاص ثابت ہوتا ہو۔ اور یہ (خاص) صورت تو آئمہ میں سے جس نے اس بارے میں عام الفاظ سے کلام کیا ہے، شاید اُن کے ذہن میں ہی نہ ہو۔ کیونکہ اُن کے زمانے میں اس کا وجود ہی نہیں تھا''۔ (ح ۱۵)

اس کی مثال ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ ہمارے زمانے کے بعض علماء رحمہم اللہ نے اس بات کا فتویٰ دیا ہے کہ ہوائی جہاز میں بغیر عذر کے نماز جائز نہیں ہے۔ اس کی علت انہوں نے یہ بیان فرمائی کہ ہوائی جہاز میں سجدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سجدہ کی تعریف فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بتائی ہے:

"وضع بعض الوجه علی الارض"

(اپنے چہرے کے کچھ حصے کو زمین پر رکھنا)

لہٰذا سجدہ متحقق ہونے کیلئے ضروری ہے کہ پیشانی زمین پر رکھی ہوئی ہو یا کسی ایسی چیز پر ٹکائی ہوئی ہو، جو زمین پر ٹھہری ہوئی ہے۔

ہوائی جہاز جب فضاء میں ہو تو وہ نہ خود زمین ہے اور نہ دورانِ پرواز زمین پر ٹھہرا ہوا ہے۔ کیونکہ ہوائی جہاز ہوا پر جما ہوا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہوا زمین پر ٹھہری ہوتی ہے۔ ان حضرات کی یہ دلیل، فقہاء کی طرف سے بیان کردہ سجدہ کی اُس تعریف پر مبنی ہے جو ابھی گزری ہے۔

لیکن ہمارے شیخ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جیسا کہ میں نے اپنے والد حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ سے سنا، کہ جب فقہاء نے سجدہ کی تعریف میں "الارض (زمین) کا لفظ استعمال کیا تھا تو ہوائی جہاز اُن کے تصور میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ ہوائی جہاز تو اُن حضرات کے دور میں نہ موجود تھے نہ اُن کا کوئی خیال تھا۔ لہٰذا جب ان حضرات نے لفظ "الارض" استعمال کیا تو اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے فضاء میں موجود ہوائی جہاز کو نکال رہے ہیں (کہ اس میں سجدہ نہیں ہوسکتا)۔

انہوں نے لفظ "الارض" کے ذریعے اس فرش کی تعبیر کی ہے، جس پر لوگ چلتے ہیں اور اُسے پاؤں سے روندنے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ اوصاف اُن کے زمانے میں صرف زمین (الارض) میں ہی تصور کیے جاسکتے تھے لہٰذا انہوں نے سجدہ کی تعریف:

وضع الجبهة او بعض الوجه علی الارض

(پیشانی یا چہرے کا کچھ حصہ زمین پر رکھنا)

سے کردی۔ لیکن ہوائی جہازوں کی ایجاد کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تمام مطلوبہ اوصاف تو ہوائی جہاز کے فرش میں بھی پائے جاتے ہیں اور عرف میں بھی اُس کو "الارض" کہہ دیا جاتا ہے۔ تو ایسی صورت حال میں یہ صحیح نہ ہوگا کہ سجدہ کی تعریف میں موجود صرف لفظ "الارض" سے استدلال کرکے یہ کہہ دیا جائے کہ ہوائی جہاز کے فرش پر سجدہ جائز نہیں ہے۔

اسی طرح بعض علماء نے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا اور اس کی علت یہ قرار دی کہ لاؤڈ اسپیکر سے سنی جانے والی تکبیرات کے مطابق عمل کرنا تو "تلقن من الخارج" کو قبول کرنا ہے (یعنی ایسے شخص کی بات مانتے

ہوئے عمل کرنا ہے جو اس کی نماز سے خارج ہے)۔ کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز تو امام کی آواز سے الگ آواز ہے۔

لیکن فقہاء نے جب "تلقن من الخارج" کی بات کہی تھی تو لاؤڈ اسپیکر اُس زمانے میں موجود تھا' نہ ہی اُس کا کوئی تصور تھا۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ انہوں نے "تلقن من الخارج" کے الفاظ استعمال کر کے لاؤڈ اسپیکر کا حکم بیان کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس لیے اس سے استدلال کر کے اُس شخص کی نماز کو فاسد کہنا بھی درست نہ ہوگا' جس نے لاؤڈ اسپیکر سے تکبیرات سن کر نماز کے ارکان ادا کیے ہوں۔

کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز' خواہ بعینہ امام کی آواز ہو یا الگ سے کوئی آواز ہو' بہر حال یہ ایک ایسے آلے کی آواز ہے جس کا اپنا کوئی اختیار نہیں' اس لیے اس آواز کو آلہ کی طرف منسوب بھی نہیں کیا جائے گا اور اس آواز کی نسبت با اختیار فاعل یعنی امام کی طرف کی جائے گی۔ جیسا کہ میرے والد حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے "آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام" میں تحقیق بیان فرمائی ہے۔

ایسے مسائل میں فتویٰ دینے سے پہلے بہتر ہے کہ مفتی دیگر علماء و فقہاء سے بھی مشورہ کر لے اور ایسے مسائل میں فتویٰ دینے میں جلدی نہ کرے اور ان تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔ کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اجرؤ کم علی الفتیا اجرؤ کم علی النار

(تم میں سے جو شخص فتویٰ دینے پر زیادہ جری ہے' وہ جہنم پر زیادہ جراءت کرنے والا ہے)

(العیاذ باللہ العظیم)

(اس حدیث کی پاک کی تخریج پہلے باب کے حاشیہ نمبر ا میں گزر چکی ہے)

افتاء کے آداب

آداب الافتاء

(ا)...... مفتی کیلئے مناسب ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح جواب کی ہدایت کا سوال کرے۔

ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت مکحول رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات اُس وقت تک فتویٰ جاری نہیں کرتے تھے، جب تک:

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ

نہ پڑھ لیتے۔ ہم مفتی کیلئے اس کے ساتھ چند دیگر اذکار بھی پسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ مفتی جب فتویٰ دینے کا ارادہ کرے تو اُسے چاہیے کہ یہ اذکار پڑھ لے:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

(البقرہ۔۳۲)

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔

(الانبیاء۔۷۹)

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ۔

(طٰہٰ۔۲۵تا۲۸)

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَحَنَانَيْكَ۔

اَللّٰهُمَّ لَا تُنْسِنِيْ وَلَا تُنَسِّنِيْ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَفْضَلَ الْحَمْدِ۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَسَائِرِ النَّبِيِّيْنَ وَالصَّالِحِيْنَ وَسَلِّمْ۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَسَدِّدْنِيْ وَاجْمَعْ لِيْ بَيْنَ الصَّوَابِ وَالثَّوَابِ، وَاَعِذْنِيْ مِنَ الْخَطَاءِ وَالْحِرْمَانِ۔ آمین۔

اگر مفتی ہر فتویٰ کے وقت یہ نہ پڑھ سکے تو روزانہ پہلا فتویٰ لکھتے وقت پورے دن کے فتاویٰ کی نیت سے پڑھ لے اور مزید اس کے ساتھ سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور جو اذکار آسانی سے پڑھ سکے، وہ بھی ملا لے۔

جو شخص اس کی پابندی کرے گا' وہ واقعی اس بات کا مستحق ہوگا کہ اُسے اپنے فتاویٰ میں صحیح جواب کی توفیق نصیب ہو۔ (ح ۵۲)

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مفتی کو چاہیے کہ صحیح حدیث میں آنے والی یہ دعا اکثر پڑھا کرے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ اِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ بِاِذْنِكَ، اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ہمارے شیخ (یعنی علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ) بہت کثرت سے یہ گزشتہ دعا پڑھتے تھے۔ اور جب انہیں مسائل میں مشکل پیش آتی تو یہ پڑھتے:

يَا مُعَلِّمَ اِبْرَاهِيْمَ عَلِّمْنِيْ

وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی پیروی میں ان الفاظ کے ساتھ کثرت سے اللہ تعالیٰ کی مدد مانگتے تھے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا جب انتقال کا وقت آیا تو انہوں نے مالک بن یخامر سکسکی رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ مالک بن یخامر رحمہ اللہ نے عرض کیا:

''اللہ کی قسم! میں آپ سے جو دنیا حاصل کرتا تھا' اُس پر نہیں رو رہا بلکہ آپ سے میں جو علم اور ایمان سیکھتا تھا' اس سے محرومی کی بناء پر رو رہا ہوں''۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اُنہیں جواب میں فرمایا:

''علم اور ایمان کی بھی کچھ مخصوص جگہیں ہیں' جو انہیں وہاں سے تلاش کرتا ہے تو انہیں پالیتا ہے۔ تم ان چار حضرات سے علم حاصل کرنا' حضرت عویمر ابی الدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے چوتھا نام بھی ذکر فرمایا تھا۔ (پھر فرمایا) اگر یہ حضرات علم کی کسی بات سے عاجز آ گئے تو باقی سارے روئے زمین کے لوگ ان سے زیادہ عاجز ہوں گے' ایسی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معلّم (یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہ) سے مدد مانگنا''۔ (ح ۵۳)

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ کوئی فتویٰ دیتے تھے اور نہ کوئی بات کرتے تھے مگر پہلے یہ

پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ سَلِّمْنِیْ وَسَلِّمْ مِنِّیْ (ح،۵۴)

(۲)......مفتی کیلئے مناسب نہیں ہے کہ جس مجلس میں اُس سے بڑے عالم موجود ہوں‘ وہاں فتویٰ دینے میں جلدی کرے بلکہ ایسی صورت میں سوال اُن کے سامنے پیش کر دے۔ (ح،۵۵)

اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہوگی کہ جب مفتی کو وہ ہی بڑے عالم جواب دینے کا حکم دیں تو تب وہ اپنے علم کے مطابق جواب دے دے۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"افتاء کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ مفتی‘ مستفتی حضرات کے درمیان ترتیب اور عدل کا لحاظ کرے۔ مفتی‘ مالدار لوگوں یا سلطان اور امراء کے خواص کی طرف مائل نہ ہو بلکہ جو بھی پہلے آئے‘ اُس کا جواب پہلے دے‘ خواہ وہ مالدار ہو یا فقیر"۔ (ح،۵۶)

(بندہ کو ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا پہلی بات سے ربط سمجھ میں نہیں آیا۔ بظاہر یہ ایک الگ اور مستقل ادب ہے)۔

(۳)......مفتی کیلئے مناسب ہے کہ جب تک جواب کے صحیح ہونے پر اُسے اچھی طرح اطمینان حاصل نہ ہو جائے‘ وہ جواب نہ دے۔ بلکہ اگر اس کے دل میں معمولی سا بھی شبہ ہو تو وہ جواب نہ دے اور اس سلسلے میں مستفتی کے اس اصرار سے متاثر نہ ہو کہ اُسے جلدی جواب چاہیے۔

جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ چلتے ہوئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے‘ تو اُن کی بات کا مقصد بھی یہی ہے۔ (کہ اس حال میں غور و فکر کرنا مشکل ہوتا ہے)۔

ابن السلام رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ کبھی کوئی مستفتی اُن سے جلدی جواب کا بہت اصرار کرتا اور یہ بتاتا کہ وہ بہت دور سے آیا ہے تو وہ اُسے فرماتے:

فلا نحن نا دینا ك من حیث جئتنا
ولا نحن عمینا علیك المذاھبا

(جناب! جہاں سے آپ آئے ہیں‘ ہم نے تو آپ کو نہیں بلایا اور نہ ہی ہم نے دیگر راستے آپ کیلئے بند کر دیئے ہیں)۔ (ح،۵۷)

حضرت سحنون رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے:

اُن کے پاس "صطفورۃ" (افریقہ کا ایک شہر ہے۔معجم البلدان حموی) سے ایک صاحب آئے اور کوئی مسئلہ پوچھا اور پھر مسلسل تین دن جواب کیلئے آتے رہے۔ بالآخر انہوں نے عرض کیا:

''اللہ پاک آپ کو تندرست رکھے! میرے مسئلے کو تین دن ہو گئے''۔

حضرت سحنون رحمہ اللہ نے فرمایا:

''میں آپ کیلئے کیا کر سکتا ہوں؟ آپ کے مسئلے میں میری کیا تدبیر کارآمد ہو گی؟ نیا پیش آیا ہوا مشکل مسئلہ ہے اور اس میں مختلف اقوال ہیں اور میں اس بارے میں کسی ایک کو ترجیح دوں گا''۔

اُن صطفوری صاحب نے کہا:

''اللہ پاک آپ کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرے' آپ ہر مشکل مسئلہ کیلئے ہیں نا! اس پر حضرت سحنون رحمہ اللہ نے فرمایا:

''یہ بہت دور کی بات ہے اے میرے بھتیجے! میں آپ کے اس کہنے سے اپنے گوشت اور خون کو آگ کی خوراک نہیں بنا سکتا۔ ایسے تو بہت سے مسائل ہیں' جو میں نہیں جانتا۔ اگر آپ صبر کر سکیں تو مجھے امید ہے کہ آپ اپنے مسئلے کا جواب لے کر جائیں گے اور اگر میرے علاوہ کسی اور سے پوچھنا چاہیں تو تشریف لے جائیں' آپ کو فوراً ہی جواب مل جائے گا''۔

انہوں نے عرض کیا ''میں تو آپ کے پاس ہی آیا ہوں اور کسی دوسرے کے پاس نہیں جانا چاہتا۔

تو حضرت سحنون رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ آپ کو عافیت سے رکھے! پھر صبر کریں'' بعد ازاں انہوں نے سوال کا جواب دے دیا۔ ح۵۸۰

ہم پہلے فتویٰ دینے کی بابت احتیاط اختیار کرنے اور خوفزدہ رہنے کے بارے میں اسلافِ کرام کے اتنے حالات لکھ چکے ہیں جو انسان کو فتویٰ دینے میں جلد بازی سے روکنے کیلئے کافی ہیں۔ (کتاب کے آغاز میں "تهيب السلف للفتيا" کے عنوان کے تحت ان کی تفصیل گزر چکی ہے)

(۴)......مفتی کیلئے اس بات کی رعایت کرنا بھی مناسب ہے کہ وہ ایسے وقت میں فتویٰ نہ دے کہ اُس کا دل ایسے غصہ، خوف یا شہوت میں مشغول ہو' جو اُسے حالتِ اعتدال سے نکال دے۔ اسی طرح شدید غم اور انتہائی خوشی وغیرہ میں بھی فتویٰ نہ دینا چاہیے۔

اگر مفتی اتنا متاثر ہو کہ وہ صحیح طرح غور و فکر نہ کر سکے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ فتویٰ دینے سے اُس وقت تک باز رہے'

جب تک اُس کی طبیعت اپنی اصل حالت پر واپس نہیں آجاتی۔

یہ حکم اُس وقت بھی ہوگا جب مفتی کو اونگھ آرہی ہو' یا بھوک لگی ہو' یا شدید بیماری ہو' یا بے قرار کردینے والی گرمی ہو' یا تکلیف دہ سردی ہو یا قضائے حاجت کا تقاضا ہو۔

(۵)......مفتی کو چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے' مستفتی کی بدسلوکی پر صبر سے کام لے۔ علماء نے اس بات پر حضرت داؤد علیہ السلام کے قرآن مجید میں بیان کردہ واقعہ سے استدلال کیا ہے' جس میں یہ آیت ہے کہ جب دو افراد' جو مقدمے کے فریق تھے' دیوار پر چڑھ کر عبادت گاہ میں گھس آئے اور اُنہیں کہنے لگے:

وَلَا تُشْطِطْ (ص۔ ۲۲)

''اور آپ زیادتی نہ کیجئے''۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کو اتنی بدسلوکی کے باوجود جو انہوں نے کی تھی' نہیں جھڑکا۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس (واقعہ میں ان افراد کی طرف سے) جو بدکلامی ہے وہ بالکل ظاہر ہے...... حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف سے اُن کی باتیں برداشت کرنے میں اس بات کی راہنمائی ہے کہ مقدمے کے فریقوں کی طرف سے ایسی باتیں حاکم کو برداشت کرلینی چاہئیں۔ خاص طور پر جب کہ حقدار شخص ایسی بات کرے...... تعجب ہے اُس حاکم پر اور اُس ثالث پر اور اُس شخص پر جس کی طرف جھگڑوں میں کچھ رجوع کیا جاتا ہے جیسے مفتی' کہ یہ لوگ اللہ کے خاص ذکر کرنے والے اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی اس بارے میں کوئی پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کے سامنے اگر مقدمے کے فریقوں میں سے کسی ایک کے منہ سے' اگر اچانک اور بغیر سوچے سمجھے ہی ایسی بات نکل جائے' جس سے اُن کی قدر اور شان میں کمی کا وہم ہوتا ہو تو وہ بری طرح غضبناک ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ دل میں غور کریں تو یہ ضرور جان لیں گے کہ اللہ کی قسم! یہ لوگ اس عظیم اور مقرب پیغمبر علیہ السلام کی بنسبت مکھی کے ناک کے برابر بھی انصاف نہیں کرتے۔

اے اللہ! ہمیں اچھے اخلاق کی ہدایت دے اور ہمیں غلطیوں سے محفوظ فرما'' (آمین)۔ (ج۲۳، ۵۹)

(۶)......بہتر یہ ہے کہ مفتی' جواب کے آغاز میں ہی مسئلہ کا حکم ایسی واضح تعبیر کے ساتھ بیان کردے' جسے مخاطب سمجھ لے اور مسئلہ کا حکم بیان کرتے وقت' دلائل کا بالکل ذکر نہ کرے۔ تاکہ مستفتی شروع میں ہی جواب سے فائدہ اٹھا

سکے، پھر مفتی دلائل ذکر کر دے۔ ہاں اگر مستفتی' علماء میں سے ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ مفتی جواب کا آغاز ہی دلائل سے کرے۔

(۷)...... مفتی کیلئے مناسب ہے کہ وہ مسئلہ کا حکم ایسی آسان عبارت میں لکھے' جسے ہر عالم اور عامی شخص سمجھ سکے۔ البتہ اگر مستفتی عالم ہو تو پھر حکم بیان کرنے میں علمی اور اصطلاحی عبارات استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں تک دلائل کا تعلق ہے تو اس بارے میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں:

بعض فقہاء کا موقف یہ ہے کہ مفتی صرف حکم بیان کرنے کا ذمہ دار ہے اور اُس کیلئے حکم کی دلیل ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

شافعیہ میں سے علامہ ماوردی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ (ح۶۰)

حنابلہ میں سے ابن حمدان رحمہ اللہ (ت۱۵۹) نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (ح۶۱)

مالکیہ میں سے علامہ قرافی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور وہ مزید لکھتے ہیں:

''سوائے اس صورت کے کہ جب مفتی کو معلوم ہو کہ بعض فقہاء اس فتوی کا انکار کریں گے اور اس میں جھگڑا پیدا ہوگا' تو (دلائل کے ذکر کرنے سے) اُس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ان فقہاء کے سامنے صحیح صورت حال بیان کر دے' جن سے نزاع کا خوف ہے تو یا وہ اس سے راہنمائی حاصل کر لیں گے یا (کم از کم) اس طرح وہ اپنی عزت کو طعن و تشنیع سے محفوظ کر لے گا''۔ (ح۶۲)

بعض فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ جب دلیل واضح اور مختصر نص ہو تو مفتی کیلئے جائز ہے کہ وہ اُسے ذکر کر دے۔ باقی قیاس اور اس جیسی دیگر باتیں فتویٰ میں لکھنا نامناسب ہیں۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ اور ابن الصلاح رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

بعض فقہاء فرماتے ہیں:

مفتی کیلئے مستحب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکم کی دلیل اور اپنے فتویٰ کا مأخذ ذکر کر دے۔ یہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے ہے۔

اہم اور راجح قول

یہاں ظاہر بات یہ ہے کہ مفتیان کرام میں سے جو غیر مجتہد ہیں' اُن کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنے فتویٰ کے مآخذ ذکر کر دیں۔ کیونکہ یہ حضرات' جیسا کہ پہلے گزر چکا' درحقیقت مفتی نہیں بلکہ مجتہدین میں سے ہی کسی مجتہد کے فتویٰ کو نقل کر

کے دینے والے ہیں۔لہٰذا ان کو چاہیے کہ یہ بات ذکر کریں کہ انہوں نے اس مجتہد کا قول کہاں سے لیا ہے۔البتہ اگر کوئی بہت معروف بات ہوتو پھر یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بنیاد پر جب مفتی، حکم کی دلیل ذکر کرے تو چاہیے کہ وہ مضبوط علمی عبارت میں ہو جسے سوائے علماء کے دیگر لوگ نہ سمجھ سکیں کیونکہ عام لوگ کبھی دلائل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے، جس سے وہ اشتباہ میں پڑ جاتے ہیں۔

(۸)......مناسب ہے کہ فتویٰ میں صرف شرعی حکم اور اس کی فقہی دلیل ہی ذکر کی جائے اور فتویٰ جذباتیت کے بغیر ہو نیز وقتی تعریف اور فوری غصے کے تقاضوں سے بھی خالی ہو۔اسی طرح یہ بھی مناسب ہے کہ فتویٰ کی عبارت نہ تو اتنی مختصر ہو کہ بات سمجھنے میں ہی خلل آجائے اور نہ اتنی طویل ہو کہ پڑھنے والا اُکتا جائے۔جواب کے جملوں میں سے کوئی جملہ بھی نئے فائدے سے خالی نہیں ہونا چاہیے (یعنی ایک بات کا ہی تکرار نہ ہو)۔

لہٰذا مفتی، فتوی میں طویل تمہیدات اور اسرار و حِکَم (یعنی احکامِ شریعت کے مقاصد اور حکمتیں) کو بیان سے اجتناب کرے گا، سوائے اس کے کہ مستفتی نے اس بارے میں پوچھا ہو اور مفتی کو بھی یقین ہو کہ یہ باتیں مستفتی کیلئے مفید ہیں۔لیکن علامہ قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب استفتاء کسی ایسے عظیم واقعہ کے بارے میں ہو، جو دین کے اہم امور یا مسلمانوں کی مصلحتوں کے متعلق ہے اور اُس کا تعلق ذمہ دار اور بااختیار لوگوں کے ساتھ بھی ہے تو ایسی صورت میں بات کو خوب واضح کرنا، سریع الفہم (جلد سمجھ میں آنے والی) عبارات کے ذریعے حق کو خوب بیان کرنا اور خوب مبالغہ سے کام لینا، حکم کی نافرمانی کرنے والوں کو ڈرانا اور حکم کو جلدی پورا کرنے پر خوب ابھارنا تاکہ مصلحتیں حاصل کی جاسکیں اور مفاسد کو دور کیا جاسکے، یہ سب اسلوب اختیار کرنا مفتی کیلئے مناسب ہے۔

ایسے مقامات اور مواقع پر بات کو پھیلانا اور ایسے دلائل ذکر کرنا جو ان شرعی مصلحتوں پر ابھاریں یہ بھی بہترین طریقہ ہے۔اسی طرح فتویٰ میں اُن منکرات کے متعلقات پر نکیر کرنا، جن کی حرمت اور برائی پر سب کا اتفاق ہے، یہ بھی بہترین طریقہ ہے۔ان مواقع کے علاوہ دیگر فتاویٰ میں یہ طریقہ کار مناسب نہیں ہے بلکہ صرف سوال کا جواب دینے پر ہی اکتفاء کرنا چاہیے''۔ ح ۱۳۰

(۹)......مفتی کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ ''حرام'' کا لفظ صرف تب کہے جب کسی کام کی حرمت دلائل قطعیہ سے

ثابت ہو۔ اب وہ امور جن پر کوئی نص نہیں ہے اور وہ امور جو اجتہادی ہیں، تو وہاں اس لفظ کے بجائے دوسری تعبیر اختیار کرنی چاہیے مثلاً یوں کہہ دے کہ ''یہ جائز نہیں ہے''۔ یا ''یہ ناپسندیدہ ہے''۔ جتنے درجے کی نکیر چاہیے ہو اس کے مطابق الفاظ اختیار کرنے چاہئیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''موجودہ لوگوں کا یہ حال تھا نہ پہلے لوگوں کا اور نہ ہی اُن اسلاف کرام کا جن کی پیروی مسلمان کرتے ہیں اور اسلام کا دارومدار جن پر ہے کہ وہ یہ کہتے رہیں:

''یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے''۔ لیکن (ضرورت پڑنے پر) وہ یہ کہہ دیتے تھے ''میں اس کو ناپسند کرتا ہوں'' یا ''میں اس کو پسند کرتا ہوں''۔ رہا حلال و حرام (کا اپنی طرف سے حکم لگا لینا تو) یہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سن رکھا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (یونس۔۵۹)

(تو حلال وہ ہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہو اور حرام وہ ہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو)۔ ج ۱۲۷

(اس سلسلے میں ''ھدایۃ'' میں بھی ہے:

''وما لم يجد فيه نصاً يحتاط في ذلك فيقول في الحل ''لا بأس به'' وفي الحرمة يقول ''يكره'' او ''لم يؤكل''۔

(جس جانور کے بارے میں واضح نص انہوں نے نہیں پائی تو اس کا حکم بیان کرنے میں احتیاط کی ہے، اُس کے حلال ہونے کی صورت میں ''کوئی حرج نہیں'' اور اُس کے حرام ہونے کی صورت میں ''ناپسندیدہ ہے'' یا ''یہ نہیں کھایا جائے گا'' کہا ہے)۔

(کتاب الذبائح ۴/ ۴۴۳، طبع رحمانیہ، لاہور)

(۱۰)...... مفتی کو چاہیے کہ وہ مسائل جن میں عمومِ بلویٰ (عام ابتلاء) ہو اور وہ اُن احکام میں سے ہوں جن میں دلائل کا تعارض ہو تو ان میں وہ لوگوں کیلئے آسانی کا خیال رکھے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

انما العلم عندنا الرخصة من ثقة. فاما التشديد فيحسنه كل احد

''ہمارے نزدیک تو علم صرف یہ ہے کہ قابلِ اعتماد دلائل کی بنیاد پر (یا قابلِ اعتماد علماء کی طرف سے) آسانی اور رخصت بیان کرے، ورنہ حکم میں سختی کا پہلو اختیار کرنا، تو یہ کام ہر شخص بخوبی کر سکتا ہے''۔ (ح ۶۵)

دوسری طرف مفتی پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس سے بچے کہ منصوص امور میں آسانی پیدا کر کے لوگوں کو شرعی ذمہ داریوں سے ہی آزاد کر دے۔ (کہ وہ ہر ناجائز کام کو بھی جائز سمجھنے لگ جائیں)۔

(۱۱)...... مفتی کو چاہیے کہ ایسے جدید مسائل، جن کے بارے میں قرآن وسنت یا متوارث اور منقول فقہ میں کوئی صریح نص نہ ہو، وہ عبادت گزار فقہاء سے مشورہ کرے۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''میں نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! اگر ہمارے پاس کوئی ایسا معاملہ آجائے، جس میں (پہلے سے) کوئی وضاحت، امر یا نہی کی شکل میں موجود نہ ہو تو آپ ہمیں اس بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟''۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

شاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رای خاصة

''تم عبادت گزار فقہاء سے مشاورت کرو اور اس میں کسی خاص شخص کی رائے مت نافذ کرو''۔ (ح ۶۶)

خطیب رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

اجمعوا له العابدين من امتي، واجعلوه شوریٰ بينكم ولا تقضوه برای واحد۔ (ح ۶۷)

(ایسے مسئلہ کیلئے تم میری امت کے عبادت گزار لوگوں کو جمع کر لو اور اُس پر باہم مشورہ کرو اور تم اس پر کسی ایک شخص کی رائے کے مطابق فیصلہ مت کرو)۔

سنن دارمی میں حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

نبی کریم ﷺ سے ایسے معاملے کے بارے میں پوچھا گیا جو نیا پیش آیا ہو اور قرآن وسنت میں اُس کا حکم بیان نہ ہوا ہو تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ینظر فیه العابدون من المومنین (ح،۶۸)

(ایسے مسئلہ پر ایمان والوں میں سے عبادت گزار لوگ غور وفکر کریں)

فقہی مسائل میں دوسروں سے مشورہ کرنا' ہمیشہ سے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کی عادت رہی ہے۔ امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس سلسلے میں ان حضرات کے کئی آثار نقل فرمائے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض تابعین نے تو ان لوگوں پر نکیر فرمائی ہے جو تن تنہا فتویٰ دیتے ہیں' فتویٰ میں انفرادیت اختیار کرتے ہیں اور اپنے علاوہ دیگر حضرات سے مشورہ نہیں کرتے۔

ابوحصین رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

ان احدھم لیفتی فی المسئلة، ولو وردت علی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لجمع لھا اھل بدر (ح،۶۹)

(ان لوگوں میں سے کوئی ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں فتویٰ دے ڈالتا ہے کہ اگر وہ ہی مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوتا تو وہ مشورہ کیلئے تمام بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر لیتے)۔

(ابوالحصین رحمہ اللہ کا یہ مقولہ پہلے "تھیب السلف للفتیا" کے عنوان کے تحت' اصل کتاب کے ص ۲۱ پر گزر چکا ہے)

(۱۲)......ایسے شاذ فتاویٰ سے بچنا واجب ہے' جو جمہور فقہاء امت کے خلاف ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

ان اللہ لا یجمع امتی۔ اوقال: امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ علی ضلالة، وید اللہ علی الجماعة، ومن شذ شذ الی النار۔ (ح،۷۰)

(بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو' یا یہ الفاظ فرمائے کہ اللہ تعالیٰ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے اور جو اکیلا کسی راہ پر چلے گا' وہ اکیلا ہی آگ میں جائے گا)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

" ان امتی لا تجتمع علی ضلالة، فاذا رایتم اختلافاً، فعلیکم

بالسواد الاعظم"۔

(بے شک میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ لہٰذا جب تم کوئی اختلاف دیکھو تو بڑے گروہ کو لازم پکڑو)۔ ح۱۰۷

بعض فقہاء نے ایسے تفرّدات (یعنی سب سے الگ مؤقف والے مسائل) اختیار کیے جنہیں جمہور اہل علم نے نہیں لیا بلکہ اُن سے صاف طور پر روکا۔ ایسے تفردات کو آسانی حاصل کرنے اور رخصتیں تلاش کرنے کیلئے اختیار کر لینا ایسا کام ہے جسے قدیم اور جدید تمام علماء نے ہی برا کہا ہے۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس شخص نے علماء کے صرف نادر اقوال لے لیے، وہ اسلام سے نکل گیا''۔ ح۱۰۸

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص، مختلف مذاہب کی آسانیوں اور مجتہدین کی غلطیوں کے پیچھے پڑ گیا تو اُس کا دین کمزور ہو جائے گا۔ جیسا کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ جو متعہ کے بارے میں اہلِ مکہ کا قول اختیار کرلے، نبیذ (نشہ آور شربت) کے بارے میں اہلِ کوفہ کا، گانے بجانے کے بارے میں اہلِ مدینہ اور خلفاء کے معصوم ہونے کے بارے میں اہلِ شام کے قول کو لے لے تو اُس نے شر کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اسی طرح جس شخص نے رِبا (سود) کے معاملات میں اُس شخص کی بات کو لے لیا جو اُس میں حیلۃ سے کام لیتے ہیں اور طلاق و نکاحِ تحلیل (حلالہ) میں اُن کی بات لے لی جو اس میں توسع اور آسانی کے قائل ہیں اور دیگر ایسے مسائل میں طریقہ کار اختیار کیا تو وہ شخص (اپنی) تباہی کے درپے ہو گیا ہے''۔ ح۱۰۹

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص ہر رخصت پر عمل کرے کہ نبیذ (کھجور وغیرہ سے بنا میٹھا مشروب) کے بارے میں اہلِ کوفہ کی بات لے اور سماع کے بارے میں اہلِ مدینہ کی اور متعہ کے بارے میں اہل مکہ کی تو وہ فاسق ہے''۔

امام معمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص سماع یعنی گانے بجانے کے بارے میں اہل مدینہ کے مذہب کو لے نیز عورتوں سے غیر فطری عمل کے بارے میں بھی ان کے قول کو اختیار کر لے۔ متعہ اور بیع صرف میں اہل مکہ کے قول کو لے اور نشہ آور چیز کے بارے میں اہل کوفہ کی بات اختیار کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سب سے برا ہوگا''۔

حضرت سلیمان تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر تم ہر عالم کی رخصت (آسان مسئلے) کو لے لوگے' یا یہ فرمایا کہ ہر عالم کی غلطی کو لے لوگے' تو ساری برائی تم میں جمع ہو جائے گی''۔ ح۷۴

حضرت عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص شاذ اقوال کو اختیار کرے' وہ علم میں امامت کے مرتبے پر فائز نہیں ہوسکتا' نہ ہی وہ شخص علم میں امام بن سکتا ہے جو ہر ایک سے روایتِ حدیث کر لے' اسی طرح وہ شخص بھی علم میں مقتداء اور راہنما نہیں بن سکتا' جو ہر سنی سنائی بات نقل کر دے''۔ ح۷۵

(یہ اقوال تفصیل سے پہلے الافتاء بمذھب آخر کے باب میں الافتاء بمذھب آخر لحاجة عامة کے عنوان سے گزر چکے ہیں)۔

یہ اِن حضرات کی رائے ہے اُن شاذ اقوال کے بارے میں جو ایسے بڑے فقہاء کرام سے صادر ہوئے جو قابل اعتماد بھی تھے اور اہلِ علم نے اُن کے تفقہ اور تقویٰ کی گواہی بھی دی ہے۔ اب تمہارا کیا خیال ہے اُن شاذ اقوال کے بارے میں جو ایسے چند لوگوں سے صادر ہوئے' جن کو علم اور فقہ سے کوئی تعلق نہیں اور انہوں نے جو کچھ کہا محض اپنی غیر معتدل آراء یا نفسانی جذبات کی بنیاد پر کہا۔ یا ایسی اجنبی ثقافتوں کی بناء پر کہا' جن کا اسلام سے کوئی ربط و تعلق نہیں۔

لہٰذا (ہر مسئلے میں) اُسی بات کو لینا لازم ہوگا' جو شریعت اسلامیہ کے بنیادی مآخذ (قرآن وسنت) شریعت کے عظیم مقاصد اور جمہور فقہاء کرام کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے' سب اقوال سے دلیل کے اعتبار سے راجح اور حجت کے اعتبار سے مضبوط ہو۔

(۱۳)......شرعی حکم بیان کرتے وقت ہر قسم کے دباؤ قبول کرنے سے بچنا واجب ہے' یہ دباؤ خواہ ذاتی ہو یا سیاسی' حکومتی ہو یا گروہی۔ پھر یہ دباؤ ڈالنے والے خواہ مستفتی ہو' کوئی پارٹیاں ہوں یا حکومتیں ہوں۔

کیونکہ فتویٰ دینا' اللہ تعالیٰ کے حکم اور پیغام کو دوسرں تک پہنچانا ہے اور جو لوگ یہ واجب ادا کر رہے ہیں' ان کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۔ (الاحزاب۔۳۹)

(پیغمبر وہ لوگ ہیں جو اللہ کے بھیجے ہوئے احکام کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حساب لینے کیلئے اللہ کو کسی کی ضرورت نہیں)۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (المائدہ۔۵۴)

(اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا' اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے' جو مومنوں کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے' اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور اللہ بڑی وسعت والا' بڑے علم والا ہے)۔

(۱۴)...... جب استفتاء کا تعلق اصول دین یا شریعت کے قطعی مسائل سے ہو تو لازمی ہے کہ دلیل' قرآن وسنت سے بیان کی جائے، نہ کہ صرف فقہ کی کتابوں سے۔ کیونکہ اصول میں اجتہاد اور تقلید کا گزر نہیں ہے (تقلید صرف فروعی مسائل میں ہوتی ہے' تفصیل کیلئے اسی کتاب میں تقلید کی بحث دیکھیں)۔

اس کی مثال جیسے عقیدۂ توحید' رسالت' آخرت نیز شراب' جھوٹ اور زنا جیسے مسائل کی حرمت کے بارے میں سوال کیا جائے۔ ہاں اگر مسئلہ کا تعلق فروعی فقہی احکام سے ہے تو پھر دلیل فقہی کتابوں سے لکھی جائے گی اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایسی صورت میں صرف اسی پر اکتفاء کر لیا جائے۔

(۱۵)...... اگر مفتی کے پاس کسی دوسرے کا فتویٰ تصدیق کی غرض سے لایا جائے تو اُس پر لازم ہے کہ پہلے وہ یہ

دیکھ لے کہ کیا پہلا مفتی، فتویٰ دینے کا اہل بھی ہے یا نہیں؟ اگر وہ فتویٰ دینے کا اہل نہیں ہے تو وہ اپنی تصدیق اُس کے فتویٰ پر نہ لکھے اگرچہ جواب بالکل درست ہو، بلکہ اُسے چاہیے کہ وہ الگ سے اپنا جواب لکھ کر دیدے۔

(از حاشیہ:

علامہ قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب مفتی کے پاس کوئی ایسا فتویٰ آئے، جس میں ایسے شخص کی تحریر ہو جو فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اُسے چاہیے کہ وہ اُس فتویٰ پر کچھ نہ لکھے کیونکہ اگر وہ لکھے گا تو یہ اُس نااہل شخص کے طرزِ عمل کی تائید ہوگی اور اُس کی ایسی بات کو رائج کرنے میں تعاون ہو جائے گا، جو نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ اُس نااہل کا جواب درست بھی ہو کیونکہ کبھی جاہل بھی صحیح جواب دے دیتا ہے۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں ایسا شخص فتویٰ دے جو اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ کسی کا نااہل ہونا کبھی علم کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی دینداری کی کمی کی بناء پر اور کبھی دونوں ہی وجوہات نااہلی کی جمع ہو جاتی ہیں''۔

(الاحکام للقرافی، ص ۲۴۷)

اگر پہلا مفتی، فتویٰ دینے کا واقعی اہل ہے تو پھر دو صورتیں ہیں:

جس کے پاس تصدیق کیلئے فتویٰ آیا ہے، اُس کے نزدیک یہ فتویٰ صحیح ہے یا صحیح نہیں ہے۔ اگر اس کے نزدیک پہلے مفتی کا فتویٰ درست نہیں تو یہ اپنا جواب الگ لکھ دے۔

پھر اگر اس کے نزدیک پہلے مفتی کا جواب صحیح ہے تو پھر دو صورتیں ہیں:

پہلے مفتی نے اپنے جواب پر جس دلیل سے استدلال کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر دلیل صحیح نہیں یا اُس میں کسی اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے تو اس صورت میں بھی یہ اپنا جواب دلیل کی درستگی کے ساتھ الگ لکھ دے۔

اور اگر اس کے نزدیک دلیل بھی صحیح ہے تو پھر اس کیلئے گنجائش ہے کہ یہ پہلے فتویٰ پر ہی ''**الجواب صحیح**'' لکھ کر اپنے دستخط کر دے۔

(از حاشیہ:

اگر اصل جواب لکھنے والے مفتی، تصدیق کرنے والے سے علم اور مرتبے میں بڑے ہوں تو اسلاف نے ایسی صورت میں "**الجواب صحیح**" لکھنے کو ناپسند کیا ہے۔

علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایسی صورت میں تصدیق کرنے والا یوں لکھ دے "کذلک جوابی" تو یہ تواضع کے زیادہ مناسب ہے)۔

(الاحکام للقرافی، ص۲۴٦)

(۱٦)......علامہ صیمری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مفتی کیلئے مناسب ہے کہ اگر سائل کیلئے کوئی جائز راستہ اُسے معلوم ہے' تو اُس کی راہنمائی' اُس کی طرف کردے یا اُس بارے میں اس کو تنبیہ کردے یعنی جب تک کسی دوسرے کو ناحق تکلیف اور ضرر نہ پہنچے۔ جیسے کسی شخص نے قسم کھالی کہ وہ اپنی بیوی کو ایک مہینے تک خرچ نہیں دے گا' تو مفتی اُسے کہے کہ تم اپنی بیوی کو اس کے مہر میں سے کچھ دیدو' یا قرض کے طور پر دے دو یا اُس کو سامان ضرورت بیچ دو اور بعد میں تم اُسے واجب الاداء رقم سے بری کردینا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص نے اُنہیں کہا کہ میں نے اس بات کی قسم اٹھالی ہے کہ ''میں رمضان کے مہینے میں (دن کے وقت) اپنی بیوی سے ایسی ہمبستری کروں گا کہ نہ میں گنہگار رہوں گا اور نہ مجھ پر کفارہ آئے گا''۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے فرمایا: ''تم اپنی بیوی کو لے کر سفر پر چلے جاؤ''۔ ح۶،ک

(سفرِ شرعی میں رمضان کا روزہ قضاء کرنے کی اجازت ہوتی ہے)

(المجموع شرح المهذب، المقدمة، فصل فی آداب الفتوی، المسألة الحادية عشرة۔ اصل کتاب کے حاشیہ میں اس کا حوالہ "منقول من الفتوی فی الاسلام لجمال الدین القاسمی، ص ۹۴" درج ہے' یہ کتاب بندہ کو نہیں مل سکی لیکن بحمدللہ تعالیٰ "المجموع" میں بعینہ یہ عبارت مل گئی)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب مستفتی کسی تنگی میں مبتلا ہو رہا ہو تو مفتی اُس کے سامنے ایسی جائز صورت بیان کردے گا جس کے ذریعے وہ تنگی سے نکل سکے۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر ابوجبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ ابوجبلہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم سرزمین شام پر آتے ہیں تو ہمارے پاس پورے وزن کے (بھاری چاندی کے) بازار میں چلنے والے چاندی کے سکے (درہم) ہوتے ہیں اور یہاں کے لوگوں کے پاس ہلکے وزن کے' بازار میں نہ چلنے والے چاندی کے سکے

(درہم) ہوتے ہیں۔کیا ہم اپنے ساڑھے نو درہم کے بدلے اُن کے دس درہم خرید سکتے ہیں؟''
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

لا تفعل ولكن بع ورقك بذهب، واشتر ورقهم بالذهب، ولا تفارقه حتى تستوفى، وان وثب فثب معه''۔

(تم ایسا مت کرو۔لیکن تم ایسا کر سکتے ہو کہ اپنے (چاندی کے) درہم' سونے کے بدلے فروخت کر دو اور پھر سونے کے بدلے اُن کے (چاندی کے) درہم خرید لو اور تم خریدار سے اُس وقت تک جدا مت ہو' جب تک وہ تمہیں ادائیگی نہ کر دے اور اگر وہ تمہارے پاس سے تیزی سے چل دے تو تم بھی اُس کے ساتھ چل پڑو)۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس مؤقف سے رجوع کی دلیل ملتی ہے کہ (اموالِ ربویہ میں) تفاضل جائز ہے۔جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب تھا اور اس بات کی بھی یہ دلیل ہے کہ نقود (دراہم و دنانیر) میں (جودت) عمدگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔نیز اس عبارت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مفتی جب اُس مسئلہ کا جواب دے دے جو اُس سے پوچھا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ سائل کو ایسا راستہ بتا دے جس سے وہ حرام سے بچتے ہوئے اپنا مقصود حاصل کر لے اور یہ طریقۂ کار، حیلوں کی تعلیم دینے کی مذمت کے تحت نہیں آتا۔بلکہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد کی پیروی کرنا جو آپ نے خیبر کے عامل کو فرمایا تھا:

هلا بعت تمرك بسلعة ثم اشتريت بسلعتك هذا التمر

(تم نے اپنی کھجوریں' کسی سامان کے بدلے کیوں نہ بیچ دیں کہ پھر تم اس سامان کے بدلے یہ کھجوریں خرید لیتے)۔ ج---

(۱۷)......جب مفتی کو مسئلہ کا جواب سمجھ نہ آ رہا ہو یا وہ چاہتا ہے کہ مستفتی کو کسی دوسرے مفتی کی راہنمائی کر دے تو مناسب یہی ہے کہ صرف اُسی مفتی کی طرف راہنمائی کرے جسے وہ اُن لوگوں میں سمجھتا ہے جو واقعتاً فتویٰ دینے کے اہل ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ بہت اہمیت (اور خطرے) کا مقام ہے، لہٰذا انسان کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہ اس بارے میں کیا کرتا ہے، کیونکہ کہیں وہ اپنی راہنمائی کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اُن کے احکامات میں جھوٹ باندھنے کا یا بغیر علم کے اُن کی طرف کوئی بات منسوب کرنے کا ذریعہ تو نہیں بن رہا ہے۔ اس طرح وہ گناہ اور ظلم پر تعاون کرنے والا ہوگا اور یا وہ نیکی اور تقویٰ پر معاون بن سکتا ہے (کہ اہل مفتی کی طرف راہنمائی کرے) لہٰذا انسان کو خوب غور کر لینا چاہیے کہ وہ (دوسرے لوگوں کی) کس کی طرف راہنمائی کر رہا ہے اور اس بارے میں اُسے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے''۔ ح-۱۰

فتویٰ لکھنے کے آداب

آداب کتابۃ الفتوی

(۱)...... مفتی کو چاہیے کہ فتویٰ لکھنے میں اپنے خط (تحریر) کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرے کیونکہ اچھا خط، مطلب کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے اور اشتباہ سے بچاتا ہے۔ اسی طرح اچھے خط کا عبارت کے مؤثر ہونے میں بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنا خط اس نیت سے اچھا بنائے کہ پڑھنے والے کو اس سے راحت ملے گی تو اُسے اس پر بھی ثواب ملے گا۔ (ان شاء اللہ)۔

(۲)...... مناسب ہے کہ جواب کو اُسی کاغذ پر لکھا جائے، جس پر سوال لکھا ہوا ہے اور جب تک ممکن ہو الگ کاغذ پر جواب نہ لکھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ کسی شخص کیلئے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ کوئی دوسرا سوال گھڑ کر اُسے مفتی کے لکھے ہوئے جواب کے ساتھ لگا دے۔

(۳)...... مفتی اپنے فتویٰ کے لکھنے کا آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور حمد و صلاۃ (اللہ کی تعریف اور درود شریف) سے کرے۔

(۴)...... ایسی لکھائی ہونا مناسب ہے کہ جس سے کوئی اشتباہ پیدا ہونے کا ڈر نہ ہو۔

(۵)...... مناسب ہے کہ مفتی اپنے جواب کے آخر میں "واللہ اعلم" یا ایسا کوئی جملہ لکھ دے اور یہ بھی کہا گیا

ہے عقائد کے مسائل میں "واللہ الموفق" یا اس جیسا کوئی جملہ لکھے۔

ح، ۷۹

(٦)...... مفتی اپنے جواب کے آخر میں ایسے دستخط کرے جو سمجھ میں آتے ہوں اور اس کے آخر میں فتویٰ لکھنے کی تاریخ بھی لکھ دے۔

مفتی کیلئے ذاتی آداب

آداب المفتی فی نفسه

(۱)...... فتویٰ دینے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی ہیئت اور لباس کو اچھا رکھے، اس میں شرعی امور کی پابندی کرے، طہارت و نظافت کا خیال رکھے، ستر پوشی کا اہتمام کرے، ریشم، سونا اور اس لباس سے اجتناب کرے جس میں کفار کے مخصوص نشانات اور مشابہت ہو۔

امام قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مفتی کو چاہیے کہ وہ شرعی طریقے کے مطابق اچھی ہیئت اور شکل اختیار کرے کیونکہ لوگوں کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ نمایاں صورت کی تعظیم کرتے ہیں اور جب تک مفتی کی تعظیم لوگوں کے دلوں میں نہیں ہوگی تو وہ نہ تو اس کی راہنمائی قبول کریں گے اور نہ ہی اس کی بات کی پیروی کریں گے"۔ ح، ۸۰

(۲)...... مفتی اپنی عادات کو سنوارے، اپنے افعال کو شریعت کے مطابق بنائے اور اپنے اقوال کو شریعت کے ترازو میں تولے کیونکہ وہ اپنے منصب اور احکام خداوندی کے بیان کرنے کی وجہ سے لوگوں کیلئے اپنے قول و فعل میں مقتداء کہلائے گا۔ اور لوگوں کیلئے اس کے کام سے بھی بیان صادر ہوتا ہے (کہ لوگ بہت سے کام علماء کو کرتا دیکھ کر جائز سمجھ لیتے ہیں)۔ وہ صرف درمیانے افعال پر اکتفاء نہ کرے بلکہ عمل کے اعتبار سے سب سے اونچے لوگوں میں اس کا شمار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کی طرف لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں اور لوگ اس کے عادات و اطوار کی اتباع کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ح، ۸۱

(۳)...... اپنے اخلاق کو بہتر سے بہتر بنائے۔ اچھی نیت کو یاد رکھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا نائب ہے اور اس کے

دل میں اُس وعدے کے پورا کرنے کی نیت ہو جو اللہ تعالیٰ نے علماء سے لیا ہے کہ وہ حق کو بیان کریں گے اس کو نہیں چھپائیں گے اور یہ ارادہ ہو کہ قرآن وسنت پر عمل کو زندہ کرنا ہے، اس منتخب امت کے حالات کی اصلاح شریعت کے مطابق کرنی ہے، اس کا مقصد ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہو، لوگوں سے داد وصول کرنے یا شہرت اور ناموری کا ارادہ نہ ہو، نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بری نیتوں کو ذہن سے نکال دے، مثلاً لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کا شوق اور اپنی تعظیم اور احترام پر خوش ہونا اور لوگوں سے تعریف وثناء کا امیدوار ہونا یا مالی منافع حاصل کرنا وغیرہ۔

اس کو یہ بھی چاہیے کہ وہ اپنے دل کو ایسے امور سے بھی صاف رکھے جو بسا اوقات ایسے منصب پر فائز لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً غرور وتکبر اور دوسرے لوگوں پر بڑائی جتانا، بڑے بڑے فضلاء اور اہل مرتبہ لوگوں کی مشابہت اختیار کرنا نیز اپنی بات اور جواب پر خوش ہونا، خصوصاً جب اپنا جواب صحیح ہو تو اس صورت میں دوسروں کو جواب کے نہ سمجھنے کی بنیاد پر حقیر سمجھنا وغیرہ۔

ابن حمدان رحمہ اللہ نے امام سحنون رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

فتنة الجواب بالصواب اشد من فتنه المال

"صحیح جواب کا فتنہ مال کے فتنے سے زیادہ خطرناک ہے"۔ ح۸۲

(۴)...... مفتی کو چاہیے کہ جس نیکی کے کام کا فتویٰ دے اس پر خود بھی عمل کرے، بعض اصولیین نے لکھا ہے کہ جس شخص کا عمل تقاضۂ علم کے خلاف ہو اس کا فتویٰ درست نہیں ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

> "اس کے فتویٰ کا اعتبار اس لیے نہیں ہے کہ جب اس کے افعال واقوال خلاف شرع ہوں اور یہ فتویٰ بھی اس کے اقوال میں سے ایک قول ہے تو ممکن ہے کہ یہ بھی خلافِ شرع ہو لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے...... مثلاً اگر مفتی یہ کہتا ہے کہ بے مقصد باتوں سے خاموش رہنا چاہیے تو اگر وہ خود بھی بے مقصد باتوں سے خاموشی اختیار کرتا ہے تو اس کا فتویٰ صحیح ہے اور اگر وہ خود لایعنی میں مشغول رہتا ہے تو اس کا فتویٰ غیر صادق ہے"۔

اسی طرح اگر کوئی مفتی آپ کو دنیا سے بے رغبتی کی ترغیب دیتا ہے اور خود بھی دنیا سے کنارہ کش ہو تو اس کے فتویٰ میں اس کو صادق سمجھا جائے گا اور اگر وہ خود دنیا کی طرف راغب ہو تو اس کے فتویٰ میں اس کو جھوٹا کہا جائے گا۔

اگروہ تجھے نماز کی پابندی کا حکم دے اور خود بھی پابند ہو تو اس کا فتویٰ سچا ہو گا ورنہ نہیں' یہی ترتیب دوسرے احکام شرع اور دیگر اوامر و نواھی وغیرہ میں ہے، اگر وہ نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے منع کرے اور خود بھی بچتا ہو تو وہ اپنے فتوے میں سچا ہے یا وہ جھوٹ سے منع کرے اور خود بھی زبان کا سچا ہو یا بدکاری سے روکے اور خود بھی یہ نہ کرے یا فحش گفتگو سے ممانعت کرے اور خود بھی ایسی گفتگو نہ کرتا ہو یا برے لوگوں کے ساتھ اٹھنے، بیٹھنے سے روکے اور خود بھی ان سے بچتا ہو وغیرہ ایسی دیگر مثالیں۔

تو ایسا شخص اپنے فتوے کا سچا ہے اور ایسے ہی شخص کی باتوں اور کاموں کی پیروی کی جائے گی ورنہ نہیں، کیونکہ کسی کی بات کے سچے ہونے کی یہ علامت ہے کہ اُس کی بات اُس کے فعل کے مطابق ہو۔ بلکہ حقیقی سچ تو علماء کے ہاں صرف یہی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (الاحزاب:۲۳)

(وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا)

اس کے برخلاف صورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔

(التوبہ ۷۵، ۷۷، ۷۶)

(اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور یقینا نیک لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔ لیکن جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے نوازا تو اس میں بخل کرنے لگے اور منہ موڑ کر چل دیے۔ نتیجہ یہ کہ اللہ نے سزا کے طور پر نفاق اُن کے دلوں میں اُس دن تک کے لیے جما دیا ہے جس دن وہ اللہ سے جا کر ملیں گے' کیونکہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے)۔

دیکھیں اللہ تعالیٰ نے صدق اور سچائی اسی کو قرار دیا ہے کہ قول، فعل کے مطابق ہو اور کذب اس کی مخالفت کو قرار دیا...... اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس طرح جیسے آپ نے کہا! تو فتویٰ دینے کا کام بہت مشکل ہو جائے گا اور **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** میں دقت پیش آئے گی حالانکہ علماء کرام نے یہ لکھا ہے کہ **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود بھی اس کی پابندی کرتا ہو...... اور کون ایسا ہو سکتا ہے جس سے لغزش یا غلطی نہیں ہوتی اور نہ وہ گمراہ ہوتا ہے اور کس کا قول عمل کے مخالف نہیں ہو سکتا؟ خصوصاً اس زمانے میں، جو پیغمبر ﷺ کے دور مبارک سے بہت دور ہے۔

جواب:...... یہ سوال ہمارے مقرر کردہ (مفتی کے لیے) معیار پر وارد ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ کیسے شخص کا فتویٰ کیلئے تقرر کرنا درست ہے اور واقعتا اس سے (امت کو) فائدہ پہنچے گا، ہماری بات حکم شرعی کے بارے میں نہیں (کہ ایسے شخص کیلئے فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں۔ اس کے حکمِ شرعی کے بارے میں تو) ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد عالم پر واجب ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو سنبھالے اور بہر حال فتویٰ دے، خواہ اس کا فعل اس کے قول کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ لیکن (اپنے بے عمل ہونے کی صورت میں) اس کے فتویٰ سے (امت کو) فائدہ نہیں ہوگا اور اگر فائدہ ہو بھی گیا تو (زیادہ عرصہ) باقی نہیں رہے گا"۔ (ح:۸۳)

(۵)...... مفتی اپنے اعمال میں شبہات سے احتراز کرے اور اپنی ذات کی حد تک ان اعمال کا التزام کرے جن کو عام لوگوں کیلئے لازمی نہیں سمجھا جاتا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ ان اعمال کا بھی التزام کرتے تھے جن کو وہ دوسروں کیلئے غیر ضروری سمجھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کوئی شخص اس وقت تک عالم نہیں ہو سکتا جب تک خاص طور پر خود ایسے عمل نہ کرے جو لوگوں کیلئے لازم نہیں سمجھتا، ایسے عمل کہ اگر ان کو چھوڑ بھی دے تو وہ گناہگار نہیں ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ یہ طریقہ اپنے استاد ربیعہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے تھے۔

یہ بات امام نووی رحمہ اللہ نے **مقدمہ شرح المھذب** میں ذکر کی ہے۔ (ح:۸۴)

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ بات بھی مجتہد کے حق میں درست ہے کہ وہ اپنے آپ کو درمیانے درجے کے اعمال سے زیادہ

کا مکلف بنائے جیسا کہ رخصتوں کے احکام میں گزر چکا ہے اور چونکہ وہ اپنے قول وفعل میں مفتی ہے اس لیے ان جیسی چیزوں کو دوسروں سے چھپائے جس میں ممکن ہے کہ لوگ اس کی اقتداء کریں کیونکہ اس کی اتباع بسا اوقات ایسے لوگ کریں گے جن کو اس عمل کی طاقت نہیں ہے تو وہ اس کو ادا نہیں کر پائیں گے، اگر اتفاقاً لوگوں کے سامنے یہ عمل ظاہر ہو گیا تو مفتی اس پر تنبیہ کر دے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے...... یہی وجہ ہے کہ غالباً (واللہ اعلم) کہ سلف صالحین اپنے اعمال کو لوگوں سے چھپاتے تھے تا کہ لوگ ان کی اس بارے میں اتباع نہ کریں، نیز ریا کاری وغیرہ سے ڈرتے ہوئے بھی وہ ایسا کرتے تھے''۔ (ح۸۵)

میں نے اپنے بعض مشائخ سے سنا ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ عام لوگوں کو اس بات کا فتویٰ دیتے تھے کہ بازار سے پھل خریدنا جائز ہے اور اس تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ پھل اپنے ظاہر ہونے سے پہلے بیچے گئے ہیں یا اس کے بعد، لیکن خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پوری عمر بازار سے خریدے ہوئے پھل نہیں کھائے کیونکہ عام طور پر تاجر یہ پھل (باغات کی شکل میں) ان کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی خرید لیتے تھے۔ (جو جائز نہیں ہے) حضرت نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی البتہ آپ کے بعض ساتھیوں کو آپ کے طرزِ عمل سے یہ پتہ چلا۔ (واللہ سبحانہ اعلم)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ایک اہم قول ''تشریحات نمبر ۲۹'' میں دیکھیں

(۶)...... مفتی کو چاہیے کہ وہ مہارت حاصل کرنے کے ہمہ تن درپے ہو اور علم میں اضافہ کرنے کا حریص ہو، اپنی حاصل شدہ معلومات پر کبھی اکتفاء نہ کرے بلکہ ہمیشہ نت نئی معلومات حاصل کرنے کا اہتمام کرے۔ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے دنیاوی تعلقات میں کمی کرے اور کوشش کرے کہ وہ علم کی طرف متوجہ رہے۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے "الفقیہ والمتفقہ" میں سند کے ساتھ ملیح بن وکیع رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''میں نے ایک شخص کو سنا کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھ رہے تھے کہ فقہ کے یاد کرنے میں کس چیز سے مدد لی جاتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ قوت ارادی کو جمع کر کے۔ اس نے پوچھا کہ تعلقات کو کم کرنے میں کس چیز سے مدد لی جاتی ہے''؟

انہوں نے فرمایا:

''ضرورت کے وقت چیز لے لو اور زیادہ کی فکر نہ کرو''۔ (ح۸۶)

نیز انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے سنداً نقل کیا ہے

''انہوں نے فرمایا کہ کوئی شخص بھی دولت اور عزت کے ساتھ علم کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتا' ہاں وہ شخص جو نفس کی ذلت' تنگ دستی اور علماء کی خدمت کرے وہ ہی اس میں کامیاب ہوتا ہے''۔ ح،۸۷

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ربیع بن سلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کو کبھی دن میں کچھ کھاتے ہوئے اور رات کو سوتے ہوئے نہیں پایا، کیونکہ وہ تصنیف میں مشغول رہتے تھے''۔

امام ابن جماعہ رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر کی ہے۔ ح،۸۸

اس جیسے بے شمار واقعات علماء وفقہاء کے سوانح پر لکھی کتابوں میں ملتے ہیں۔

(۷)......مفتی کو چاہیے کہ وہ عبادات اور نوافل کی طرف پہل کرے، ابوقلابہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

اذا احدث الله لك علما فاحدث لله عبادة، ولا تكونن انما همك ان تحدث به الناس۔

(اللہ تعالیٰ نے جب تجھے علم سے نوازا تو تم اللہ تعالیٰ کیلئے عبادت کرو' نہ یہ کہ تمہاری فکر صرف یہ ہو کہ وہ علم لوگوں کو نقل کرتے رہو)۔ ح،۸۹

ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمے کی اکتیسویں (۳۱) فصل میں فرمایا ہے:

'' سلف صالحین رحمہم اللہ اور مسلمانوں میں سے جو اہل دین اور تقویٰ والے تھے تو انہوں نے شریعت کو عملی طور پر اپنا لیا تھا اور اس کے مذاہب کی پوری تحقیق کی تھی۔ جس نے شریعت کو نہ صرف نقل سے بلکہ عمل اور تحقیق دونوں طریقوں سے اپنایا، تو حقیقتاً وہی اس کا وارث شمار ہوگا، جیسا کہ رسالہ القشیریة ت،۱۶۰ کے مصنف اور جس کو یہ دونوں چیزیں حاصل ہوں درحقیقت عالم اور وارثِ دین وہی ہے۔ جیسے فقہاء تابعین' علمائے سلف، آئمہ اربعہ اور وہ لوگ جنہوں نے ان کے طریقے کو اپنایا اور ان کے نقش قدم کی پیروی کی۔

اگر کوئی فقیہ ان دونوں چیزوں میں سے ایک کا حامل ہو تو اس "غير عابد فقيه" (ایسا مفتی جو عبادت گزار نہ ہو) سے صرف عبادت گزار شخص زیادہ حقدار ہے کہ وارثِ دین بنے، کیونکہ عابد تو

ایک وصف کا وارث ہے لیکن "فقیہ غیر عابد" (ایسا مفتی جو عبادت گزار نہ ہو) کسی چیز کا وارث نہیں ہے، بلکہ وہ چند اقوال کا حامل ہے جن کو ہمارے سامنے اعمال کی کیفیت کے متعلق نقل کرتا ہے۔ ہمارے دور کے اکثر فقہاء کا یہی حال ہے مگر جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل بھی کیا اور ایسے لوگ بہت تھوڑے سے ہیں"۔ (ح، ۹۰)

رہی حدیث مبارکہ:

"فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد" (ح، ۹۱)

(ایک فقیہ شیطان پر ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ بھاری ہے)۔

اگر یہ صحیح ہو تو بھی ابن خلدون کی عبارت کی رو سے فقیہ سے مراد صرف اقوال کا ناقل شخص نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا عبادت اور رجوع الی اللہ کے اندر ایک عظیم حصہ ہو، لیکن اکثر مصروفیت اس کی فقہ کے سمجھنے اور سمجھانے میں ہو، اور وہ عابد جس پر فقیہ کو فضیلت دی گئی ہے وہ ہے جس کا اکثر مشغلہ عبادت ہے اور ابن خلدون کی عبارت کے مطابق وہ (فقیہ جسے فضیلت دی گئی ہے) صرف صاحب نقل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جلیل القدر فقہاء باوجود اس کے کہ وہ علم اور فقہ میں شدید مصروفیت رکھتے تھے مگر عبادات میں بھی بڑی کوشش کرتے تھے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ قضاء کے منصب پر فائز ہونے کے بعد روزانہ دوسو (۲۰۰) رکعات پڑھتے تھے۔ (ح، ۹۲)

یحییٰ بن سعید قطان رحمہ اللہ بیس برس تک ہر رات کو قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور چالیس سال تو ان کے اس طرح گزرے کہ وہ ہر روز زوال کے وقت مسجد میں ہوتے تھے۔

بندار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں بیس سال سے زائد عرصہ ان کے پاس رہا مگر انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ (ح، ۹۳)

ابن جریج رحمہ اللہ، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مسلسل بیس سال تک گویا مسجد کا فرش بن کے رہے اور ان کی مجلس اللہ تعالیٰ کے ذکر سے معمور ہوتی تھی۔ (ح، ۹۴)

کہا جاتا ہے کہ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے چالیس سال کے دوران کبھی اذان نہیں سنی مگر یہ کہ وہ پہلے سے مسجد میں ہوتے تھے، وہ مسلسل روزہ رکھتے تھے اور انہوں نے چالیس حج کیے۔ (ح، ۹۵)

حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ کے متعلق ہشام بن حسان رحمہ اللہ کہتے ہیں:

ہم دن کو ان کے ہنسنے کی آواز سنتے تھے اور رات کو ان کے رونے کی آواز سنتے تھے۔ (ح، ۹۶)

آخری دور تک علماء و فقہاء کرام رحمہم اللہ کا یہی معمول رہا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ رمضان کی ہر رات میں قرآن کریم کو ختم کرتے تھے، ساتھ ساتھ اس کے معانی میں بھی غور کرتے تھے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

یہ بات ان کے فرزند ارجمند نے مقدمہ قرۃ عیون الاخیار (تکملۃ ردالمحتار) میں ذکر کی ہے۔ ح،۹۷

استفتاء کے احکام

احکام الاستفتاء

کتاب کے اختتام پر ہم وہ چند احکام اور آداب ذکر کرتے ہیں جو فتویٰ پوچھنے والے حضرات کے متعلق ہیں۔

(۱)...... مستفتی پر لازم ہے کہ وہ صرف ایسے شخص سے ہی شرعی مسئلہ پوچھے جس کے علم اور دیانت سے وہ واقف ہو اور اس کے بارے میں یہ بھی جانتا ہو کہ وہ واقعی فتویٰ دینے کا اہل ہے، خواہ یہ بات اسے ذاتی تجربے سے معلوم ہوئی ہو یا کسی با اعتماد عالم کے بتانے سے معلوم ہوئی ہو یا اس بات کی ایسی عمومی شہرت ہو چکی ہو کہ اس زمانے کے علماء اس کے فتویٰ پر اعتماد کرتے ہیں۔ مستفتی پر لازم ہے کہ وہ استفتاء سے پہلے جتنا ہو سکے، اس کی تحقیق کر لے۔ اگر مفتی کی عدالت اور دیانت داری پوشیدہ ہو تو اس کی ظاہری دیانت داری پر بھی اکتفاء کیا جا سکتا ہے۔

(۲)...... جو عالم فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتا ہو اس سے فتویٰ پوچھنا جائز ہے۔ خواہ شہر میں اس سے بڑے علماء بھی موجود ہوں اور مستفتی پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ سب سے بڑے عالم کو ہی تلاش کرے۔

(۳)...... اگر مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کے درمیان اختلاف ہو تو مستفتی کو چاہیے کہ اس کی نظر میں جو مفتی، علم اور تقویٰ میں زیادہ مرتبے کا حامل ہو اُنہی کے فتویٰ کو مقدم رکھے۔ اگر دو مفتیوں میں سے ایک بڑے عالم اور دوسرے زیادہ متقی پرہیز گار ہیں، تو ایک قول یہ ہے کہ متقی اور پرہیز گار مفتی کے فتویٰ کو مقدم رکھا جائے گا لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں زیادہ علم رکھنے والے کو ترجیح دی جائے گی، یہی علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی حتمی رائے ہے۔ ح،۹۸

ایسی صورتِ حال کے بارے میں حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ نے کئی اقوال نقل کیے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

''جب مستفتی کے سامنے دو مفتیوں کے فتاویٰ میں اختلاف آجائے تو اس بارے میں فقہاء کرام کی کئی آراء ہیں:

(۱)...... مستفتی دونوں فتووں میں سے اس فتویٰ کو لے گا جس میں سخت حکم بیان ہوا ہو' چنانچہ وہ ممانعت کے حکم کو لے گا، نہ کہ اباحت کے حکم کو کیونکہ ایسا کرنا ہی زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔

(۲)...... مستفتی دونوں فتووں میں سے آسان حکم والے پر عمل کرے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ ایسے دین کو دے کر مبعوث فرمائے گئے ہیں جو سب سے الگ' آسان اور سہولت والا ہے۔

(ان الفاظ سے اشارہ ہے' اس حدیث پاک کی طرف جو مسند احمد میں ان الفاظ سے منقول ہے "وانی ارسلت بالحنیفیة السمحة السهلة") (۲۶۶/۵)

(۳)...... مستفتی کوشش کرے کہ جو زیادہ با اعتماد مفتی ہے اس کے فتوی کو اختیار کرے۔ لہٰذا ایسے مفتی جو علم اور تقویٰ میں بڑھ کر ہوں گے مستفتی اُن کی بات کو لے گا۔ اس قول کو "السمعانی الکبیر" ت، ۱۶۱ نے اختیار کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے قبلہ کی بحث میں ایسے ہی قول کی صراحت کی ہے۔

(لیکن علامہ نووی رحمہ اللہ نے فتویٰ کو قبلہ پر قیاس کرنے کو رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قبلہ کی علامات تو حسی ہوتی ہیں جن میں صحیح سمت کو سمجھنا آسان ہے۔ جب کہ فتاویٰ کی علامت تو معنوی ہوتی ہیں لہٰذا ایسی صورت میں مجتہدین کے درمیان کوئی واضح فرق ظاہر نہیں ہوگا۔ دیکھیں المجموع شرح المهذب)

(۴)...... مستفتی کسی اور مفتی سے پوچھ لے اور وہ جس مفتی کے فتوی کی تائید کرے مستفتی اسی پر عمل کرے۔

(۵)...... مستفتی کو اختیار ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے جس کی بات کو چاہے اختیار کر لے۔

اس قول کو شیخ ابو اسحاق شیرازی رحمہ اللہ نے درست قرار دیا ہے۔ صاحب الشامل یعنی ابن صباغ بغدادی رحمہ اللہ ت، ۱۶۲ نے بھی اس صورت میں اس قول کو اختیار کیا ہے" جب دونوں مفتی ذاتی اعتبار سے برابر مرتبے کے حامل ہوں"۔

پسندیدہ بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں مستفتی پر لازم ہوگا کہ وہ خوب کوشش کرے اور زیادہ راجح کو تلاش کرے...... اور ایسے وقت مفتیان میں سے انتہائی قابل اعتماد کو تلاش کر کے اس کے فتوی پر عمل کرے اور اگر اس کے نزدیک دونوں مفتیان کرام رحمہم اللہ سے کسی کو کوئی ترجیح حاصل نہ ہو تو پھر

کسی اور سے استفتاء کرلے اور یہ جس کی موافقت کرے اسی کے فتوے پر مستفتی عمل کرلے، اگر ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو اور دونوں مفتیان کا اختلاف بھی جواز اور عدم جواز کا ہو اور ابھی تک مستفتی نے وہ عمل بھی نہیں کیا (جس کے بارے میں فتویٰ ہے) تو ایسی صورت میں مستفتی ممانعت اور ترک کی جانب کو اختیار کرلے کیونکہ اس میں زیادہ احتیاط ہے اور اگر دونوں مفتیانِ کرام ہر اعتبار سے برابر ہیں تو ہم مستفتی کو ان دونوں کے درمیان اختیار دے دیں گے اگرچہ ہم ایسی صورتوں کے علاوہ مستفتی کو اختیار دینے کے قائل نہیں ہیں۔

کیونکہ یہ اختیار ضرورت کی بناء پر ہے اور ایسا کبھی شاذ و نادر صورت ہی میں ہوتا ہے۔ ح ۹۹

امام نووی رحمہ اللہ نے ابن الصلاح رحمہ اللہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جس بات کو شیخ ''ابن الصلاح رحمہ اللہ'' نے اختیار کیا ہے یہ کوئی مضبوط قول نہیں بلکہ زیادہ ظاہر تو تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہے اور وہ تین صورتیں قول نمبر تین، قول نمبر چار اور قول نمبر پانچ ہیں۔ اور بظاہر ان میں سے پانچواں قول زیادہ واضح ہے کیونکہ مستفتی اہل اجتہاد میں سے تو ہے نہیں اور اس کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ کسی ایسے عالم کی تقلید کرلے جو فتویٰ دینے کا اہل ہے اور جب مستفتی نے دونوں مفتیان کرام میں سے کسی ایک کا قول اپنی مرضی کے مطابق لے لیا تو اس نے اپنا فرض ادا کردیا ہے۔ ح ۱۰۰

ابن ھمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کسی شخص نے دو فقہاء کرام سے یعنی جو دونوں مجتہد ہوں ان سے استفتاء کیا' ان دونوں نے اسے الگ الگ جواب دیا تو بہتر یہ ہے کہ مستفتی اس کے فتویٰ پر عمل کرے جس کی طرف ان دونوں میں سے اس کے دل کا میلان ہو''۔

اور میری رائے یہ ہے کہ اگر وہ اس مفتی کے قول کو بھی اختیار کرلے جس کی طرف اس کا دل مائل نہیں ہے تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ مستفتی کے قلبی میلان کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ اس پر اصل واجب تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی مجتہد کی تقلید کرے اور یہ تو وہ کر ہی چکا ہے۔ اب وہ مجتہد خواہ صحیح جواب دے یا اس سے خطاء ہوجائے۔ ح ۱۰۱

بظاہر ابن ھمام رحمہ اللہ کی یہ رائے اسی وقت ہے کہ جب دونوں فقیہ' مستفتی کی نظر میں برابر ہوں ورنہ مستفتی اس مفتی کی بات پر عمل کرے جو زیادہ علم کا حامل ہو جیسا کہ ہم پہلے ابن نجیم رحمہ اللہ کے حوالے سے ذکر کرچکے ہیں

(واللہ تعالیٰ سبحانہ اعلم)

(۴)......ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر مستفتی کا دل مفتی کے جواب سے مطمئن نہ ہو تو اس کے لیے دوسرے مفتی سے سوال کرنا صرف مستحب ہے، واجب نہیں ہے''۔

ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قواعد کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بارے میں تفصیل بیان کریں، لہٰذا ہم کہتے ہیں:

جب مفتی، مستفتی کو فتویٰ دے دے تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہاں کوئی دوسرا مفتی نہیں پایا جاتا تو مستفتی پر لازم ہوگا کہ اسی مفتی کے فتوے پر عمل کرے۔ اور یہ اس پر موقوف نہیں رہے گا کہ مستفتی خود اپنے اوپر لازم کرے گا، تو اس فتویٰ پر عمل لازم ہوگا، اسی طرح مستفتی، اس فتوی پر عمل شروع کرے یا نہ کرے، بہرحال اس پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

اسی طرح یہ اس پر بھی موقوف نہیں ہوگا کہ مستفتی کا دل فتویٰ کے حقیقی طور پر صحیح ہونے کے بارے میں مطمئن ہو جائے کیونکہ مستفتی کا فرض تقلید کرنا ہے جیسا کہ یہ معلوم ہی ہے۔

(اصل کتاب ''أدب الفتوی والمستفتی'' کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ کے اُس قول کی تردید کرنا چاہتے ہیں جو ''ادب الفتوی والمستفتی'' ص۱۶۶ پر اس سے متصل پہلے مذکور ہے)۔

ہاں اگر کوئی دوسرے مفتی بھی موجود ہوں تو اگر یہ واضح ہو کہ پہلے جنہوں نے فتویٰ دیا ہے وہ ہی زیادہ علم کے حامل اور زیادہ قابلِ اعتماد ہیں تو مستفتی پر لازم ہوگا کہ انہی کے فتویٰ پر عمل کرے، اس بناء پر کہ صحیح قول کے مطابق وہ ہی فتویٰ دینے کیلئے متعین ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

اور اگر پہلے مفتی کے بارے میں یہ واضح نہ ہو تو پھر صرف اس کے فتویٰ دینے سے مستفتی کیلئے اس پر عمل کرنا لازم نہیں ہوگا کیونکہ مستفتی کیلئے کسی دوسرے سے استفتاء کرنا اور اس کی تقلید کرنا بھی جائز ہے۔ اور اسے دونوں مفتیان کے فتویٰ میں متفق ہونے کا تو علم نہیں ہے۔ پس اگر مفتیانِ کرام کے درمیان اتفاق ہو یا حاکم مستفتی پر کسی فتویٰ کے مطابق حکم جاری کر دے تو تب مستفتی پر اسی فتویٰ کو اختیار کرنا لازم ہوگا''۔ (ح:۱۰۲)

(۵)......ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر مستفتی کو کسی ایسے واقعے کے بارے جواب دیا گیا جو بار بار پیش نہیں آتا' پھر وہ مسئلہ دوبارہ پیش آ گیا تو اس پر لازم ہوگا کہ اگر اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ پہلا جواب کسی نص یا اجماع کی دلیل پر مبنی تھا' تو وہ دوبارہ سوال کرے۔

ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب کسی شخص نے استفتاء کیا اور اسے فتویٰ دے دیا گیا پھر وہی واقعہ دوسری مرتبہ پیش آ گیا تو کیا مستفتی کیلئے نئے سرے سے سوال کرنا لازمی ہے؟ تو اس میں دو رائے ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ اس پر دوبارہ سوال کرنا لازم ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ مفتی کی رائے بدل چکی ہو۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اس پر دوبارہ سوال کرنا لازم نہیں ہے اور یہی بات زیادہ صحیح ہے کیونکہ حکم شرعی وہ معلوم کر چکا ہے اور اصل یہی ہے کہ مفتی اپنی پہلی رائے پر ہی قائم ہوگا۔

(۶)......ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مستفتی کو چاہیے کہ وہ مفتی کے ساتھ ادب سے پیش آئے اور اسے مخاطب کرنے میں' سوال پوچھنے میں اور ایسے کاموں میں اس کی تعظیم کا انداز اپنائے۔ اپنے ہاتھ سے مفتی کے چہرے کی طرف اشارہ نہ کرے اور نہ ہی یوں سوال کرے کہ تمہیں اس بارے میں کیا کیا یاد ہے؟ اسی طرح یہ بھی نہ کہے کہ تمہارے امام شافعی رحمہ اللہ کا اس بارے میں کیا مذہب ہے؟ اور جب مفتی اسے جواب دے دے تو مستفتی اسے یہ نہ کہے کہ میرا بھی یہی کہنا تھا اور میرے ذہن میں بھی یہی جواب آیا تھا۔ اسی طرح مستفتی' مفتی کو یہ بھی نہ کہے کہ مجھے آپ کے علاوہ فلاں فلاں نے یوں جواب دیا ہے''۔

(۷)......ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مستفتی ایسے حال میں مفتی سے سوال نہ کرے جب وہ کھڑا ہو یا اٹھنے کی تیاری میں لگا ہو، جب مفتی کو کسی غم نے گھیر رکھا ہو یا اس کو کوئی پریشانی ہو یا کوئی بھی ایسی کیفیت ہو جس نے مفتی کے دل کو مشغول کر رکھا ہو''۔

(۸)......ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عامی شخص کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ مفتی جب اسے فتویٰ دے تو یہ اس سے دلیل کا مطالبہ کرے، مستفتی کو مفتی کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہیے ''کیوں'' اور ''کیسے''۔

اگر وہ اپنے دل کو دلیل سن کر مطمئن کرنا ہی چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ کسی دوسری مجلس میں مفتی سے دلیل پوچھ لے یا پھر اسی مجلس میں پوچھ لے لیکن پہلے بغیر دلیل کے فتویٰ کو قبول کر لے"۔

علامہ سمعانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

"مستفتی اگر اپنی ذاتی احتیاط کیلئے مفتی سے دلیل پوچھے تو اسے نہیں روکا جائے گا اور اگر دلیل قطعی ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ اسے بیان کر دے اور اگر اس فتویٰ کی دلیل قطعی نہیں ہے تو پھر اس پر دلیل کو بیان کرنا لازم نہیں کیونکہ ایسی دلیل کو سمجھنے کیلئے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے جس سے عامی شخص عاجز ہوتا ہے"۔

فتویٰ میں دیانۃً کا حکم لکھا جائے گا یا قضاءً؟ اس کی وضاحت "تشریحات نمبر۳۰" میں ملاحظہ فرمائیں

وهذا اخرما اردنا ايراده في هذا التاليف، والحمد لله سبحانه اولاً واخراً وصلى الله تعالىٰ على سيدنا ومولانا محمد خاتم الرسل وعلى اله وصحبه اجمعين وعلى كل من تبعهم باحسان الى يوم الدين۔

(آج اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے مورخہ ۹ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ، مطابق 31 دسمبر 2014ء، شبِ پنج شنبہ نمازِ عشاء سے کچھ قبل کتاب کا ترجمہ مکمل ہوا)۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

وصلى الله على النبي الكريم وعلى اله وصحبه اجمعين۔

☆......☆......☆

حواشی (۷)

فتویٰ دینے کے احکام اور اس کا طریقہ کار

احکام الافتاء و منهجه

(۱) المجموع شرح المهذب ،النووی ،باب اقسام العلم الشرعی ،فصل تعلیم الطالبین ،الجزء ۱ ،الصفحة ۲۷ ۔طبع دار الفکر بیروت، ۔

(۲) سنن ابی داود، کتاب الاقضیة ،باب فی القاضی یخطی ،رقم الحدیث ۳۵۷۳ ،الصفحة ۵٦۷ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت ۔

(۳) المدخل الی السنن الکبریٰ ،البیهقی ،باب التوقی عن الفتیا و التثبت فیها ،رقم ٦۴۷، الجزء ۲ ،الصفحة ۱٦۷ ،طبع دار الخلفاء لکتاب الاسلامی کویت ۔

(۴) المدخل الی السنن الکبریٰ ،البیهقی ،باب التوقی عن الفتیا والتثبت فیها ، رقم ٦۴۸ ،الجزء ٦۴۸ ،الصفحة ۱٦۸ ۔طبع دار الخلفاء الکتاب الاسلامی کویت ۔

(۵) المدخل الی السنن الکبریٰ ،البیهقی ،باب التوقی عن الفتیا والتثبت فیها ،رقم ٦۵۰ ،الجزء ۲ الصفحة ۱۷۰ ،طبع دار الخلفاء لکتاب الاسلامی کویت ۔

(٦) جامع بیان العلم وفضله ،ابن عبد البر ،باب ما یلزم العالم اذا سئل عما لا یدریه من وجوه العلم ،رقم ۱۰۰۴ ،الجزء ۳ ،الصفحة ٦۳ ۔طبع دار الکتب العلمیة بیروت ۔

"ومعناه أن من غفل من أن یقول لا أدری فیما لا یعلم فکأنه اصیبت أعضاؤه التی

يهلك باصابتها الانسان»۔

(۷)جامع بيان العلم وفضله،ابن عبدالبر، باب مايلزم العالم اذاسئل عمالايدريه من وجوه العلم ،رقم ۱۰۰۵،الجزء ۳،الصفحة ۶۲،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۸) الفقيه والمتفقه،الخطيب،باب ماجاء في الاحجام عن الجواب اذا خفي على المسئول ،رقم ۱۱۲۱،الجزء ۳،الصفحة ۲۲۷۔طبع مكتبة الظاهرية دمشق۔

(۹) دیکھیں: ترتيب المدارك وتقريب المسالك ،عياض،تحريه في العلم والفتيا ء والحديث وورعه فيه وانصافه،الجزء ۱،الصفحة ۴۱ الى ۴۲،طبع دار مكتبة الحياة بيروت۔

(۱۰) الاقناع لطا لب الانتفاع شرف الدين موسیٰ بن سالم ابي النجا الحجاوی المقدسی، كتاب القضاء والفتيا،فصل:ويشترط في القاضي عشر صفات، الجزء ۴،الصفحة :۳۹۷،طبع ادارة الملك عبدالعزيز الرياض۔

(۱۱)صحيح البخاری، كتاب الاحكام ،باب هل يقضي الحا كم أو يفتي وهوغضبان ،رقم الحديث ۷۱۵۸،الصفحة ۱۲۹۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۱۲) اخلاق العلماء الأجری الفقيه ابو بكر الأجری ،صفته اذاعرف ،بالعلم ،الجزء ۱، الصفحة ۴۳، طبع دار البيضاء،دار الثقافة۔

(۱۳)سنن الدارمی ،المقدمة ،باب كراهية الفتياء ،رقم الحديث ۱۲۷، الجزء ۱، الصفحة ۱۴۵،طبع دار القلم دمشق۔

(۱۴)صحيح مسلم ، كتاب العلم ،باب :هلك المتنطعون ،رقم الحديث ۲۶۷۰، الصفحة ۱۰۲۹ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت،

(۱۵)فيض القدير شرح الجامع الصغير ،محمد عبدالرؤف بن تاج العارفين المناویؒ عند حديث هلك المتنطعون ،رقم الحديث ۹۵۹۴، الجزء ۶ ،الصفحة ۳۵۹ الى ۳۶۰، طبع المكتبة التجارية الكبرىٰ مصر۔

(۱۶)الاداب الشرعية والمنح المرعية ،ابن مفلح ،فصل في كراهة السئوال عن الغرائب وعمالا ينتفع به شمس الدين ابي عبدالله محمد بن مفلح المقدسی،الجزء ۲،الصفحة

۱۴۴ الی ۱۴۵،طبع ادارة البعوث والعلمیة والافتاء الریاض۔

(۱۷) حاشیة ابن عابدین ، کتاب الخنثی ،مسائل شتی ،الجزء ۱۰، الصفحة ۵۲۰ ،طبع دار المعرفة،بیروت،

(۱۸) صحیح البخاری،معلقاً، کتاب العلم ،باب من خص بالعلم قوما دون قوم کراهیة أن لایفهموا ،الصفحة ۴۲،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۱۹) الاحکام فی تمیز الفتاوی عن الاحکام السوال الاربعون،التنبیه العاشر ،القرافی، الصفحة ۲۶۴ الی ۲۶۶۔

(۲۰) الاداب الشرعیة والمنح المرعیة،ابن مفلح،فصل فی کراهة السوال عن الغرائب وعما لاینتفع ولایعمل به ومالم یکن ،الجزء ۲ الصفحة ۱۴۴، طبع ادارة البعوث والعلمیة والافتاء الریاض۔

(۲۱) سنن الترمذی ، کتاب الزهد ،باب بلا ترجمة ،رقم الحدیث ۲۳۱۷،الصفحة ۵۵۵، طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

عن ابی هریرة رضی الله عنه،وعن علی بن الحسین مرسلاً،

(۲۲) نقله شیخنا عبد الفتاح ابو غدہ فی حاشیه علی احکام القرافیؒ الصفحة ۲۶۵،طبع مکتب المطبوعات الاسلامیه حلب۔

وترتیب المدارك وتقریب المسالك،عیاض،زیاد بن عبد الرحمان بلقب بشبطون۔۔۔ ذکر فضائل وخبره،الجزء ۱ ،الصفحة ۱۲۴ الی ۱۲۵،طبع دار مکتبة الحیاة بیروت۔

(۲۳) اداب المفتی والمستفتی ،ابن الصلاح الشهرزوری رحمه الله (باب آداب الفتوی والمفتی والمستفتی) القول فی أحکام المفتین،الصفحة ۱۱۵ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۲۴) سنن ابی داود ، کتاب ،باب التوقی فی الفتیا ،رقم الحدیث ۳۶۵۶ الصفحة ۵۸۰،طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

"حدیث عن معاویة رضی الله عنه: ان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن الاغلوطات،

(۲۵) الموافقات ،الشاطبی ،النظر الثانی :فی احکام السوال والجواب وهو علم الجدل :

فصل : ویتبین من هذاان الکراھیۃ السئوال مواضع ،التاسع : السوال عما شجر بین السلف الصالح ،الجزء٥ ،الصفحة٣٩١ ،طبع المکتبة التجاریةمصر۔

(٢٦) صحیح البخاری ، کتاب الاحکام ،باب الألد الخصم ،وھوالدائم فی الخصومة ،رقم الحدیث٧١٨٨ ،الصفحة ١٣٠٢ طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

الموافقات ،الشاطبی ،النظر الثانی : فی احکام السوال والجواب وھوعلم الجدل ،فصل :ویتبین من ھذا ان الکراھیة السئوال مواضع ،العاشر : سوال التعنت والافحام وطلب الغلبة فی الخصام ،الجزء٥ ،الصفحة ٣٩٢ 'سبع المکتبة التجاریةمصر۔

(٢٧)الموافقات ،الشاطبی ،النظر الثانی : فی احکام السوال والجواب وھوعلم الجدل ،الجزء٥ ،الصفحة ٣٩٢طبع المکتبة التجاریة مصر۔

(٢٨)السنن الکبری ،البیہقی ،باب من اجتھد ثم رأی ان اجتھادہ خالف نصااو اجماعا أو ما فی معناہ ردہ علی نفسه وعلی غیرہ ،الجزء١٠ ،الصفحة١١٩۔

السنن الکبری ،البیہقی ، کتاب الشھادات ،باب لایحیل حکم القاضی علی المقضی له والمقضی علیه ولایجعل الحلال علی واحد منھما حرام والحرام علی واحد منھما حلالا ،الجزء١٠ الصفحة١٥٠۔

(٢٩)المجموع شرح المھذب ،النووی ، (باب آداب الفتوی والمفتی والمستفتی) فصل فی احکام المفتین ،الجزء١ ،الصفحة٤٥ ،بشی من التقدیم والتأخیر ،طبع دار الفکر بیروت۔

(٣٠) السنن الکبری ،البیہقی ،باب :ماجاء فی قول الله تعالیٰ : وامھات نسائکم وربا ئبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم التی دخلتم بھن ،الجزء٧ ،الصفحة١٥٩۔

(٣١) الفقیه والمتفقه ،الخطیب ،باب رجوع المفتی عن فتواہ اذاتبین له ان الحق فی غیرھا ،رقم الحدیث١٢٠٨ ،الجزء٢ ،الصفحة٣٣٩ ،طبع مکتبة الظاھریة دمشق۔

(٣٢)المجموع شرح المھذب ،النووی ، باب آداب الفتوی والمستفتی ، فصل فی احکام المفتین ،الجزء١ ،الصفحة٤٥ ،طبع دار الفکر بیروت۔

(٣٣) المصنف ،ابن شیبة ، کتاب الفرائض ،باب فی زوج وام واخوة واخوات لاب وام ،واخوات واخوة لام من شرك بینھم ،رقم الحدیث ٣١٦٤٣ ،الجزء ١٦ ، الصفحة ٢٣٢ الی ٢٣٣ ،طبع

المجلس العلمی بیروت۔
(۳۴)اعلام الموقعین عن رب العالمین ،ابن قیم ،حکم رجوع المفتی فتواہ ،الفائدۃ الأربعون: الجزء ۴،الصفحۃ ۱۷۱،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔
(۳۵) المجموع شرح المہذب ،النووی، باب آداب الفتوی والمفتی والمستفتی، فصل فی احکام المفتین ،الجزء ۱، الصفحۃ ۴۵،طبع دار الفکر بیروت۔
(۳۶) الفقیہ والمتفقہ ،الخطیب ،باب رجوع المفتی عن فتواہ اذا تبین لہ أن الحق فی غیرھا ،رقم ۱۲۰۵، الجزء ۳، الصفحۃ ۳۳۶،طبع مکتبۃ الظاھریۃ دمشق۔
(۳۷) المجموع شرح المہذب ،النووی، باب آداب الفتوی والمفتی والمستفتی، فصل فی احکام المفتین ،الجزء ۱، الصفحۃ ۴۵ الی ۴۶،طبع دار الفکر بیروت ۔
(۳۸) البحر الرائق شرح کنز الدقائق فی فروع الحنفیۃ ،ابن نجیم ، کتاب القضاء قبیل فصل فی التقلید ،الجزء ۶، الصفحۃ ۴۵۱،طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت ۔
(۳۹) قرۃ عیون الاخیار تکملۃ رد المحتار قبیل کتاب الشھادات ،الجزء ۱۱، الصفحۃ ۴۸، طبع دار المعرفۃ بیروت ۔
(۴۰) حاشیۃ ابن عابدین مع الدر المختار ،الحصکفی رحمۃ اللہ علیہ ، کتاب الاجارۃ ،مسائل شتی الجزء ۹، الصفحۃ ۱۵۵ ،طبع دار المعرفۃ بیروت ۔
(۴۱) المجموع شرح المہذب ،النووی، باب آداب الفتوی والمفتی والمستفتی، فصل فی احکام المفتین ،الجزء ۱، الصفحۃ ۴۶، طبع دار الفکر بیروت ۔
(۴۲) تأسیس النظر القول فی القلم الذی فیہ خلاف بین ابی حنیفہ رضی اللہ عنہ وبین صاحبیہ ،الدبوسی، الصفحۃ ۱۸، طبع :مطبعۃ الامام ۱۳، شارع محمد کریم بالقلعۃ بالقاھرۃ
(۴۳) دستور العلماء ،احمد نگری ،الجزء ۴، الصفحۃ ۱۶۰ ۔
(۴۴) ذکرہ فضیلۃ الدکتور عبد الستار ابو غدہ راجع مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی العدد السابع عشر ،الجزء ۱، الصفحۃ ۸۵۵ طبع :منظمۃ المؤتمر الاسلامی جدہ۔
(۴۵) رسائل ابن عابدین ،نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ،نقلا عن البحر

عن مناقب الكردری، الجزء ۲، الصفحة ۱۳۰، طبع مكتبة عثمانية كوئته۔

(۴۶) شرح عقود رسم المفتی، ابن عابدين، تحت الاشعار، رقم ۳۴ الی ۳۹، طبع مكتبة عثمانية كوئته۔

(۴۷) شرح عقود رسم المفتی، ابن عابدين، تحت الأشعار، رقم ۳۴ الی ۳۹، مكتبة طبع عثمانية كوئته۔

(۴۸) حاشية ابن عابدين، كتاب الطلاق، باب العدة، مطلب : فی عدة الموت، الجزء ۵، الصفحة ۱۹۲ الی ۱۹۳، طبع دار المعرفة بيروت۔

قال ابن عابدين : والمراد به الحمل الذی استبان بعض خلقه أو كله، فان لم يستبن بعضه لم تنقض العدة .. ثم نقل عن المحيط أنه لا يستبين الا فی مائة وعشرين يوماً، وعن البحر انه قد يستبين قبل اربعة أشهر۔

(۴۹) دیکھیں : حاشية ابن عابدين، باب العدة، الجزء ۱۰، الصفحة ۳۰۶، فقرہ ۱۵۳۲۲، وباب ثبوت النسب، الی ۱۰، الصفحة ۳۸۰۔

(۵۰) رسائل ابن عابدين، نشر العرف فی بناء بعض الاحكام علی العرف، الجزء ۲، الصفحة ۱۳۱، طبع مكتبة عثمانية كوئته۔

(۵۱) مجموع الفتاویٰ، ابن تيمية رحمه الله، الجزء ۲۶، الصفحة ۲۳۹ الی ۲۴۰، طبع مطالع الرياض۔

(۵۲) ادب المفتی والمستفتی، ابن الصلاح الشهرزوری رحمه الله، القول : فی كيفية الفتوی وآدابها، الصفحة ۱۴۰ الی ۱۴۱، طبع قديمی كتب خانه كراتشی۔

(۵۳) اعلام الموقعين عن رب العالمين، ابن قيم رحمه الله، يجمل بالمفتی أن يكثر من الدعاء لنفسه بالتوفيق، الفائدة الحادية والستون، الجزء ۴، الصفحة ۱۹۷ الی ۱۹۸، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۵۴) ادب المفتی والمستفتی، ابن الصلاح الشهرزوری رحمه الله، باب بيان شرف حرمة الفتوی وخطرها وغررها، الصفحة ۸۰، طبع قديمی كتب خانه كراتشی۔

(۵۵) دستور العلماء، احمد نگری، الجزء ۴، الصفحة ۱۵۹۔

(۵۶)البحر الرائق شرح کنز الدقائق فی فروع الحنفیة ، ابن نجیم رحمہ اللہ ،کتاب القضاء،فصل یجوز تقلید من شاء من المجتهدین،الجزء۶،الصفحة ۴۵۱ طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۵۷)البحر الرائق شرح کنز الدقائق فی فروع الحنفیة ، ابن نجیم رحمہ اللہ، کتاب القضاء فصل یجوز تقلید من شاء من المجتهدین،الجزء۶،الصفحة ۴۵۱،طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۵۸)ترتیب المدارك وتقریب المسالك ،عیاض ،ذکر بقایا فضائل سحنون.وتقاه وخوفه وزهده وتحریه،الجزء۱،الصفحة ۲۳۱ طبع دار مکتبة الحیاة بیروت۔

اداب المفتی والمستفتی ،ابن الصلاح الشهرزوری ،باب بیان شرف حرمة الفتوی وخطرها وغررها ،الصفحة ۸۱ الی ۸۲،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۵۹)روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،سورة ص ایت ۲۲،الجزء ۲۳، الصفحة ۲۳۸ ،طبع دار احیاء التراث العربی بیروت۔

(۶۰)ادب المفتی والمستفتی ،ابن الصلاح الشهرزوی رحمہ اللہ ،القول :فی کیفیة الفتوی وآدابها ،المسألة التاسعة،الصفحة ۱۳۱ ،طبع قدیمی کتب خانه کراتشی۔

(۶۱) صفة الفتوی ،باب کیفیة الاستفتاء والفتوی، احمد بن حمدان الحنبلی الحرانی ،الصفحة ۶۶۔طبع المکتب الاسلامی دمشق۔

(۶۲) الاحکام ،الامام القرافی رحمه الله تعالیٰ،التنبیه التاسع من فیما یتعلق بوضع الفتیاء ورقة الاستفتاء السئوال الاربعین ،الصفحة ۲۴۹،طبع :مکتب المطبوعات الاسلامیة حلب۔

(۶۳)الاحکام ،القرافی التنبیه التاسع من الاربعین فیما یتعلق بوضع الفتیاء ورقة الاستفتاء الصفحة ۲۴۹ الی ۲۵۰،طبع :مکتب المطبوعات الاسلامیة حلب۔

(۶۴)ترتیب المدارك وتقریب المسالك،عیاض،تحریه(ای الامام مالك رحمہ اللہ)فی العلم والفتیا والحدیث وورعه فیه وانصافه،الجزء۱،الصفحة ۴۱،طبع دار مکتبة الحیاة بیروت۔

(۶۵)المجموع شرح المهذب ،النووی ،باب (اداب الفتوی والمفتی والمستفتی، فصل :فی احکام المفتین،الجزء۱،الصفحة ۴۶،طبع دار الفکر بیروت۔

(٦٦) المعجم الاوسط ،الطبرانی ،من اسمه احمد ،رقم الحدیث ١٦٧٨ ، الجزء ٢ ،الصفحة ١٣٨ ،طبع مکتبة المعارف الریاض ۔

وقال الهیثمی :رجاله موثقون من اهل الصحیح ،مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ،الهیثمی ،کتاب العلم ،باب الاجماع ،الجزء ١ الصفحة ١٠٧۔

(٦٧) الفقیه والمتفقه ،الخطیب ،باب القول فی الاحتجاج لصحیح القیاس ولزوم العمل به ،رقم الحدیث ٥١٢ ،الجزء ٢ ، الصفحة ٧٣ ،باب ما یفعله المفتی فی فتواه ،رقم الحدیث ١١٣٩ ،الجزء ٢ الصفحة ٢٧٧ ،طبع مکتبة الظاهریة دمشق ۔

(٦٨) سنن الدارمی ،باب التورع عن الجواب فیما لیس فیه کتاب ولاسنة ،رقم الحدیث ١١٩ ،الجزء ١ ،الصفحة ١٣٦ ،طبع دار القلم دمشق ۔

(٦٩) المدخل الی السنن الکبری ،البیهقی ،باب التوقی عن الفتیا والتثبت فیها ،رقم ٦٥٧ ،الجزء ٢ ،الصفحة ١٧٧ ،طبع دار الخلفاء لکتاب الاسلامی کویت ۔

(٧٠) سنن الترمذی ،کتاب الفتن ،باب ماجاء فی لزوم الجماعة ،رقم الحدیث ٢١٦٨ ،الصفحة ٥٢٣ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت ۔

وقال "هذا حدیث غریب من هذا الوجه ،وسلیمان المدینی هو عندی سلیمان بن سفیان ،وفی الباب عن ابن عباس ' دار الکتب العلمیة بیروت کے نسخہ نیز ہمارے سامنے موجودہ ترمذی کے پاکستانی نسخہ مطبوعہ ایچ ایم سعید کراچی میں بھی یہ عبارت یہیں تک ہے جبکہ حاشیہ میں لکھی گئی مندرجہ ذیل عبارت ہمیں صرف المکتبة الشاملة کے نسخے میں مل سکی ہے "وقد روی عنه ابوداود الطیالسی وأبو عامر العقدی ، وغیر واحد من أهل العلم وتفسیر الجماعة عند أهل العلم هم الفقه والعلم والحدیث "۔

(٧١) سنن ابن ماجه ، کتاب الفتن ،باب السواد الاعظم ،رقم الحدیث ٣٩٥٠ ،الصفحة ٦٣٥ ،طبع دار الکتب العلمیة بیروت ۔

"وقال البوصیری : هذا اسناد ضعیف لضعف أبی خلف الأعمی وقد روی هذا الحدیث من حدیث أبی ذر وأبی مالك الاشعری وابن عمر وأبی نصرة وقدامة بن عبد الله الکلابی ،وفی

كلها نظر قال شيخنا العراقى رحمه الله تعالىٰ،(مصباح الزجاجة باب السواد الاعظم الجزء۴، الصفحة۱۶۹) طبع دار المعرفة بيروت۔

(۷۲) تذكرة الحفاظ،النهبى،ترجمة الامام أبي عمر وعبد الرحمن بن عمرو ، الأوزاعى، الجزء ۱، الصفحة۱۸۰طبع،دار الفكر العربى۔

(۷۳) سير اعلام النبلاء،النهبى،ترجمة الامام مالك بن انس بن مالك المدنى، الجزء۸ ،الصفحة۹۰طبع مؤسسة الرسالة بيروت۔

(۷۴) دیکھیں: لوامع الانوار البهية وسواطع الأسرار الأثرية شرح الدرة المضية فى عقد الفرقة المرضية ،السفارينى،الخاتمة،تقليد الائمة الاربعة،الجزء ۲ ،الصفحة ۴۶۶،طبع الشيخ على آل شامى:قطر۔

(۷۵) جامع بيان العلم وفضله،ابن عبد البر،باب من يستحق أن يسمى فقيها أو عالما حقيقة لا مجازاً ومن يجوز له الفتيا عند العلماء،الجزء۳،الصفحة۳۵،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۷۶) المجموع شرح المهذب،النووى،فصل فى اداب الفتوى،الجزء۱، الصفحة ۵۰، طبع دار الفكر بيروت۔

(۷۷) المبسوط، السرخسى ،أوائل كتاب الصرف، الجزء ۱۴، الصفحة ۵الى ۶، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۷۸) اعلام الموقعين عن رب العالمين،ابن قيم ،دلالة العالم للمستفتى على غيره ،الفائدة الخامسة والعشرون،الجزء۴،الصفحة۱۵۹،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۷۹) البحر الرائق شرح كنز الدقائق،ابن نجيم رحمه الله، كتاب القضاء،فصل يجوز تقليد من شاء من المجتهدين،الجزء۶،الصفحة۴۵۶،طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۸۰) الاحكام ،القرافى ،الصفحة ۲۵۳،فى حاشية على التنبيه العاشر،طبع مكتب المطبوعات الاسلامية حلب۔

(٨١) تبصرة الحكام فی أصول الاقضية ومناهج الاحكام ،ابن فرحون ،الركن الاول :فی شروط القضاء واداب القاضی واستخلافه ،فصل فيما يلزمه من خاصة نفسه (بألفاظ متقاربة) الجزء١، الصفحة٥٩،طبع دار المعرفة بيروت۔

(٨٢) صفة الفتوی والمفتی والمستفتی ابن حمدان الحرانی الحنبلی باب وقت اباحة الفتيا واستحبابها وايجابها وكراهتها وتحريمها، الصفحة١١،طبع المكتب الاسلامی دمشق۔

(٨٣) الموافقات ،الشاطبی، الطرف الثانی :فيما يتعلق بالمجتهد من الاحكام فيما يتعلق بفتواه المسألة الثالثة ،الجزء٥، الصفحة٦٥٥ الی ٦٥٦ طبع مطبعة المكتبة القاهرة مصر

(٨٤) المجموع شرح المهذب ،النووی ،باب اداب الفتوی والمفتی والمستفتی ،الجزء١، الصفحة٤١، طبع دار الفكر بيروت۔

(٨٥) الموافقات ،الشاطبی ،الطرف الثانی فيما يتعلق بالمجتهد من الاحكام فيها يتعلق بفتواه ،المسألة الرابعة ،فصل قد يسوغ للمجتهد أن يحمل نفسه من التكليف ما هو فوق الوسط ،الجزء٥ ،الصفحة٢٧٩، الی ٢٨٠ طبع المكتبة القاهرة مصر ۔

(٨٦) الفقيه والمتفقه ،الخطيب ،باب حذف المتفقه العلائق، رقم ٨٢٢،الجزء ٢ الصفحة٤٢٦،طبع مكتبة الظاهرية دمشق۔

(٨٧) الفقيه والمتفقه ،الخطيب ،باب المتفقه العلائق ،رقم ٨٢٣ ،الجزء ٢ ،الصفحة ٤٢٧،طبع مكتبة الظاهرية دمشق۔

(٨٨) تذكرة السامع والمتكلم فی اداب العالم والمتعلم ،بدر الدين بن جماعة ،الباب الثانی ،الفصل الاول فی آدابه فی نفسه، الصفحة٢٨ ،طبع دار الكتب العلمية بيروت ۔

(٨٩) المعرفة والتاريخ ،الفسوی ،ابو قلابة الجرمی ،الجزء ١، الصفحة ١٩٣،طبع مؤسسة الرسالة بيروت۔

(٩٠) مقدمة ابن خلدون ،الفصل الحادی والثلاثون فی الخطط الدينية الخلافية ،الجزء١ ،الصفحة ١١٧،طبع نور محمد كتب خانه كراتشی۔

(٩١) سنن الترمذی ،ابواب العلم ،باب ماجاء فی فصل الفقه علی العبادة ،رقم الحديث

۲۶۸۱، الصفحة ۶۳۱، طبع دار الكتب العلمية بيروت،

سنن ابن ماجه فی السنة عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم الحديث ۲۲۲، طبع دار الكتب العلمية بيروت، وقال الترمذی: غريب ولانعرفه الا من هذا الوجه من حديث الوليد بن مسلم، وأورده ابن الجوزی فی العلل وقال: لا يصح، والمتهم به روح بن جناح، قال أبو حاتم: يروی عن الثقات مالم يسمعه۔ وقال الحافظ العراقی: ضعيف جداً كذا فی فيض القدير شرح الجامع الصغير النووی، رقم الحديث ۵۸۹۶، والطبرانی فی الأوسط، باب الميم من اسمه محمد رقم الحديث ۶۳۴۵ الجزء ۱۳ الصفحة ۳۶۳، وغيرهما من حديث حديث ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنة موقوفا، وقال الطبرانی: لم يروه عن صفوان الا يزيد وسنده ضعيف۔۔ قال السخاوی، لكن يتاكد احدهما بالاخر (المقاصد الحسنة، السخاوی، حرف اللام رقم ۸۶۴، الجزء ۱، الصفحة ۵۳۴)

(۹۲) مراة الجنان وعبرة اليقظان فی معرفة حوادث الزمان، اليافعی، سنة اثنتين وثمانين ومائة، الجزء ۱، الصفحة ۱۷۴، طبع مؤسسة الاعلمی للمطبوعات بيروت۔

(۹۳) تاريخ بغداد، الخطيب، المجلد السادس عشر، الصفحة ۲۱۲۔

(۹۴) تذكرة الحفاظ، الذهبی فی تذكرة عطاء بن ابی رباح، الجزء ۱، الصفحة ۹۸، طبع دار الفكر العربی۔

(۹۵) تهذيب الاسماء واللغات، النووی، سعيد بن المسيب، الجزء ۱، الصفحة ۲۹۷، طبع ادارة الطباعة المنيريه مصر۔

(۹۶) تهذيب الاسماء واللغات، النووی، محمد بن سيرين الانصاری الجزء ۱، الصفحة ۱۰۴، طبع ادارة الطباعة المنهرية مصر۔

(۹۷) قرة عيون الأخيار تكملة رد المحتار علی الدر المختار، خطبة الكتاب الجزء ۱۱، الصفحة ۱۳، طبع دار المعرفة بيروت۔

(۹۸) البحر الرائق، ابن نجيم، كتاب القضاء، الجزء ۶، الصفحة ۴۴۹، طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

(۹۹)ادب المفتی و المستفتی ،ابن الصلاح الشھرزوری رحمہ اللہ ،القول فی صفتہ المستفتی واحکامہ واداب،الصفحة ۱۶۴ الی ۱۶۵،طبع قدیمی کتب خانہ کراتشی۔

(۱۰۰)المجموع شرح المھذب ،النووی ،فصل فی اداب المستفتی وصفتہ احکامہ، الجزء ۱،الصفحة ۵۶،طبع دارالفکر بیروت۔

(۱۰۱)فتح القدیر ،ابن الھمام ، کتاب ادب القاضی،الجزء ۷،الصفحة ۳۳۸،طبع دار الکتب العلمیة بیروت،

(۱۰۲)ادب المفتی والمستفتی ،ابن الصلاح الشھرزوری رحمہ اللہ ،القول فی صفتہ المستفتی واحکامہ واداب،الصفحة ۱۶۶ الی ۱۶۷ ،طبع قدیمی کتب خانہ کراتشی۔

★...★...★

8

① ... فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں

② ... چند دلچسپ راہ نُما واقعات

تشریحات

(ضمیمہ نمبرا)

البلاغ، مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر سے
حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوبِ افتاء کے متعلق
حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا مکمل مضمون

بعنوان

فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں

میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق فتویٰ کے بارے میں آپ ہی سے سنی ہوئی چند متفرق باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں، ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی، وجہ یہ ہے درحقیقت ''فقہ'' کے معنی سمجھ کے ہیں، اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو، اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا سنی، اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح و تفصیل بھی سمجھنی چاہیئے کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعے یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی، ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جاسکتا، اور نہ متعین الفاظ میں ان کی تعبیر و تشریح ممکن ہے، گویا

بسیار شیوہ ھا است بتاں راکہ نام نیست

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے انداز فکر ونظر کا مشاہدہ کیا جائے، اس طرح مدت کے تجربے اور انداز فکر خود بخود زیر تربیت شخص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ جانبین میں مناسبت ہو ، اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا بھی چاہتا ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ اس دور ہوا وہوس میں اسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے، اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمے کا سوال آتا تو فرماتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے، کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو کم از کم ان کے مساوی تو ہو اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ساتھ ہی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے:

''تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے مؤقف کے لئے وزنی دلائل موجود ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے، اختیار کرلے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرلے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے فرمایا کہ آجکل معاملات پیچیدہ ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں، اس لئے خاص طور سے بیع وشراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو، وہاں آئمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذاہب میں عام لوگوں کے لئے گنجائش کا پہلو ہو اس کو فتویٰ کے لئے اختیار کرلیا جائے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لئے چند باتوں کا اطمینان کرلینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر فیصلہ کرلیا جائے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی

خودرائی کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کرے، بلکہ دوسرے اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے، اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کیا جارہا ہے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں، محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفاء نہ کیا جائے، کیونکہ بسااوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اوران کے نظرانداز کردینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔(تلفیق کی تفصیل اسی کتاب کے پانچویں باب ''دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔از مرتب)

تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے، کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''عقد الجید'' میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں چنانچہ بعض مصیبت زدہ خواتین کے لئے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے مالکی مذہب پر فتویٰ دینے کا ارادہ کیا تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مدنظر رکھا اور براہ راست مالکی علماء سے خط وکتابت کے ذریعے مذہب کی تفصیلات معلوم کیں اور تمام علمائے ہند سے استصواب کے بعد فتویٰ شائع فرمایا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں۔ اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کے لئے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہوجائے، خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں ''تأمل'' یا ''تدبر'' کہہ کر خود بری ہوجاتے ہیں اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسااوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفاء نہیں ہوتی''۔

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ ردالمحتار میں تو رہا ہے، مگر چونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے البحر الرائق کا حاشیہ منحۃ الخالق اور تنقیح الحامدیۃ بعد میں لکھا ہے، اس لیے ان کتابوں میں مسائل زیادہ منقح انداز میں آئے ہیں، جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہوجاتی ہے۔

فقہاء کرام نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع ومانع اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی

ہیں، چنانچہ ان متون میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے لئے اتنے ہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جتنے ناگزیر ہوں، ان کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مسئلے کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ قرآن وسنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت نہیں مانتے کیونکہ قرآن وسنت کا اسلوب احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ وعظ وتذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لیے ہوئے ہے اور اس میں بعض الفاظ اسی نقطہ نظر سے بڑھائے جاتے ہیں لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں اس لیے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے تسلیم کیا ہے۔

(''مفہوم مخالف'' کا مطلب اسی کتاب کے چوتھے باب ''قواعد رسم المفتی کی تلخیص'' میں دسویں قاعدے کے تحت دیکھ سکتے ہیں۔ از مرتب)

خلاصہ یہ کہ فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے، لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں اس کے لغوی مفہوم اور ٹھیٹھ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلے کی علت اور اس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے اور بعض حضرات اس لفظ کے ٹھیٹھ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اس سیاق کو مدنظر رکھتے ہیں جن میں وہ بولا گیا ہے، خواہ اس سے لفظ کے منطقی نتائج پورے نہ ہوتے ہوں۔ ان دونوں میں سے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی، فقہاء حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ (لڑکی) کا نکاح اس کے باپ یا دادا نے کیا ہو، تو اسے خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا، البتہ اس کے ساتھ ہی درمختار وغیرہ میں ایک استثناء مذکور ہے:

'' الااذاکان الاب معروفاًبسوء اختیاره مجانة وفسقا''

(بمعناه: فی کتاب النکاح، باب الولی)

(یعنی جب باپ فسق وفجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بدخواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہوگا، بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیار بلوغ حاصل ہوگا)۔

یہاں فقہاء نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو، بلکہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بدخواہی میں

معروف ہو۔ لہٰذا لفظ ''معروف'' کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھیٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو ''معروف بسوء الاختیار'' (اولاد کی بدخواہی میں معروف) اسی وقت کہا جائے گا جب اس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی اولاد کا نکاح بد خواہی سے صرف لالچ کی بناء پر کر دیا ہو، اور جس شخص نے اب تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ ''معروف بسوء الاختیار'' نہیں کہلا سکتا، لہٰذا اگر کوئی پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ ''سیئی الاختیار'' تو ہے لیکن ''معروف بسوء الاختیار'' نہیں ہے، اس لئے اس کی لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہوگا، ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ ''معروف بسوء الاختیار'' بن گیا ہے، اس لیے دوسری لڑکی کو خیار بلوغ مل جائیگا۔

لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواہر الفقہ کے ایک رسالے میں اس نقطہ نظر سے اختلاف فرمایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ ''معروف بسوء الاختیار'' کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن، باپ کی بد خواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو، اس وقت تک اسے خیار بلوغ حاصل نہ ہو، اس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیارِ بلوغ باپ کی مظنونہ شفقت کے مدنظر ساقط کیا گیا تھا، لیکن جب سوءِ اختیار سے اس شفقت کا فقدان ثابت ہو گیا تو خیار بلوغ لوٹ آئے گا۔ اس موقع پر فقہاء رحمہم اللہ نے ''معروف بسوء الاختیار'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ سوء اختیار کا فیصلہ محض کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ باپ کی بد خواہی اتنی واضح ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :

''شریعت اسلامی چونکہ صرف شہریوں اور پڑھے لکھے افراد کے لئے نہیں ہے، بلکہ ہر ان پڑھ، دیہاتی اور دور دراز علاقے کا رہنے والا بھی اس کا اتنا ہی مخاطب ہے جتنا ایک تعلیم یافتہ انسان۔ اس لیے شریعت کے احکام میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے لمبے چوڑے حساب و کتاب، ریاضی کے باریک فارمولوں اور فلسفیانہ تدقیقات کی ضرورت پیش نہ آئے''۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اپنے مضامین میں بھی تحریر فرمائی ہے، چنانچہ رسالہ ''سمت قبلہ'' میں لکھتے ہیں:

''شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے تمام احکام کی بنیاد یسر و سہولت اور سادگی و بے تکلفی پر ہے فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں، کیونکہ دائرہ حکومت اس شریعت کا تمام عالم کے بحر و بر، اسود و احمر، شہری و دیہاتی آبادیوں اور ان کے

مکان پر حاوی ہے۔ اسلامی فرائض نماز وروزہ وغیرہ جس طرح شہریوں اور تعلیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دروں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ وناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اس درجہ عام ہوں، ان میں مقتضاءِ عقل، وحکمت ورحمت کا یہی ہے کہ ان کو تدقیقات وقواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے، تاکہ ہر خاص وعام، خواندہ وناخواندہ بآسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔ روزہ ورمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے حسابات ریاضیہ پر نہیں، مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا مدار رویت ہلال پر ہے شمسی مہینے جن کا مدار خاص حسابات ریاضیہ پر ہے، عام احکام شرعیہ میں ان کو نہیں لیا گیا، اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

(جواہر الفقہ ج ۱ ص ۲۵۸، طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

فتویٰ لکھنے سے پہلے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنا ایک اہم کام ہے، اسی طرح فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس طرح مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے، مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں؟ اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے، مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہماری مسجد کا امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ غالب گمان ہو گیا کہ اس استفتاء کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں، بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے بعض خلافِ احتیاط امور کی تشہیر ہے، چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں، ان سے کہیے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمالیں'' اور اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہو گیا۔

اسی طرح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو ان کی ہمت شکنی کی جائے، کیونکہ ایک عرصے سے لوگوں میں یہ مزاج ابھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن

پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے ان سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں، اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کردیتے ہیں جس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو۔

مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ ''یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟'' آپ نے جواب دیا ''یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیے۔'' ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہوگئے؟ آپ نے فرمایا ''مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟''

غرض اگر عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضہ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پاگئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟

اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مؤمن تھے یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے یا نہیں؟ اور والد صاحب کو اندازہ ہوتا کہ یہ سوالات بلاضرورت محض بحث ومباحث کی خاطر پوچھے جارہے ہیں تو عموماً آپ ان کو جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے کہ ''ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان وعمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل پر بحث مباحثے میں وقت خرچ کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے''۔

بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفاء فرماتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''من حسن اسلام المرء تركه مالا يعنيه (جامع الترمذی، ابواب الزھد)

''یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔''

ایک مرتبہ ملک میں ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے مسئلے پر بحث ومباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے، اور فریقین کی طرف سے مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہوگیا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس مسئلے پر بھرمار ہوئی تو اس زمانے میں آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر سوال کوئی ذی علم شخص کی طرف آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس مسئلے کا مقصد اپنے کسی شبہے کو دور کرنا یا واقعۃً علمی تحقیق کرنا ہے، تو آپ اس کا جواب حسب ضرورت اجمالاً یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دیتے کہ حیات

النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس بحث میں پڑنے کے بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجیے۔

من حسن اسلام المرء تركه ما لا يعنيه

اسی طرح آپ نے بارہا فرمایا کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کے فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتوے کے بجائے مشورے کے طور پر لکھنا چاہیے، ایسے موقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ "فلاں عمل مناسب نہیں" یا "درست نہیں" یا اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے"۔ اسی ذیل میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں، اس کی بناء پر بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکام شریعت میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ سے کسی نے کہا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو اکابر علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیے۔ لیکن اب آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات ارشاد فرمائی وہ لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ فرمایا کہ یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقے پر وبا کے مسلط ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس وباء کو روکا جاسکے، لیکن جب وباء آجاتی ہے تو پھر معالجوں کی تدبیر بدل جاتی ہے، اور اس وقت ایسے نسخے بتائے جاتے ہیں جن کے ذریعے وہ بیماری آنے کے بعد شفاء حاصل ہو، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید علوم وفنون یا کسی زبان کی تحصیل کو بذاتِ خود کسی نے حرام نہیں کہا لیکن اس وقت چونکہ علماء کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم وفنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے، بلکہ ملحدانہ عقائد ونظریات اور دین سے بیزاری کی وباء ساتھ لائیں گے جس کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہوگیا اس لیے شروع میں انہوں نے اس وباء کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کا ایمان بچالیا، لیکن جب یہ وباء عالمگیر ہوگئی تو پھر تدبیر بدل گئی، اور وہ یہ کہ ان علوم وفنون یا اس زبان کو حتی

الوسع ان بیماریوں سے پاک کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ غرض یہ مختلف حالات کی مختلف تدبیریں تھیں ٹھیٹھ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں۔

فتویٰ نویسی میں آپ کا خصوصی انداز

حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتویٰ نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''مفتی کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس کے فتویٰ کو مخاطب ٹھیک ٹھیک سمجھ لے، اور نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ پہلے زمانے میں چونکہ علم دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی اس لیے لوگ علمی وفقہی اصطلاح واسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے، چنانچہ مفتی حضرات اپنے جوابات میں بلا تکلف فقہی اصطلاحات استعمال کر لیتے تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا اس لیے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ موجود تھے جو اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکیں۔ اب ہماری شامت اعمال سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ علم دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی اور اہل علم کی تعداد بھی کم ہوگئی ہے، اس لیے اب اگر سوال کرنے والا کوئی عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیے''۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملہ لکھتے ہیں: ''مرحوم کا جملہ ترکہ **بعد تقدیمِ حقوقِ متقدمہ علی الارث** حسب ذیل طریقے پر تقسیم ہوگا''۔

اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا، لیکن آج گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آجائے تو وہ اس کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اور اس سے میراث کی شرعی تقسیم میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اول تو آج لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکے میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں؟ چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں بلکہ بعض اوقات گھر کے ساز وسامان تک کو ترکے کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پھر نہ لوگوں کو ''**حقوق متقدمه علی الارث**'' کا مطلب معلوم ہے اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے، اس لیے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی:

''صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی، زیور، جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو۔ اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز وتکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر مرحوم کے ذمے کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر

اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دَین میں شامل ہے اس کو ادا کیا جائے، پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ۱؍۳ (ایک تہائی) کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے الخ''۔

یہ تو ایک مثال تھی، ورنہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار ہیں، اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے، چنانچہ جو حضرات آپ سے فتویٰ کی تربیت لیتے تھے ان کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے، اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کی عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔ مفصل فتووں میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جواب اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات پورے فتوے کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز فتویٰ نویسی جس کی آپ دوسروں کو بھی تاکید فرماتے تھے، اس سے مختلف تھا آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو، وہ باآسانی حکم معلوم کر لے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔ فتوے میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے اور دلائل اہل علم کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جانی چاہیے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، اس کا مختصر جواب کیا ہے؟ اس جواب کے بعد اہل علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتووں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے فتوے کے شروع یا آخر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقے پر مسئلے کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز احقر کو غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاویٰ تھے، لیکن ان کا طریقہ یہی تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ ھل یجوز ؟ اس پر حضرت شاہ جلال صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع میں لکھا تھا: الجواب: نعم، یجوز اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بطور مثال پیش کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے

ایک لفظ سے مل گیا۔ اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھتا تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لئے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح سوال بعض اوقات تہہ در تہہ ہوتا ہے اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو گڈمڈ کر کے پوچھتا ہے، ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کرنے کا تجزیہ خود فرما لیتے اور یہ تنقیح فرما دیتے کہ اس مسئلے میں فلاں فلاں باتیں قابل غور ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبر وار بحث فرماتے تھے اس طرح مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتے تھے اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہتی تھی۔

فتویٰ کے کام کی عظمت واہمیت

حضرت والد صاحب قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کی بے شمار خدمتیں لیں، جن میں تدریس، تصنیف، وعظ، اصلاح وارشاد، اقامت دین اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے سیاسی جدوجہد وغیرہ۔ لیکن ان تمام خدمات میں سے وہ خدمت جو آپ کی زندگی کا جزء بن گئی تھی، فتویٰ کی خدمت تھی جو ''مفتی'' کے منصب پر فائز ہونے کے بعد شاید ایک دن کیلئے بھی نہیں چھوٹی، یہاں تک کہ زندگی کا آخری کام جو وفات سے چند گھنٹے پہلے انجام دیا وہ بھی ایک استفتاء کا جواب تھا۔ دوسری خدمات اپنے اپنے وقت کے ساتھ مخصوص رہیں اور ان کی انجام دہی میں وقفے آتے رہے، لیکن فتویٰ کا کام سفر وحضر، صحت وعلالت، مصروفیت وفراغت، تنگدستی وخوشحالی کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑا، آپ سفر میں جاتے تو ڈاک کا ایک ضخیم پیکٹ ساتھ ہوتا اور چلتی ہوئی ریل میں بھی، جب کہ عام آدمیوں کے لئے لکھنا ممکن نہیں ہوتا، ڈاک کا جواب برابر جاری رہتا تھا۔ ایک روز آپ نے فتویٰ کے ساتھ اس قدر شغف اور انہماک کا سبب خود بیان فرمایا جس سے اس طرز عمل کی حقیقت واضح ہوئی۔ فرمایا کہ دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں ان میں سے فتویٰ وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہوتا ہے، انسان تصنیف کرتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے وہ اس پر عمل کریں گے یا نہیں! اسی طرح وعظ وتقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے بیان سے کوئی متاثر ہو کر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں! یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے لوگ اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتوے کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے۔ اس لیے اس کا فائدہ اگرچہ بظاہر محدود ہے لیکن نقد اور متعین ہے اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائد نفس دوسری خدمات کے مقابلے میں کم ہیں، اس لیے اس میں

اجر وثواب کی امید زیادہ ہے۔

یوں تو فقہ وفتویٰ کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج ومزاق اور اس شعبے میں آپ کی خدمت ایک وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ نہ مجھ جیسے کم سواد اور نااہل کے لیے ممکن ہے اور نہ کسی مختصر مقالے میں اس کا حق ادا ہوسکتا ہے۔لیکن چند موٹی باتیں جو اس وقت یاد آگئیں، انہیں بے ربط سے انداز میں پیش کر دیا ہے اور فی الوقت اس سلسلے میں اسی پر اکتفاء کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور پڑھنے والے حضرات کے لیے نافع ومفید بنائے۔آمین۔

☆......☆......☆

(ضمیمہ نمبر۲)

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے چند راہ نُما واقعات

اس کتاب میں جا بجا آپ نے متقدمین علماء کے اقوال اور واقعات ملاحظہ کیے۔ یہاں ہم فتویٰ دینے کے متعلق ماضی قریب کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند دلچسپ واقعات، تحفۃ العلماء (مرتبہ مفتی محمد زید صاحب)، سے پیش کر رہے ہیں، جو یقیناً قارئین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

(۱)...... حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک شخص کا خط آیا کہ ایک واعظ صاحب فرماتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت ایک دفعہ تو واجب ہے اور دوسری دفعہ منع ہے''۔ یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

اسی طرح ایک شخص نے لکھا تھا کہ ایک واعظ صاحب یہ فرماتے ہیں: ''جو عشاء کی سنتوں کو پڑھے وہ کافر ہے''۔ ایک ایسا ہی مضمون شہادتِ کربلا کے متعلق تھا۔ اس قسم کے مسائل میں غلط فہمی سے سائل کچھ کا کچھ سمجھ کر پوچھتا ہے اور اس بناء پر جواب حاصل کر کے فساد کا سبب بنتا ہے۔

اس قسم کے سوالات کے متعلق میرا معمول جواب دینے میں یہ ہے کہ لکھ دیتا ہوں:

''انہوں نے کچھ اور فرمایا ہوگا۔ عالم آدمی کبھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا۔

آپ نے غلطی سے کچھ اور خیال کر لیا ہے اور اگر واقعی یہ بات ہے تو ان کے ہاتھ سے لکھوا کر بھیجیے''۔

فرمایا: ''پھر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔ یہ طرز رفعِ فتنہ وانسدادِ فساد کے لیے بہت مستحسن ہے''۔

(۲)......ایک واقعہ اور پیش آیا، جس شخص نے حضرت سے کوئی فتوی لیا تھا، اس نے اس پر مناظرانہ انداز سے اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے۔ اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''ہم نے اپنی معلومات کے مطابق جواب لکھ دیا ہے۔ اگر پسند نہیں ہے تو جس عالم پر اعتماد ہو، اس سے رجوع کرو۔ وفوق کل ذی علم علیم''۔

(۳)......ایک دفعہ مولانا (غالباً اس سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ مراد ہیں) کے ایک تصحیح کردہ فتویٰ پر کہیں سے کچھ اعتراضات لکھے ہوئے آئے تھے۔ آپ نے اس کا جواب لکھنا چاہا۔ مولانا نے فرمایا: ''اس کا جواب مت لکھنا! صرف یہ لکھ دو کہ اس کا جواب تو ہے، مگر ہم مرغانِ جنگی نہیں ہیں کہ سوال و جواب کا سلسلہ دراز کریں۔ بس اس جواب کا حق ایک دفعہ ادا ہو گیا تھا اور یہ لکھ دو کہ اگر اطمینان نہ ہو تو '' فوق کل ذی علم علیم ' دوسری جگہ دریافت کرلو، جنگ وجدل سے معاف کرو''۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا کی بات اس وقت تو سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ جنگ وجدل کرنا اس کا کام ہے جس کو فرصت ہو اور بیکار ہو۔ اس کی مثال ایک حکایت ہے: ''ایک شخص کی داڑھی میں سفید بال تھے، جب حجام کے سامنے خط بنانے بیٹھا تو کہنے لگا: سفید بال سارے چن لو۔ نائی نے ساری داڑھی صاف کردی اور کہا: تم خود چن لو، مجھ کو فرصت نہیں''۔ کام کا آدمی بکھیڑوں سے اس طرح گھبراتا ہے۔ ہاں شرعی ضرورت ہو تو اور بات ہے۔ جو سمجھنا چاہے اس کو سمجھا سکتے ہیں لیکن اعتراض کا تو کوئی جواب نہیں۔

(۳)......فرمایا: ''ایک شخص کا خط آیا۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس نے بیس دن کے بعد اپنی سالی سے نکاح کرلیا ہے۔ یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟ اور شامی میں جو مردوں کے واسطے بیس عدتیں لکھی ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے لکھا: '' نکاح تو ہو گیا، شامی میں جو لکھا ہے وہ خود دیکھ لو۔ مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو؟''۔

(۴)......فرمایا: ''لوگوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب نے کچھ مسائل دریافت کیے ہیں۔ لکھا ہے کہ ان کا جواب حدیث سے تحریر فرمایا جائے۔ میں نے لکھ دیا ہے: ''فقہ میں تو اس کا جواب یاد ہے، حدیث میں نہیں، اس لیے معذور ہوں''۔

(۵)......ایک شخص نے اصحاب کہف کے نام خط میں پوچھے۔ آپ نے لکھا: ''اصحاب کہف کے اعمال پوچھو، تم ہی اصحاب کہف کی طرح ہو جاؤ گے''۔

(۶)......ایک شخص نے خط میں سوال کیا کہ بیس رکعت تراویح کا کیا ثبوت ہے؟ اس کا جواب تحریر فرمایا: کیا

مجتہدین پر اعتبار نہیں؟''۔

یہ جواب لکھنے کے بعد فرمایا: ''اگر اس شخص نے یہ لکھا کہ ''مجتہدین پر اعتبار نہیں'' تو میں یہ لکھوں گا: ''مجھ پر کیسے اعتبار کرلیا، جب کہ امام ابوحنیفہ جیسے حضرات پر اعتماد نہیں کیا؟''۔

(۷)......ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ میں نے عورت کو لفظ طلاق نہیں کہا بلکہ ''تلاک'' کہا۔ فرمایا: ''نکاح کے وقت بھی نکاح نہ کہا تھا ''نکاہ'' کہا تھا۔ اگر اس سے نکاح نہ ہوا تھا تو عورت سے نکاح نہ ہونے کے سبب جدا ہونا چاہیے''۔

(۸)......ایک صاحب کا خط آیا: ''جناب آپ خط کے ذریعے لوگوں کو مرید کرتے ہیں' اس کی کیا دلیل ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا: ''یہ میرا فعل ہے۔ آپ میرے فعل کی دلیل کیوں دریافت کرتے ہیں؟ آپ کو اس کا کیا حق ہے؟ آپ بلا دلیل کسی کو مرید نہ کریں''۔

(۹)......ایک شخص نے سوال کیا: ایک عورت جارہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر اور بھائی بھی تھا۔ راستہ میں کسی رہزن (ڈاکو) نے ان دونوں کو قتل کردیا۔ اتفاقاً اس طرف سے ایک فقیر کا گذر ہوا۔ عورت کی التجا سے فقیر نے کہا کہ ان دونوں کا سر دھڑ میں ملا کر رکھ دے میں، دعا کروں گا۔ عورت نے غلطی سے بھائی کا سر شوہر کے دھڑ میں اور شوہر کا سر بھائی کے دھڑ میں جوڑ دیا۔ فقیر نے دعا کی تو دونوں زندہ ہوگئے۔ اس میں عورت کس کو ملے گی؟

حضرت فرماتے ہیں: ''میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور سوال کرنے والے کو زجر و توبیخ کی، کیونکہ ایسے سوال بالکل لغو اور بے ہودہ ہیں۔ ایسے سوال کا کوئی جواب نہیں دینا چاہیے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے کام کی بات دریافت کریں۔ ایسے فضول سوالات سے تضییع اوقات نہ کیا کریں''۔

(۱۰)......کسی نے لکھا حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال پہلے ہوا یا حضرت حوا کا؟ اور ان دونوں کے بیچ میں کس قدر زمانہ گزرا ہے؟ آپ نے اس کا جواب دیا: ''میں نے کہیں نہیں دیکھا''۔

(۱۱)......ایک خط میں آیا تھا کہ معلوم ہوا بھوک کے وقت حضور ﷺ نے شکم مبارک پر پتھر باندھا ہے۔ کتب سیَر کے حوالے بھی دیئے تھے۔ پھر پوچھا تھا: کیا یہ صحیح ہے؟ آپ نے لکھا: ''اگر صحیح ہے تو تم کیا کروگے؟'' مطلب یہ کہ غیر ضروری تحقیق سے کیا فائدہ؟

(۱۲)......ایک شخص نے سوال کیا: ''حضور ﷺ کے والدین شریفین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' آپ نے اس سائل سے دریافت کیا: ''تم سے موت کے وقت یا قبر میں یا حشر میں یا میزان پر یہ سوال ہوگا؟'' عرض کیا: نہیں۔ پھر

کہا: ''کیاتم کومعلوم ہے کہ روز قیامت نماز کی پوچھ ہوگی؟'' عرض کیا کہ جی معلوم ہے۔ کہا: ''اچھا بتلاؤ! نماز میں فرائض ، واجبات، سنن، مستحبات کیا کیا ہیں؟'' بے چارہ گم صم ہوگیا۔ فرمایا: ''جاؤ! کام کی باتوں میں وقت صرف کیا کرتے ہیں۔ غیر ضروری سوال نہ کرنا چاہیے''۔

(۱۳)......ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک سوال آیا کہ عوج بن عنق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے لمبے تھے؟ آپ نے جواب لکھا: ''جیسا یہ سوال غیر ضروری ہے، اسی طرح جواب کی بھی ضرورت نہیں''۔

(۱۴)......فرمایا: ''بعض لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں: کوا حلال ہے یا حرام؟'' میں ان سے پوچھتا ہوں: کیا اس کے کھانے کا ارادہ ہے؟ وہ کہتے ہیں: ''بھلا اس کو کیوں کھانے لگیں؟'' میں نے کہا: ''جب ارادہ کھانے کا نہیں تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟'' کیونکہ یہ فروعی مسائل میں سے ہے، اصول وعقائد میں سے نہیں کہ قیامت میں پوچھ ہو کہ کیا اعتقاد رکھا تھا؟ غرض میری یہ تھی کہ عوام الناس کو علماء پر جرأت نہ ہو، اور فضول میں مشغول نہ ہوں''۔

(۱۵)......ایک شخص نے سوال کیا: تصویر کا رکھنا گناہِ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

آپ نے جواب لکھا: ''کپڑوں کے بکس میں آگ رکھتے ہوئے بھی تحقیق کی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑا انگارہ؟''۔

(۱۶)......ایک صاحب نے سوال کیا: ''حضرت! کشمیر کے متعلق اکثر لوگوں کو مالی وجانی امداد کرنے میں اشکال ہے، شرعی حکم کیا ہے''؟ اس سائل کا قصد خود عمل کا نہ تھا ویسے ہی مشغلہ کے طور پر پوچھا تھا، اس لیے فرمایا: ''جس شخص کا امداد کرنے کا ارادہ ہو اس کو خود سوال کرنا چاہیے۔ اگر آپ ہی کا ارادہ ہے تو ظاہر کیجئے کون سی امداد کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کا حکم ظاہر کروں''۔ عرض کیا: بعض لوگ دریافت کرتے ہیں۔ فرمایا: ''سوال اسی شخص کو کرنا چاہیے جس کا کچھ کرنے کا ارادہ ہو، دوسروں کو جواب دینے کی آپ کو کیا فکر؟ کہہ دیجئے: ''ہم کو نہیں معلوم''۔ دوسری بات یہ ہے کہ جواب تو جب ہی ہوسکتا ہے جب سوال کی صورت متعین ہو۔ وہاں کے واقعات کی تنقیح جب تک نہ کی جائے جواب کس بات کا ہو؟ اس کے متعلق یہاں پر بہت سارے سوالات آتے ہیں، میں لکھ دیتا ہوں: ''زبانی سمجھنے کی بات ہے، زبانی آ کر سمجھ لو''۔ یہ اس واسطے کہ سائل سے واقعات کی تنقیح کر لی جائے۔

(۱۷)......فرمایا: ایک خط آیا ہے کہ ایک شخص ضد کر رہا ہے کہ مجھ کو بقر عید کے دن قربانی میں ذبح کر ڈالو ورنہ میں کنویں میں کود کر مر جاؤں گا۔ تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ میں نے لکھ دیا: ''اگر ایسا کیا تو دونوں جہنم میں جاؤ گے اور اگر وہ کنویں میں کود گیا تو وہ جہنمی ہوگا''۔

(۱۸)......ایک خط میں کسی نے لکھا: ''ارواحِ انبیاء واولیاء درد دنیا آیند یا نہ؟'' میں نے لکھ دیا ہے: ''بدیں مسائل چہ حاجت دردین؟'' اور اگر تصحیح عقائد کی غرض ہو تو ایسے امور میں ''الله اعلم'' کا عقیدہ کافی ہے، کیونکہ ایسے امور غیر مقصود ہیں۔

(۱۹)......فرمایا: ''ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کا خط آیا جس میں درود شریف اور **قراءت خلف الامام** پر کچھ شبہ ظاہر کیا ہے، مگر اس شخص کو لیاقت نہیں، کچھ نہیں سمجھے گا۔ میں نے لکھ دیا ہے: ''پہلے مبادی سیکھ لو تب جواب لکھوں گا، ورنہ نہیں''۔ اسی طرح ایک اور انجینئر صاحب تھے، وہ ان مبادی کے سیکھنے کے بارے میں فرمانے لگے: ''اب ہم پھر بچوں کے ساتھ الف باء پڑھیں؟'' میں نے کہا: ''اگر نہ پڑھو تو مقلد بنو، محقق بننے کا ارادہ نہ کرو''۔

(۲۰)......ایک مرتبہ فرمایا: ''ایک صاحب نے عجیب بے ہودہ سوال کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میرے لیے میری اصلاح بہتر ہے یا میرے اہل وعیال کی؟'' میں نے لکھ دیا: ''کلیات لکھ کر سوال کرنا اصول کے خلاف ہے۔ جزئیات ظاہر کر کے اپنی پوری حالت لکھو اور پھر رائے معلوم کرو''۔

(۲۱)......مجھ سے ایک دفعہ پوچھا گیا: سود کیوں حرام ہے؟ میں نے کہا: اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے''۔ کہا: ''حق تعالیٰ نے کیوں حرام کیا؟'' میں نے کہا میں اس وقت مشورے میں شریک نہ تھا جو وجہ پوچھ لیتا، اور اگر شریک ہوتا تب بھی یہی کہتا جو آپ لوگ حکامِ دنیا کے مشوروں میں رات دن کہا کرتے ہیں: ''جو ہجور (حضور) کی رائے ہو'' یا شاید یہ بھی کہہ دیتا کہ مسلمانوں پر ایک وقت افلاس کا آنے والا ہے، لہٰذا اس کو حرام نہ کیجئے، مگر مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ حکم خداوندی تو حکمت سے خالی ہوگا نہیں، وہ حکمت معلوم ہونی چاہیے۔ میں نے کہا: ''حکمت ضرور ہے مگر میں بیان سے معذور ہوں، کیونکہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی''۔ کہنے لگے: ''بیان تو کیجئے، میری سمجھ میں آئے نہ آئے۔'' میں نے کہا: ''میرے پاس ایسا فالتو دماغ نہیں ہے۔ ہاں! اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی سمجھدار طالب علم کو میرے پاس لے آؤ، جو کم از کم ہدایہ پڑھتا ہو۔ وہ مجھ سے یہ سوال کرے تو میں اس کو حکمت بتا دوں گا۔ آپ بھی سن لیں۔ اس صورت میں میرا وقت تو بے کار ضائع نہیں ہوگا، کیونکہ صحیح مخاطب سامنے ہوگا۔ اس وقت آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ ان حکمتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں''۔

افسوس! آج کل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ اس غرض سے مسئلہ پوچھتے ہیں کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کا جواب دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ریفارمر سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے ہی نہیں، بلکہ خود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں۔ گویا دین ان کے گھر کا قانون ہے، جو چاہا بنا دیا۔

(۲۲)......ایک وکیل نے پوچھا: ''نمازیں پانچ کیوں مقرر ہوئیں؟ میں نے کہا: ''تمہاری ناک منہ پر کیوں ہے،

پشت پر کیوں نہیں؟'' اس نے جواب دیا: اگر پشت پر ہوتی تو بدصورت معلوم ہوتی۔ میں نے کہا: ''بالکل غلط ہے۔ اگر سب کی ناک پشت ہی پر ہوا کرتی تو ہرگز بری نہ لگتی''۔ بس چپ رہ گیا۔

(۲۳)......ایک شخص نے دریافت کیا تھا: ''اجنبیہ عورت کا بوسہ لینے سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''یہ کیوں نہیں دریافت کیا کہ گناہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟'' آج پھر خط آیا ہے کہ یہ تو مجھ کو معلوم تھا اس میں گناہ ہے۔ میں نے آج جواب لکھا ہے: ''جب روزہ میں معاصی صادر ہوں تو وہ مقبول ہی نہیں ہوتا، پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے''۔

اگر میں ضابطہ کا جواب دیتا ہوں کہ فاسد نہیں ہوتا تو دلیری پیدا ہوتی ہے، اگر لکھتا ہوں کہ فاسد ہو جاتا ہے تو غلط ہوتا ہے، اس لیے میں نے ایسا جواب لکھا ہے جس سے نہ فتویٰ غلط ہو، نہ دلیری بڑھے۔

(۲۴)......حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں، وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی واسطہ نہ پڑے، یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہو سکے۔

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے، جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا۔ میں سمجھ گیا اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے۔ میں نے کہا: ''آپ امتحان کے لیے پوچھتے ہیں یا عمل کے لیے؟ اگر عمل کے لیے پوچھتے ہیں تو اس کے لیے مسئول سے اعتقاد ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے بنے؟ اور محض نام سننا کافی نہیں، نام تو نہ معلوم کتنوں کا سنا ہوگا؟ اور اگر امتحان کے لیے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے؟''۔

بس وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کا اس کی مرضی کے مطابق جواب دیا کروں''۔

(۲۵)......حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص مع اپنے کنبے کے لایا گیا۔ وہ خانساماں تھا۔ اس نے انگریز کی بچی ہوئی چائے پی لی تھی۔ اس کے تمام متعلقین نے اس سے نفرت ظاہر کی کہ تو ''کرسٹان'' (عیسائی) ہو گیا۔ یہ شخص بہت پریشان تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے پاس سب مسئلہ پوچھنے آئے۔ شاہ صاحب کے پاس اہل علم کا مجمع رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا: ''اتنی بڑی بات اتنی جلدی طے نہیں ہو سکتی۔ کل آنا! کسی بڑی کتاب میں مسئلہ دیکھیں گے'' اور اس کے بیوی بچوں سے کہا: ''اس سے الگ رہنا!'' کئی روز دِق کر کے فرمایا: ''آج ایک روایت نکلی ہے۔ بہت بڑی بات ہو گئی تم سے! اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤ! اتنی نفلیں پڑھو! غسل کرو!'' غرض بڑا بکھیڑا بتلایا۔ شاگردوں نے جرحاً باہم کہا: نہ معلوم شاہ صاحب نے یہ مسئلہ کہاں سے فرمایا؟ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا: ''تم کیا جانو؟ یہ

انتظامی بات ہے۔ایسا نہ ہوتا تو لوگ دلیر ہو جاتے اور کرسٹان (عیسائی) بننا شروع ہو جاتے"۔

(۲۶)......ایک شخص نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: حضرت! میں نے چماروں کے کنویں سے پانی لیا ہے ۔فرمایا: "توبہ کرلو اور آئندہ ایسا مت کرنا"۔ جب وہ شخص چلا گیا تو فرمایا: "یہ میں نے اس لیے کہا تا کہ دل میں رکاوٹ رہے اور آگے نہ بڑھے، نفرت پیدا ہو"۔

(۲۷)......ایک اور صاحب نے حضرت سے استفسار کیا کہ میرے لیے ملازمت سرکاری کے علاوہ اور کوئی صورت معاش کی نہیں اور سرکاری ملازمت بغیر ڈاکٹری معائنہ کے ہو نہیں سکتی اور ڈاکٹری معائنہ میں بالکل برہنہ ہونا پڑتا ہے اور میں منتخب ہو چکا ہوں صرف ڈاکٹری معائنہ کی رکاوٹ باقی ہے تو کیا اس مجبوری میں ڈاکٹری معائنہ جائز ہے یا نہیں؟۔

حضرت نے جواب تحریر فرمایا: "جائز سمجھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ ناجائز سمجھا جائے اور کرا لیا جائے۔ اس کے بعد توبہ کرلی جائے"۔

پھر فرمایا: "ایسے جواب کی یہ بھی وجہ ہے کہ اب کیا معلوم واقعی اس کے سوا اور تمام ذرائع آمدنی ان کے لیے مفقود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ گھاس تو کھود سکتے ہیں، کسی مسجد میں مؤذنی تو کر سکتے ہیں، البتہ تنعّم (آسائش) چاہتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ پھر ضرورت کے تحقیق پر بھی اگر میں یہ لکھ دیتا ہوں کہ جائز ہے تو جرأت بڑھ جاتی، نہ معلوم کہاں تک نوبت پہنچتی۔ میرے اس جواب میں اہل علم کے لیے بڑا سبق ہے کہ وہ ایسے خیالات کی رعایت رکھا کریں"۔

(۲۸)......حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک جگہ فرمایا ہے: "میں اہل علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ فتوی۔ میں یہ طریق اختیار کریں کہ کسی کے کہنے سے دوسرے پر فتویٰ نہ لگائیں۔ اسی طرح سے کسی پر کفر کا فتویٰ نہ لگائیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کہا کہ فلاں کا یہ فاسد عقیدہ ہے اور وہ یوں کہتا ہے، میں نے کہا: "جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس سے لکھوا کر لاؤ"۔

(۲۹)......ایک مدرسے سے خط آیا کہ ایک مدرس صاحب نے تحریکات میں حصہ لیا تھا اور ڈیڑھ برس تک جیل میں رہے تو قید کے زمانے کی تنخواہ ان کو دینی چاہیے یا نہیں؟ میں نے جواب میں لکھا: "دو باتیں دریافت طلب ہیں:

(۱)......نوکر رکھتے وقت اس سے معاہدہ کیا تھا یا نہیں؟

(۲)......وہ تنخواہ لینے والے مدرس کیا توجیہ کرتے ہیں؟

صاف لکھو تو جواب دوں"۔

لوگ آج کل علماء کو اپنی جنگ کی آڑ بناتے ہیں اور خود الگ رہتے ہیں۔ میں ان کی رگوں سے خوب واقف ہوں، جوابوں میں اس کی رعایت رکھتا ہوں، اس لیے یہاں کے جوابوں سے لوگ خوش نہیں ہوتے۔

(۳۰)......ایک خط بطور شکایت لکھا آیا تھا کہ یہاں کی انجمن میں اتنے عرصے سے مدِ زکوۃ کا روپیہ جمع ہے۔اگر لوگ ان سے صَرف کرنے کو کہتے ہیں یا حساب مانگتے ہیں تو کوئی جواب نہیں دیتے۔ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

میں سمجھ گیا یہ فتویٰ حاصل کر کے لوگوں کو دکھاتے پھریں گے اور فساد برپا کریں گے۔ میں نے جواب لکھا: ''ان انجمن والوں سے اس کا جواب سوال میں درج کروا کر لے کر آؤ کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اور پھر جواب حاصل کرو''۔ اب اس جواب سے بھلا کیا خوش ہوں گے؟

(۳۱)......حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے تھے: شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے سائل کے فہم کے مطابق جواب دینے میں کمال عطا فرمایا تھا۔ایک مرتبہ ان سے کسی نے دریافت کیا: ہندوستان میں جمعہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا: ''جیسا جمعرات کی نماز پڑھنا''۔

(۳۲)......ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا: فاحشہ عورت کی نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اس کے آشناؤں کی نماز پڑھنا کیسا سمجھتے ہو؟''

(۳۳)......حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے کسی شخص نے بذریعہ خط دریافت کیا: '' یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ!'' کے وظیفہ کا کیا حکم ہے؟ آگے گستاخانہ عبارت تھی، پھر پوچھا گیا تھا: اس کا حکم آپ کو کہاں تک معلوم ہے؟

آپ نے جواب لکھا: ''حکم سے کیا مراد ہے، منصوص یا مستنبط؟''

پھر فرمایا: ''یہ اس کی گستاخی کی سزا ہے۔وہ اس جواب کے چکر سے مدت تک نہیں نکل سکتا''۔

(۳۴)......ایک مرتبہ ایک صاحب کا خط آیا کہ انگریزی پڑھنے کے لیے (جگہ وغیرہ) وقف کرنے پر ثواب ہوگا یا نہیں؟

آپ نے لکھا: ''انگریزی پڑھنے سے کیا نیت ہے؟ اور انگریزی پڑھنے کے قواعد کیا ہیں اور کورس کیا ہے؟ اور اس کی ضرورت کیا ہے؟''

پھر فرمایا: ''اب جیسا جواب دے گا، ویسا حکم اس پر مرتب ہوگا''۔

(۳۵)......ایک صاحب نے لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا: '' کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟''۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر(۱)

توقیع کامفہوم

توقیع'' کامعنی آج کل دستخط کے کیے جاتے ہیں۔اس طرح موقع کا مطلب ہوا'' دستخط کرنے والا''۔

زمانہ ماضی میں جب حکمران کسی درخواست یا عرضی پر جو جواب لکھتے تھے'اُسے توقیع کہا جاتا تھااور عام طور پر یہ ادبی اعتبار سے بہت بلند پایہ الفاظ ہوتے تھے۔جیسے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک سرکاری اہلکار نے اپنے لیے گھر بنانے کی غرض سے جب ایک لمبی چوڑی جگہ اور سینکڑوں کھجور کے درختوں کیلئے درخواست پیش کی تو آپ نے اُس پر تحریر فرمایا:

ادارک بالبصرة ام البصرة فی دارک

(جناب کاارادہ بصرہ میں گھر بنانے کا ہے یا پورے بصرہ کو اپنے گھر میں شامل کرنا چاہتے ہیں)۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی کتاب'' العقد الفرید ''کے باب توقیعات الخلفاء میں اس نوعیت کے کئی دلچسپ جملے ملتے ہیں۔

بعدازاں خلفاء اور حکمرانوں نے اپنے زمانے کے بہترین اہلِ علم کو'' توقیع ''کے عہدے پر فائز کرنا شروع کر دیا۔یہ ہی حضرات سرکاری فرامین لکھنے کے ذمے دار ہوتے تھے اور یہ ہی حضرات ''موقع '' کہلاتے تھے۔

مصباح اللغات میں''توقیع ''کے یہ معانی لکھتے ہیں:

کسی چیز کا وہم وگمان کرنا۔آخررات میں اترنا۔کتاب سے فراغت کے بعد ضمیمہ لگانا۔شاہی مہر،جمع تواقیع۔

'' الموقع.''کے یہ معانی لکھے ہوئے ہیں:

آہستہ قدم رکھنے والا۔مہر شاہی کا محافظ۔شاہی فرمان لکھنے والا)۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲)

(مناهج الفتوىٰ فی السلف ،الفتوىٰ فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم)

عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں احادیث مبارکہ کے مجموعے

حدیث پاک کے ان مجموعوں کی فہرست سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کتابت حدیث کا کام دور نبوت اور دور صحابہ میں ہی شروع ہو چکا تھا۔

① ...... صحائف حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (۱۵ھ)

② ...... صحائف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (۶۸ھ)

③ ...... صحیفہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ (۶۰ھ)

④ ...... صحیفہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (۷۸ھ)

⑤ ...... صحائف حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ (۱۵۱ھ)

⑥ ...... صحیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱۳ھ) جسے انہوں نے خود جلا کر ضائع کر دیا۔

⑦ ...... صحائف حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (۹۳ھ)

⑧ ...... صحائف حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (۶۳ھ)، جماعتِ صحابہ میں اس سلسلے میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی لکھنے کا اہتمام کر رکھا تھا جس کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھتے رہنے کا حکم وتاکید فرمائی۔

......☆......

تشریحات نمبر (۳)

(مناهج الفتوىٰ فی السلف ،الفتوی فی......)

استنباط کا مطلب

استنباط کا لفظ اس کتاب میں اور دیگر کتب اسلامیہ میں بکثرت آتا ہے۔ اس لئے یہاں اس کی مختصر وضاحت کرنا مناسب معلوم ہے۔

نبط الشئی نبطاً و نبوطاً کے معنی ہوتے ہیں پوشیدگی کے بعد ظاہر ہونا، عرب کہتے ہیں: حفر الارض حتّی نبطَ الماء: زمیں اتنی کھودی کہ پانی نکل آیا۔

جدّفی النقب حتی نبط المعدن: زمین کو گہرائی تک کھودا حتی کہ کان نکل آئی۔

استنبط فلان": استنباط واستخراج کرنا، کسی بات پر غور وفکر کر کے علت مشترکہ کی بناء پر کوئی نئی بات دریافت کرنا یا کسی مسئلہ سے نیا جز ئیہ نکالنا۔

اس اجمال کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ہر ایسے مسئلے کا تسلی بخش حل پیش کرتا ہے جو آنے والے کسی بھی صورتِ حال میں پیش آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قرآن کریم، سنتِ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان علماء کے استنباط کردہ احکامات میں ہماری سماجی و معاشی زندگی کی ہر ہر تفصیل بیان کردی گئی ہے، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ ﷺ نے وسیع اور عمومی ضابطے مقرر فرما دیے ہیں، جن کی روشنی میں ہر دور میں اپنے زمانے کی نئی صورت حال کے متعلق خاص حکم شرعی تک پہنچنے کے لیے ماہرین شریعت کو بڑا اہم کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔

انہیں ہر سوال پر قرآن وسنت میں طے کردہ اصولوں اور اسلامی فقہ کی کتابوں میں بیان کردہ قواعد کی روشنی میں غور کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل کو ''استنباط'' اور اجتہاد کہا جاتا ہے، اجتہاد واستنباط کے اس عمل نے اسلامی فقہ کو علم وحکمت کی ایسی دولت عطا فرمائی ہے جس کے ہم پلہ کوئی اور مذہب نظر نہیں آتا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں شریعت اپنے پورے اثر ونفوذ کے ساتھ نافذ العمل ہو، وہاں اجتہاد واستنباط کا مسلسل جاری عمل اسلامی فقہی ورثے میں نئے قواعد وضوابط اور تصورات شامل کرتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے یہ بات آسان ہوجاتی ہے کہ تقریباً ہر صورت حال کا واضح حکم اسلامی فقہ کی کتابوں میں تلاش کیا جائے۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۴)

(مناهج الفتوى فی السلف ،منهج الصحابة والتابعين فی الافتاء)

اشباہ کا مفہوم

اصل کتاب میں یہاں اشباہ کا لفظ ہے، جس کی کچھ لغوی تحقیق یہ ہے:

(الاشباه) جمع شبه ، والشبه والشبيه ، المثل ، واثبه الشئ والشئ : ماثله و فی المثل : من

اشبه اباه فما ظلم ، واشبهت فلاناً ، و شابهته ، واشتبه علی ، وتشابه الشیئان ، واشتبها : اشبه کل واحد منهما صاحبه، وفی التنزیل (مشتبها و غیر متشابه) والمشتبها ت من الامور : المشکلات ، والمتشابهات المتماثلات ، وٖالتشبیه : التمثیل،(انظر : لسان العرب مادة شبه ۴/ ۲۱۹).

......☆......

تشریحات نمبر (۵)

(مناهج الفتویٰ فی السلف ،الفتویٰ فی عهد الصحابة رضی اللہ عنہم)

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور غامدیہ خاتون رضی اللہ عنہا کا مکمل واقعہ

ابن قیم رحمہ اللہ کی اس عبارت میں جن روایات کی طرف اشارہ ہے' حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ اور غامدیہ خاتون رضی اللہ عنہا کی اُن مکمل احادیث کا ترجمہ یوں ہے:

(۱)......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منہ موڑ لیا۔ پھر انہوں نے بار بار یہی بات کہی،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ موڑ لیا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم سے یہ دریافت فرمایا کہ یہ شخص مجنون ہے؟لوگوں نے عرض کیا :نہیں!اس کو کسی قسم کا کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے اس عورت سے زنا کیا ہے؟

انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنگسار کرنے کا حکم فرمایا پھر لوگ ان کو لے گئے اور سنگسار کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز (جنازہ) نہیں پڑھی۔

(دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی اس وقت نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی،البتہ اگلے روز ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی)۔

(۲)......حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبیلہ غامد کی ایک عورت خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں نے زنا کر لیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا: تم واپس ہو جاؤ،تو وہ عورت واپس چلی گئی۔ پھر اگلے دن اس عورت نے آ کر

عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ جس طرح آپ ﷺ نے حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کو واپس فرما دیا تھا' آپ ﷺ مجھے بھی واپس فرمانا چاہتے ہیں۔ (یعنی آپ ﷺ مجھے رجم نہیں کرنا چاہتے) اور واللہ! میں تو زنا سے حاملہ بھی ہوں' تو بھی آپ ﷺ نے اس سے فرمایا واپس ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ عورت چلی گئی۔

اگلے دن وہ عورت پھر حاضر ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا: واپس چلی جاؤ اور جب تک بچہ پیدا نہ ہو مت آنا۔ وہ عورت واپس چلی گئی' جب اس عورت کے بچہ کی پیدائش ہوئی تو وہ بچہ لے کر حاضر ہوئی اور اس نے کہا: اس بچے کو میں نے جنم دیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: تم واپس ہو جاؤ اور اس بچہ کو دودھ پلاؤ، یہاں تک کہ تم اس بچہ کا دودھ چھڑاؤ۔

چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں بچہ کا دودھ چھڑا کر اُسے لے آئی اور اس بچہ کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی، جس کو وہ کھا رہا تھا۔ پھر بچہ کسی مسلمان کے سپرد کر دیا گیا اور اس عورت کے لئے حکم فرمایا گیا' تو اس عورت کے لئے ایک گڑھا کھودا گیا اور اس کو رجم کرنے کا حکم ہوا تو وہ عورت رجم کی گئی اور اس کے رجم کرنے میں خالد رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اُن کا پتھر اس عورت کے ایسا لگا کہ اس عورت کے خون کا قطرہ ان کے چہرہ پر پڑا تو انہوں نے اس عورت کو بُرا کہا۔ آپ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

اے خالد ٹھہرو! اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلاشبہ اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ظالم انسان اور انسانوں کے حقوق میں نقصان ڈالنے والا شخص بھی ایسی توبہ کر لے تو اس کی بھی بخشش ہو جائے۔ پھر آپ ﷺ کے حکم سے اس عورت پر نماز پڑھی گئی اور اس کی (مسلمانوں کے قبرستان میں) تدفین ہوئی۔

(سنن ابی داؤد، کتاب الحدود' بابٌ فی الرجم)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۶)

ایک غلط فہمی کا ازالہ، تقلید صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق

بعض لوگ یہاں یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ جب ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی فقہ مرتب و مدون ہو چکی ہے تو آئمہ اربعہ رحمہم اللہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ بلاشبہ یہ عنوان تو بہت اچھا ہے کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام و مرتبہ تمام آئمہ رحمہم اللہ سے بڑھ کر ہے لیکن عملی طور پر ایسا کرنا بالکل ناممکن ہے۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقہ کے یہ مجموعے چند مسائل میں اُن کی آراء پر مشتمل ہیں۔ کتابِ زندگی کے بے شمار عنوانات ایسے ہیں، جن کے بارے میں ان کی کوئی رائے یا فتویٰ موجود نہیں، اس کے برخلاف آئمہ اربعہ رحمہم اللہ کی فقہ اب زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان فتاویٰ میں سے اکثر کی نسبت اُن کی طرف کسی مضبوط سند سے نہیں بلکہ نقل در نقل کے ذریعے ہے، جب کہ آئمہ اربعہ کی آراء و فتاویٰ متصل سند کے ساتھ اُن تک پہنچتے ہیں بلکہ بہت سے مسائل تو اُن سے حدِ تواتر یا درجۂ شہرت تک پہنچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس صورت حال میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید بھی آئمہ کی تقلید کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس سلسلے میں نامور فقہاء کرام کی تصریحات آگے مسئلہ تقلید کی بحث میں آ رہی ہیں۔

ان شاء الله تعالیٰ.

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۷)

(مناهج الفتو ی فی السلف ،ائمة الفتویٰ فی عهد التابعین)

اقسامِ کتب حدیث کا تعارف

موطا و مصنف

یہاں کتب حدیث کی جن مختلف اقسام کی اشارہ کیا گیا، اُن کا مختصر تعارف تحریر کیا جاتا ہے:

وہ کتب جن کی ترتیب ابوابِ فقہ کے مطابق ہو اور ان میں احادیثِ مرفوعہ کے ساتھ موقوف و مقطوع احادیث بھی جمع کی گئی ہوں، جیسے مصنف ابوبکر یعقوب ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ (۲۳۵ھ)، مصنف عبدالرزاق رحمہ اللہ (۲۱۱ھ) وغیرہ، اور مؤطا امام مالک رحمہ اللہ و مؤطا ابن ابی ذئب رحمہ اللہ (۱۵۹ھ) وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (۱۵۰ھ) کے تلامذہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ و امام محمد رحمہ اللہ (۱۵۹ھ) و حسن بن زیاد رحمہ اللہ، امام زُفر رحمہ اللہ وغیرہ کی کتاب الآثار کے عنوان سے جو کتب منقول ہیں وہ بھی مؤطا و مصنف کے قبیل کی ہیں، ان میں فقہی ابواب کے مطابق احادیثِ مرفوعہ کے ساتھ موقوف و مقطوع روایات بھی جمع کی گئی ہیں اور یہ دراصل ان روایاتِ حدیث کا مجموعہ ہے جن کا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے تلامذہ کو اِملاء کرایا تھا۔

سنن

سے مراد وہ کتبِ حدیث ہیں جن کی ترتیب فقہی ابواب کے مطابق ہے اور ان میں عقائد و مناقب اور غزوات و

تفسیر وغیرہ سے متعلق روایات نہیں ہوتیں اور عموماً مرفوع احادیث ہی مذکور ہوتی ہیں، ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ چند اہم ومشہور یہ ہیں: سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) سنن سنائی (۳۰۳ھ)، سنن ابن ماجہ (۲۷۳)، سنن بیہقی (۴۵۸ھ) سنن دار قطنی (۳۸۵ھ) سنن دارمی (۲۵۵ھ)، سنن شافعی (۲۰۴ھ)۔

مسند

جمع ''مسانید'' استعمال ہوتی ہے، اس سے مراد عموماً وہ کتبِ حدیث ہوتی ہیں جن میں ہر ہر صحابی سے منقول روایات یکجا ذکر کی گئی ہیں خواہ صحابی کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہو یا ان کے باہمی مراتب وفضائل کے اعتبار سے، ایسی کتبِ حدیث کی تعداد سو سے زائد ہے، اہم حسبِ ذیل ہیں:-

مسند احمد بن حنبل، (۲۴۱ھ)، مسند حمیدی (۲۱۹ھ)، مسند ابی داؤد طیالسی (۲۰۴ھ)، مسند عبد بن حمید (۲۲۹ھ)

ان میں سے اولین ''مسند طیالسی'' ہے۔

کبھی محض احادیثِ مرفوعہ کی جامع کتبِ حدیث کو بھی ''مسند'' کہہ دیا کرتے ہیں جیسے ''مسند بقی بن مخلد اندلسی'' (۲۷۶ھ) جس کی ترتیب ابوابِ فقہ کے مطابق ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (۱۵۰ھ) کی طرف بھی ''مسند'' کے نام سے ایک مجموعۂ احادیث منسوب ہے جو دراصل ان کا ترتیب دیا ہوا یا تصنیف کردہ مجموعہ نہیں ہے بلکہ ان سے مروی احادیث کا مجموعہ ہے۔

......☆......

تشریحات نمبر (۸)

''مذہب کا عمومی معنیٰ''

''اردو میں مذہب بمعنیٰ دین ہے، تعلیم الاسلام کے شروع میں سوال وجواب ہیں۔ سوال تم کون ہو؟ یعنی مذہب کے لحاظ سے تمہارا کیا نام ہے؟ جواب: مسلمان! اور عربی میں مذہب کے معنیٰ ہیں: مسلک۔ کہا جاتا ہے:

کذافی مذهب ابی حنیفة ، کذافی مذهب الشافعی .

اسی لیے اردو میں لامذہب، دھریے اور بے دین کو کہتے ہیں، جب کہ عربی میں لامذہب بمعنیٰ غیر مقلد استعمال ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۹)

ماوراء النہر کا مطلب

جیحون وسط ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہی دریا آمو بھی کہلاتا ہے۔ پامیر سے نکلنے والے اس دریا کی کل لمبائی ۲۴۰۰ رکلومیٹر ہے۔ یہ افغانستان، تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان سے ہوتا ہوا بحیرۂ ازل میں گرتا ہے۔ بحیرۂ اُورال کا خوازم بھی کہتے ہیں۔

سیحون بھی وسطِ ایشیاء کا ایک اہم دریا ہے۔ یہ دریا کرغزستان، اوراز بکستان کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مغربی اور شمال مغربی ازبکستان اور جنوبی قازقستان میں ۲۲۲۰ کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد بحیرۂ اُرال میں گرتا ہے۔

عربی زبان میں ماوراء النهر یعنی "دریا کے اُس پار" سے مراد دریائے آمو (جیحون) کے پار واقع بڑے شہر سمرقند اور تاشقند وغیرہ ہوتے ہیں، جو کبھی فقہ حنفی کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور ان علاقوں سے نامور فقہاء حنفیہ نے جنم لیا تھا۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۰)

مسألة "خيار المغبون"

قد استدل الحنابلة و بعض المالكية بهذا الحديث على مشروعية خيار المسترسل المغبون، والمسترسل عندهم من لا معرفة له بقيمة السلعة ولا يحسن المبايعة ، وفسره احمد بالذى لا يماكس ، فكأنه استرسل الى البائع ، فأخذ ما أعطاه منْ غير مماكسة ولا معرفة بغبنه ، فمثل هذا المسترسل اذا غبن غبناً يخرج عن العادة فله الخيار بين الفسخ والا مضاء عند الامام احمد رحمه الله، ولا تحديد للغبن المثبت للخيار فى المنصوص عن احمد ، وحده ابو بكر و ابن ابى موسى من الحنابلة بثلث القيمة ، وهو قول البغداد يين من المالكية ، فاذا غبن المسترسل بثلث القيمة بان اشترى سلعة باثنتى عشرة روبية مثلاً وكانت قيمتها المثلية ثمانية فله الخيار ، وهذا اِذا كان الرجل مستر سلاً، واما غير المسترسل فليس له الخيار ، لانه دخل على بصير ة بالغبن، فهو كالعالم بالعيب ، وكذا لوا ستعجل ، فجهل مالو تثبت لعلمه لم يكن له خيار ، لا نه انبنى على

تقصیرہ و تفریطہ. ھذا ملخص ما فی المغنی لا بن قدامة ، و شرح مسلم للابی .

واما الحنفیة والشافعیة واکثر المالکیة فلا خیار عند ھم للمغبون سواء کان مسترسلا او غیرہ ، لا ن العقد و قع علی ثمن مخصوص بالتراضی و کل من المتعاقدین عاقل فصار تجارة عن تراض منھما فلا خیار لاحدھما بعد ذالک

(تکملة فتح الملھم، باب من یخدع فی البیع ، مبحث فی خیار المغبون ، ۱/۲۴۵، طبع دار القلم ، دمشق)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۱)

(طبقات الفقھاء ، الملاحظة الأولیٰ علی تقسیم ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ)

جمع بین الحقیقة والمجاز کا مسئلہ

احناف کے نزدیک ایک لفظ سے ایک وقت میں حقیقت اور مجاز دونوں کو مراد نہیں لیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں ایک لفظ سے معنی حقیقی بھی مراد ہو اور معنی مجاز بھی مراد ہو۔ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ لفظ دونوں کو بظاہر شامل ہو اور دونوں کا احتمال رکھتا ہو لیکن دونوں کا ارادہ کرنا یہ قطعاً ناجائز ہے۔

اگر چہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح حقیقت لفظ کا مدلول بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اسی طرح مجاز بھی لفظ کا مدلول بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک ساتھ دونوں کو مراد لینے سے کوئی مانع بھی موجود نہیں ہے۔ چونکہ اگر کسی نے لا تنکح ما نکح ابوک کہا تو اس سے عقد (مجازی معنی) اور وطی (حقیقی معنی) دونوں مراد ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ تو اپنے باپ کی موطوءہ سے نہ عقد نکاح کر اور نہ وطی کر اور اس اجتماع میں کوئی استحالہ نہیں ہے لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ حقیقت اور مجاز کو ایک لفظ سے ایک وقت میں مراد لیا جا سکتا ہے۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ حقیقت اپنے محل میں مستقر اور ثابت ہوتی ہے اور مجاز اپنے محل سے متجاوز ہوتا ہے اور یہ بات بالکل محال ہے کہ ایک شئی ایک وقت میں اور ایک حالت میں اپنے محل میں مستقر اور ثابت بھی ہو اور متجاوز بھی ہو جیسا کہ ایک حالت اور ایک وقت میں ایک لابس کے بدن پر ایک کپڑا ملکاً بھی ہو اور عاریۃً بھی ہو یہ محال ہے۔

احناف کے نزدیک ایک لفظ سے حقیقت اور مجاز دونوں کا بیک وقت مراد لینا چونکہ محال ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں

کہ رسول اللہ ﷺ کے قول " لا تبیعوا الدرهم بالدرهمين ولا الصاع بالصاعين"
(ایک درہم کو دو درہم کے عوض اور ایک صاع کو دو صاع کے عوض فروخت مت کرو) میں جب صاع کے مجازی معنی یعنی داخل صاع اور مایحل فی الصاع (مظروف) بالاتفاق مراد ہے۔تو حقیقت ومجاز کے اجتماع سے بچنے کے لئے نفس صاع اور عین صاع یعنی ظرف مراد نہ ہوگا اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک صاع اناج کا اس کے ہم جنسی دو صاع اناج کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے البتہ ایک عین صاع یعنی ظرف کا دو عین صاع یعنی ظرف کے عوض بیچنا جائز ہے۔اسی طرح آیت او لا مستم النساء میں لمس ، مس بالید کے معنی میں حقیقت ہے اور جماع کے معنی میں مجاز ہے اور ہمارا اور شوافع کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں جماع کے معنی مراد ہیں چنانچہ پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں جنبی کے لئے اسی آیت سے تیمّم کی اجازت دی گئی ہے اور جب یہاں جماع کے معنی مراد ہیں تو ہمارے نزدیک مس بالید کے معنی مراد نہ ہوں گے۔چنانچہ یہ ناقص وضو نہ ہوگا اس لیے کہ مس بالید مراد لینے کی صورت میں جمع بين الحقيقةوالمجاز لازم آئے گا حالانکہ وہ ثابت کر چکے ہیں جمع بين الحقيقة والمجاز جائز نہیں ہے۔

(تلخيص از اجمل الحواشي على اصول الشاشي ، ص۷۶،طبع دارالاشاعت کراچی)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۲)

(طبقات الفقهاء ،الملاحظة الاولىٰ على تقسيم ابن كمال باشا رحمہ اللہ)

" المجاز خلف عن الحقيقة في اللفظ اوفي الحكم " کا مسئلہ:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ حقیقت اور مجاز دونوں لفظ کی صفات ہیں یعنی یہ دونوں "لفظ" کی قسمیں ہیں اسی طرح اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے لیکن یہ خلیفہ کس اعتبار سے ہے، اس میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے لفظ کے اعتبار سے اور صاحبین رحمہما اللہ کے ہاں مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے حکم کے اعتبار سے۔

امام صاحب رحمہ اللہ کے ہاں لفظ کے اعتبار سے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو لفظ معنی حقیقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہو معنی مجازی کے استعمال کرتے وقت قواعد عربیہ اور نحوی ترکیب کے اعتبار سے درست ہو تو مجازی معنی مراد لینا

درست ہے اگر چہ لفظ کا معنی حقیقی ممکن نہ ہو۔ صاحبینؒ کے ہاں حکم کے اعتبار سے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو لفظ معنی مجازی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کا معنی حقیقی (حکم) ممکن ہو لیکن کسی عارض کی وجہ سے اس معنی حقیقی پر عمل نہ ہو سکتا ہو تو معنی مجازی مراد لینا درست ہے اور مجاز حقیقت کا خلیفہ اور بدل بن جائے گا لیکن اس لفظ کا معنی حقیقی ہی ممکن نہ ہو تو معنی مجازی کے لئے استعمال کیا ہوا لفظ لغو ہو جائے گا۔

ایک مثال سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے سے بڑے غلام کو "هذا ابنی" کہہ کر هذا حرّ مراد لے تو صاحبینؒ کے ہاں اس سے غلام آزاد نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ هذا ابنی مجاز ہوگا بنوت (بیٹا ہونے) کے حکم میں اس هذا ابنی کا جو بیٹے کے لئے بولا گیا ہو اور جس غلام کے لئے هذا ابنی بولا گیا ہے وہاں بنوت کا حکم آہی نہیں سکتا یعنی وہ کہنے والے کا بیٹا بن ہی نہیں سکتا کیونکہ اپنے سے بڑی عمر والا تو بیٹا ہوتا نہیں اس لئے هذا ابنی سے هذا حرّ مراد لینا صحیح نہیں ہوگا لہٰذا اس کا یہ کلام لغو ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اپنے سے عمر میں چھوٹے غلام کو هذا ابنی کہہ کر هذا حر مراد لیتا ہے تو صاحبینؒ کے ہاں وہ غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ بنوت کے حکم کا پایا جانا ممکن ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں عمر میں اپنے سے بڑے غلام کو هذا ابنی کہہ کر هذا حر مراد لیتا ہے تو جائز ہے اس سے اس کا غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ هذا ابنی کہہ کر هذا حرّ مراد ہو یہ مجاز ہے۔ اس هذا ابنی کے لفظ کا جو بیٹے کے لئے بولا گیا ہو اور یہ لفظ عربی قواعد کے اعتبار سے صحیح ہے، اگر چہ معنی حقیقی (بیٹا ہونا) ممکن نہیں لیکن لفظ کے صحیح ہونے کی وجہ سے هذا حرّ سے مجاز بن جائے گا اور غلام آزاد ہو جائے گا۔

(تلخیص از صفوة الحواشی شرح اصول الشاشی، ص ۱۳۳، طبع فریدیة)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۳)

(طبقات الفقهاء، الجامع الصغیر)

(تلخیص قواعد رسم المفتی، الأصل التاسع)

الجامع الصغیر کے چھ اختلافی مسائل

ابن نجیم رحمہ اللہ غایة البیان کی عبارت میں فخر الاسلام رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ فرمائش کرتے تھے کہ وہ ان کی طرف سے ایک کتاب روایت کریں پس امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب یعنی **الجامع الصغیر** تصنیف فرمائی اور اس کی سند امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تک بیان کی۔

جب وہ کتاب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اس کی تحسین کی اور فرمایا: ابو عبداللہ نے خوب یاد رکھا مگر چند مسائل کو مجھ سے روایت کرنے میں اُن سے غلطی ہوئی ہے۔ جب یہ بات امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: کہ میں نے تو ان مسائل کو یاد رکھا اور وہ بھول گئے۔

اور وہ چھ مسائل جو **الجامع الصغیر** کی شرح میں مذکور ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

یہ مسائل علامہ سراج ہندی رحمۃ اللہ علیہ نے **المغنی** کی شرح میں نقل فرمائے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

(۱)...... اگر کوئی شخص پہلی دو رکعتوں میں سے ایک اور آخری دو رکعتوں میں سے ایک میں قرأت کرے تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے **الجامع الصغیر** میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وہ شخص چار رکعت کی قضاء کرے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی نفی فرمائی اور کہا کہ میں نے تمہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کی تھی کہ اس پر دو رکعتوں کی قضاء لازم ہے۔

(۲)......: مستحاضہ عورت طلوع شمس کے بعد وضو کرے تو وہ نماز پڑھ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ظہر کا وقت نکل جائے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں یہ روایت کی تھی یہاں تک کہ ظہر کا وقت داخل ہو جائے۔

(۳)......: اگر کوئی شخص غاصب سے خرید کر غلام کو آزاد کر دے اور پھر اصل مالک اس بیع کی اجازت دے تو عتق نافذ ہو جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں یہ روایت کیا تھا کہ یہ عتق نافذ نہ ہوگا۔

(۴)......: جو عورت ہجرت کر کے آئے تو اس پر عدت نہیں ہے اور اس سے نکاح کرنا جائز ہے سوائے اس کے کہ وہ حاملہ ہو۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں یہ روایت کیا تھا کہ اس سے نکاح جائز ہے لیکن شوہر اس کے قریب وضع حمل تک نہیں جائے گا۔

(۵)......: ایک غلام مشترک تھا، اس نے ایک آزاد کردہ غلام جوان دونوں کا آزاد کردہ تھا اُس کو قتل کر دیا۔ پھر احد الشریکین (دو شریکوں میں سے ایک) نے اس قاتل غلام کو معاف کر دیا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اس کا خون باطل ہو جائے گا۔ جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے ہاں وہ اس غلام کی قیمت کا چوتھا حصہ اپنے شریک کو دے گا یا چوتھائی دیت کا

فدیہ اس کو ادا کرے گا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کی تھی کہ اس مسئلے میں ان کا قول بھی ہمارے قول کی طرح ہے اور میں نے جو اختلاف نقل کیا تھا وہ اس صورت میں تھا جب کوئی غلام اپنے آقا کو عمداً قتل کردے اور اس کے دو بیٹے ہوں اور ان میں سے ایک معاف کردے، مگر امام محمد رحمہ اللہ نے اختلاف کو دونوں مسئلوں میں بیان کیا اور پہلے مسئلے میں اپنا قول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ذکر فرمایا۔

(۶)......: ایک شخص فوت ہوا جس کے ورثاء میں صرف ایک بیٹا تھا اور ترکہ میں ایک غلام چھوڑا، غلام نے دعویٰ کیا کہ میت نے اس کو حالت صحت میں آزاد کر دیا تھا، اور ایک شخص نے میت پر ہزار دینار قرض کا دعویٰ کر دیا۔ جبکہ غلام کی قیمت بھی ہزار دینار تھی اور بیٹے نے دونوں کی تصدیق کردی تو وہ غلام آزاد ہوگا اور اپنی قیمت کے بقدر سعی کرے گا اور وہ رقم قرض خواہ اپنے قرض کے بدلے وصول کرے گا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں یہ روایت کی تھی کہ جب تک اپنی قیمت کی ادائیگی کیلئے سعی کرے گا تب تک وہ غلام ہی رہے گا۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۴)

حوض کی پیمائش کا مسئلہ

اس مسئلہ کی مکمل صورت حال یہ ہے کہ نجاست گرنے سے پانی ناپاک نہ ہونے کے بارے میں دو مرفوع احادیث منقول ہیں:

(۱)......راشد بن سعد (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جو (نجس چیز) اس کے رنگ، مزہ یا بو پر غالب ہو جائے''۔ اس کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اس کو مرسلاً صحیح کہا ہے۔ (اعلاء السنن ۲۶۶/۱، مطبع دار الفکر)

''الماء لا ينجسه شئي الا ما غلب على لونه اوطعمه اوريحه''

(۲)......حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: پانی کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی مگر وہ (نجس چیز) کہ اس کی بو کو یا مزہ کو بدل دے''۔

اس کو طبرانی نے اوسط اور کبیر میں روایت کیا ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے:

"الا ما غلب ریحه وطعمه و لونه"

''مگر جو چیز غالب آجائے اس کی بو، مزہ اور رنگ پر'' (مجمع الزوائد)

(اعلاء السنن " لا ینجس الماء شئی الا ما غیر ریحه او طعمه" ۱/۲۸۰، مطبع دار الفکر)

جبکہ دیگر کئی احادیث مبارکہ سے پانی میں نجاست گرنے سے اُس کے ناپاک ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

فقہاء حنفیہ نے دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے مضبوط دلائل اور قرائن کی بنیاد پر فرمایا کہ اگر پانی کم ہو تو وہ نجاست گرنے سے ناپاک ہوگا اور اگر پانی کی مقدار زیادہ ہو، تو جب تک اوصاف میں تغیر نہ ہو جائے پانی ناپاک نہیں ہوگا' حنفیہ کے یہاں پانی کی مقدار زیادہ ہونے یعنی ماء کثیر ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں' راجح قول یہ ہے کہ اس کی کوئی مقدار متعین نہیں، جس مقدار کو پانی کی ضرورت سے دو چار شخص کثیر سمجھیں اور اس کا احساس ہو کہ اس میں ایک طرف کی نجاست کا اثر دوسری طرف نہیں پہنچ سکتا تو یہ کثیر ہے، اگر ان کے خیال میں یہ مقدار قلیل ہو اور ایک طرف کی نجاست کا اثر دوسری طرف پہنچ سکتا ہو تو پھر یہ پانی قلیل تصور کیا جائے گا' یہ قول تو حنفیہ کے یہاں راجح ہے۔ لیکن چونکہ عوام کے لئے اس طرح کثیر و قلیل کا امتیاز کرنا دشوار تھا اس لئے بعد کے فقہاء نے یہ رائے اختیار کی کہ اگر حوض دس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا ہو یعنی بحیثیت مجموعی ۱۰۰ مربع ہاتھ ہو تو یہ ماء کثیر ہوگا یہ قول اصل میں ابو سلیمان جوز جانی کا ہے اور اکثر متون نے غالباً عوام کی سہولت کے لئے اسی کو اختیار کیا ہے۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۵)

شرح عقود رسم المفتی کا تعارف اور اہم مباحث

اس موقع پر علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کی کتاب '' شرح عقود رسم المفتی '' کا مختصر تعارف پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے مباحث کی مختصر فہرست بھی دے دی گئی ہے تا کہ بوقتِ ضرورت مراجعت کی جا سکے۔

علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ نے افتاء کے قواعد کے بارے میں ابتداء میں جو نظم لکھی ہے' اُس میں ۷۴ اشعار ہیں۔

ابتدائی آٹھ اشعار تمہیدی ہیں اور آخری ایک شعر اختتامی مضمون پر مشتمل ہے۔اس نظم کا نام "عـــقـــود رســـم المفتی" ہے۔

عقود عِقد کی جمع ہے،جس کے معنیٰ "ہار" کے آتے ہیں، جو گردن میں لٹکایا جاتا ہے،یہاں اس سے مراد نظم ہے۔ رسم کے معنیٰ کسی چیز کا خاکہ،علامت اور معاملہ ہیں۔اس کے اصطلاحی معنیٰ ہیں:

العلامة التی تدل المفتی علی مایفتی به (ردالمحتار)

(وہ نشانی جو فتویٰ دینے میں مفتی کی راہنمائی کرے)۔

لہٰذا عقود رسم المفتی کا مطلب ہوا،قواعدِ افتاء کو سکھانے اور بتانے والی نظم۔ پھر علامہ شامی رحمہ اللہ نے اسی نظم کی شرح لکھی،جسے شرح عقود رسم المفتی کہا جاتا ہے۔اس شرح میں اصل کے اعتبار سے عنوانات نہیں تھے۔بعد میں مختلف علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق یہ عنوانات لگائے ہیں۔

ہمارے ناقص تتبع اور تلاش سے "شرح عقود رسم المفتی" کے یہ مباحث سامنے آئے ہیں:

۱...... **یجب اتباع الراجح و عدم جواز العمل ولا الافتاء بالمرجوح**

۲...... **طبقات الفقهاء و الکتب والمسائل فی المذهب.**

۳...... **الرد علیٰ ابن کمال باشا فی تفریقه بین ظاهر الروایة وروایة الاصول.**

۴...... **تحقیق لفظ السیر.**

۵...... **معنی کتب الاصول والاصل.**

۶...... **سبب تالیف الجامع الصغیر.**

۷...... **الفرق بین الصغیر و الکبیر.**

۸...... **سبب تصنیف السیر الکبیر وانه المرجع عند اختلاف الاقوال الا اذا اختار المشائخ خلافه.**

۹...... **مبسوطات الحنفیة.**

۱۰...... **الفرق بین اختلاف القول واختلاف الروایة.**

۱۱...... **صحة نسبة القولین الیٰ المجتهد ولورجع عن احدهما.**

۱۲...... **اقوال اصحاب الامام.**

۱۳ ......معنی اذا صح الحدیث فھو مذھبی.

۱۴ ......اقوال اصحاب الامام والمسائل المبنیة علی العرف والضرورۃ وتخریجات المشایخ.

۱۵ ......تخریجات المشایخ علیٰ قواعد الامام اقرب الیٰ مذھبه من اقوال الاصحاب.

۱۶ ......الترتیب بین روایات المذھب.

۱۷ ......یجوز اتباع الدلیل و ترک قول الامام.

۱۸ ......علی المفتی اتباع اھل الترجیح والتصحیح.

۱۹ ......الردعلیٰ ابن نجیم فی ان الافتاء مطلقاً علی قول الامام وان افتی المشایخ بخلافه.

۲۰ ......معنی اھلیة النظر والفتویٰ.

۲۱ ......معنی لا یحل لا حد ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا .

۲۲ ......ابن الھمام و تلمیذہ من اھل الاجتھاد لا ابن نجیم.

۲۳ ......طریق الافتاء فی مالم توجد روایة من المتقدمین.

۲۴ ......عدم جواز الافتاء بالقواعد ولا بالنظیر فی بعض الحوادث العرفیة .

۲۵ ......قواعد الترجیح بین الاقوال.

۲۶ ......المتون المعتبرۃ.

۲۷ ......التصحیح الصریح والا لتزامی.

۲۸ ......قواعد الترجیح عند تعارض التصحیح.

۲۹ ......المفھوم اقسامه و حکمه.

۳۰ ......العرف حجیته و شرط اعتبارہ .

۳۱ ......الافتاء والعمل علی القول الضعیف.

۳۲ ......القضاء بالضعیف و مذھب الغیر.

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۶)

(تلخیص قواعد رسم المفتی ، الأصل الأول ، الأمر الرابع)

تحقیق المناط، تنقیح المناط اور تخریج المناط کا مفہوم

چونکہ یہ الفاظ کتبِ فقہ اور اصول فقہ میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں اور اس کتاب میں بھی کئی مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں، اس لیے یہاں ان کی عام فہم وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مناط کا لغوی معنی ہے "لٹکانے کی جگہ" عرب کہتے ہیں:

هو مني مناط الثريا ۔

(یعنی وہ مجھ سے اتنا دور ہے جیسے ستارۂ ثریا)۔

اسی طرح کہتے ہیں:

فلان مناط الثريا

(یعنی فلاں شخص معزز اور بلند مرتبہ ہے)۔

علماء اصول و اخلاق کے نزدیک **مناط الحکم**، حکم کی علت کا نام ہے۔ جیسے حرمت خمر کا مناط یعنی علت اس کا خمر ہونا ہے۔

مجتہد جب قیاس کے ذریعہ احکام کا استخراج اور ان کی تحقیق کرتا ہے، تو اُسے تحقیقِ مناط، تنقیح مناط اور تخریجِ مناط کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ا......تحقیق المناط

اس کی دو صورتیں ہیں:

(ا)......وہ قاعدہ کلیہ جو کسی نص یا اجماع سے ثابت ہو چکا ہو تو مجتہد اس بات میں غور کرتا ہے کہ وہ جزئی صورت مسئلہ جس میں کوئی نص نہیں آئی، کیا وہ اس قاعدہ کے تحت داخل ہو رہی ہے جو نص یا اجماع سے ثابت ہو چکا ہے یا نہیں؟ اگر وہ جزئی مسئلہ اس قاعدہ کلیہ میں داخل ہے' تو وہی حکم اس پر لاگو کر دیا جائے گا۔

اس کی آسان مثال یہ ہے کہ نماز میں قبلہ رخ ہونا نص کے ذریعہ ثابت شدہ قاعدہ کلیہ ہے' لیکن کسی خاص جگہ سمتِ قبلہ کی تعیین کرنا' یہ تحقیق مناط ہے۔ اسی طرح بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہونا نص سے ثابت شدہ قاعدہ کلیہ ہے۔ لیکن کسی خاص صورت حال میں شوہر اور بیوی کے حالات اور معیارِ زندگی کے مطابق، اس نفقہ کی مقدار مقرر کرنا یہ تحقیق مناط ہے۔

(۲)...... تحقیق مناط کی دوسری صورت یہ ہے کہ حکم کی علت نص یا اجماع سے ثابت شدہ ہو، تو مجتہد اس بات پر غور کرے کہ اصل حکم کی یہ علت، خاص اُس واقعہ میں جس پر نص نہیں آئی، پائی جاتی ہے یا نہیں؟ لہٰذا علت جیسے اصل میں ثابت ہوا اُسی طرح فرع میں اس علت منصوصہ کی تحقیق اور اس کو ثابت کرنا یہ بھی تحقیق مناط ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بلی کے بارے میں یہ فرمایا تھا:

انها من الطوا فين عليكم والطوافات (سنن ابی داؤد، باب سور الهرة)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلی کا گھر میں بار بار آنا اس کے جھوٹے پانی کے ناپاک نہ ہونے کی علت ہے، تو اب اس بات کی تحقیق کرنا کہ کیا یہی علت چوہے اور حشرات الارض جیسے دیگر جانوروں میں جو گھروں میں رہتے ہیں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اسی تحقیق کا نام تحقیقِ مناط ہے۔

(۲)...... تنقيح المناط :

تنقيح المناط کا مطلب یہ ہے کہ شارع نے حکم کو اس کے سبب کی طرف منسوب کیا ہو لیکن ساتھ ہی کئی ایسے اوصاف بھی ذکر کر دیئے ہوں کہ جن کا حکم میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تو اب مجتہد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی پوری کوشش اس پر خرچ کرے کہ حقیقی علت جس پر حکم کی بنیاد ہے، وہ متعین ہو جائے اور وہ اوصاف جن کے حکم میں کوئی تاثیر نہیں ہے، ان کو حذف کر دے اور پھر حقیقی علت جن جن فروع اور جزئیات میں پائی جائے ان پر بھی اصل حکم لاگو کر دے۔

اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک اعرابی صحابی رضی اللہ عنہ، اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا:

"هلكت يا رسول الله"

(اے اللہ کے رسول ﷺ میں تو مارا گیا)۔

رسول ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کیا کیا ہے۔

انہوں نے عرض کیا: میں نے رمضان کے دن میں جان بوجھ کر اپنے گھر والوں سے ہمبستری کی ہے' تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا تم ایک غلام آزاد کر دو۔

(سنن الترمذی، كتاب الصوم، باب ماجاء فی كفارة الفطر فی رمضان رقم الحديث ۷۲۴ ص ۲۰۳، طبع دار الكتب العلمية).

اس حدیث پر غور کرنے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں، سوال پوچھنے والے صحابی کا اعرابی ہونا، اس غلطی کا ایک

خاص رمضان کے خاص روزے میں پیش آنا، اس غلطی کا دن کے وقت ہونا، ہمبستری کا گھر والوں کے ساتھ ہونا۔ جب فقہاء نے غور کیا تو پتہ چلا کہ اس واقعہ میں کفارہ کے حکم کا اصلی سبب یہ ہے کہ کوئی مکلف شخص کسی بھی رمضان کے مہینے میں کسی بھی خاتون سے ہمبستری کر لے۔ لہٰذا سائل کا اعرابی ہونا یا اس واقعہ کا کسی خاص رمضان میں پیش آنا وغیرہ ایسے اتفاقی اوصاف اور قیود ہیں، جن کا اصل حکم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حکم کی علت کو دیگر ملے جلے اوصاف سے الگ اور ممتاز کر دینا، یہی تنقیح مناط ہے اور پھر اسی کی بنیاد پر شریعت کا حکم صرف اس کے اصل مورِد تک بند نہیں رہتا بلکہ عام ہو کر جن جن فروع میں وہ علت پائی جائے وہاں حکم بھی جاری ہو جاتا ہے۔

(۳)...... **تخریج المناط :**

اس کا مطلب یہ ہے کہ شارع کی طرف سے کوئی حکم کسی خاص مسئلہ میں آیا ہو لیکن شارع نے اس کی علت بیان نہ کی ہو۔ تو یہ مجتہد کی ذمہ داری ہے کہ پہلے وہ اپنے اجتہاد سے علت کا استنباط کرے اور پھر جس غیر منصوص احکام میں وہ علت پائی جائے وہاں اس حکم کو لاگو کر دے۔ اس کی مثال ''**ربا الفضل**'' کے بارے میں وارد شدہ حدیث میں بیان کی گئی چھ اشیاء میں سے مختلف فقہاء کی طرف سے الگ الگ عِلَل کا استخراج اور استنباط ہے۔ اس کی تفصیل چونکہ اسی کتاب میں ''**تغیر الاحکام بتغیر الزمان**'' کی پہلی صورت ''**تغیر الحکم بتغیر العلة**'' کے تحت موجود ہے (اصل کتاب کا صفحہ نمبر ۲۴۱ تا ۲۴۴) اس لیے یہاں ذکر کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تحقیق مناط کی پہلی صورت جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ نص یا اجماع سے ثابت شدہ قاعدہ کلیہ کے تحت جزئی صورت کو داخل کر دینا، تو اس کے درست ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

تحقیق مناط کی دوسری صورت اور تنقیح مناط تو یہ بھی جمہور علماء اور اکثر منکرین قیاس کے نزدیک بھی مسلمہ دلائل میں سے ہیں۔ آخری قسم یعنی تخریجِ مناط، جمہور علماء تو اس کے قائل ہیں لیکن ظاہریہ اور دیگر کئی باطل فرقے اس کا انکار کرتے ہیں۔

(تفصیل کیلئے دیکھیں **فقه المشکلات** 'شیخ مجاہد الاسلام قاسمی' **بحث عملية الاجتهاد** ' صفحہ ۸۴ تا ۸۸، طبع ادارۃ القرآن کراچی)

(نیز التوضیح مع التلویح ، فصل فی شرائط القیاس' ص ۵۷۸ ،طبع نور محمد اصح المطابع کراچی)
نیز المستصفی للغزالی)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۷)

(تلخیص قواعد رسم المفتی ،الأصل الثالث)

اقوال،روایات اور وجوہ

شوافع امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال کو''روایات'' کہتے ہیں اور بعد کے مشائخ کے اقوال کو''وجوہ'' کہتے ہیں اور احناف کے ہاں آئمہ ثلاثہ کے اقوال کو روایات اور بعد کے علماء کی آراء کو''اقوال'' کہا جاتا ہے۔

(معارف السنن للشیخ البنوری رحمہ اللہ ، ۱/۳۳)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ اختلاف اقوال اور اختلاف روایات میں فرق بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اور یہ بات جان لو کہ دو روایتوں کا اختلاف دو قولوں کے اختلاف کی طرح نہیں ہے کیونکہ دو قول تو مجتہد کی صراحت کی وجہ سے ہوتے ہیں اور دو روایتوں کے اختلاف کا معاملہ اس سے الگ ہے۔گویا دو اقوال کا اختلاف تو منقول عنہ یعنی امام کی طرف سے ہوتا ہے،قائل کی طرف سے نہیں ہوتا اور دو روایتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے(کہ وہ ناقلین کی طرف سے ہوتا ہے،امام کی طرف سے نہیں)

(شرح عقود رسم المفتی، تحت الاشعار ۲۳الیٰ ۲۵)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۸)

(تلخیص قواعد رسم المفتی ، الأصل الثالث)

نبیذِ تمر سے وضو کا مسئلہ

نبیـذ نبـذ سے ہے جس کے معنی ڈالنے کے ہیں فعیل کا صیغہ ہے مفعول کے معنی میں۔منبوذ ،یہ ایک قسم کا شربت ہے جو مختلف چیزوں تمر ، زبیب ، عسل ، حنطہ ، شعیر وغیرہ سے بنتا ہے لیکن زیادہ تر نبیذ تمر کی ہوتی تھی ،اسی کو آپ ﷺ نوش فرمائے تھے،اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کی نبیذ بنانی ہو مثلاً کھجور یا کشمش اس کو شام کے وقت پانی میں بھگو کر رکھ دیا جائے صبح کو جب اس میں مٹھاس پیدا ہو جائے پی لیا جائے یا صبح کو پانی میں ڈال کر رکھ دیں اور شام کو پی لیں۔

احکام کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں۔اول یہ کھجوریں تھوڑی دیر کے لئے پانی میں بھگودی جائیں اور پھر نکال لی جائیں کہ ابھی تک مٹھاس کا اثر بھی پانی میں نہ آیا ہو، دوسری قسم یہ ہے کہ اتنی دیر پانی میں رکھی جائیں کہ اس پانی میں تغیر آجائے حدت اور تیزی، جھاگ اور نشہ پیدا ہو جائے، اور تیسری صورت یہ ہے کہ اتنی دیر بھگوئی جائیں کہ پانی کے اندر صرف مٹھاس پیدا ہو اور کسی قسم کا تغیر تیزی یا جھاگ پیدا نہ ہو، قسم اول سے وضو بالاتفاق جائز ہے اس لئے کہ فی الواقع عرفاً وہ نبیذ ہی نہیں ہے صرف لغۃً نبیذ ہے اور قسم ثانی جس میں سکر پیدا ہو جائے اس سے وضو بالاتفاق جائز نہیں ہے اور قسم ثالث جو درمیانی ہوتی ہے اس میں اختلاف ہو رہا ہے۔ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے وضو جائز نہیں ہے اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ اس سے وضو جائز ہے۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسی نبیذ سے وضو بھی کیا جائے اور تیمّم بھی کیا جائے۔

جاننا چاہیے کہ نبیذ تو مختلف چیزوں کی بنائی جاتی ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا لیکن علماء کا اختلاف صرف نبیذ تمر میں ہے تمر کے علاوہ دوسری چیزوں سے جو نبیذ بنائی جائے اس سے وضو بالاتفاق جائز نہیں ہے اس لئے کہ **وضو بالنبیذ** کا جواز امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلاف قیاس حدیث کی بناء پر ہے اور جو حکم خلاف قیاس حدیث سے ثابت ہو وہ اپنے مورد پر منحصر ہوتا ہے دوسری شئ کو اس پر قیاس کرنا جائز نہیں ہوتا، نیز امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو **وضو بالنبیذ** کے جواز کے قائل ہیں وہ اس وقت میں ہے جب ماء مطلق نہ ہو اور ماء مطلق کی موجودگی میں وہ بھی جواز کے قائل نہیں ہیں، البتہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ماء مطلق کی موجودگی میں بھی نبیذ سے وضو جائز ہے۔

نیز یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ابتداء میں نبیذ سے جوازِ وضو کے قائل تھے، پھر بعد میں مسلک جمہور کی طرف ان کا رجوع ثابت ہے لہٰذا اب فتویٰ اسی قول اخیر پر ہے، اسی کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار فرمایا ہے۔

(تلخیص از الدرالمنضود علی سنن ابی داؤد ' ۱/۲۱۶' طبع مکتبۃ الشیخ ' کراچی)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۱۹)

(تلخیص قواعد رسم المفتی ،الأصل الرابع)

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے مفتیٰ بہ بیس مسائل

ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیس مسائل تحریر فرمائے ہیں لیکن ان کی تفصیلات دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان

میں سے مسائل نمبر ۳، ۴، ۶، ۱۶، ۱۷، اور ۲۰ صحیح طور پر منطبق نہیں ہوتے۔ کیوں کہ ان میں جو قول مفتی بہ ہے، وہ تنہا امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں ہے، بلکہ ان کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ یا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے۔ نیز مسئلہ نمبر ۸ (یعنی "تہہ شدہ کپڑے کو اوپر سے دیکھنا کافی نہیں ہے") میں فتویٰ اِب بظاہر عرف کے مطابق ہی ہونا چاہیے، نہ کہ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر۔ لہٰذا بقیہ تیرہ (۱۳) مسائل ہی امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے مفتیٰ بہ اقوال کی واضح مثالیں ہیں۔ وہ تیرہ مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)...... مریض کا نماز میں تشہد کی حالت کی طرح بیٹھنا۔

(۲)...... نفل پڑھنے والے کا تشہد کی طرح بیٹھنا۔

(۳)...... وکیل بالخصومت کا وکیل بالقبض نہ ہونا۔

(۴)...... مکفول بہ کو مجلس قضاء میں کفیل کے سپرد کرنا۔

(۵)...... گھر کا بیرونی حصہ دیکھنے سے خیار رؤیت کا ساقط نہ ہونا۔

(۶)...... ردی دراہم کے بدلہ میں عمدہ دراہم ادا کرنے کا مسئلہ۔

(۷)...... لقطہ کو نفقہ کی وصولی کے لیے روکنے کے دوران ہلاک ہونے کا حکم۔

(۸)...... انتِ طالق واحدۃ فی ثنتین کہنے کا حکم۔

(۹)...... جس غلام کے مدبّر ہونے کو موت یا قتل پر معلق کیا جائے وہ مدبر مطلق ہے۔

(۱۰)...... وہ نکاح جس میں وقت مقرر کیا گیا ہو اس کا حکم۔

(۱۱)...... اجنبیہ خاتون سے بیوی سمجھ کر ہم بستری کرنے کی صورت میں حد کا مسئلہ۔

(۱۲)...... کسی کو عاریت نہ دینے کی قسم کھائی پھر اس کے وکیل کو دیدی۔

(۱۳)...... عام نمازوں میں وقت نکلنے کے ڈر سے تیمم کا حکم۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کردہ بقیہ مسائل یہ ہیں، جن کے بارے میں ابتداء میں عرض کردیا گیا کہ ان میں سے چھ مسائل میں تو امامِ زفر رحمۃ اللہ علیہ تنہا نہیں بلکہ صاحبینؒ میں سے بھی کوئی ایک اُن کے ساتھ ہیں اور ایک مسئلہ میں اب فتویٰ عرف کے مطابق ہونا چاہیے:

(۱)...... زوجہ مفقود کے نفقہ کا حکم۔

(۲)...... بیع مرابحہ میں عیب جدید اور اصل قیمت کو بیان کرنے کا حکم۔

(۳)...... حکمران کو ناحق شکایت پہنچانے والے پر ضمان کا مسئلہ۔

(۴)......تہہ شدہ کپڑوں کوصرف اوپر سے دیکھنے کی صورت میں خیار رؤیت کا مسئلہ۔

(۵)......شفعہ میں طلبِ خصومت میں ایک مہینہ کی تاخیر پر سقوط شفعہ کا حکم۔

(۶)......دینار اور درہم کو وقف کرنے کا مسئلہ۔

(۷)......ماکول اللحم جانوروں کے فضلہ کا حکم۔

(تلخیص از''فتویٰ نویسی کے رہنما اصول''از مفتی محمد سلمان منصور پوری، صفحہ ۹۳ تا ۱۰۰ طبع نعمانیہ کراچی)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۰)

(تلخیص قواعد رسم المفتي ، الوجه الثاني : جمع المؤلف روايات ضعيفة)

مسئلہ ایصالِ ثواب

ایصالِ ثواب کے ثبوت کے لئے چند قرآنی آیات یہ ہیں:

فاعلم انه لا اله الا الله و استغفر لذنبک وللمومنين والمومنات (سورة محمد : ۱۹)

و في سورة الحشر : ۱۰

والـذين جاء وا من بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا ولا خو اننا الذين سبقونا بالايمان ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين امنوا ربنا انک رء وف رحيم .

وفي سورة نوح :۲۸

رب اغفرلي ولو الدى ولمن دخل بيتي مومنا وللمومنين والمومنات.

اور چند احادیثِ مبارکہ یہ ہیں:

و فـي الـصـحيـح لـلبـخـاری رحمه الله، بـاب اذا قـال داری صدقة ...... الخ رقم :۲۶۰۵ ج ۳ص، ۱۰۱۳ (طبع دار ابن کثير يمامة بيروت)

عن ابن عباس رضي الله عنه ان سعد بن عبادة رضي الله عنه تو فيت امه و هو غائب عنها فقال : يا رسول الله ! ان امي توفيت وانا غائب عنها اينفعها شئي ان تصدقت به عنها ؟ قال : نعم ! قال : فاني اشهدک ان حائطي المخراف صدقة عليها.

و فی مشکوٰۃ المصابیح ج : ۱ ص : ۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه)

عن معقل بن یسار قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقروا سورة یٰسین علی موتاکم. رواه احمد و ابو داؤد.

و فی شرح الصدور للسیوطیؒ ص : ۱۳۵ (مطابع الرشید مدینة المنورة)

اخرج ابو القاسم سعد بن علی الزنجا نی فی فوائده عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من دخل المقابر من المومنین والمومنات کانوا شفعا ء له الی الله تعالیٰ

و فیه ایضاً ص : ۱۳۵.

عن انسؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسین خفف الله عنهم و کان له بعدد من فیها حسنات .

و فیه ایضاً ص : ۱۳۲

اخرج الطبراني في الاوسط والبیهقی فی سننه عن ابی هریرةؓ قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله لیر فع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول : یا رب انّٰی لی هذه ؟ فیقول : باستغفار ولدک لک. ولفظ البیهقی : دعا ء ولدک لک واخرجه البخاری فی الادب عن ابی هریرهؓ موقوفاً .

و فیه ایضاًص: ۱۳۵

عن احمد بن حنبلؒ قال : اذا دخلتم المقابر فاقرؤا بفاتحة الکتاب والمعوذتین و قل هوالله احد واجعلوا ذٰلک لا هل المقابر فانه یصل الیهم.

و فی الصحیح للامام مسلمؒ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم : ۱۶۳۱ ج :۳ص :۱۲۵۵ (طبع داراحیاء التراث العربی بیروت)

عن ابی هریرةؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : ثم اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جاریة او علم ینتفع بها او ولد صالح ید عوله

وراجع ایضاً مرقاة المفاتیح ج ۴ص :۸۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان)

و فی شرح العقائد ص :۱۷۲ (طبع قدیمی کتب خانه)و فی دعاء الاحیاء للا موات و

صدقتهم ای صدقة الاحیاء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات خلافاً للمعتزله.

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث وکتب عقائد کی عبارات کی بناء پر حضرات فقہاء کرامؒ نے اس عقیدۂ ایصالِ ثواب کو درست قرار دیا ہے، اور نہ صرف اس کا اثبات فرمایا بلکہ اسے مستحسن قرار دیا، چنانچہ کتب فقہ میں ہے:

و فی الهداية ، باب الحج عن الغير ج : ا ص : ۲۹۶ (طبع مكتبه شركت علميه)

ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوٰة او صوماً او صدقة او غير ها كذافی الهداية...... الافضل لمن يتصدق نفلاً ان يسوی لجميع المومنين والمومنات لا نها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شی هو مذهب اهل السنة والجماعة (و فيه بعد اسطر) و فی البحر : من صام او صلی او تصدق و جعل ثوابه لغيره من الاموات والا حياء جاز ، و يصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة ، كذافی البدائع.

و فی معارف السنن ج :۵ ص : ۲۸۶ (طبع ايچ ايم سعيد) و قد تعرض فی الهداية الیٰ مسالة الاثابة واهداء الثواب فقال الاصل فی هذا الباب ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوٰة او صوماً او صدقة و غير ها عند اهل السنة والجماعة : و فيه ايضاً ج :۵ ص : ۲۹۱ ثم ان الشافعیؒ لايجوز اهداء ثواب تلاوة القرآن ولا يصح عنده الاثابة فيما عدا الدعاء والصدقة ولكن الشافعية افتوا بايصال ثواب التلاوة ويجوز عندنا اهداء ثواب كل شی...... وتبين ان مذهب ابی حنيفةؒ فی هذا الصدد اوسط المذاهب ......الخ

(تلخیص از حاشیہ فتاویٰ عثمانی ۱/۵۸۸، طبع مکتبہ معارف القرآن کراتشی)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۱)

(تلخيص قواعد رسم المفتی، الأصل الحادی عشر)

دمِ حیض کے مختلف رنگ

طلبۂ کرام کے تکمیلِ فائدہ کیلئے اس مسئلہ کی کچھ تفصیل عرض کی جاتی ہے:

حیض کے رنگوں کے متعلق مذہب میں ظاہر الروایۃ کے علاوہ کم از کم چار ضعیف اقوال اور ہیں جن کی تفصیل

درج ذیل ہے......

(۱)......ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ ایام حیض میں سرخ، کالا، پیلا، گدلا، ہرا، مٹیالا، ہر طرح کا خون حیض ہے اور ایام حیض کے بعد سرخ اور کالے خون کے علاوہ کوئی خون حیض نہیں ہے (امام شافعیؒ کا مذہب اور امام مالکؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے بدایۃ المجتھد، ۱/۳۸)۔

(۲)......امام ابو یوسف کی ایک روایت یہ ہے کہ گدلا پانی اگر ابتداء ایام حیض میں نظر آئے تو وہ حیض نہیں۔ اور اگر اخیر میں نظر آئے تو حیض ہے۔

(۳)......بعض مشائخ نے کہا کہ ہرا پانی مطلقاً حیض میں شمار نہیں، خواہ ایام میں آئے یا ایام کے بعد۔

(۴)......صاحب ہدایہ نے کہا کہ اگر عورت حیض والی ہو تو ہرا خون حیض ہے اور اگر آئسہ ہو تو ہرا خون حیض نہیں ہے، اگرچہ ایام عادت میں آئے۔

(۵)......بعض علماء کا قول یہ ہے کہ گدلا، مٹیالا، پیلا، اور ہرا خون غیر آئسہ عورتوں میں مطلقاً حیض ہے (خواہ ایام میں آئے یا بعد میں، اس لئے کہ اگر اس قول میں بھی ایام کی شرط لگائیں گے تو اس قول میں اور ظاہر الروایہ میں کوئی فرق نہ رہے گا) اور آئسہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وضع حمل کا زمانہ قریب ہے تو حیض ہے ورنہ نہیں (امام مالکؒ کا مذہب بھی المدونۃ الکبریٰ میں اسی کے قریب نقل کیا گیا ہے (بدایۃ المجتھد، ۱/۳۸)۔

ان اقوال کو صاحب البحر الرائق نے نقل کیا ہے اور اخیر میں فخر الائمہ کے حوالہ سے معراج کی یہ عبارت نقل کی ہے:

لو افتی مفت بشیء من ھذہ الا قوال فی مواضع الضرورۃ طلبا للتیسیر لکان حسنا.

یعنی اگر کوئی مفتی ضرورت کے وقت ان ضعیف اقوال میں سے کسی کو اختیار کرے گا تو یہ بہتر ہوگا۔

جس کی مثال دیتے ہوئے علامہ رافعیؒ نے فرمایا ہے کہ مثلاً کسی عورت کی عدت طہر کے لمبے ہونے کی وجہ سے طویل ہو جائے پھر وہ علاج کرائے اور پیلا خون کسی وقت بھی آجائے تو قول نمبر ۵ کے اعتبار سے وہ خون حیض میں شمار کر لیا جائے گا۔ اور اس کی عدت شروع ہو جائے گی۔ یہ قول اگرچہ مذہب میں راجح نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے مگر اس میں چونکہ مبتلا بہا خاتون کے لئے سہولت ہے اس لئے ضرورۃً اسے اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۲)

(تلخیص قواعد رسم المفتی، اختتام باب)

قواعد رسم المفتی کے اجراء کی چند مثالیں

(۱)......راجح قول پر ہی فتویٰ دینا ضروری ہے:

(الف)......مسواک کے بارے میں ایک روایت مستحب ہونے کی ہے اور دوسری سنت ہونے کی اور راجح بھی یہی ہے۔اس لیے فتویٰ اسی پر ہوگا۔

ردالمحتار مع الدرالمختار ، كتاب الطهارة ، سنن الوضوء ، ۱/۲۴۸، طبع دارالمعرفة)

(ب)......وتر کے بارے میں تین روایات ہیں۔فرض ہے، واجب یا سنتِ مؤکدہ۔راجح دوسری یعنی وجوب کی روایت قرار دی گئی، سو اسی پر فتویٰ لازم ہے۔

(بدائع الصنائع ، كتاب الصلاة ، فصل و اما الصلاة الواجبة ۱/ ۴۰۲ ، طبع دارالفكر)

(۲)......جب ظاہر الروایۃ پر فتوی دیا جائے گا:

قضاء شدہ نمازیں اگر زیادہ ہوں تو پہلی نماز کیلئے اذان و اقامت دونوں کہی جائیں اور بقیہ نمازوں کیلئے اقامت لازمی ہے، اذان اختیاری۔یہ ظاہر الروایۃ اور مفتیٰ بہ ہے۔

(فتح القدير ، كتاب الصلاة ، باب الاذان ، ۱/ ۲۵۶، طبع دارالكتب العلمية)

(۳)......جب غیر ظاہر الروایہ کو ترجیح دے دی جائے تو وہ ہی مفتیٰ بہ ہے:

عورت کی ہتھیلی کا اوپر والا حصہ ستر میں داخل نہیں ہے۔یہ غیر ظاہر الروایۃ لیکن راجح اور مفتیٰ بہ ہے۔

(ردالمحتار ' كتاب الصلاة ، باب شروط الصلاة ۲/ ۹۶ ' طبع دارالمعرفة)

(اس کی کئی مثالیں اصل کتاب میں "طبقات مسائل الحنفیۃ" کے عنوان کے تحت آ گئی ہیں)

(۴)......کئی اقوال کی صورت میں راجح پر فتوی:

حج فرض ہو جائے تو فوری طور پر جانا ضروری ہے یا نہیں؟ دونوں قول ہیں لیکن فتویٰ اسی پر ہے کہ فوری جانا لازمی ہے۔

(بدائع الصنائع ' كتاب الحج ' فصل و اما كيفية فرضه ' ۲/۱۸۰' طبع دارالفكر)

(۵)......غیر مستند باتوں کا اعتبار نہیں:

الدرالمختار میں ہے کہ مسواک ایک بالشت سے لمبی نہ ہو ورنہ اُس پر شیطان سواری کرے گا۔ اس بات کا کوئی معتبر حوالہ نہیں ہے۔

(الدرالمختار' کتاب الطهارة سنن الوضوء' ۱/ ۲۵۱' طبع دارالمعرفة)

(۶)......اختلاف کی صورت میں اکثر مشائخ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا:

بڑی مسجد یا میدان میں بغیر آڑ کے نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گزرنے کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ فتویٰ اس پر ہے سجدہ کی جگہ سے آگے' جہاں تک نمازی خشوع وخضوع سے نماز پڑھے تو اس کی نگاہ جاتی ہے' اُس سے آگے گزرنا جائز ہے۔

(فتح القدير، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة و ما يكره فيها' ۱/ ۴۱۶، طبع دارالكتب العلمية)

(ردالمحتار' کتاب الصلاة، بعد مطلب" اذا قرء قوله تعالىٰ جدك ۲/ ۴۷۷، طبع دارالمعرفة)

(البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب يفسد الصلاة و ما يكره فيها' ۲/ ۲۶، طبع دارالكتب العلمية)

(۷)......باہم ملتے جلتے مسائل میں فقہاء کے بیان کردہ فرق کو سامنے رکھا جائے گا:

(الف)......گندم کے ڈھیر میں سے ایک کلو غیر متعین گندم بیچنا جائز ہے' جب کہ بکری کے ریوڑ میں سے غیر متعین بکری بیچنا جائز نہیں ہے۔

(فرق کیلئے دیکھیں: هدايه' كتاب البيوع' ۳/ ۱۲، طبع ادارة القرآن كراتشي)

(ب)...... راستے سے گزرنے کا حق قابل فروخت ہے لیکن تعمیر شدہ گھر کی بالائی منزل بنانے کا حق قابلِ فروخت نہیں ہے۔

(فرق کیلئے دیکھیں: هدايه' كتاب البيوع' باب البيع الفاسد' ۳/ ۱۱۰، طبع ادارة القرآن، كراتشي)

(ج)...... غاصب' غصب کردہ چیز میں تبدیلیاں کردے تو اس کے مختلف احکام ہیں۔ اُن تبدیلیوں میں کئی فروق ہیں۔

(تفصیل کیلئے دیکھیں: هدایه ' کتاب الغصب ' فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب ۳/ ۴۹۴ ' طبع ادارة القرآن ' کراتشی)

(۸)......عبادات میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا:

(الف)......اگر کنویں چڑیا وغیرہ ملے اور گرنے کا وقت معلوم نہ ہو تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر صرف مری ہوئی ہے تو ایک دن' ایک رات کی نمازوں کا اعادہ اور اگر پھول پھٹ چکی ہے تو تین دن' تین رات۔ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کا اس مسئلے میں اختلاف ہے۔

(ردالمحتار ' کتاب الطهارة ' فصل فی البئر ، ۱/ ۴۲۰ ، طبع دار المعرفة)

(ب)......نفاس کے درمیان خون اگر چند دن کیلئے رک جائے تو وقفہ پندرہ دن ہو یا زیادہ' بہر صورت نفاس ہی شمار ہوگا' یہ قولِ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہے اور مفتی بہ ہے۔ صاحبینؒ کا اس میں اختلاف ہے۔

(ردالمحتار ' کتاب الطهارة ' باب الحیض ' تتمة ، ۱/ ۵۳۲ ، طبع دار المعرفة)

(۹)......قضاء کے مسائل میں فتویٰ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہوگا:

ایک قاضی' دوسرے قاضی کو خط لکھے تو اس میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بڑی کڑی شرائط ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بہت آسانی ہے اور یہی امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک راجح ہے۔

(هدایه' کتاب ادب القاضی ' باب کتاب القاضی الی القاضی، ۳/ ۱۷۵' طبع ادارة القرآن 'کراتشی)

(۱۰)......استحسان پر مبنی فتویٰ کی چند مثالیں:

(الف)...... چیر پھاڑ کر کھانے والے پرندوں کے جھوٹے پانی کا حکم۔

(کشف الاسرار ' البزدوی' باب القیاس والا ستحسان، ۴/ ۹، طبع دار الکتب العلمیة)

(ب)......سواری پر نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم:

(الدرالمختار مع الرافعي' کتاب الصلاة ' باب صلاة الجنازة' ۳/ ۱۴۷'طبع دار المعرفة)

(ج)......تمام مال صدقہ کرنے سے زکوٰۃ ساقط ہونے کا حکم۔

(البنایة، کتاب الزکاة' قبیل باب صدقة السوائم ، ۳/ ۳۱۲،طبع دار الکتب العلمیة)

(۱۱)......قیاس پر مبنی فتویٰ کی چند مثالیں:

(الف)......رکوع کے ذریعے سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

(كشف الاسرار ،البزدوى ،باب القياس والاستحسان ۴/۱۲ ،طبع دارالكتب العلمية)

(ب) بیع سلم میں مسلم فیہ کپڑے کی مقدار کے بارے میں اختلاف کا حکم:

(كشف الاسرار ،البزدوى ،باب القياس والاستحسان ،۴/۱۵ ،طبع دارالكتب العلمية)

(ج)......ایک آیت سجدہ دو رکعتوں میں پڑھے تو ایک سجدہ کافی ہے۔

(كشف الاسرار' البزدوى، باب القياس والا ستحسان' ۴/۱۱' طبع دارالكتب العلمية)

(۱۲)......درایت پر مبنی روایت پر فتویٰ کی مثالیں:

(الف)......نماز میں تعدیلِ ارکان کے وجوب کی روایت مفتیٰ بہ ہے:

(ردالمحتار' كتاب الصلاة ، بعد مطلب قد يشار الى لمثنیٰ ۲/۱۹۳ ، طبع دارالمعرفة)

(ب)......نماز میں قومہ اور جلسہ واجب ہونے کی روایت پر فتویٰ ہے۔

(ردالمحتار ، كتاب الصلاة ، مطلب لا ينبغى ان يعدل عن الدراية، ۲/ ۱۹۴ ، طبع دارالمعرفة)

(ج)......عیدین کی نماز واجب ہونے کی روایت پر فتویٰ ہے۔

(البناية ، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، ۳/ ۹۵، طبع دارالكتب العلمية)

(۱۳)......مسلمان کو کافر قرار دینے میں احتیاط کی چند مثالیں:

(الف)......قاضی نے کہا: ارض بالشرع۔ سننے والے نے کہہ دیا: لا اقبل تو کیا حکم ہے؟

(ردالمحتار ' كتاب الجهاد ' باب المرتد ' مطلب فى حكم من شتم دين مسلم' ۶/ ۳۵۳، طبع دارالمعرفة)

(ب)......کسی مسلمان کو کہہ دیا: ''تیرا دین بہت خراب ہے''۔ تو کیا حکم ہے؟

(ردالمحتار ، كتاب الجهاد ' باب المرتد ' مطلب فى حكم من شتم دين مسلم، ۶/۲۵۳، طبع دارالمعرفة)

(ج)......کسی نے کہہ دیا ''نماز نہیں پڑھوں گا'' تو کیا حکم ہے؟

(البحرالرائق ، كتاب السير ، باب احكام المرتدين، ۵/۲۰۵، طبع دارالكتب العلمية)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۳)

(الافتاء بمذهب آخر ،الافتاء بمذهب آخر لحاجة عامة)

امدادالفتاویٰ کے مسائل کی مکمل عبارات

گنا پیدا ہونے سے پہلے اس کی خریداری کا حکم

سوال: آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ پیداوارا یکھ یعنی رس کا معاملہ' خرید ایسے وقت ہو جاتا ہے کہ کہیں ایکھ بوئی بھی نہیں جاتی ہے، کہیں کچھ کچھ بوئی جاتی ہے، اگر نہیں خریدی جاتی تو عین وقت پر جب کہ رس تیار ہو ملتی ہی نہیں ہے اس صورت میں خریداری کھنڈسال کی اجازت ہو سکتی ہے یا نہیں، اگر اجازت نہ ہو تو غالباً کھنڈسال ہی نہ ہو یا بہت ہی زاید قیمت دینے پر شاید ملے۔

الجواب: عقدِسلم میں بیع کا وقت میعاد تک برابر پایا جانا حنفیہ کے نزدیک شرط ہے۔ اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو عقدسلم جائز نہ ہوگا، لیکن شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف وقت میعاد پر پایا جانا کافی ہے، کذا فی الہدایہ، تو اگر ضرورت میں اس قول پر عمل کر لیا جاوے تو کچھ ملامت نہیں رخصت ہے۔

(۲۷ رجب ۱۳۳۸ھ)

قصاب کو پیشگی روپیہ دے کر گوشت کا نرخ مقرر کرنا

سوال: یہاں یہ دستور ہے کہ بکر قصاب کو کچھ روپے پیشگی دے دیئے اور گوشت کے دام فی سیر ٹھیرا لئے جو بازار کے نرخ سے کچھ کم ہوتا ہے۔ مثلاً بازار میں ۴ سیر بکتا ہے، لیکن ۳ سیر ٹھیرا لیا، اور گوشت آتا رہا، اس کی یادداشت رکھ لی' اور ختم ماہ پر حساب کر دیا، اور کمی بیشی پوری کر کے بیباقی کر دی اور آئندہ ماہ کے لئے پھر نقد روپیہ دے دیا اور نیا معاہدہ بھاؤ کا کر لیا، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بازار کا بھاؤ ۳ / اور ۳ / اور ۲ / ہو جاتا ہے، مگر یہ مقرر شدہ نرخ بدلا نہیں جاتا، اس کا اگلے مہینے میں لحاظ کر کے بھاؤ مقرر کرتے ہیں، قصاب کو یہ نفع ہوتا ہے کہ اس روپیہ سے بکریاں خریدتا ہے اور گوشت بیچتا ہے، اس کو کسی دوسرے سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، اب عرض یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے؟

الجواب: یہ معاملہ حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے، اس لئے کہ جو کچھ پیشگی دیا گیا ہے وہ قرض ہے اور یہ رعایت قرض کے سبب کی ہے، اور بیع سلم کہہ نہیں سکتے اس لئے کہ اس میں کم سے کم مہلت ایک ماہ کی ہونی چاہیے، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چونکہ اجل شرط نہیں، اس لئے سلم میں داخل ہو سکتا ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے۔ لہٰذا امام

شافعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔ (۱۷ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ)

دفع بقرہ بر نصف نما

سوال: زید نے اپنا بچھڑا بکر کو دیا کہ تو اس کو پرورش کر بعد جوان ہونے کے اس کی قیمت کر کے ہم دونوں میں سے جو چاہے گا نصف قیمت دوسرے کو دے کر اسے رکھ لے گا، یا زید نے خالد کو ریوڑ سونپا اور معاہدہ کر لیا کہ اس کو بعد ختم سال پھر پڑتال لیں گے، جو اس میں اضافہ ہوگا وہ باہم تقسیم کر لیں گے، یہ دونوں عقد شرعاً جائز ہیں یا قفیز طحان کے تحت میں ہے جیسا کہ عالمگیری جلد پنجم ص ۲۷۱ مطبوعہ احمدی میں ہے۔ **دفع بقرة الی رجل علی ان یعلفها وما یکون من اللبن والثمن بینهما انصافاً والا جارة فاسدة.**

الجواب: **کتب الی بعض الاصحاب من فتاویٰ ابن تیمیه کتاب الاختیارات مانصه ولو دفع دابته اونخله الی من یقوم له وله جزء من نمائه صح و هورواية عن احمد ج ۴ص ۸۵ س ۱۴،**

پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد ناجائز ہے، کما نقل فی السوال عن عالمگیریة لیکن بنا بر نقل بعض اصحاب امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے، اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جا سکتا ہے۔

(۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۴ھ)

شرکت بالعروض کی صورت

بظاہر اس عقد کی حقیقت شرکت عنان ہے، کیونکہ جو لوگ کمپنی قائم کرتے ہیں وہ دوسروں کو شریک کرنے کے وقت خود کو بھی کمپنی کا ایک حصہ دار قرار دیتے اور اپنی عمارات مملوکہ متعلقہ کمپنی اور جملہ سامان و مالِ تجارت کو نقد کی طرف محمول کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپیہ کمپنی قائم کرنے کے عمارات و سامان وغیرہ میں لگایا تو وہ اپنے کو کمپنی کے سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت بالنقد نہ ہوگی، بلکہ بالعروض ہوگی، سو بعض ائمہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے۔

فیجوز الشرکة والمضاربة بالعروض بجعل قیمتها وقت العقد راس المال عند احمد فی رواية وهو قول مالک و ابن ابی لیلی کما ذکره الموفق فی المغنی (ص ۱۲۵، ج۵)

پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکت مذکورہ کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے)۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۴)

قلتین کا مسئلہ

قلتین تثنیہ ہے قلۃ کی قلۃ کے مختلف معنی آتے ہیں' پہاڑ کی چوٹی، اونٹ کا کوہان، سر کا اوپری حصہ، بڑا گھڑا، چھوٹا کوزہ، اس کی جمع قلل اور قلال آتی ہے، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک پانی کی کم اور زیادہ تعداد (قلیل وکثیر) ہونے کا مقدار دو قلہ یا اس سے کم ہونے پر ہے، ان حضرات کے نزدیک قلہ سے مراد مٹکے' خاص طور پر یمن کے "حجر" نامی مقام کے مٹکے ہیں جس کی مقدار پانچ سو رطل بغدادی بتائی جاتی ہے، اگر کوئی مربع مٹکہ ہو، تو سوا ہاتھ چوڑا، سوا ہاتھ گہرا، ایک دو قلہ کے برابر ہے۔ ہندوستانی اوزان میں اس کا وزن دو سو تین سیر دس تولے بتایا گیا ہے۔ جدید اوزان میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی رائے کے مطابق دو سو چار لیٹر پانی دو قلہ کے برابر ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۵)

قفیز کی مقدار اور بیع صبرہ کا مطلب

فی المجموع شرح المهذب' النووی(۱۰/۳۲۲):

و اصل القفيز مكيال يسع اثنى عشر صاعاً، والصاع خمسة' ارطال وثلث بالبغدادی ......

(البيوع ' باب مانهى عنه من بيع الغرر)

ففيه ايضاً:...... اذا باع قفيز امن صبرة فقد قطع المصنف بالصحة ' ومراده اذكانت الصبرة اكثر من قفيز ......وفيه وجه انه لا يصح و هو اختيار القفال و سعيد المسالة واضحة ......

(۱۰/۳۲۳، البيوع ، باب مانهى عنه من بيع الغرر)

ثم فيه ۱۰/۳۲۵ (كتاب البيوع ،باب مانهى عنه من بيع الغرر)

وفی فتاوئ القفال أنه كان اذا سئل عن هذه المسألة يفتي بالصحة مع أنه يعتقد البطلان ،فيقال له فيقول : المستفتي يستفتيني عن مذهب الشافعي رحمه الله ،لا عن اعتقادي.

تشریحات نمبر (۲۶)

(الافتاء بمذهب آخر ،اذا كان القضاء نفسه مجتهدافيه)

قضاءعلی الغائب کا مسئلہ

اگر مدعی علیہ غائب ہوتو ایسی صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غائب شخص کے خلاف مقدمہ سننا اور فیصلہ کرنا جائز ہے اور بعض جزوی اختلاف کے ساتھ مالکیہ اور حنابلہ کا نقطہ نظر بھی یہی ہے، حنفیہ کے نزدیک قضاء علی الغائب درست نہیں، پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو مقدمہ کی سماعت اور فیصلہ دونوں مرحلوں میں مدعی علیہ کی موجودگی ضروری ہے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر سماعت مقدمہ کے بعد مدعی علیہ غائب ہو جائے، تب اس شخص کے خلاف فیصلہ کرنا بھی درست ہوگا۔ بلکہ حنفیہ کے نزدیک اس بات کی بھی گنجائش نہیں کہ قاضی غیر حاضر فریق کی طرف سے کسی کو وکیل مسخر مقرر کردے اور مقدمہ کی کاروائی چلائی جائے۔

ليس للقاضي ان ينصب عنه وكيلا.

تاہم اگر قاضی نے وکیل مسخر معین کردیا اور مقدمہ کی کاروائی مکمل کی تو قاضی کا یہ عمل درست سمجھا جائے گا اسی پر فتویٰ ہے۔

- **مع هذا لو وكل وكيلا وانفذ الخصومة بينهم جاز و عليه الفتوىٰ.**

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فقہاء حنفیہ میں خواہر زادہ قضاء علی الغائب کے جواز کے قائل ہیں۔

وکیل مسخر کا تقرر: موجودہ زمانے میں اگر مدعی علیہ کے غائب ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کاروائی نہیں کی جائے تو اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اور اس سے جرائم پیشہ لوگوں کو تقویت حاصل ہو گی، اسی لئے ہمارے زمانہ میں اصحاب تحقیق علاء اور قضاء کی رائے یہی ہے کہ اگر مدعی علیہ ابتداء حاضر ہوا اور پھر حاضری سے گریز کرے یا قاضی کو نوٹس ملنے کے باوجود حاضری سے گریز اور اس سے انکار کا راستہ اختیار کرے تو اسے رفع الزام سے عجز اور نکول عن الحلف تصور کیا جائے اور اگر اسے حاضر کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی طرف سے کسی

شخص کو وکیل مقرر کیا جائے، جس کے بارے میں توقع ہو کہ وہ اس کے حقوق ومفادات کا تحفظ کرے گا، ایسے ہی شخص کو فقہ کی اصطلاح میں وکیل مسخر کہتے ہیں اور حصکفی نے وکیل مسخر کے واسطہ سے قضاء علی الغائب کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقیہ الامت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے موجودہ احوال کی روشنی میں قضاء علی الغائب کے سلسلے میں تحریر کیا ہے:

اگر مدعی علیہ مقدمہ کی اطلاع ملنے کے باوجود حاضری سے گریز کرے تو ایسے رفع الزام سے عاجز تصور کرتے ہوئے قاضی مقدمہ کی سماعت کرے گا اور فیصلہ بھی اور قاضی ایسے مدعی علیہ کی طرف سے جسے حاضر کرنا ممکن نہ ہو کسی ایسے شخص کو اس کی طرف سے اظہارِ حق کے لئے طلب کرے گا، جس کے بارے میں امید ہو کہ وہ مدعی علیہ کے مفادات کی حفاظت کرے گا، اسے اصطلاح فقہاء میں وکیل مسخر کہا جاتا ہے۔

(قاموس الفقہ ۵۲۰/۴ مکتبہ زمزم پبلشرز)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۷)

(الافتاء بمذهب آخر ،اذا كان القضاء نفسه مجتهد فيه)

الحجر علی الحر کا مسئلہ

''حجر'' کا لغوی معنی ہے......روکنا۔

اصطلاح شریعت میں کسی شخص کے مالی معاملات میں زبانی تصرفات کو روکنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

آزاد عاقل، بالغ شخص پر مالی معاملات میں زبانی تصرف کی پابندی کو کم عقلی، قرضدار ہونے، دینی معاملات میں فسق اور غفلت کی وجہ سے عائد کرنا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جائز نہیں ہے۔

جبکہ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ فسق وفجور کے علاوہ دیگر تین امور کی بناء پر پابندی عائد کرنا جائز ہے اس طرح کہ اس کے تصرفات جیسے خرید وفروخت وغیرہ درست نہیں ہوں گے' فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان تمام اسباب کی بناء پر پابندی عائد کرنا جائز ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھیں (ردالمحتار، کتاب الحجر، ۲۳۱/۹ تا ۲۵ دار المعرفۃ)

☆......☆......☆

تشریحات نمبر (۲۸)

بحث متروک التسمیة عمداً

و فی المجموع شرح المهذب ،کتاب الحج' باب الاضحیة ۹/ ۳۴۳، طبع دارالکتب العلمیة:

واحتج اصحابنا بقول الله تعالیٰ" حرمت علیکم المیتة والدم(المائدة:۳) الی قولہٖ تعالیٰ : الاماذ کیتم فأباح المذکی' ولم یذکر التسمیة...... وایضاً قوله تعالیٰ : وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم (المائدة.۵)فأباح ذبائحهم ولم یشترط التسمیة .

وبحدیث عائشةرضی الله عنها ، انهم قالوا : یا رسول الله ان قومنا حدیثو عهدٍ بالجاهلیة یاتون بلحمان لا ندری اذکروا اسم الله علیه ام لم یذکروا فنأکل منها ؟ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم . سموا وکلوا ، حدیث صحیح رواه البخاری فی صحیحه ، ورواه ابوداؤد و النسائی و ابن ماجة باسانید صحیحة کلها ......

قال اصحابنا : وقوله صلی الله علیه وسلم " سموا و کلوا " هذه هی التسمیة المستحبة عند اکل کل طعام و شرب کل شراب ، فهذا الحدیث هوالمعتمد فی المسألة.

تشریحات نمبر (۲۹)

فقیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

مشہور تابعی اور فقیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے کہا کہ فلاں مسئلہ میں فقہاء آپ کے خلاف کہتے ہیں،تو آپ نے فرمایا:

وهل رأیت فقیها بعینک ؟ انما الفقیه الزاهد فی الدنیا الراغب فی الاخرة البصیر بدینه المداوم علیٰ عبادة ربه الورع الکاف عن اعراض المسلمین العفیف عن اموالهم الناصح لجماعتهم.

''تم نے اپنی آنکھ سے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو آخرت کا طلب گار ہو، اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہو، اپنے رب کی عبادت میں لگا رہے متقی ہو، مسلمانوں کی عزت وآبرو (کو نقصان پہنچانے) سے پرہیز کرتا ہو، ان کے مال ودولت سے بے تعلق ہو اور جماعتِ مسلمین کا خیر خواہ ہو''۔

(ردالمختار۔مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

تشریحات نمبر (۳۰)

فتویٰ میں دیانۃً کا حکم لکھا جائے یا قضاءً

مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے، البتہ فقہائے متاخرین نے جب یہ دیکھا کہ قاضیوں میں جہالت عام ہو چکی ہے تو انہوں نے یہ حکم دیا کہ مفتی کو دیانت کے حکم کے ساتھ قضاء کا حکم بھی ضرور لکھنا چاہیے، علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لکن یکتب (المفتی) بعدہ ولا یصدق قضاءً لان القضاء تابع للفتویٰ فی زماننا لجهل القضاة، فربما ظن القاضی انه یصدق قضاء ایضًا.

(ردالمحتار کتاب الحظر والاباحة، ج۶، ص: ۴۵۱، طبع ایچ ایم سعید، کراتشی).

نیز تنقیح الحامدیہ میں ہے:

المراد من قولهم یدین دیانة لا قضاء انه اذا استفتیٰ فقیها یجیبه علیٰ وفق مانویٰ، ولکن القاضی یحکم علیه بوفق کلامه، ولا یلتفت الی نیته اذا کان فیما نویٰ تخفیف علیه ...... جری العرف فی زماننا ان المفتی لا یکتب للمستفتی مایدین به، بل یجیبه عنه باللسان فقط، لئلا یحکم له القاضی لغلبة الجهل علیٰ قضاة زماننا. (تنقیح الحامدیة، ج: ۱، ص: ۳، طبع دارالمعرفة بیروت).

★ ★ ★

9

تعارف شخصیات

تراجم الاعلام

تعارف شخصیات

(۱) امام نووی رحمہ اللہ

یحییٰ بن شرف نووی، ان کا لقب محی الدین اور کنیت ابوزکریا ہے۔

۶۳۱ھ میں شام کی ایک بستی نویٰ میں پیدائش ہوئی۔

جب آپ کی عمر نو سال تھی، دمشق تشریف لائے اور طلب علم اور فقہ میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔

آپ کے شاگرد علامہ ابن عطار رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''ہمیں ہمارے استاذ نے بتایا کہ وہ رات اور دن میں سے اپنا کوئی وقت ضائع نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ راہ چلتے بھی مصروف رہتے اور انہوں نے اس طرح چھ سال گزارے اور پھر تصنیفِ کتب اور افادۂ خلق، نصیحتِ عوام اور حق بات کہنے میں مصروف ہوگئے''۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ اپنے مجاہدہ نفس اور تقویٰ کی باریکیوں پر عمل اور مراقبات وغیرہ کے ساتھ حدیث، فنونِ حدیث اور رجالِ حدیث کے حافظ بھی تھے۔ مذہب شافعی میں تو یہ سب کے سردار تھے۔ یہ ان غیر شادی شدہ علماء میں سے تھے جنہوں نے علم کو شادی پر ترجیح دی۔

مختصر سی عمر میں آپ نے بہت سی تحقیقی کتب تحریر فرمائیں، جن میں سے شرح صحیح مسلم، ریاض الصالحین، المجموع شرح المهذب (جسے آپ مکمل نہیں کر سکے تھے اور باب المصراۃ تک پہنچے تھے) روضة الطالبين جو امام رافعی رحمہ اللہ کی شرح الوجیز کا اختصار ہے، قابل ذکر ہیں۔

جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو اپنی بستی نویٰ واپس تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۶۷۶ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی عمر صرف ۴۵ سال تھی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الحفاظ، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، العلماء العزاب الذین آثروا العلم علی الزواج)

☆......☆......☆

(۲۰) امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن ابوبکر دمشقی، ابوعبداللہ، شمس الدین، ابن قیم الجوزیہ۔

آپ کی ولادت ۶۹۱ھ کو دمشق میں ہوئی۔

آپ کے والد محترم مدرسہ جوزیہ کے قیّم (نگران) تھے اس لئے آپ کو ان کی طرف منسوب کر کے ابن قیم جوزی کہا گیا ہے۔

آپ کا شمار اکابر علماء کرام میں سے ہوتا ہے۔ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی شاگردی اختیار کی کہ کسی بات میں ان سے اختلاف نہیں کیا، بلکہ ہر مؤقف میں ان کا دفاع کرتے رہے۔ ان کی کتابوں کو مرتب کیا، ان کے علم کو پھیلایا یہاں تک کہ قلعہ دمشق میں ان کے ساتھ قید بھی کاٹی۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کو رہائی ملی۔

آپ بہت اچھے اخلاق والے تھے اور لوگ آپ کے گرویدہ تھے۔

کتابوں کے ایسے شوقین تھے کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد جمع کر رکھی تھی۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں سے اعلام الموقعین، الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، اور زاد المعاد انتہائی شہرت کی حامل ہیں۔

آپ کا انتقال ۷۵۱ھ کو دمشق میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الدرر الکامنۃ، الاعلام)۔

☆......☆......☆

(۳) امام ابن عبد البر رحمہ اللہ

یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم، نمری، قرطبی۔

آپ اپنے زمانے کے امام، حافظِ اندلس اور بخاریِ مغرب کے لقب سے معروف تھے۔ بڑے فقیہ محدث، نقاد اور اصولی تھے۔ آپ کی کتابوں میں التمھید، الاستذکار اور الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب مشہور ہیں۔

آپ کی ولادت ماہ ربیع الثانی، جمعہ کے دن ۳۶۸ھ میں ہوئی اور آپ کا انتقال شب جمعہ، ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو، ۹۵ سال کی عمر میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(مقدمۃ التحقیق للاستذکار)

☆......☆......☆

(۴) خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی، کنیت ابوبکر۔

آپ کی پیدائش ۳۹۲ھ میں ہوئی۔

آپ اور آپ کے والد دونوں عراق کے بعض علاقوں کے خطیب تھے۔ آپ نے بغداد میں اپنے زمانے کے شوافع کے بڑے عالم ابوطیب طبری سے علم فقہ حاصل کیا۔ آپ کا شمار ان عظیم محدثین میں ہوتا ہے جو علم حدیث کی باریکیوں میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔

آپ کی تصنیفات کی تعداد ۶۰ سے زیادہ ہے، جن میں سے تاریخ مدینۃ السلام یعنی تاریخ بغداد اور الفقیہ والمتفقۃ بہت مشہور ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں جو چند ناقابل اعتماد روایات آپ نے نقل کی ہیں ان کا جواب علامہ زاہد الکوثری رحمہ اللہ نے تأنیب الخطیب کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔

آپ کا انتقال ۷ ذوالحجہ ۴۶۳ھ کو بغداد میں ہوا اور مشہور صوفی بزرگ بشر حافی رحمہ اللہ کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(سیر اعلام النبلاء، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)۔

(۵) عمر بن خلدہ رحمۃ اللہ علیہ

یہ تابعی ہیں اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ عبد الملک بن مروان کے دور میں مدینہ منورہ میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے۔

محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عمر بن خلدہ رحمۃ اللہ علیہ ثقہ تھے، احادیث کم روایت کرتے تھے اور بڑی ہیبت والے، باوقار متقی اور باعفت تھے۔

عہدۂ قضاء پر انہوں نے کبھی کوئی وظیفہ حاصل نہیں کیا گیا، جب ان کو معزول کیا گیا تو کسی نے پوچھا کہ آپ جس حال میں تھے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے دو بھائی تھے ہم نے ان کو حصہ دے کر جدا کر دیا اور ہماری ایک چھوٹی سی زمین تھی جس کی آمدنی سے ہم گزارہ کرتے تھے، ہم نے وہ بیچ دی اور اس کی قیمت خرچ کر دی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(طبقات الکبری لابن سعد، المعرفۃ والتاریخ)

☆......☆......☆

(۶) ربیعہ بن ابی عبد الرحمان فروخ رحمۃ اللہ علیہ

یہ بڑے امام اور فقیہ تھے، ان کی کنیت ابو عثمان تھی اور مدینہ منورہ کے رہائشی تھے۔

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

یہ فقہ اور حدیث کے عالم تھے، آپ رائے میں بہت مہارت رکھتے تھے اس لیے ربیعۃ الرائے کہلائے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔

ان کا انتقال ۱۳۶ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الحفاظ)

☆......☆......☆

(۷) ابن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ

ابوبکر عبداللہ بن یزید بن ہرمز، الاصم۔

بعض نے ان کا نام یزید بن عبداللہ بن ہرمز بھی لکھا ہے۔ یہ تابعین میں سے تھے اور مدینہ منورہ کے بڑے فقیہ تھے۔ آپ نے بہت ہی کم احادیث روایت کی ہیں۔ بڑے عابد اور زاہد تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میں ان کے پاس تیرہ ۱۳ سال تک رہا اور انھوں نے مجھ سے یہ قسم لے رکھی تھی کہ میں ان کا نام مسند حدیث میں ذکر نہ کروں گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے ان کی اقتداء اور پیروی بہت پسند تھی۔ فتوے بہت کم دیتے اور بہت احتیاط سے کام لیتے تھے، علم کلام کے ماہر تھے، گمراہ فرقوں کی تردید کرتے اور اس سلسلے کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں جب بھی کسی معزز شخص کو پریشانی لاحق ہوتی تو وہ ابن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے۔ جب مدینہ منورہ میں صدقات کی بکریاں آتیں تو یہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے کیونکہ لوگ ان کو صحیح جائز طریقے سے حاصل نہیں کرتے تھے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۸) امام سحنون رحمۃ اللہ علیہ

عبدالسلام بن سعید بن حبیب تنوخی رحمۃ اللہ علیہ۔

سُحنُون دراصل ایک پرندے کا نام ہے جس کی نگاہ بڑی تیز ہوتی ہے۔ ان کا یہ لقب مسائل شریعت میں مہارت کی وجہ سے پڑا۔

ان کی ولادت ۱۶۰ھ یا ۱۶۱ھ کو قیروان کے شہر میں ہوئی۔

قاضی اور فقیہ تھے، آپ اپنے زمانے میں مالکیہ کے امام تھے اور مغربی ممالک یعنی افریقی ممالک میں سب سے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ہی فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''المدونہ'' امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد عبدالرحمن بن قاسم سے روایت کی ہے۔ یہ حق بات کہنے کے معاملے میں کسی بادشاہ سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔ عبادت اور تقویٰ کے بارے میں ان کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔

ابوالعرب محمد بن احمد بن تمیم رحمہ اللہ نے آپ کی زندگی پر کتاب لکھی تھی جس کا نام ''مناقب سحنون و سیرتہ وادبہ'' ہے۔

آپ کا انتقال ۲۴۰ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الاعلام۔ ترتیب المدارک)

☆......☆......☆

(۹) حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ

عثمان بن مفتی صلاح الدین عبدالرحمٰن بن عثمان الکردی، شہرزوری، موصلی، شافعی۔

ان کی دو کتابیں ادب الفتوی اور علوم الحدیث اپنے اپنے فن کی مایہ ناز کتابیں ہیں۔ اکابر علماء نے بعد میں ان کی پیروی کی ہے۔

آپ کی ولادت ۵۷۷ھ میں ہوئی۔

طلب علم کے لئے مختلف شہروں کا سفر کیا، بالآخر دمشق کو اپنا وطن بنالیا۔ آپ علم وعمل کے جامع تھے یہاں تک کہ آپ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ فرماتے تھے:

''میں نے اپنی عمر میں کبھی کوئی صغیرہ گناہ بھی نہیں کیا''

آپ کا انتقال ۶۶ سال کی عمر میں ۶۴۳ھ میں ہوا اور یہ بات مشہور ہے کہ ان کی قبر کے قریب اللہ سے مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء، طبقات الشافعیۃ الکبری، ومقدمۃ التحقیق لعلوم الحدیث)

(۱۰) علقمہ رحمۃ اللہ علیہ

علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک، ابوشبل نخعی، کوفی۔

یہ کوفہ کے بڑے فقہاء میں سے تھے، آپ زمانے کے امام، حافظ اور بڑے قاری تھے۔ آپ اسود بن یزید اور ان کے بھائی عبدالرحمن کے چچا لگتے ہیں اور فقیہِ عراق ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں ہیں۔

ان ہی کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک گفتگو میں فرمایا تھا:

''علقمہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کم نہیں ہیں اگرچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے''

ان کے بارے میں منقول ہے کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی فقہ میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مخضرمین میں ہوتا ہے، (جنہوں نے زمانہ نبوت پایا لیکن زیارت نبوی سے مشرف نہ ہوسکے)۔

طلب علم اور جہاد کے لئے کئی سفر کیے، آخر کار کوفہ آئے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کرلی۔

ان کی سن وفات کے بارے میں ۶۱ھ سے ۶۵ھ تک مختلف اقوال ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(اعلام النبلاء۔ مسند امام اعظم مع شرح ملا علی قاری)

☆......☆......☆

(۱۱) مسروق رحمۃ اللہ علیہ

مسروق بن اجدع بن مالک بن امیہ بن عبداللہ، ابوعائشہ، وادعی، ہمدانی، کوفی۔

یہ حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے۔

مشہور ہے کہ بچپن میں یہ اغوا ہوئے تھے، بعد میں مل گئے تو آپ کا نام مسروق (چوری شدہ) پڑ گیا۔

آپ کا شمار بڑے تابعین اور مخضرمین میں ہوتا ہے۔ آپ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بڑے شاگردوں میں سے تھے اور اتنے عبادت گزار تھے کہ یہاں تک مروی ہے کہ اتنی طویل نماز پڑھتے کہ پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔

ان کا انتقال ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

(۱۲) امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ

عامر بن شراحیل بن عبد بن ذی کبار، ابو عمرو ہمدانی، شعبی۔

آپ کی ولادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھ سال گزرنے کے بعد ہوئی، سن ولادت بعض نے ۲۱ھ اور بعض نے ۲۸ھ بیان کیا ہے۔

آپ نے کئی اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیث پاک کی سماعت کی۔ آپ جوڑواں اور لاغر بدن کے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں تو رحم مادر میں بھی ستایا گیا ہے۔ ان سے یہ بھی منقول ہے کہ ہم تو فقہاء نہیں، ہم تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ ہم جو حدیث سنتے ہیں اسے آگے روایت کر دیتے ہیں، اصل فقہاء تو وہ ہیں جو علم حاصل کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

ان کی وفات کے بارے میں سب سے مشہور قول ۱۰۴ھ کا ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۱۳) ابو حصین رحمۃ اللہ علیہ

المدخل الی السنن الکبری میں اس روایت کے تحت شیخ ضیاء الرحمان اعظمی لکھتے ہیں کہ اس کنیت کے دو حضرات ہیں:

(۱) عثمان بن عاصم اسدی رحمۃ اللہ علیہ جو امام زہری کے ساتھیوں میں سے ہیں، ان کا انتقال ۱۲۷ھ میں ہوا۔

(۲) ھیثم بن شفی حجری بصری رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

ممکن ہے کہ یہی دوسرے راوی ہوں، جنہوں نے زہری سے کتب کے متن والی روایت سنی ہو، لیکن غالب یہ ہے کہ اس کے راوی اسدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ابو حصین سے مراد عثمان بن عاصم ہوں تو ان کی کنیت حا کے فتحہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اگر اس سے مراد ھیثم بن شفی ہوں تو اعراب حا کے ضمہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ ہوگا۔

(شرح الامام النووی علی مسلم ۔ تاج العروس)

(۱۴) زُبَید رحمۃ اللہ علیہ

زبید بن حارث الیامی، الکوفی، الحافظ، کنیت ابوعبداللہ یا عبدالرحمان تھی۔

صغارِ تابعین میں سے تھے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا اور اکابر تابعین سے حدیث روایت کی۔ سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر اللہ پاک مجھے اس کا اختیار دے دے کہ میں اس کے سامنے کسی دوسرے شخص کے وجود میں پیش ہونا چاہوں تو میں زبید الیامی کو اختیار کروں گا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام کوفہ والوں میں چار افراد مجھے پسند ہیں اور ان چار میں سے ایک انہوں نے انہی زبید کو پسند کیا۔

یونس بن محمد المودب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے زیاد نے بتایا کہ زبید رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسجد کے مؤذن بھی تھے۔ آپ بچوں کو کہتے کہ آؤ نماز پڑھو تو میں تمہیں اخروٹ دوں گا، بچے نماز پڑھتے اور ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے۔ میں نے اس بارے میں ان سے بات کی تو وہ فرمانے لگے، میرا کیا جاتا ہے کہ میں بچوں کے لئے درھم کے اخروٹ خریدلوں اور بچے اس بہانے نماز کے عادی بن جائیں۔

حضرت زبید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جب کسی رات بارش ہوتی تو وہ محلے کی بڑی بوڑھیوں سے پوچھتے کہ کسی نے بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں۔

ان کی وفات کے بارے میں ۱۲۲ھ کا قول ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۱۵) قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ

قاسم بن محمد بن سیدنا ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء میں سے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ولادت ہوئی۔

حضرت ابوزناد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کسی کو سنت کا عالم نہیں دیکھا۔
ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۶ھ سے ۱۰۸ھ تک کے مختلف اقوال ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ مسند امام اعظم مع شرح ملا علی قاری)

☆......☆......☆

(۱۶) قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ

عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرون بن یحصبی، سبتی، مالکی، کنیت ابوالفضل تھی۔
کلامِ عرب اور انسابِ عرب اور تاریخ عرب کے سب سے بڑے عالم تھے۔
سبتہ میں ۴۷۶ھ میں ولادت ہوئی۔
۳۵ سال کی عمر میں سبتہ کے قاضی بنے پھر غرناطہ کے عہدہ قضاء پر فائز ہوئے۔
آپ کی کتابوں میں "الاکمال شرح صحیح مسلم" جس کے ذریعے آپ نے علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المعلم کی تکمیل کی تھی۔ اسی طرح مشارق الانوار فی تفسیر غریب الحدیث اور الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ترتیب المدارك وتقريب المسالك فی معرفة اعلام مذهب امام مالك رحمۃ اللہ علیہ بہت مشہور ہیں۔ آپ نے عمدہ اشعار بھی کہے ہیں۔
آپ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات اپنے وطن سے دور مراکش میں رمضان یا جمادی الثانیہ ۵۴۴ھ کو شبِ جمعہ میں ہوئی۔
حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ان کو نیزے سے اس جرم میں قتل کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے ابن تومرت کی عصمت (یعنی معصوم ہونے کا) کا انکار کر دیا تھا۔
بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ آپکی شہادت زہر دینے کی وجہ سے ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے زہر دینے والا ایک یہودی تھا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ الصلة۔ الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۷) امام ابن القاسم رحمۃ اللہ علیہ

امام ابن القاسم عتقی، یہ ان غلاموں کی طرف نسبت ہے جو طائف سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے تھے تو آپ نے انہیں آزاد قرار دے دیا تھا۔ (جیسا کہ تدریب المدارك میں ہے)۔

ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے اور مصر کے بڑے علماء اور مفتیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

ان کی ولادت ۱۳۲ھ میں ہوئی۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے وہ شاگرد تھے جن کے بارے میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اللہ ان کو عافیت سے رکھے کہ ان کا حال اس تھیلے کی طرح ہے جو مشک سے بھرا ہوا ہو۔

یہ **المدونہ** کے راوی امام سحنون رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ہیں۔ اسد بن فرات رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہر دن اور رات میں دو ختم کرتے تھے۔

ان کا انتقال ۱۹۱ھ میں ہوا اور انہوں نے ۵۹ سال عمر پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ ترتیب المدارك)

☆......☆......☆

(۱۸) امام ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ

عبداللہ بن وھب بن مسلم، فھری، مصری۔ کنیت ابو محمد تھی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے اور ائمہ میں بڑے فقیہ شمار ہوتے تھے۔ فقہ و حدیث اور عبادت کے جامع تھے۔

ان کی کتابوں میں سے " الجامع " اور " الموطا " حدیث میں ہیں۔ ان کے سامنے عہدہ قضاء پیش کیا گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو چھپا لیا اور اپنے گھر میں ہی بند ہو گئے۔

ان کی پیدائش ۱۲۵ھ اور وفات ۱۹۷ھ کو مصر میں ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الاعلام)

(۹) امام لیث رحمہ اللہ

لیث بن سعد رحمہ اللہ مصر کے فقیہ اور حدیث کے امام تھے۔ بڑے علماء اور روساء میں سے تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے محمد بن رمح سے نقل کیا ہے کہ لیث بن سعد رحمہ اللہ کی آمدنی سالانہ ۸۰۰۰۰ یعنی اسی ہزار دینار تھی، (بوجہ سخاوت) کبھی ان پر ایک درھم زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوئی۔

ابن خلکان رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ میں نے بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ لیث رحمہ اللہ حنفی مذہب پر تھے۔ علامہ قرشی رحمہ اللہ نے بھی آپ کا ذکر طبقات حنفیہ میں کیا ہے۔

آپ کی وفات شب جمعہ، نصفِ شعبان ۱۷۵ھ میں ہوئی جبکہ آپ کی عمر ۸۱ سال تھی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الحفاظ، سیر اعلام النبلاء، الجواھر المضیئۃ، وفیات الاعیان)

☆......☆......☆

(۲۰) امام ماوردی رحمہ اللہ

علی بن محمد بن حبیب ماوردی۔ ان کا گھرانے کا ماء الورد یعنی عرق گلاب کے بنانے اور اس کی تجارت کا مشغلہ تھا، اسی وجہ سے یہ ماوردی کہلائے۔ مذہباً شافعی تھے، بصرہ میں امام صیمری رحمہ اللہ سے فقہ حاصل کی پھر بغداد ابو حامد اسفرائنی رحمہ اللہ کے پاس چلے گئے۔

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ نے اس بات پہ تنبیہ کی ہے کہ ان کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بعض مسائل میں معتزلی تھے۔

آپ کی کتابوں میں سے "الحاوی، ادب الدنیا والدین النکت فی التفسیر، دلائل النبوۃ" اور "الاحکام السلطانیہ" مشہور ہیں۔

آپ کا انتقال اختتامِ ربیع الاول ۴۵۰ھ کو ۸۶ سال کی عمر میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(طبقات الشافعیۃ الکبری۔ سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۲۱) قاضی شُرَیح رحمۃ اللہ علیہ

شریح بن الحارث بن قیس بن الجھم بن معاویہ۔کنیت ابوامیہ تھی۔

کوفہ کے قاضی رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان ہی کے بارے میں فرمایا:

"انت اقضی العرب"

ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔خلفاء راشدین حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قضاء کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے دور خلافت کے بعد انھوں نے حجاج کے دور میں استعفیٰ دے دیا، جس وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی، پھر اس کے بعد ایک سال زندہ رہے۔

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت نے کہا کہ انھوں نے ۷۸ھ میں وفات پائی۔خلیفہ نے کہا ۸۰ھ میں اور مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۸۲ھ کا کہا ہے اور ۹۹ھ کا قول بھی ہے۔اس کے علاوہ اور بھی کئی قول نقل کئے گئے ہیں۔

ان کے پوتے کا کہنا یہ ہے کہ آپ ۹۰ھ کے بعد بھی حیات رہے، لیکن یہ قول کوئی بہترین قول نہیں ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(طبقات ابی عمرو خلیفۃ بن خیاط، الاصابۃ، سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۲۲) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ

ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن موسیٰ البیہقی۔

خراسان کے شیخ تھے، امام حافظ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصانیف سے مذہب شافعی کی تائید کی۔بیہقی کی طرف نسبت اس وجہ سے ہے کہ یہ نیساپور کے اطراف میں سے ایک بستی ہے، جہاں کے آپ رہنے والے تھے۔

آپ ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔

حدیث میں امام حاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور انھوں نے حدیث، فقہ اور مختلف فنون میں بہت سی کتب تالیف وتصنیف کیں۔ان کی تالیف ایک ہزار کے قریب ہیں۔جن میں سے السنن الکبریٰ، شعب الایمان اور معرفۃ السنن والآثار زیادہ مشہور ہیں۔

ان کے حالات میں سے ایک عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے بہت مفید تصانیف کیں، حالانکہ ان کے پاس سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں سے کوئی کتاب نہیں تھی۔ جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔

انہوں نے ۴۵۸ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(ملخص من تذکرۃ الحفاظ)

☆......☆......☆

(۲۳) علامہ ابن حزم رحمہ اللہ

علی بن احمد بن سعید بن حزم الظاہری، ابو محمد ان کی کنیت تھی۔

اندلس کے اکابر علماء میں سے ہیں۔ آپ رحمہ اللہ قرطبہ میں رمضان المبارک کے آخری دن ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کو ریاست و وزارت کے امور میں کافی عمل دخل حاصل تھا، لیکن انہوں نے ان کاموں سے منہ پھیر کر علم و تالیف کو اپنایا۔ یہ ان نادر لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فقہ میں بڑی ابحاث پیش کی ہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ آپ پہلے فقہ شافعی پر تھے۔ پھر اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر ہر قسم کے قیاس جلی و خفی کا انکار کر بیٹھے اور ظاہر نصوص پر عمل پیرا ہوئے۔ اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھیں اور مناظرے کیے لیکن آئمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آداب کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے اس لئے آپ مختلف طریقوں سے پریشانیوں سے دوچار ہوئے۔

آخر کار اندلس کے ایک دیہات لبلۃ تشریف لے گئے اور وہاں اختتام شعبان سے دو راتیں قبل ۴۵۶ھ میں وفات پائی۔

آپ کی مشہور کتابوں میں سے "المحلی" اور "الفصل فی الملل والاھوا والنحل" ہیں۔ کئی عظیم اہلِ علم نے باوجود علمی اختلاف کے آپ کی بعض کتابوں کی تعریف کی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء، الاعلام)

☆......☆......☆

(۲۴) امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری، الدھلوی، الحنفی، الامام، المجدد۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ہند کے علاقہ مظفر نگر میں ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد علامہ الشیخ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ ان حضرات میں سے ہیں، جنہوں نے سلطانِ صالح اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسِ فقہاء میں فتاوی ھندیہ کو جمع کرنے اور مرتب کرنے کے لیے شرکت کی۔

سات سال کی عمر میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر دیگر علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اپنی عمر کے پندرھویں سال اس سے فارغ ہوئے اور بہت ساری کتب اساسیہ اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔

۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے پھر وہیں پورے دو سال قیام فرمایا اور علماء کرام کی صحبت پائی، ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان سے صحاح ستہ اور اس کے علاوہ دوسرے علوم حاصل کیے۔ پھر ھندوستان کی طرف لوٹے جہاں کے لوگوں میں دوسرے علوم کا اس قدر اہتمام تھا کہ قریب تھا کہ ان علاقوں سے اس (علم حدیث) چراغ بجھ جاتا۔ تو انھوں نے یہاں آکر حدیث اور اس کے علوم کا احیاء کیا۔

ان کی بہت سی تصانیف ہیں جو اپنے موضوعات میں دقیق ہیں۔ ان میں سے حجۃ اللہ البالغہ، اصول تفسیر میں الفوز الکبیر، المصفیٰ شرح الموطا، شرح تراجم البخاری، الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف بین المجتھدین، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید زیادہ مشہور ہیں۔

آپ نے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ۶۲ سال عمر پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(نزھۃ الخواطر)

☆......☆......☆

(۲۵) مکحول بن ابی مسلم الہذلی رحمۃ اللہ علیہ

اھلِ شام کے عالم، کابل کے رہنے والے تھے۔ مصر میں قبیلہ ھذیل کی ایک عورت کے غلام تھے پھر اُس نے انہیں آزاد کر دیا۔ انہوں نے علم حاصل کرنے کیلئے طویل ترین سفر اختیار کئے۔

ابوحاتم الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"ما اعلم بالشام افقه من مکحول"

(میں شام میں مکحول سے زیادہ فقیہ کسی کو نہیں جانتا)

آپ نے ۱۱۳ھ یا ۱۱۲ھ میں وفات پائی، اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الحفاظ، تاریخ الاسلام)

☆......☆......☆

(۲۶) ابوسلمہ ابن الصحابی الجلیل عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

ابوسلمہ رحمۃ اللہ علیہ، جلیل القدر صحابی کہ جن کو جنت کی خوشخبری دی گئی یعنی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف القرشی الزھری رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔

ان کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ ہے یا اسمٰعیل۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ھ کے چند سال بعد میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے روایات نقل کی ہیں۔ امام زھری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قریش میں چار افراد ایسے ہیں جنہیں میں نے علم کا سمندر پایا ہے۔ عروہ رحمۃ اللہ علیہ، ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ، ابوسلمہ رحمۃ اللہ علیہ، عبیداللہ بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں انہیں مدینہ منورہ کا قاضی بنایا گیا۔

بہتّر سال کی عمر میں ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں مدینہ منورہ میں ہی ۹۴ھ کو وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء، طبقات ابن سعد)

☆......☆......☆

(۲۷) طاؤس بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ

ابوعبدالرحمٰن طاؤس بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ، الہمدانی، بڑے فقیہ اور یمن کے بڑے عالم تھے۔

۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔

یہ ایک مدت تک حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ رہے۔ان کا شماران کے بڑے شاگردوں میں ہوتا ہے، اصلاً فارس کے رہنے والے تھے اوران کی پیدائش اور جائے پرورش یمن ہے، اکابر تابعین میں سے تھے۔دین کی سمجھ رکھنے والے اور حدیث کی خوب روایت کرنے والے تھے۔انہوں نے بڑی مشکلات اور مجاھدات والی زندگی بسر کی۔

مزدلفہ یا منیٰ میں حج کے دوران ۱۰۶ھ یا ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء، الاعلام)

☆......☆......☆

(۲۸) امام ابوعبداللہ الحلیمی رحمۃ اللہ علیہ

قاضی علامہ حسین بن الحسن بن محمد بن حلیم، البخاری، الشافعی۔کنیت ابوعبداللہ ہے۔

ماوراء النہر کے رئیس المحدثین والمتکلمین تھے۔

۳۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔انہوں نے امام ابوبکر قفال رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر سے علم حاصل کیا اوران کا شمار مذھب شافعی کے **اصحاب الوجوہ** میں ہوتا ہے۔حدیث میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، چنانچہ امام ابوعبداللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ ان سے حدیث نقل کرتے تھے باوجود یکہ ابوعبداللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ ان سے بڑے تھے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع الاول کے مہینہ، ۴۰۳ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔)

☆......☆......☆

(۲۹) سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ

سعید بن المسیب بن حزن بن ابی وھب۔

اپنے زمانے میں مدینہ کے عالم تھے، فقہاء سبعہ میں سے ایک ہیں۔ان کے والد کا نام مسیب ہے اوران کے

دادا کا نام حزن ہے، دونوں حضرات صحابی تھے۔

حضرت سعید رحمہ اللہ کا نکاح حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے ہوا تھا۔

حدیث کو لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے، انہی سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''میری چالیس سال سے جماعت کے ساتھ نماز کبھی فوت نہیں ہوئی''

نیز انہی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

''تیس ۳۰ سال سے جب بھی موذن اذان دیتا تو میں پہلے ہی مسجد میں ہوتا تھا''

ان کی مراسیل (وہ احادیث جن میں صحابی کا واسطہ ذکر نہ کیا گیا ہو) بالاتفاق قابل حجت ہیں، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دیگر مراسیل حجت نہیں ہیں۔

آپ نے ۹۴ھ میں وفات پائی۔ یہ قول ان کی وفات کے بارے میں صحیح ترین قول ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ اصول البزدوی۔ الاصابۃ)

☆......☆......☆

(۳۰) حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ

یہ حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ مدینہ کے بڑے عالم تھے۔ ابو عبد اللہ عروہ بن زبیر، القرشی، الاسدی فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔

اپنے والد سے کم عمری کی بناء پر بہت کم روایت کی ہے، جب کہ اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے اور اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے خوب احادیث نقل کی ہیں، ان کے ساتھ بھی بہت رہے، ان سے علم فقہ حاصل کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے بھی روایات کی ہیں۔

راجح قول کے مطابق حضرت عروہ ۲۳ رحمہ اللہ ھ میں پیدا ہوئے۔

ایک سفر میں ان کے پاؤں میں بیماری لاحق ہوگئی، اطباء کے مشورے سے مجبوراً اسے کاٹنا پڑا تو ان کا پاؤں ایسے کاٹ دیا گیا کہ انہوں نے کوئی نشہ آور دوا استعمال نہیں کی، زبان سے بھی معمولی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔

اسی سفر میں انہیں اپنے بیٹے محمد کے انتقال کی خبر ملی، جسے اصطبل میں ایک خچر نے لات مار کر قتل کر ڈالا تھا۔ تب بھی

کسی نے آپ کے منہ سے کوئی ناشکری کی بات نہیں سنی۔ جب وادی القریٰ پہنچے تو فرمایا:

لقد لقینا من سفرنا ھٰذا نصبا ۔(الکھف ۶۳)

(یعنی ہمیں تو اس سفر سے بڑی تھکاوٹ پہنچی ہے)۔

پھر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کیا:

''اے اللہ میرے سات بیٹے تھے، آپ نے ایک لے لیا ہے تو باقی چھ میرے پاس چھوڑ دیئے ہیں، میرے چار اطراف تھے (یعنی دو ہاتھ، دو پاؤں) آپ نے صرف ایک لے لیا باقی تین تو میرے پاس ہی رہنے دیئے ہیں ۔اگر آپ نے آزمائش دی تو عافیت بھی تو آپ نے ہی عطاء کی ۔اگر آپ نے کچھ لے لیا تو بہت کچھ باقی بھی تو چھوڑ دیا ہے''۔

ان کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ جب ان کا پاؤں کاٹا گیا اور وہ طشت میں رکھا ہوا تھا تو اس کو مخاطب کر کہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں کبھی بھی جان بوجھ کر تجھے گناہ کی طرف نہیں لے کر گیا۔

ان کے سن وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ۹۳ھ سے ۹۵ھ کے اقوال ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۱) عبید اللہ بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ

ابو عبد اللہ، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، الہذلی، المدنی۔

محدث عون رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی ہیں، ان دونوں کے دادا عتبہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔

مدینہ کے عالم تھے اور فقہاء سبعہ میں سے ایک ہیں، عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے معلم ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ طویل عرصہ رہے اور ان سے احادیث روایت کیں۔ اسی طرح انہوں نے حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا، ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ، فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے بھی احادیث نقل کی ہیں۔ حضرت عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ میں جب بھی کوئی حدیث سنی اور اسے یاد کرنا چاہا تو وہ فوراً مجھے یاد ہوگئی۔ آپ کی آنکھوں کی بصارت

ختم ہو گئی تھی۔

آپ کا سنِ وفات ۹۸ھ یا ۹۹ھ ہے اور دیگر اقوال بھی ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۲) سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ

ابوایوب سلیمان بن یسار، ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام اور عطاء ابن یسار رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔ فقہاء سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام، ۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔

آپ نے ۱۰۴ھ یا ۱۰۷ھ میں وفات پائی۔ آپ رحمہ اللہ لوگوں کے ہاں بڑی عزت و مرتبہ والے تھے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۳) خارجہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ

امام ابن امام، الفقیہ خارجہ بن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ الصحابی الجلیل۔

فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ آپ کا سن وفات ۹۹ھ یا ۱۰۰ھ ہے۔ جب ان کی وفات کی خبر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو پہنچی تو انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، پھر انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا! اللہ کی قسم! اسلام میں ایک شگاف اور رخنہ پڑ گیا ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۴) ابوبکر بن عبد الرحمن بن حارث رحمہ اللہ

ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام۔

فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ان کے والد عبدالرحمن بن حارث رحمہ اللہ کبار تابعین میں سے ہیں اور اپنی قوم کے سردار ہیں۔

یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوئے، اور ان کو زیادہ نمازیں پڑھنے کی وجہ سے راہبِ قریش کہا جاتا تھا۔آپ نابینا تھے اور بہت صابر تھے۔

آپ کا سنِ وفات ۹۴ھ یا ۹۵ھ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۵) ابان رحمہ اللہ بن امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

امام ابان بن عثمان بن عفان۔

یہ سات سال تک مدینہ منورہ کے والی اور امیر رہے، حدیث کے ثقہ راویوں میں سے تھے، مدینہ کے فقہاء اور اہلِ فتویٰ حضرات میں سے تھے۔

آخری عمر میں فالج کی بیماری لاحق ہوئی۔آپ کا سن وفات ۱۰۵ھ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔الاعلام)

☆......☆......☆

(۳۶) سالم بن عبد اللہ ابن امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

الامام الزاھد، الحافظ ابوعمرو، ابوعبداللہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ القریشی، العدوی، المدنی۔

فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوئے۔خوشحال زندگی

اختیار نہ کرنے میں اپنے والد کا راستہ اختیار کیا اور تنگ دستی اور مشکلات کی زندگی بسر کی۔
صحیح قول کے مطابق آپ کی وفات ۱۰۶ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۷) عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ

امام ابومحمد بن اسلم (ابو رباح) القرشی، المکی۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد یمن میں پیدا ہوئے۔ مکہ میں عبادت اور زُہد کے ساتھ پرورش پائی۔ تنگ دستی اور مشکلات کی زندگی گزاری، یہاں تک کہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیس سال تک حضرت عطاء کا بچھونا مسجد رہی اور آپ از روئے نماز لوگوں میں سب میں سے بہترین تھے اور اپاہج تھے۔

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد میرے ملازم تھے اور ٹوکریاں بنایا کرتے تھے۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نابینا، مفلوج، چپٹی ناک والے، لنگڑے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ ان کا ہاتھ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کاٹا گیا تھا۔ لوگ فتویٰ میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے اہلِ مکہ! تم میرے پاس آتے ہو حالانکہ تمہارے پاس عطاء رحمۃ اللہ علیہ موجود ہیں۔

یہ محدّث تھے، ان کی بعض مراسیل میں کلام کیا گیا ہے، جسے حافظ الذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے السیر میں ذکر کیا ہے۔
آپ نے مکہ میں ۱۱۵ھ یا ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ الاعلام)

☆......☆......☆

(۳۸) قتادہ بن دعامہ رحمۃ اللہ علیہ

قتادہ بن دعامہ بن قتادہ بن عزیز، بعض نے یوں فرمایا: قتادہ بن دعامہ بن عکابہ حافظ العصر، قدوۃ المفسرین

والمحدثین، ابوالخطاب السدوسی، البصری۔

مادرزادنابینا تھے۔آپ ۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔علوم کوسب سے زیادہ محفوظ کرنے والے تھے۔آپ سے آئمہ اِسلام جیسے ایوب سختیانی ،شعبہ ابن حجاج، جریر بن عازم، ابن ابی عروبہ ،معمر بن راشد، امام اوزاعی ،مسعر بن کدام اور عمرو بن الحارث المصری رحمۃ اللہ علیہم نے حدیث روایت کی ہے۔

آپ کا سن وفات ۱۱۸ھ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۳۹) ابوادریس الخولانی رحمۃ اللہ علیہ

عائذ اللہ بن عبداللہ بن عمرو، الخولانی، الدمشقی۔

آپ غزوہ حنین والے سال پیدا ہوئے ،اور مخضرمین تابعین نیز فقہاء شام میں سے ہیں۔اہلِ دمشق کے واعظ تھے۔

عبدالملک کی خلافت میں قصہ گو (قاص) تھے، پھر عبدالملک نے انہیں اس عہدہ سے معزول کیا اور قضاء کے عہدے پر فائز کردیا۔

ابوادریس الخولانی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے:

"عزلونی عن رغبتی وتر کونی فی رھبتی"

(یعنی انہوں نے مجھے اُس کام سے معزول کردیا جس کی مجھے رغبت تھی اور مجھے اس کام میں لگا دیا جس سے مجھے شدید خوف تھا)۔

آپ کی وفات ۸۰ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الحفاظ۔ الاعلام)

☆......☆......☆

(۴۰) رجاء بن حیوۃ الکندی رحمۃ اللہ علیہ

الامام الفقیہ ابونصر، ابوالمقدام رجاء ابن جرول بن احنف، الکندی، الازدی۔

اموی خلافت کے بہترین وزراء میں سے تھے۔ کبار تابعین میں سے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ان کے دادا جرول بن احنف صحابی تھے۔

مطرالوراق فرماتے ہیں:

"ما رایت شامیا افقہ منہ"

(میں نے کوئی شامی ان سے زیادہ فقاہت والا نہیں دیکھا)

انہوں نے ہی سلیمان بن عبدالملک کو اس کی وفات کے وقت یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ نامزد کر دیں۔

آپ کا سن وفات ۱۱۲ھ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ تذکرۃ الحفاظ)

☆......☆......☆

(۴۱) ہشام بن الحکم

ابو محمد ہشام بن حکم، الشیبانی، الکوفی۔

متکلم اور مناظر تھے۔ اپنے وقت میں امامیہ کے اکابر میں ان شمار ہوتا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "لسان المیزان" میں فرمایا کہ یہ روافض کے اکابر اور ان کے مشاہیر میں سے تھا، حضرت جعفر بن محمد صادق کے اصحاب میں سے تھا، کوفہ میں پیدا ہوا، واسط میں پرورش پائی اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ یحییٰ بن خالد البرمکی سے اس کا خاص تعلق تھا۔

بہت سی کتب تصانیف کیں، جن میں سے الامامہ، القدر، الشیخ والغلام، الرد علی من قال بامامۃ المفضول ہیں۔

ان کا انتقال کوفہ میں برامکہ کے زوال کے بعد ۱۹۰ھ میں ہوا اور کہا جاتا ہے کہ مامون الرشید کی خلافت تک زندہ رہے۔

(الاعلام۔لسان المیزان)

☆......☆......☆

(۴۲) ابو محمد حسن بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ

ابو محمد حسن بن عبد الرحمن بن خلاد، الرامھر مزی۔

آپ کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی۔ رامھر مز شہر کا نام ہے جو خوزستان کے مضافات میں ہے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے رامھر مزی کہلاتے ہیں۔

انہوں نے ہی سب سے پہلے علوم حدیث اور اصولِ حدیث میں کتاب تالیف کی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ)

☆......☆......☆

(۴۳) وکیع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ

الامام، الحافظ، محدث العراق ابو سفیان وکیع بن جراح بن ملیح بن عدی، الرؤاسی، الکوفی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا: وکیع امام المسلمین۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸ھ یا ۱۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں بیت المال کے نگہبان تھے۔

یحییٰ بن یمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے تو ان کی جگہ حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے۔

ابن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ استقبال قبلہ کیے رہتے تھے۔ احادیث مبارکہ یاد کرتے، رات کو قیام کرتے، پے در پے روزے رکھتے تھے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

آپ کا انتقال عاشوراء کے دن ۱۹۶ھ یا ۱۹۷ھ کو حج سے واپسی پر ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ الاعلام)

(۴۴) زفر بن ہذیل رحمۃ اللہ علیہ

امام زفر بن ہذیل بن قیس البصری۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں سے تھے اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے، اور فرماتے: یہ میرے شاگردوں میں سے قیاس کے سب سے زیادہ ماہر ہیں۔ ان کے خطبہ نکاح میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لئے یہ بلند پایہ الفاظ استعمال فرمائے تھے:

"هذا زفر امام من آئمة المسلمين وعلَم من اعلام في شرفه وحسبه ونسبه"

یہ علم اور عبادت دونوں کے جامع تھے جیسا کہ حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ اکٹھے تھے، امام داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تو فقہ کو چھوڑ دیا اور عبادت کی طرف متوجہ ہو گئے اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو جمع کر لیا۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے امام زفر رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ فرمار ہے تھے کہ ہم رائے کو نہیں لیتے جب تک اثر ہو اور جب اثر (حدیث) آجائے تو ہم رائے کو چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ قضاء کے عہدے کو ناپسند کرتے تھے اس لیے انہوں نے انکار کیا اور چھپ گئے۔ اس وجہ سے دو مرتبہ ان کے گھر کو منہدم کیا گیا۔

آپ نے سن ۱۵۸ھ میں وفات پائی۔

رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعة

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۴۵) سلیمان بن عبد القوی رحمۃ اللہ علیہ

نجم الدین ابو الربیع سلیمان بن عبد القوی بن عبد الکریم بن سعید الطوفی، الصرصری، البغدادی۔

آپ ۶۷۰ رحمۃ اللہ علیہ ھ کو طوفی نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ طوفی یہ بغداد کے قریب ایک بستی ہے۔ انھوں نے حافظ المزی صاحب تہذیب الکمال، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، حافظ شرف الدین الدمیاطی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔

ان کی بہت عمدہ تصانیف ہیں، جن میں سے اصول فقہ میں "مختصر الروضة" ہے جو موسوم ہے البلبل سے

اوراس کی شرح بھی لکھی۔ یہ دونوں کتب حنابلہ کے اصول فقہ میں عمدہ کتب ہیں۔ ان کی کتابوں میں سے "الاکسیر فی اصول التفسیر" اور "التعالیق علی الاناجیل الاربعة" بھی ہیں۔

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے آپ کو شیعت کی طرف منسوب کیا ہے لیکن بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کچھ ایسی آراء تھیں، جن کی وجہ سے انہیں بڑی تکالیف برداشت کرنی پڑیں لیکن بعدازاں ان کے بارے میں کوئی قابل گرفت بات سامنے نہیں آئی۔

قابل اعتماد قول کے مطابق آپ کا انتقال ۷۱۶ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(مقدمة التحقيق لشرح مختصر الروضة)

☆......☆......☆

(۴۶) امام داؤد الظاہری رحمۃ اللہ علیہ

ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف، الاصبہانی، الظاہری۔

ائمہ مجتہدین میں سے ہیں۔ ظاہریہ کا گروہ انہی کی طرف منسوب ہے۔ ان کو "الظاہری" اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت کے ظاہر کو لیا اور تاویل، رائے اور قیاس سے اعراض کیا اور داؤد پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اس بات کا برسر عام اعلان کیا۔

آپ کوفہ میں ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اصل میں اصبہانی ہیں، پھر بغداد میں سکونت اختیار کی بغداد کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے اور آپ نے بغداد میں ہی ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الاعلام۔ الفهرست لابن النديم)

☆......☆......☆

(۴۷) مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

علامہ، مفسر قرآن، فقیہ النفس، مفتی اعظم پاکستان محمد شفیع بن محمد یاسین بن خلیفہ تحسین علی۔

آپ شہرۂ آفاق تفسیر ''معارف القرآن'' کے مصنف ہیں۔

آپ ۱۳۱۴ھ کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش خصوصی علمی فضاء اور فضل و کرم والے گھرانے میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی زندگی دارالعلوم دیوبند کی ایمان افروز فضاء میں گزری اور آپ نے تمام علوم، دارالعلوم میں اپنے زمانے کی عبقری شخصیات سے حاصل کیے۔ جن میں محدث العصر امام علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بھی کئی مرتبہ شریک ہوئے۔

آپ نے ۱۳۳۵ھ میں علوم سے رسمی فراغت حاصل کی اور دارالعلوم میں معین مدرس مقرر ہوئے۔ تدریس کے دوران آپ نے مختلف فنون سے لے کر حدیث شریف تک تمام اسباق پڑھائے۔ اسی طرح آپ دارالعلوم دیوبند میں مفتی بھی مقرر ہوئے اور آپ نے ہزاروں تحقیقی فتاویٰ جاری فرمائے۔

سلوک و طریقت میں آپ حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامن سے وابستہ ہوئے اور انہی سے طریقت کی اجازت پائی۔

تحریک پاکستان میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا، اور جب پاکستان وجود میں آ گیا تو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے یہیں آباد ہوئے اور پاکستان کے قانونی اور سیاسی نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔

آپ نے کراچی میں ایک دینی درسگاہ کی جامعہ دارالعلوم کے نام سے بنیاد رکھی جو الحمدللہ آج بھی علوم دینیہ کے چشمہ صافی کے طور پر لاکھوں تشنگانِ علوم دینیہ کو سیراب کر رہا ہے۔

آپ نے بہت سی گراں قدر کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔

جن میں معارف القرآن، احکام القرآن، امداد المفتین اور جواھر الفقه خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۱ شوال ۱۳۹۶ھ کو ہوا اور دارالعلوم کے قدیم قبرستان میں مدفون ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(البلاغ، مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر)

☆......☆......☆

(۴۸) شیخ الہند محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الہند امام محمود حسن بن ذوالفقار علی بن فتح علی۔

آپ نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا جس کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

آپ ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے جہاں آپ نے ماہر اساتذہ سے علوم حاصل کیے اور حضرت علامہ امام محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر ان سے دیگر کتابوں کے ساتھ حدیث پاک کی صحاح ستہ پڑھیں، اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں خوب مہارت حاصل کی۔ آپ نے سلوک و تصوف بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور ان سے اجازت بھی پائی۔ اسی طرح انہیں سلوک و طریقت میں شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ الہندی ثم المکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی۔

۱۲۹۰ھ میں فراغت کے فوراً بعد ہی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے اور مسلسل ترقی کرتے ہوئے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ نے ۱۲۹۵ھ سے صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث کی تدریس شروع کی اور دور دراز سے طلبۂ علوم نبوت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طرح آپ نے تقریباً چالیس سال تک دارالعلوم میں بے مثال تدریسی خدمات سرانجام دیں۔

۱۳۳۳ھ میں آپ اپنے دوسرے حج کے لئے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں آپ انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد آزادی کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔ پہلے آپ کو حجاز میں قید رکھا گیا پھر مصر اور بالآخر جزیرہ مالٹا منتقل کر دیا گیا۔ دوران قید بھی آپ اپنے علم اور تقویٰ سے قیدیوں کو مستفید کرتے رہے اور آپ نے اسی دوران قرآن مجید کا وہ اردو ترجمہ مکمل فرمایا، جس کا آغاز آپ اپنے وطن میں کر چکے تھے۔ آپ نے تراجم صحیح بخاری کی ایک شرح بھی لکھنی شروع فرمائی لیکن تقدیر الٰہی سے اس کو مکمل نہ کر پائے۔ کئی سال کی قید کے بعد ۱۳۳۸ھ کے رمضان المبارک میں واپس ہندوستان پہنچے اور آزادی ہند کے لئے لازوال اور یادگار خدمات سرانجام دیں۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد ۱۳۳۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

آپ کی قیمتی تصانیف میں اردو ترجمہ قرآن، شرح تراجم ابواب بخاری، فقہ حنفی کے بعض مسائل پر اعتراض کے جوابات میں "الادلہ الکاملہ" اور "ایضاح الادلہ" اور گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائیگی پر رسالہ "احسن

القرائی فی توضیح اوثق العری" شامل ہیں۔ آپ نے سنن ابی داؤد کے نسخہ کی تصحیح بھی فرمائی۔ آپ کے شاگردوں میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، حکیم الامت حضرت تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

(حیات شیخ الھند از: حضرت مولانا سید اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ)

☆......☆......☆

(۶۹) امام اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اشرف علی بن عبدالحق حنفی، یہ وہ شخصیت ہیں جن کو عوام اور خواص نے حکیم الامت اور مجدد الملت کا لقب دیا۔ فقہ میں خوب مہارتؒ رکھنے والے تھے۔

آپ ۱۲۸۰ھ میں ہندوستان کے شہر مظفر نگر کی بستی تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور دینی فضاء میں پرورش پائی۔ آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ ابتدائی علوم ماہر اساتذہ سے پڑھنے کے بعد اپنی عمر کے پندرھویں سال دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے اپنے زمانے کے علم وعمل میں یکتا اساتذہ شیخ الہند الامام المجاھد محمود حسن، محقق وقت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم حاصل کیے۔

۱۳۰۰ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور پھر کانپور کے مدرسہ فیض عام میں ۴ سال تک تدریس کی۔ پھر اپنے شہر تھانہ بھون واپس آکر اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی مسند کو سنبھالا اور یہیں سے علم اور اصلاح کے بے مثال چشمے جاری فرمائے۔

۱۳۶۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ تالیف اور وعظ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص توفیق سے نوازا تھا۔ چنانچہ آپ کی کتب چھوٹی بڑی ملا کر ایک ہزار تک پہنچتی ہیں۔ آپ کے مواعظ میں بھی اصلاح کے حوالے سے بلا کی تاثیر پائی جاتی ہے، جو تیس جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ اردو تفسیر بیان القرآن، قرآن فہمی کے سلسلے میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح امداد الفتاویٰ آپ کے تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

آپ کا انتقال ۱۷ رجب المرجب کی شب ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(مقدمۃ اعلاء السنن)

(۵۰) امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ

فقیہِ وقت رشید احمد بن ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش۔

گنگوہ (ہندوستان کا ایک قصبہ) کی طرف نسبت کی گئی ہے، صحابی جلیل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے آپ کا نسب ملتا ہے۔ اپنے زمانے کے ابو حنیفہ اور فقیہ النفس تھے۔

آپ رحمہ اللہ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم آلیہ حاصل کرنے کے لئے دہلی کی طرف رختِ سفر باندھا، اور پھر تفسیر اور فقہ کا علم مولانا یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ کے والد محترم علامہ مملوک علی صاحب رحمہ اللہ سے حاصل کیا۔

محدث کبیر علامہ عبد الغنی دھلوی رحمہ اللہ جو کہ مجدد الف ثانی سرھندی رحمہ اللہ کے اَخلاف میں سے ہیں، ان سے حدیث مبارکہ کا علم حاصل کیا۔ پھر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ الہندی ثم المکی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے۔ آپ نے علوم ظاہرہ اور باطنہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ سے ظاہری اور باطنی علوم کے لئے دور دراز سے لوگ سفر کر کے آتے اور بالخصوص صحاح ستہ کے مشکل مقامات کو آسان اور مختصر جملوں میں حل کرنے کی خاص مہارت آپ کو حاصل تھی، جیسا کہ صحیح بخاری پر آپ کے تقریری افادات کے مجموعہ "اللامع الدراری" اور جامع ترمذی پر آپ کے درسی افادات کے مجموعہ "الکوکب الدری" سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقہ میں بھی آپ کو بہت مہارت حاصل تھی، یہاں تک کہ آپ کو ابو حنیفہ عصر کہا جاتا تھا اور فتاویٰ رشیدیہ میں آپ کے شائع شدہ فتاویٰ اور فقہی رسائل اس پر شاہد عدل ہیں۔

آپ ہندوستان کی دو عظیم دینی درسگاہوں دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے سرپرست بھی تھے۔

آپ کا انتقال ۱۳۲۳ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تذکرۃ الرشید۔ اکابر علماء دیوبند)

☆......☆......☆

(۵۱) امام ابو جعفر الطحاوی رحمہ اللہ

احمد بن محمد سلامۃ، ابو جعفر۔

الطحاوی، طحیۃ کی طرف نسبت ہے، جو مصر کے شہر صعید کی ایک بستی ہے۔ جلیل القدر امام ہیں اور مشہور

شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنے ماموں امام مزنی شافعی رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا۔ پھر ان کے مذہب کو چھوڑ کر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کو حاصل کرنے لگے۔

ابو یعلی الخلیلی رحمہ اللہ نے کتاب الارشاد میں ترجمۃ المزنی کے تحت ذکر کیا ہے کہ محمد بن احمد الشروطی رحمہ اللہ نے امام طحاوی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کے مذہب کی مخالفت کیوں کی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس لیے کہ میں اپنے ماموں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتب دیکھتے ہیں اور اُن کا مطالعہ کرتے ہیں۔

احمد بن محمد ابو جعفر الطحاوی رحمہ اللہ حدیث سے فقہ کے مسائل اخذ کرنے کے ماہر تھے۔ پھر آپ شام کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ کی ملاقات ابو خازم عبد الحمید رحمہ اللہ سے ہوئی، جو شام کے قاضی القضاۃ تھے، آپ نے ان سے علم حاصل کیا۔ وہ عیسیٰ بن ابان رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، جو امام محمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ احادیث اور تاریخ میں امام تھے۔

انکی بہت عمدہ اور معتبر تصانیف ہیں۔ جن میں سے معانی آلاثار جس کا اصل نام، شرح معانی الاثار ہے، مشکل الآثار، احکام القرآن، المختصر فی الفقه، شرح الجامع الصیغر، شرح الجامع الکبیر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

آپ رحمہ اللہ نے ۳۲۱ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۵۲) قاضی ابو عبید ابن حربویہ رحمہ اللہ

قاضی القضاۃ ابو عبید علی بن حسین بن حرب بن عیسیٰ البغدادی، الشافعی۔

مصر میں قضاء کے عہدے پر فائز تھے۔ امام محی الدین النووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ "اصحاب الوجوہ" میں سے تھے، آپ کا حوالہ، امام نووی رحمہ اللہ نے تکرار کے ساتھ "المهذب" اور "الروضة" میں ذکر کیا ہے۔

آپ رحمہ اللہ کا سن وفات ۳۱۹ھ ہے۔ ابو سعید الاصطخری رحمہ اللہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(۵۳) علامہ شامی، فتاوی شامیہ اور دیگر متعلقات کا تعارف

ہمارے سامنے ردّالمحتار کے موجودہ نسخے عام طور پر ان اجزاء کے جامع ہیں:

(۱) تنویر الابصار (محمد بن عبد اللہ بن احمد التمر تاشی)

(۲) الدر المختار (محمد بن علی بن محمد المعروف بعلاء الدین الحصکفی)

(۳) ردالمحتار یعنی حاشیہ ابن عابدین المعروف بفتاویٰ شامیہ

(محمد امین بن عمر بن عبد العزیز بن احمد المعروف بابن عابدین)

(۴) قرۃ عیون الاخیار تکملہ ردالمحتار علی الدر المختار

(علاؤ الدین محمد بن محمد امین بن عمر بن عبد العزیز)

(۵) (تقریرات الرافعی (عبد القادر بن مصطفیٰ بن عبد القادر الرافعی)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کے حالات زندگی

محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز بن احمد بن عبدالرحیم ابن نجم الدین بن محمد صلاح الدین الشهیر بعابدین، المعروف بابن عابدین۔

ان کا نسب سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔آپ کے چھٹے دادا محمد صلاح الدین کا لقب عابدین تھا۔ان کی اولاد میں جتنے بیٹے پیدا ہوئے سب ابن عابدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ ۱۱۹۸ھ کو شام کے شہر دمشق میں پیدا ہوئے۔

اپنے والد کی نگرانی میں پرورش پائی اور بہت تھوڑی سی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا تھا ان کے والد تجارت کرتے تھے تو یہ بھی ان کے پاس اکثر جاتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ دکان میں والد کی جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے، تو ان کے قریب سے ایک اجنبی شخص گزرا، اس نے ان کی تلاوت سنی، تو اس نے ان کو ڈانٹا اور کہا کہ آپ کے لئے یہاں تلاوت قرآن کریم کرنا دو وجہوں سے جائز نہیں ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ جگہ تجارت ہے اور کثرت سے لوگوں کا آنا جانا ہے۔تو یہ لوگ آپ کی تلاوت نہیں سن پا رہے، جس کی وجہ سے یہ گناہگار ہو رہے ہیں اور اسی طرح آپ بھی گناہگار ہو رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی قراءت میں غلطیاں ہیں۔

جب ابن عابدین نے یہ بات سنی تو فوراً کھڑے ہوگئے اور اس سے پوچھا کہ میں اس زمانے میں اپنی قراءت بہتر کرنے کیلئے کس کے پاس جاؤں؟ اس شخص نے شیخ القراء علامہ الحموی کا بتایا تو یہ ان کے پاس چلے گئے اور اجازت طلب کی کہ مجھے قراءت کے احکام، تجوید کے ساتھ پڑھائیں۔

ابن عابدین رحمہ اللہ جب سعید الحموی رحمہ اللہ کے پاس تشریف لائے تو ابھی تک وہ بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ شیخ القراء رحمہ اللہ نے ان کو بخوشی اجازت دے دی انھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں **میدانیہ، جزریہ اور شاطبیہ** جیسی بڑی کتابیں حفظ کرلیں۔ یہاں تک کہ فن قراءت میں مہارت حاصل کرلی۔ اس کے بعد پھر آپ نے صرف، نحو اور فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ فقہ، صرف اور نحو کے مایہ ناز متون کو زبانی یاد کیا اور پھر اس کے بعد مشہور عالم دین، شیخ محمد شاکر السالمی الحنفی رحمہ اللہ سے وابستہ ہوگئے اور فقہ حنفی اور جملہ علوم وفنون میں انہی سے تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب کا التزام کرلیا۔ ان کے پاس کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا کیونکہ ان کے والد تاجر تھے اور انھوں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ جس کتاب کی تمہیں ضرورت ہو بے تکلف خرید لو۔ اس کے علاوہ ان کے والد صاحب کے پاس اپنا آبائی کتب خانہ بھی بہت عظیم الشان تھا وہ بھی انہی کو ملا۔

آپ لمبے قد والے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے، اعضاء پُر گوشت تھے، رنگ سفید اور بال سیاہ تھے اور کچھ بال سفید تھے، اگر کوئی شمار کرنا چاہتا تو ان کو گنا جاسکتا تھا۔

حسن اخلاق کا پیکر تھے، نرم مزاج اور وضع قطع شریعت کے مطابق تھی۔ آپ نہایت تقوی والے اور پاکدامن تھے۔

ایک مرتبہ ان کو درہم کی پچاس تھیلیاں بطور رشوت کے پیش کی گئیں تاکہ وہ مرجوح قول پر فتویٰ دے دیں تو انھوں نے انکو ٹھکرادیا اور فتویٰ مرجوح قول پر نہ دیا۔

آپ انتہائی نرم مزاج کے تھے اور جس نے بھی آپ کے ساتھ سفر کیا یا کوئی معاملہ تو اس نے ان کی تعریف ہی کی اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے دوستوں اور خادموں پر غصہ نہیں کیا بلکہ کسی عام شخص پر بھی غصہ نہیں کرتے تھے۔ انکی مجلس فحش گوئی، غیبت اور لایعنی باتوں سے محفوظ ہوتی تھی۔ آپ کی عادات میں سے ہے کہ آپ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے انھوں نے اپنے اوقات کو تقسیم کیا ہوا تھا اور رات کا اکثر حصہ تصنیف وتالیف وغیرہ میں صرف کرتے۔

رمضان کی ہر رات میں ایک مکمل قرآن کریم کا ختم کرتے تھے، ان کی رات کا اکثر حصہ قرآن کی تلاوت میں

حالت بکاء میں گزرتا تھا، اور آپ ہر وقت باوضو رہتے تھے، بہت زیادہ صدقہ وخیرات کرنے والے تھے خصوصا ایسے فقراء کو عطا کرتے جو اس آیت کا مصداق ہیں "لایسألون الناس الحافا"۔

اسی طرح علماء وطلباء کی حاجات اپنے مال سے پوری کرتے تھے اور آپ بہت زیادہ شفیق تھے۔ ان کے پاس جو بھی ان کی مجلس میں بیٹھتا تو وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں ان کے ہاں ان کے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز ہوں۔ حق گو تھے، ظالم بادشاہ کے سامنے بھی حق بات کہنے سے نہیں کتراتے تھے۔

چند تصنیفات درج ذیل ہیں

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار (۲) اعلام الاعلام لا قرار العام (۳) الابانة عن اخذ الاجرة علی الحضانة (۴) تحریر النقول فی نفقة الفروع و الاصول (۵) تنبیه الولاة والحکام علی احکام شاتم خیر الانام او احد من الصحابة الکرام۔

آپ کے اساتذہ کرام

(۱) شیخ القراء سعید الحموی رحمۃ اللہ علیہ

(۲) الشیخ محمد شاکر السالمی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ

(۳) محدث الدیار الشامیہ الشیخ محمد الکزبزی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کے تلامذہ

(۱) الشیخ عبد الغنی المدانی رحمۃ اللہ علیہ (۲) الشیخ حسن البیطار رحمۃ اللہ علیہ (۳) احمد افندی الاستامبولی رحمۃ اللہ علیہ (۴) الشیخ احمد الحلاوی المصری رحمۃ اللہ علیہ (۵) الشیخ عبد الرحمن الجمل المصری رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ کے والدین

ان کے والدین میں سے والد محترم نے انکی زندگی ہی میں وفات پائی، انہوں نے ۱۲۲۳ھ میں رحلت فرمائی، آپ ان کیلئے ہر رات قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کر کے ایصال ثواب کیا کرتے تھے، والد کی وفات کے ایک ماہ بعد ان کو خواب میں دیکھا تو انہوں نے کہا:

"جزاك الله خيرا يا ولدي على هذه الخيرات التي تهديها الىّ في كل ليلة"

شیخ کی والدہ محترمہ بڑی صالحہ اور صابرہ تھیں، شیخ والدہ کی حیات میں ہی وفات پا گئے تھے۔ ان کی والدہ اس کے بعد دو سال زندہ رہیں، ان کے بارے میں آتا ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ایک لاکھ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھتی

تھیں اور اس کا ثواب اپنے بیٹے کو ہبہ کرتی تھیں۔

انکے بارے میں لکھا ہے کہ اپنے بیٹے کی وفات پر جاہل عورتوں کی طرح جاہلانہ خرافات اور نوحہ نہیں کیا بلکہ ان کی حالت رضا بالقضاء والقدر والی تھی اور وہ ہر وقت یہی کہتی رہتی تھیں۔ الحمد للہ علی جمیع الاحوال۔

تاریخ وفات

آپ نے بروز بدھ ۲۱ ربیع الثانی، چاشت کے وقت ۱۲۵۲ھ کو وفات پائی، آپ کی کل عمر ۵۴ سال بنتی ہے۔ آپکا مدفن دمشق میں ہے۔ آپ نے اپنی موت سے ۲۰ دن قبل اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے تیار کی اور پھر ان کی وصیت کے مطابق اسی قبر میں ان کو دفنایا گیا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

☆......☆......☆

علامہ علاؤالدین صاحب قرۃ عیون الاخیار کا مختصر تعارف

علاؤالدین محمد بن محمد امین بن عمر عابدین ۔علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عدیم النظیر کتاب کا سب سے پہلے مسودہ تیار کیا، پھر جب تمبیض اور ترتیب سے لکھنا شروع کیا تو کتاب الاجارہ سے تمبیض کا آغاز فرمایا اور آخرِ کتاب تک لے گئے۔ اس کے بعد تمبیضِ اول کتاب سے شروع کی یہاں تک کہ قضاء کے متفرق مسائل کے درمیان تھے کہ انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند علاؤالدین نے "قرۃ عیون الاخیار" کے نام سے "تکملة ردالمحتار" تحریر کیا، جو اب شامی کا حصہ ہے اور یہ قدیم نسخے کی دو جلدوں میں ہے اور اس کے آغاز میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔

☆......☆......☆

(۵۴) احمد بن سلیمان بن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن سلیمان بن کمال پاشا۔ ان کے دادا خلافت عثمانیہ کے امراء میں سے تھے اور یہ بچپن میں انہی کی پرورش میں رہے۔

علامہ طاشکبری نے "الشقائق النعمانیۃ فی علماء الدولۃ العثمانیۃ" میں ان کے حصولِ علم میں مشغول ہونے کا سبب یہ نقل کیا ہے (وہ فرماتے ہیں) کہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ، سلطان بایزید خان کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، اور اس کے ساتھ ایک نمایاں امیر اور وزیر تھے، جن کا نام "احمد بک" تھا۔

اتنے میں انہوں نے علماء میں سے ایک عالم کو خستہ حالت اور پراگندہ لباس میں دیکھا کہ وہ امیر احمد بک سے بلند بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ کو اس سے بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سے امیر کے مقابلے میں ان کی دلیری کے متعلق پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک عالم اور مدرس ہیں، جو "مولی لطفی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ان کا وظیفہ صرف تیس درہم ہے۔ لیکن امیر ان کی عزت ان کے علم کی وجہ سے کرتا ہے اور امیر احمد یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ ان کی مجلس میں کسی سے پیچھے رہیں۔

اس سے ابن کمال پاشا کے دل میں علم کی عظمت پیدا ہوئی، اور وہ مولی لُطفی کی خدمت میں گئے اور انہوں نے حواشی شرح المطالع ان سے پڑھی۔

(ملخص من الشقائق النعمانیہ)

اسی طرح انھوں نے مصلح الدین القسطلانی رحمہ اللہ سے بھی علم حاصل کیا۔ یہ وہ شخصیت ہیں کہ جن کی فقہ میں سند اکمل الدین البابرتی، صاحب العنایہ سے متصل ہے پھر صاحب النہایۃ علامہ حسام الدین السغناقی رحمہ اللہ تک یہ سند پہنچتی ہے۔

ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ ادرنۃ شہر میں مدرّس رہے اور پھر وہیں قاضی بن گئے۔ جب سلطان نے قاھرہ کو جراً کسے سے قبضے میں لیا تو یہ ان کے ساتھ قاہرہ آئے۔ وہاں کے لوگوں نے ان کی فضیلت اور مہارت کی گواہی دی۔

بعد ازاں یہ قسطنطنیہ کے مفتی بن گئے۔

ان کی بہت زیادہ عمدہ تصانیف ہیں، جن میں سے ایک تفسیر قرآن ہے، جو بہت اعلیٰ اور بہترین ہے لیکن آپ اسے مکمل نہ کر سکے۔

نیز حواشی علی الکشاف، الاصلاح والایضاح، یہ فقہ کا متن اور اس کی شرح ہے۔ ھدایہ کی شرح جو نا مکمل ہے۔ حواشی التلویح وغیرہ۔ ان کے مختلف فنون میں بہت زیادہ رسائل ہیں، شاید ان کی تعداد تین سو سے بھی زائد ہے۔ جیسا کہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے طبقات التمیمی سے ذکر کیا۔ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات التمیمی سے ردالمحتار میں ذکر کیا کہ ہر فن میں ان کی ایک تصنیف یا کئی تصانیف موجود ہیں۔ آپ تالیف کی کثرت اور تیزی میں جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی طرح تھے۔

آپ نے قسطنطنیہ کے شہر میں ۹۴۰ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

(الفوائد البھیۃ، شرح مقدمۃ الدر المختار)

☆......☆......☆

احمد بن عمر الخصاف رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن عمر بن مھیر الخصاف۔

انہوں نے اپنے والد محترم عمر بن مھیر سے علم حاصل کیا۔ انہوں نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے اور انھوں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے۔

خلیفہ مھتدی باللہ کے نزدیک یہ بڑے مرتبے والے تھے۔

ان کی ایک تصنیف ''کتاب الخراج'' ہے اور ان کی تصانیف میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں: کتاب احکام الوقف، کتاب ادب القاضی، کتاب الحیل، کتاب الوصایا، کتاب الشروط الکبیر والصغیر، وغیرہ۔ انہوں نے مناسک حج کے موضوع پر بھی کتب تصنیف کیں۔ لیکن جب خلیفہ مہتدی باللہ کو قتل کر دیا گیا تو دار الخصاف کو بھی لوٹا گیا اور یہ کتاب بھی دوسری کتب کے ساتھ چلی گئی۔

علوم کے امام تھے یہاں تک کہ شمس الائمہ الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''خصاف علوم میں بہت بڑے آدمی ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کی اقتداء کرنا درست ہے''۔

ان سے احادیث کی بہت سارے لوگوں نے روایت کی جن میں وھب بن جریر، قعنبی، ابوداؤد الطیالسی، مسدد بن مسرھد اور علی بن المدینی رحمہم اللہ جیسے حضرات شامل ہیں۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ان کا تذکرہ زہد اور تقویٰ سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے اور یہ جوتے بنانے کا کام کرتے تھے''۔

جیسا کہ علامہ سمعانی سے الفوائد البھیہ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

آپ کا سن وفات ۲۶۱ھ ہے۔ آپ نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

(سیر اعلام النبلاء۔ الفوائد البھیۃ)

(۵۶) ابوالحسن الکرخی رحمۃ اللہ علیہ

ابوالحسن عبیداللہ بن حسن الکرخی رحمۃ اللہ علیہ۔

کرخ کی طرف نسبت اس وجہ سے ہے کہ یہ عراق کے اطراف میں ایک بستی کا نام ہے۔فقہ کا علم حاصل کیا ابو سعید البردعی سے، انھوں نے اسماعیل بن حماد ابن ابی حنیفہ سے، انہوں نے اپنے والد حماد سے اور انہوں نے اپنے والد محترم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے۔

آپ سے علم فقہ حاصل کرنے والوں میں ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ، ابوالحسن قدوری رحمۃ اللہ علیہ اور ابوقاسم تنوخی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات شامل ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے المختصر، شرح الجامع الصغیر، شرح الجامع الکبیر وغیرہ ہیں۔آپ رحمۃ اللہ علیہ بہت نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے والے تھے۔جب آخری عمر میں فالج کی بیماری لاحق ہوئی تو ان کے ساتھیوں نے سیف الدولہ ابن حمدان کو لکھا کہ وہ ان کے علاج کا خرچہ برداشت کرے۔جب امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا علم ہوا تو رو پڑے اور فرمایا: "اللھم لا تجعل رزقی الا من حیث عودتنی"

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سیف الدولہ کی طرف سے کوئی احسان پہنچنے سے پہلے ہی آخرت کا رختِ سفر باندھ لیا اور یہ ۳۴۰ھ کی بات ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۵۷) شمس الائمہ الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالعزیز بن احمد بن نصر بن صالح شمس الائمہ الحُلْوَانی یا "الحَلْوَائی"۔

"الحلوانی" نسبت ہے ان کے پیشے کی طرف۔بات یہ تھی کہ ان کے والد غریب آدمی تھے اور حلوہ بیچا کرتے تھے، اور وہ یہ حلوہ فقہاء کو بھی بطور ہدیہ دیتے تھے اور ان سے کہتے کہ میرے بیٹے کی لئے دعا کریں۔

اپنے زمانے میں بخارا میں حنفیہ کے امام تھے ۔آپ نے فقہ کی تربیت حسن ابوعلی نسفی سے حاصل کی۔آپ سے

استفادہ کرنے والوں میں شمس الآئمہ سرخسی رحمہ اللہ، فخر الاسلام علی بن محمد بن حسین بزدوی رحمہ اللہ اوران کے بھائی ابوالیسر محمد بن محمد رحمہ اللہ اور شمس الآئمہ ابوبکر محمد بن علی زرنجری رحمہ اللہ شامل ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے المبسوط اور کتاب النوادر ہیں۔

ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ان کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیة)

☆......☆......☆

(۵۸) فخر الاسلام بزدوی رحمہ اللہ

ابوالحسن فخر الاسلام علی بن محمد بن حسین بن عبدالکریم البزدوی۔

ماوراء النہر میں علماء کرام کے امام تھے۔ مذہب حنفی کے حفظ، یادداشت میں ان کی مثال بیان کی جاتی ہے۔ سمرقند میں قضاء کے عہدے پر فائز تھے اور وہیں انہوں نے تدریس کی۔

ان کی بہت زیادہ معتبر تصانیف ہیں، ان میں سے اصول فقہ میں کتاب الکبیر مشہور ہے۔

نیز اصول البزدوی، شرح الجامع الکبیر، شرح الجامع الصغیر، المبسوط، کتاب فی تفسیر الغرائب بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آخر الذکر تفسیر ۱۲۰ حصوں میں ہے اور۔ ہر حصہ ضخیم اور مجلد ہے۔

آپ کا سن وفات ۴۸۲ھ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیة)

☆......☆......☆

(۵۹) فخر الدین قاضی خان رحمہ اللہ

فخر الدین حسن بن منصور بن محمود قاضی خان الاوزجندی۔

یہ اوزجند کی طرف نسبت ہے جو فرغانہ کے قریب اصبہان کے اطراف میں ایک شہر ہے۔

بہت بڑے امام تھے، مشکل معانی میں گہری نظر رکھنے والے تھے اور مجتہد سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ظہیر الدین حسن بن علی المرغینانی رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا، انہوں نے برہان الدین عبدالعزیز بن عمر بن مازہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے اپنے دادا محمود بن عبدالعزیز الاوزجندی رحمۃ اللہ علیہ سے۔

ان کی تصانیف میں سے مشہور فتاویٰ ہیں جو "فتاویٰ الخانیہ" یا "فتاویٰ قاضی خان" کے نام سے معروف ہے۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے قاسم بن قطلوبغا سے قدوری کی تصحیح میں نقل کیا ہے:

"ما یصححه قاضی خان مقدم علی تصحیح غیره لانه فقیه النفس"

اسی طرح ان کی تصانیف شرح الزیادات، شرح الجامع الصغیر، شرح ادب القضاء للخصاف وغیرہ ہیں۔

آپ نے ۱۵/رمضان المبارک کی رات کو ۵۹۲ھ میں وفات پائی۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة۔

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

ابوبکر الجصاص رحمۃ اللہ علیہ

ابوبکر احمد بن علی الجصاص، الرازی۔

علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ انساب میں فرماتے ہیں:

"الجصاص کی نسبت ان کے چونے کا کام اور دیواروں کو سفیدی کا کام کرنے کی وجہ سے ہے۔

اپنے زمانے میں حنفیہ کے امام تھے، انہوں نے فقہ کا علم ابوسہل الزجاج اور ابوالحسن الکرخی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ آپ ۳۲۵ھ میں بغداد تشریف لے گئے، پھر اہواز کی طرف گئے اور پھر دوبارہ بغداد لوٹے، پھر وہاں سے نیشاپور اپنے شیخ ابوالحسن الکرخی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور مشورے پر صاحب المستدرک محمد بن عبداللہ الحاکم النیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ابوالحسن الکرخی رحمۃ اللہ علیہ جب فوت ہوئے تو یہ نیشاپور میں تھے۔ پھر ۳۴۴ھ میں یہ بغداد واپس لوٹے۔

ان سے ایک جماعت نے فقہ کا علم حاصل کیا، جن میں سے ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ الجرجانی، شیخ القدوری رحمہ اللہ، ابو الحسن محمد احمد الزعفرانی رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے احکام القرآن، اپنے شیخ ابوالحسن الکرخی رحمہ اللہ کی المختصر کی شرح، شرح مختصر الطحاوی، شرح جامع للامام محمد رحمہ اللہ، الاسماء الحسنیٰ کی شرح اور اصول فقہ میں ایک کتاب ہے۔

آپ رحمہ اللہ نے ۳۷۰ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

ابوحسین القدوری رحمہ اللہ

ابوحسین احمد بن محمد بن احمد البغدادی، القدوری۔

القدوری کی طرف نسبت اس وجہ سے ہے کہ یہ بغداد کی بستیوں میں سے ایک بستی تھی اور اس کو قدورۃ بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انکی نسبت ہانڈیاں فروخت کرنے کی وجہ سے ہے۔ (جیسا کہ اس بات کو علامہ سمعانی نے بھی الأنساب میں ذکر کیا ہے۔

آپ رحمہ اللہ راویوں میں ثقہ اور صدوق تھے۔ انہوں نے حدیث مبارکہ کی سماعت کی۔ عبیداللہ بن محمد الحوشی سے اور ان سے ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب الحافظ (صاحب التاریخ) نے بھی روایت کی ہے۔

آپ نے فقہ کا علم ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ الجرجانی رحمہ اللہ سے حاصل کیا۔ آپ فصیح اللسان تھے اور ہمیشہ تلاوت قرآن مجید میں مصروف رہتے۔

آپ نے امام ابوحامد الاسفرائنی الفقیہ الشافعی رحمہ اللہ سے کئی مباحثے بھی کیے۔

آپ نے "المختصر" لکھی، جو بہت مبارک اور متداول ہے، شرح مختصر الکرخی، کتاب التجرید، یہ کتاب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے درمیان اختلافی مسائل پر مشتمل ہے اور دلائل سے خالی ہے۔

اسی طرح ان کی کتاب "التقریب" ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے مابین اختلافی مسائل پر مشتمل ہے اور دلائل سے خالی ہے۔ پھر آپ نے "التقریب الثانی" تصنیف کی جس میں ان اختلافی

مسائل کو دلائل کی روشنی میں ذکر کیا۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۶۲) علی بن ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ (صاحب ہدایہ)

علی بن ابو بکر بن عبد الجلیل الفرغانی، المرغینانی۔

بڑے امام، فقیہ، حافظ اور علوم کے جامع، قناعت پسند، زاہد، متقی، گناہوں سے بچنے والے، ادیب اور شاعر تھے۔

ان کی مثل، علم اور ادب میں آنکھوں نے نہیں دیکھی، انہوں نے فقہ کا علم مشہور ائمہ سے حاصل کیا۔ جن میں سے نجم الدین ابو حفص عمر النسفی اور ان کے بیٹے ابو اللیث احمد بن عمر النسفی ہیں اسی طرح انہوں نے صدر الشہید حسام الدین عمر بن عبد العزیز بن عمر بن مازہ وغیرہ سے بھی علم حاصل کیا۔ ان کے ہم عصروں نے ان کی فضیلت اور تقدم کا اقرار کیا ہے۔

ان سے ایک جم غفیر نے فقہ کا علم حاصل کیا۔ جن میں سے ان کی اولاد اطہار، شیخ الاسلام جلال الدین، محمد نظام الدین عمر اور شیخ الاسلام عماد الدین بن ابی بکر ابن صاحب الھدایۃ بھی ہیں۔

امام لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے "تعلیم المتعلم" للزرنوجی سے نقل کیا ہے کہ صاحب ہدایہ کے شاگرد اپنے شیخ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

''مناسب ہے کہ طالب علم کمزوری اور سستی نہ کرے کیونکہ یہ آفت ہے۔ میں نے اپنے شرکاء پر فوقیت اس وجہ سے پائی کہ میں نے علم حاصل کرنے میں کمزوری اور سستی نہیں کی''۔

ان کی تصانیف میں سے "بدایۃ المبتدی" اور اس کی شرح جو کہ موسوم ہے "الھدایۃ" کے نام سے یہ اختصار ہے بدایۃ کی طویل شرح کا جو "کفایۃ المنتھی" کے نام سے ہے۔

اسی طرح ان کی کتاب التجنیس والمزید ہے، نیز مختارات، النوازل، کتاب المنتقی وغیرہ بھی ہیں۔

آپ ۵۹۳ھ میں فوت ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

(۱۱) حافظ الدین النسفی رحمۃ اللہ علیہ

ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی۔

ماوراء النہر میں سغد کے شہر نسف کی ایک بستی کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے امام اور عدیم النظیر انسان تھے، فقہ اور اصول کے سردار تھے، حدیث اور اس کے معانی میں ماہر تھے۔

انہوں نے فقہ کا علم شمس الائمہ محمد بن عبدالستار الکردری رحمۃ اللہ علیہ، علی حمید الدین الضریر رحمۃ اللہ علیہ، بدر الدین خواہر زادہ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔

ان کی معتبر تصانیف ہیں، جن میں سے "کنز الدقائق"۔ متون میں سے مشہور متن ہے۔

فروع میں لطیف متن "الوافی" اور اس کی شرح "الکافی" اصول فقہ کا متن "المنار" اور اس کی شرح کشف الاسرار ہے۔

آپ ۷۱۰ھ میں بغداد تشریف لے گئے، اور ان کی وفات بھی اسی سن ہجری میں ہوئی۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ سوانح نگاروں نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً.

(الفوائد البہیۃ)

☆......☆......☆

(۱۲) مجد الدین الموصلی رحمۃ اللہ علیہ

ابوالفضل، مجد الدین عبداللہ بن محمود بن مودود بن محمود الموصلی۔

موصلی کی طرف نسبت، ان کی جائے پیدائش موصل کی وجہ سے ہے، جو کہ الجزیرہ کا ایک شہر ہے۔

علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ان کے علاقے کو الجزیرہ کہا گیا اس وجہ سے کہ یہ دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے۔ ابتدائی علم اپنے والد محترم ابوثناء محمود سے حاصل کیا اور پھر دمشق کی طرف کوچ کیا جہاں انہوں نے علم حاصل کیا جمال الدین الحصیری سے، اور پھر کوفہ میں قضاء کے عہدے پر فائز ہوئے۔

اصول اور فروع میں زمانے کے نمایاں افراد میں سے ایک تھے۔

ان کی تصانیف میں سے "المختار" ہے جو کہ انہوں نے آغاز جوانی میں لکھی۔ پھر اس کی شرح تصنیف کی اور اس کا نام رکھا "الاختیار"۔

آپ نے ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۶۵) تاج الشریعۃ المحبوبی رحمہ اللہ

تاج الشریعۃ محمود بن احمد بن عبید اللہ بن ابراہیم المحبوبی۔

یہ جلیل القدر صحابی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ (امام لکھنوی رحمہ اللہ نے عمدة الرعایه کے مقدمے میں ان کا نسب ذکر کیا ہے)۔

انہوں نے اپنے والد محترم صدر الشریعۃ احمد سے علم حاصل کیا۔

عالم باعمل، فاضل، صاحب تحریر اور علم کا سمندر تھے۔ وہ عمدہ تصانیف کے مصنف تھے۔ جن میں سے ایک "الوقایه" ہے جو فقہ کا متن ہے جس کو انہوں نے ھدایہ سے منتخب کیا۔ اس کو انہوں نے اپنے پوتے صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود بن محمود کو زبانی یاد کروانے کے لئے لکھا تھا۔

ان کی کتابوں میں الفتاویٰ والواقعات بھی ہے نیز نہایة الکفایه جو کہ ھدایہ کی شرح ہے۔

(الفوائد البھیۃ، مقدمہ عمدۃ الرعایۃ)

☆......☆......☆

(۶۶) مظفر الدین الساعاتی رحمہ اللہ

مظفر الدین احمد بن علی بن ثعلب، البعلبکی، البغدادی۔

بعلبکی نسبت بعلبک سے ہے جو کہ شام کے شہروں میں سے ایک شہر ہے اور دمشق سے ۱۲ فرسخ کے فاصلے پر ہے۔ (الانساب)۔

ان کے والد بغداد میں باب مستنصر کے پاس گھڑیوں کا کام کرتے تھے۔ آپ علم نحو، ہیئت اور گھڑیوں کے کام

میں مشہور ہوئے اوران کے اس بیٹے نے بغداد میں پرورش پائی اور کمال کے رتبے کو پہنچے یہاں تک کہ علوم شریعہ میں امام العصر بن گئے۔ شمس الدین الاصفہانی الشافعی رحمہ اللہ جو کہ محصول کے شارح ہیں، ان کو علامہ ابن حاجب پر فضیلت دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ ذہین و سمجھدار تھے۔

انہوں نے تاج الدین علی سے علم حاصل کیا اور انہوں نے ظہیر الدین صاحب "الفتاویٰ الظهيريه" سے اور انہوں نے علامہ قاضی خان سے۔

ان کی کتاب فقہ میں معتبر متون میں سے "مجمع البحرين" ہے۔ اصول الفقہ میں "البديع" ہے۔

امام لکھنوی رحمہ اللہ نے فرمایا "میں نے یہ دونوں کتابیں مطالعہ کی ہیں اور یہ دونوں کتابیں لطف اور لطافت میں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہیں"۔

آپ کا سن وفات ۶۹۴ھ ہے۔

رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهية، النافع الكبير)

☆......☆......☆

علامہ طحطاوی رحمہ اللہ

الاعلام میں علامہ زرکلی رحمہ اللہ نے فرمایا:

احمد بن محمد بن اسماعیل الطھطاوی۔

بہت بڑے حنفی فقیہ تھے، ان کی فقہ حنفی میں ۴ جلدوں پر مشتمل کتاب "حاشیہ الدر المختار" بہت مشہور ہوئی۔

آپ رحمہ اللہ طھطا میں پیدا ہوئے۔ جو مصر میں سیوط کے قریب واقع ہے۔ انہوں نے ازہر میں علم حاصل کیا۔ آپ شیخ الحنفیہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعض مشائخ نے آپ سے یہ عہدہ لے لیا، لیکن پھر آپ کو ہی دوبارہ اس پر بحال کر دیا گیا اور آپ قاہرہ میں اپنی وفات تک اسی منصب پر رہے۔

ان کی کتابوں میں سے "حاشيه على شرح مراقي الفلاح" فقہ کے موضوع پر ہے اور ایک رسالہ "كشف الرين عن بيان المسح على الجوربين" بھی ہے۔

تاریخ جبرتی میں ہے کہ ان کے والد محترم رومی (ترکی) تھے، مصر میں مقیم ہوئے۔ طحطا میں قضاء کے عہدے پر تھے اس لیے کبھی ان کو طحطاوی بھی کہا جاتا ہے۔

علامہ زرکلی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی وفات ۱۲۳۱ھ تحریر کی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۶۸) شیخ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالحی بن عبدالحلیم بن امین اللہ بن محمد اکبر السہالوی، لکھنوی۔

انہوں نے قرآن مجید ۱۰ سال کی عمر میں حفظ کیا اور علوم شرعیہ کی تحصیل سے ۱۷ سال کی عمر میں فارغ ہوئے۔ کافی عرصہ تک حیدرآباد شہر میں مدرس رہے اور اللہ نے دو مرتبہ حج کی سعادت عطا فرمائی اور ان کو حرمین شریفین کے بہت سے مشائخ سے اجازت حاصل ہے۔ پھر انہوں نے حیدرآباد سے رخصت لی اور اپنے شہر لکھنو میں تشریف لائے اور آپ آخرِ عمر تک یہاں ہی مقیم رہے، یہاں تدریس کی اور بہت مفید تصانیف کیں۔ ان کی عادت تھی کہ جب اہل علم کے ساتھ مباحثہ ہوتا تو بالکل خاموش رہتے اور سنتے رہتے، جب سب بات کر لیتے تو یہ ایسی فیصلہ کن بات کہتے جسے سب قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

ان کی مختلف فنون میں بہت زیادہ تصانیف ہیں جن میں سے حدیث مبارکہ میں "التعليق الممجد على مؤطا محمد" "الاجوبة الكاملة للاسئلة العشرة الكاملة" "ظفر الامانی بشرح المختصر المنسوب الى الجرجانی" "الاثار المرفوعة فی الاحاديث الموضوعة" ہے اور یہ فقہ میں "السعاية فی كشف ما فی شرح الوقاية" ہے جو نامکمل ہے۔ ھدایہ اور شرح وقایہ پر آپ کے مفید حواشی بھی ہیں۔

نسب اور اخبار کے علم میں "النصيب الاوفر فی تراجم علماء المائة الثالثة عشر" جو کہ نامکمل ہے نیز "الفوائد البهية فی تراجم الحنفية" ہے اور اس کے علاوہ مختلف فنون میں بہت زیادہ تصانیف ہیں۔

امام لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں:

''میں اس سن ہجری سے (جو علوم شریعہ سے ان کا سن فراغت ہے اور یہ ان کی عمر کا سترواں سال تھا) تالیف میں

مشغول ہوگیا۔ اور اب تک ان تصانیف میں سے مکمل کتابیں معقول اور منقولات میں سے ان کی تعداد ۴۴ تک ہے۔"

(آخر التعليقات السنية على الفوائد البهية)۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی اور آپ کی کل عمر صرف ۳۹ سال تھی۔ آپ کا جنازہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تین مرتبہ پڑھا گیا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(نزهة الخواطر)

☆......☆......☆

(۶۹) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

حجۃ الاسلام، ابو حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی الطوسی رحمۃ اللہ علیہ۔

بہت بڑے فقیہ، عبادت گذار اور زہد و تقویٰ والے تھے۔

"الوجیز" فقہ شافعی میں آپ کی ہی تصنیف ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ تقریباً دو سو کتب کے مصنف تھے۔

آپ ۴۵۰ھ میں طابران (خراسان کے شہر طوس کی ایک بستی کا نام ہے) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے نیشاپور کی طرف رخت سفر باندھا پھر بغداد اور وہاں سے حجاز، پھر شام کے اور پھر مصر کی طرف گئے اور پھر اپنے وطن واپس لوٹے۔

الغزالی نسبت "اُون" کے کام کرنے کی وجہ سے ہے (ان لوگوں کے نزدیک جوزاء کو تشدید سے پڑھتے ہیں) اور جو لوگ زاء کو تخفیف سے پڑھتے ہیں ان کے نزدیک غزالہ (طوس کی ایک بستی کا نام ہے) کی طرف نسبت ہے۔

ان کی کتب میں سے "احياء علوم الدين" ۴ جلدوں میں ہے نیز "تهافت الفلاسفة" بھی آپ کی تصنیف ہے۔ آپ کی اصول فقہ میں بھی کتب ہیں: شفاء الغليل، المستصفى من علم الاصول اور المنخول وغیرہ۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ۵۰۵ھ میں طابران میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۷) امام الحرمین الجوینی رحمۃ اللہ علیہ

ابوالمعالی، رکن الدین عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف، الجوینی، الشافعی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا لقب امام الحرمین ہے۔ حافظ ابو محمد الجرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اپنے زمانے کے امام تھے ،صفات محمودہ میں بے نظیر ولا ثانی اور یکتائے زمانہ تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۴۱۹ ھ میں جوین (نیشاپور کے اطراف میں بستی کا نام ہے) میں پیدا ہوئے۔ بغداد کی طرف کوچ کیا، پھر مکہ میں چار سال رہے۔ اور پھر مدینہ منورہ گئے جہاں درس تدریس اور افتاء کے کام میں مشغول ہو گئے۔ اسی وجہ سے آپ کو ''امام الحرمین '' کا لقب دیا گیا۔

آپ اپنے وطن نیشاپور سے ایک فتنے کی وجہ سے نکلے تھے۔ سلطان طغرل بک کے ایک وزیر بے تدبیر ابونصر کندری نے اشاعرہ کے خلاف یہ فتنہ کھڑا کیا تھا اور اس کے نتیجے میں امام الحرمین، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ کو نیشاپور سے نکلنا پڑا تھا۔

بعد میں جب آپ کی واپسی ہوئی تو منبر و محراب، خطبہ اور تدریس، جمعہ کے دن کی مجلس وعظ، یہ سب کام آپ کو ہی سونپ دیئے گئے۔ اس فتنے کی تفصیلات امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھی ہیں۔

ان کی تصانیف تحقیق میں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ان میں سے "غیاث الامم فی التیاث الظلم" جو کہ ''الغیاثی'' کے نام سے مشہور ہے۔ نیز "البرھان فی اصول الفقہ" "الورقات فی اصول الفقہ" اور الارشاد الی قواطع الادلۃ فی اصول الاعتقاد" وغیرہ بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ جیسے چند علماء نے آپ کی طرف منسوب بعض باتوں کی بناء پر تنقید کی ہے لیکن علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں ان کے حالات میں، ان باتوں کا رد فرمایا ہے۔

آپ کا انتقال ۲۵ ربیع الثانی ۴۷۸ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، غیاث الامم کا مقدمۃ التحقیق)

☆......☆......☆

(۷۱) امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ

امام ابوابراہیم اسماعیل ابن یحییٰ بن اسماعیل بن عمرو بن مسلم، المزنی، المصری رحمۃ اللہ علیہ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ شاگرد ہیں جن کے بارے میں انہوں نے فرمایا:

"المزنی ناصر مذھبی"

(یعنی المزنی رحمۃ اللہ علیہ میرے مذھب کے مددگار اور معاون ہیں)

آپ اس "المختصر" کے مصنف ہیں جس کی شہرت پورے عالم میں پھیلی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے امام الحرمین سے یہ بات نقل کی ہے کہ امام شافعی کے مذہب پر جو تخریج امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہوگی وہ دیگر آئمہ شافعیہ کی تخریج کی بنسبت زیادہ راجح ہوگی۔ آپ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے۔

آپ کا انتقال عید الفطر سے چھ دن پہلے رمضان المبارک ۲۶۴ھ میں ہوا، جب کہ آپ کی عمر ۸۹ برس تھی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(سیر اعلام النبلاء۔ تھذیب الاسماء واللغات)

☆......☆......☆

(۷۲) امام ابو اسحق اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ

امام ابو اسحق ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن مہران، اسفرائینی۔

علم کلام، فقہ اور اصول فقہ کے امام تھے۔ اسفرائینی کی نسبت نیشاپور کے اطراف میں ایک چھوٹے سے شہر "اسفرائین" کی طرف ہے۔ جیسا کہ علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الانساب میں ذکر کیا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کا ہمارے آئمہ میں سے "اصحاب الوجوہ" میں شمار ہوتا ہے۔ "الوسیط" اور "الروضتہ" میں ان کا تکرار کے ساتھ ذکر ہے اور "المھذب" میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ ان کو استاد ابو اسحاق کہا جاتا ہے۔ یہ ان تین حضرات میں سے ایک تھے، جو ایک ہی دور میں علم کلام کے مسائل میں شیخ ابوالحسن شعری رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے پر قرآن وسنت پر مبنی مذہب کی تائید میں جمع ہو گئے تھے۔ باقی دو حضرات قاضی ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

آپ کا انتقال یوم عاشوراء ۶۱۸ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(تہذیب الاسماء واللغات)

☆......☆......☆

(۷۳) امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

جلال الدین، ابوالفضل عبدالرحمن ابن ابی بکر بن محمد، الخضیری، الشافعی رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ کی پیدائش آغاز رجب ۸۴۹ھ میں ہوئی۔ ان کے والد محترم اہلِ علم میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی زوجہ کو حکم دیا کہ ان کی کتب میں سے ایک کتاب لے کر آئیں، پس وہ چلیں تاکہ وہ کتاب لے آئیں کہ اسی دوران ان کو دردِ زہ آگیا اور ابھی وہ کتابوں کے درمیان تھیں کہ ان کی ولادت ہوگئی۔ اسی وجہ سے ان کا لقب ''ابنِ کُتب'' تھا۔

(النور السافر، ص۹۰)

ان کے والد محترم نے وفات پائی تو اس وقت ان کی عمر ۵ سال تھی۔ والد کی وفات کے بعد کمال بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی سرپرستی کی۔

آپ اپنے زمانے کے مشہور علماء اکابرین سے علم حاصل کرنے میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ تالیف میں تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ آپ کی پانچ سو کتابیں ہیں، جن میں سے اکثر آپ کی زندگی میں ہی دنیا بھر میں پھیل چکی تھیں۔ آپ خود اپنے بارے میں بتاتے تھے کہ دو لاکھ احادیث یاد ہیں اور اگر مجھے اس سے زیادہ احادیث مل جاتیں تو میں وہ بھی یاد کر لیتا۔

جب آپ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو آپ نے تدریس اور افتاء کا کام چھوڑ کر عبادت الٰہی اور تالیف کتب کیلئے خلوت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ شبِ جمعہ، بوقتِ سحری، ۱۹ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(شذرات الذہب)

☆......☆......☆

(۷۴) الشیخ عبدالوہاب الشعرانی رحمہ اللہ

عبدالوھاب بن احمد بن علی، الحنفی، الشعرانی، کنیت ابو محمد تھی۔

حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ تک نسب متصل ہونے کی وجہ سے ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے۔ بہت بڑے فقیہ، محدث، عبادت گذار اور بہت بڑے زاہد تھے۔

قلقشندہ (مصر) میں پیدا ہوئے۔ ابو شعرہ نامی بستی میں پرورش پائی، پھر اسی کی طرف منسوب ہو کر شعرانی کہلائے۔

ان کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں سے "المیزان الکبریٰ" الیواقیت والجواهر فی عقائد الاکابر وغیرہ مشہور ہیں۔

آپ رحمہ اللہ نے قاہرہ میں ۹۷۳ھ کو وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

(الأعلام۔ شذرات الذھب)

☆......☆......☆

(۷۵) امام الربیع الشافعی رحمہ اللہ

ابو محمد الربیع بن سلیمان بن عبدالجبار بن کامل، المرادی، الشافعی۔

آپ امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے وہ شخص ہیں، جنہوں نے اپنے استاذ سے سب سے زیادہ روایات نقل کی ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نے از راہِ فراست پہلے ہی آپ کو کہہ دیا تھا:

"انت راویة کتبی"

اور یہ بلا شبہ ایسے ہی ثابت ہوئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے آپ کے بارے میں یہ بھی کہا کہ ربیع نے میری جتنی خدمت کی ہے کسی اور نے نہیں کی۔

آپ کا تذکرہ المھذب، الوسیط اور الروضة میں موجود ہے۔

آپ کا انتقال ۲۷۰ھ میں ہوا۔

فائدہ: یہ ربیع بن سلیمان مرادی ہیں، جب کہ ربیع بن سلیمان جیزی رحمہ اللہ بھی شافعی المذہب اور امام

شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن ان کا تذکرہ کتابوں میں زیادہ نہیں آتا۔ جب ربیع کے ساتھ کوئی نسبت نہ ہوتو اس سے مراد اول الذکر ہی ہوتے ہیں۔ جب ثانی الذکر کا تذکرہ ہوتو وہاں ''الجیزی'' کی نسبت ذکر کرتے ہیں۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(تهذيب الأسماء واللغات)

☆......☆......☆

(۷۶) الشیخ ابن الھمام رحمۃ اللہ علیہ

کمال الدین محمد بن عبدالواحد بن عبدالحمید، ابن الھمام، سکندری۔

آپ السیواسی کے نام سے مشہور تھے کیونکہ آپ کے والدِ محترم روم کے شہر سیواس کے قاضی تھے، پھر وہ قاھرہ تشریف لائے جہاں تو حنفی قاضی کی طرف سے ان کو فیصلے کے نفاذ کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ پھر وہ سکندریہ میں قضاء کے عہدے پر فائز ہوئے، جہاں انہوں نے قاضی المالکی کی بیٹی سے نکاح کیا اور ان سے کمال الدین محمد پیدا ہوئے۔

انہوں نے "الهداية"، سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ "قاری الهداية" کے نام سے مشہور ہیں) سے پڑھی اور جمال حمیدی سے علوم عربیہ حاصل کئے۔ اصول وغیرہ علامہ البساطی رحمۃ اللہ علیہ سے اور حدیث کا علم ابوزرعہ العراقی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ شمس الدین محمد (جو کہ ابن امیر حاج الحلبی کے نام سے مشہور ہیں) ابن شحنہ محمد بن محمد، سیف الدین محمد بن محمد بن عمر بن قطلو بغا جیسے حضرات نے آپ سے علم حاصل کیا۔

ان کی بہت زیادہ مقبول اور معتبر تصانیف ہیں، جن میں سے ہدایہ کی شرح "فتح القدير" اصول میں "التحرير" اور عقائد میں "المسايرة" زیادہ مشہور ہیں۔

آپ نے رمضان، جمعۃ المبارک کے دن ۸۶۱ھ میں وفات پائی۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۷۷) امام ابو اسحاق المروزی رحمہ اللہ

ابو اسحاق ابراہیم بن احمد المروزی۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمارے جمہور اصحاب کے امام تھے، شیخ المذہب تھے، ہمارے عراقی اور خراسانی اصحاب کا سلسلہ آپ ہی پر منتہی ہوتا ہے''۔

نیز امام نووی رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا:

''جب فقہ شافعی میں ابو اسحاق کہا جائے تو اُس سے مراد یہی مروزی ہوں گے''۔

انہوں نے امام ابو العباس بن سریج سے علمِ فقہ حاصل کیا اور فقہ شافعی کو عراق اور دیگر علاقوں میں پھیلایا۔

آپ مصر تشریف لے گئے اور وہیں ۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تهذيب الاسماء واللغات)

☆......☆......☆

(۷۸) قاضی ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ

ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن احمد المعافری، الاندلسی، الاشبیلی، المالکی۔

ان کے والد محترم، علامہ ابو محمد بن حزم الظاہری رحمہ اللہ کے بڑے ساتھیوں میں سے تھے، برخلاف خود قاضی ابو بکر کے کہ وہ ان کے شدید مخالف تھے۔

آپ ۴۶۸ رحمہ اللہ ھ میں پیدا ہوئے اور علم حاصل کرنے کیلئے آپ نے مصر، شام، بغداد اور مکہ مکرمہ کی طرف رختِ سفر باندھا، یہاں تک کہ انہوں نے علوم میں کمال حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ کرام میں سے امام ابو حامد الغزالی رحمہ اللہ بھی ہیں۔

ان کی بہت زیادہ تصانیفِ نافعہ ہیں جو کہ ہمیشہ سے علماء کا مرجع رہی ہیں۔

ان میں سے چند ایک یہ ہیں: احكام القرآن، عارضة الاحوذي في شرح الترمذي، القبس في شرح مؤطا ابن انس، شرح لموطا الامام مالك رحمہ اللہ، العواصم من القواصم في تحقيق مواقف

الصحابة بعد وفاة النبی ﷺ"۔

آپ رحمہ اللہ نے ربیع الثانی کی آخری تاریخوں میں "فاس" نامی شہر میں ۵۴۳ھ کو وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(سیر اعلام النبلاء۔ احکام القرآن کا مقدمۃ التحقیق)

☆......☆......☆

(۷۹) شمس الدین القہستانی رحمۃ اللہ علیہ

شمس الدین محمد بن حسام الدین، القہستانی، الحنفی۔

آپ قہستان کی طرف نسبت کرتے ہوئے قہستانی کہلائے۔ یہ علاقہ ہرات اور نیشاپور کے درمیان خراسان کے کنارے واقع ہے اور پہاڑوں میں واقع ہونے والی جگہ کو "کوہستان" کہا جاتا ہے۔

معروف ہے کہ قہستان کو عبداللہ بن عامر بن کریز نے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۹ھ میں فتح کیا۔ (الانساب للسمعانی)

آپ رحمہ اللہ بخارا کے مفتی تھے اور یہ ملا عصام الدین کے ساتھیوں میں سے تھے۔

ان کی تصانیف میں سے جامع الرموز فی شرح النقایة، مختصر الوقایة، جامع المبانی فی شرح فقه الکیدانی، شرح مقدمة الصلاة ہیں، جو تمام فقہ حنفی کے مسائل میں ہیں۔ البتہ عصام الدین رحمہ اللہ نے ان قہستانی کے بارے میں کہا ہے:

"یہ شیخ الاسلام الہروی رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے نہیں تھے، نہ ہی ان کے بڑے شاگردوں میں سے اور نہ ہی چھوٹے۔ بلکہ یہ تو اپنے زمانے کے "دلّال الکتب" (کتابوں کے کمیشن ایجنٹ) تھے۔ اور نہ ہی یہ فقہ کو جاننے میں معروف تھے اور نہ ہی اپنے ہمعصروں کے درمیان کوئی اور خاص علم رکھتے تھے"۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی شرح میں رطب ویابس، صحیح اور ضعیف مسائل کو بغیر کسی تحقیق، تصحیح اور تدقیق کے جمع کیا ہے۔

ان کی تاریخ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن العماد رحمۃ اللہ علیہ نے "شذرات الذهب" میں ذکر کیا ہے کہ ان کی وفات ۹۵۳ھ میں ہوئی۔

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ۹۶۲ھ میں وفات پائی اور بعض نے ۹۵۰ھ کا ذکر کیا ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(کشف الظنون۔ شذرات الذہب۔ معجم المؤلفین)

☆......☆......☆

امام ابوثور رحمہ اللہ

ابراہیم بن خالد بن ابی الیمان الکلبی البغدادی۔

آئمہ مجتہدین میں سے تھے اور مستقل مذہب والے تھے۔ ابوثور بہت بڑے امام اور فقیہ تھے۔

حضرت امام نووی رحمہ اللہ نے ان کو اصحاب شافعیہ میں شمار کیا ہے لیکن ساتھ ہی فرمایا:

''میں نے ابوثور کو اصحاب شافعی میں سے اور اُن کی کتابوں کے راوی کے طور پر تو ذکر کر دیا ہے لیکن یہ مستقل مذہب رکھتے تھے اس لیے ان کے تفردات فقہ شافعی کا حصہ نہیں ہیں''۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی بات کا مفہوم یہ ہے:

''یہ مذہب اہلِ عراق کو اختیار کرتے تھے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ بھی رہے۔ اپنی تمام کتابوں میں ان کا میلان امام شافعی کی طرف ہے''۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ان سے بکثرت روایات لی ہیں۔

آپ کا انتقال بغداد میں ۲۴۰ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تہذیب الاسماء واللغات۔ الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء)

☆......☆......☆

(۸۱) امام ابن المنذر الشافعی رحمہ اللہ

ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری۔

بہت بڑے فقیہ تھے۔ مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے۔

ان کی تصانیف میں سے چند ایک درج ذیل ہیں: "الاشراف فی اختلاف العلماء، کتاب الاجماع، کتاب المبسوط وغیرہ۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ۲۴۲ ھ میں پیدا ہوئے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"انہوں نے کسی مذہب کی پیروی کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ جس طرف بھی دلیل قوی سمجھتے اُسے ہی اختیار فرماتے۔ اس کے باوجود ہمارے آئمہ نے انہیں اصحاب شافعی میں سے ذکر کیا ہے اور ہماری تمام کتب طبقات میں ان کا تذکرہ موجود ہے"۔

آپ کا انتقال ۳۰۹ ھ یا ۳۱۰ ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(سیر اعلام النبلاء، تهذيب الاسماء واللغات، الأعلام)

☆......☆......☆

(۸۴) امام ابو اسحاق الشیرازی رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم بن علی ابن یوسف بن عبداللہ۔

اپنے زمانے میں مذہب شافعیہ کے امام تھے۔

ابو اسحاق الشیرازی رحمۃ اللہ علیہ "المھذب اور التنبیه کے مصنف تھے، اور اُن کا ذکر "الروضة" میں بار بار آیا ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ ۳۹۳ ھ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ ان حضرات میں سے ہیں جنہوں نے فقہ کا علم ابو طیب الطبری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا جو کہ اپنے زمانے کے بغداد میں شافعیہ کے شیخ تھے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ علم اور عمل کو جمع کرنے والے تھے یعنی عالم باعمل تھے۔

اور آپ مستجاب الدعوات تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد میں ۴۷۲ ھ میں وفات پائی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(تهذيب الأسماء واللغات)

☆......☆......☆

۸۳۔ حسن بن زیاد اللؤلؤی رحمۃ اللہ علیہ

حسن بن زیاد الکوفی اللؤلئی، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے تھے۔ موتیوں کی خرید وفروخت کرنے کی وجہ سے آپ کی نسبت اللؤلئی ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے فقیہ تھے، یہاں تک کہ یحییٰ بن آدم سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''میں نے حسن بن زیاد سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا''۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ سنت سے محبت اور اس کی اتباع کرنے والے تھے۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے احمد بن عبدالحمید الحارثی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''میں نے حسن اخلاق کے اعتبار سے حسن بن زیاد سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ آپ بہت نرم مزاج تھے حالانکہ بڑے فقیہ، عالم اور متقی تھے۔ آپ اپنے غلاموں کو بھی لباس پہناتے تھے جو خود پہنتے تھے''۔

آپ حفص بن غیاث کے بعد کوفہ کے قاضی ۱۹۴ھ میں بنے لیکن پھر مستعفی ہو گئے۔

آپ سے محمد بن سماعہ، محمد بن شجاع ثلجی اور علی رازی جیسے حضرات نے علم حاصل کیا۔ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ پر کچھ تنقید کی ہے لیکن امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کے نقل کرنے کو نامناسب قرار دیا ہے۔ ابوعوانہ، حاکم اور ابن حبان جیسے محدثین آپ کی توثیق کرتے ہیں۔ آپ کو دوسری صدی ہجری کا مجدد بھی کہا گیا ہے۔

آپ کی تصانیف میں کتاب ''المجرد'' اور ''الامالی'' ہیں۔

آپ کا انتقال، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال والے سال ۲۰۴ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(سیر اعلام النبلاء۔ تاریخ الاسلام ذہبی۔ الأنساب۔ الفوائد البهية)

☆......☆......☆

محمد بن سماعہ رحمۃ اللہ علیہ

ابوعبداللہ محمد بن سماعہ بن عبداللہ التمیمی۔

انہوں نے روایت کی لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ، امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے، اور فقہ کا علم ان دونوں حضرات

سے حاصل کیا اور حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ثقہ اور حفاظ میں سے تھے۔

مامون الرشید نے بغداد میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ۱۹۲ھ میں قضاء کے عہدے پر فائز کیا۔ آپ نے صحت اور طاقت کے ساتھ طویل عمر پائی۔ جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۰ ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۳ھ میں وفات پائی۔ آپ اس عمر میں بھی گھوڑے کی سواری کرتے تھے اور روزانہ ۲۰۰ رکعت نماز نفل پڑھتے تھے۔

قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے حکایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

۴۰ سال تک میری تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی مگر ایک مرتبہ جبکہ میری والدہ محترمہ فوت ہوگئیں تھیں تو میری ایک نماز کی جماعت رہ گئی تھی۔ اور میں نے پھر وہ نماز (نفل کی نیت سے) ۲۵ مرتبہ پڑھی۔ میری آنکھ لگی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی میرے پاس آیا اور وہ کہہ رہا ہے اے محمد! تو نے پچیس مرتبہ نماز تو پڑھ لی لیکن فرشتوں کی آمین کہاں سے لائے گا"۔ (جو صرف نماز باجماعت میں ہی ملتی ہے)۔

آپ کی تصانیف میں سے کتاب أدب القاضی، کتاب المحاضر والسجلات اور کتاب النوادر ہیں۔ آپ نے ابو جعفر احمد بن ابی عمران بغدادی' جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں' سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"مات ریحانة العلم من اهل الرأی"۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۸۵) معلیٰ بن منصور رحمۃ اللہ علیہ

ابو یحییٰ معلیٰ بن منصور الرازی۔

انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے کتب امالی اور نوادر روایت کیں۔ اور یہ ابو سلیمان جوزجانی کے ہمعصر تھے اور یہ دونوں حضرات تقویٰ، دین اور حفظِ حدیث میں بلند مرتبے پر فائز تھے۔

انہوں نے روایت کی مالک رحمۃ اللہ علیہ، لیث رحمۃ اللہ علیہ، حماد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور ان سے ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کے علاوہ دیگر کتب میں آپ سے روایت کی ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور

ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی آپ سے روایات لی ہیں۔ آپ کو کئی مرتبہ عہدۂ قضاء کیلئے کہا گیا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

آپ کا انتقال ۲۱۱ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الفوائد البھیة)

☆......☆......☆

(۸۹) علامہ محمد زاہد الکوثری رحمہ اللہ

علامہ محمد زاہد بن حسن بن علی کوثری، حنفی۔ بلند پایہ محدث اور فقیہ تھے۔

پیدائش ۱۲۹۶ھ میں ترکی کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ آستانہ کے جامع الفاتح میں فقہ کی تعلیم حاصل کی اور وہیں مجلس تدریس کے رئیس بنے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب اتحادیوں نے دینی علوم کے بجائے عصری علوم کو مکمل طور پر رائج کرنے کا منصوبہ بنایا تو آپ اس راہ کی بڑی رکاوٹ تھے اور مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت نے جب سیکولرازم کے نام پر الحاد پھیلانا شروع کیا تو آپ کی گرفتاری کے احکامات جاری ہوئے۔ وقت سے پہلے اطلاع مل جانے پر آپ ایک سمندری جہاز پر سوار مصر کے شہر اسکندریہ پہنچ گئے اور طویل عرصے تک مصر اور شام کے درمیان آتے جاتے رہے۔ بالآخر آپ نے قاہرہ میں رہائش اختیار کر لی۔ عربی، ترکی اور فارسی کے علاوہ آپ کو اپنی مادری زبان جرکسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔

آپ کی کئی مفید تالیفات ہیں، جن میں سے "تأنیب الخطیب" "النکت الطریفة" اور آئمہ حنفیہ کے تعارف پر لکھی گئی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کے سو کے قریب مقالے "مقالات الکوثری" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

آپ کا انتقال قاہرہ میں ۱۳۷۱ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(مقدمہ مقالات الکوثری از علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ۔ الأعلام)

☆......☆......☆

(۸۷) ابوسلیمان جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ

موسیٰ بن سلیمان، ابوسلیمان جوزجانی۔

جوزجان، یہ خراسان کے ایک شہر کی طرف نسبت ہے جسے جوزجانان یا جوزجان کہا جاتا تھا۔ آپ نے علم فقہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور آپ معلی بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی تھے۔

مامون نے آپ کو عہدہ قضاء پیش کیا لیکن آپ نے قبول نہیں کیا۔ آپ نے السیر الصغیر اور نوادر کی روایت کی ہے۔

۲۰۰ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الفوائد البهية ۔ الانساب ۔ معجم البلدان)

☆......☆......☆

(۸۸) ابوحفص کبیر رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن حفص بن زبرقان، ابوحفص کبیر بخاری۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں سے تھے۔ انہیں الکبیر اس لیے کہا گیا کہ ان کے بیٹے محمد کی کنیت ابوحفص الصغیر تھی۔

انہی کے بارے میں وہ واقعہ مشہور ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جب بخارا آئے اور فتویٰ دینا شروع کیا تو۔ انہوں نے اُن کو منع کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اس کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن امام بخاری فتاویٰ دیتے رہے، یہاں تک کہ جب اُن سے ایسے بچے اور بچی کے بارے میں پوچھا گیا، جنہوں نے ایک بکری اور ایک گائے کا دودھ پیا ہو تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا کہ ان دونوں کا نکاح حرام ہے۔ اس پر ایک فساد برپا ہو گیا اور لوگوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو بخارا سے نکال دیا۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسی ہستی کے بارے میں بعید از خیال قرار دیا ہے۔

رحمهما اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

(الجواهر المضية ۔ الفوائد البهية)

(۸۹) شیخ الاسلام ابوبکر المعروف خواہر زادہ رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن حسین بن محمد بن حسین بخاری جو ابوبکر خواہر زادہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ خواہر زادہ کا لفظی معنی ہے' بہن کا بیٹا یعنی بھانجا۔ اس لقب سے بہت سے ایسے علماء مشہور ہوئے جو کسی مشہور شخصیت کے بھانجے تھے اور یہ قاضی ابو ثابت محمد بن احمد بخاری کے بھانجے تھے۔ یہ وسطی ایشیا میں حنفیہ کے رئیس اور ''نعمانِ وقت'' تھے۔

ان کی کتابوں میں سے "المختصر" "التجنيس" اور "المبسوط" مشہور ہیں۔ ان کی مبسوط کو مبسوط بکر خواہر زادہ یا مبسوط بکری بھی کہتے ہیں۔ کئی آئمہ نے آپ سے روایات نقل کی ہیں۔ امام عمر بن محمد نسفیؒ جن کی عقائد نسفیہ مشہور ہے' اور علامہ محمد عثمان بیکندی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ سے احادیث لی ہیں۔

آپ کا انتقال بخارا میں جمادی الاولیٰ، ۴۸۳ھ کو ہوا۔

رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً

فائدہ: جب خواہر زادہ کا لفظ بغیر کسی نسبت کے بولا جائے تو اس سے دو شخصیات مراد ہوتی ہیں۔ ایک یہی بکر خواہر زادہ۔ دوسرے امام بدر الدین محمد بن محمود کردری رحمۃ اللہ علیہ۔

(الفوائد البهية۔ سير أعلام النبلاء۔ الاعلام)

☆......☆......☆

(۹۰) علی القمی رحمۃ اللہ علیہ

علی بن موسیٰ بن یزداد (دوسرے قول کے مطابق یزید) قُمی۔

احکام القرآن کے مؤلف اور اپنے زمانے میں حنفیہ کے امام تھے۔ آپ نے محمد بن حمید رازی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے سماع حدیث کیا اور آپ سے روایت کرنے والوں میں ابو الفضل احمد بن احمد کاغذی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کا انتقال ۳۰۵ھ میں ہوا۔

ابو اسحٰق رحمۃ اللہ نے الطبقات میں لکھا ہے کہ آپ نے شوافع کی کئی کتابوں کے جوابات لکھے تھے۔

تاریخ نیساپور میں احمد بن ہارون سے منقول ہے کہ احمد بن ہارون حنفی کہتے تھے کہ یہ علی بن موسیٰ قمی' جو نیساپور میں حنفیہ کے مفتی تھے' ہمارے پاس آئے تو ہم سب کا اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ ہم نے آج تک اپنے علماء میں ان سے بڑا

فقیہ کوئی نہیں دیکھا۔

قُمّی کا لفظ قاف کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ قُم شہر کی طرف نسبت ہے جو اصبہان، ساوۃ اور کبیرہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ شہر ۸۳ھ میں حجاج بن یوسف کے دور میں آباد ہوا تھا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الجواهر المضية)

☆......☆......☆

(۹۱) ابوجعفر ہندوانی رحمہ اللہ

محمد بن عبداللہ بن محمد بن عمر، ابوجعفر، بلخی، ہندوانی۔

(ہندوانی کا لفظ ھ کے کسرہ، نون کے سکون اور دال کے ضمہ کے ساتھ ہے) یہ بلخ کے ایک محلہ کی طرف نسبت ہے، جس کا نام باب ہندوان تھا، اس محلے کے بازار میں ہندوستان سے آئے ہوئے غلام اور باندیاں فروخت ہوتی تھیں۔

یہ ذہانت، فقاہت کے ساتھ تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کو ابوحنیفہ صغیر بھی کہا گیا ہے۔ بلخ میں انہوں نے احادیث بھی روایات کیں اور مشکل مسائل میں فتاویٰ بھی دیئے۔ آپ نے علمِ فقہ ابوبکر اعمش سے حاصل کیا اور آپ کے شاگردوں میں فقیہ ابواللیث نصر بن محمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

آپ کا انتقال بخارا میں ۳۶۲ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البهية۔الأنساب)

☆......☆......☆

(۹۲) ابوعبداللہ الحسن ابن احمد الزعفرانی رحمہ اللہ

حسن بن احمد بن مالک، ابوعبداللہ، زعفرانی۔

آپ نے امام محمد رحمہ اللہ کی الجامع الصغير کو عمدہ ترتیب سے پیش کیا اور اس کو پہلی بار مرتب ابواب پر تقسیم کیا۔ نیز امام محمد رحمہ اللہ کے مسائل کو امام ابویوسف رحمہ اللہ کی روایات سے جدا بیان کیا۔ آپ کی ایک کتاب تصنیف ''الاضاحی'' بھی ہے۔

آپ کا انتقال ۶۱۰ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ۔ کشف الظنون)

☆......☆......☆

(۹۱) امیر کاتب اتقانی رحمۃ اللہ علیہ

امیر کاتب عمید بن امیر غازی، قوام الدین، ابو حنیفہ، اتقانی، فارابی۔

فاراب دریائے سیحون کے پار ایک بستی کا نام ہے اور اتقان اُسی کا ایک قصبہ ہے۔

آپ مذہب حنفیہ میں متشدد اور علم فقہ اور لغتِ عرب کے ماہر تھے۔ بغداد میں مشہور الامام میں مدرس بنے۔ دو مرتبہ دمشق تشریف لائے۔ دوسری مرتبہ جب آئے تو وہیں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مدرسہ ظاہریہ کے دارالحدیث میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔ یہ ۷۴۷ھ کی بات ہے۔

آپ کی تصانیف میں سے "غایۃ البیان و نادرۃ الاقران" شرح ھدایہ اور "التبیین" شرح حسامی قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی یہ دونوں کتابیں مطالعہ کیں تو جیسا کہ علامہ کفوی نے فرمایا ہے، ان کو واقعی حنفیت میں متعصب پایا۔

اس کی مثال یہ مسئلہ ہے کہ انہوں نے لکھا ہے کہ رفع یدین سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

آپ کا انتقال ۷۵۸ھ میں ہوا۔ ایک قول ۷۵۳ھ کا بھی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۹۲) ابو عمرو طبری رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن محمد بن عبد الرحمن طبری۔

یہ طبرستان کی طرف نسبت ہے۔ یہ لفظ دراصل تبرستان تھا کیونکہ یہاں کے لوگ تبر یعنی کلہاڑی کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔ پھر عربی میں تبرستان سے طبرستان ہوگیا۔

آپ کی فقہ کی سند یہ ہے:

"عن ابی سعید البردعی عن اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفة عن ابیه عن جده"۔

(اس طرح آپ تین واسطوں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے) آپ بغداد کے فقہاء کبار میں سے تھے اور ابو الحسن کرخی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے طبقہ کے فرد تھے۔ آپ نے الجامع الصغیر اور الجامع الکبیر کی شرح بھی تحریر فرمائی)۔

آپ کا انتقال ۳۴۰ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهیة)

☆......☆......☆

(۹۵) ظہیر بلخی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن علی بن عبدالعزیز، ابوبکر، ظہیر، بلخی۔

آپ نے نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ عمر نسفی رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن احمد اسبیجابی رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ مراغہ میں مدرس رہے اور نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں حلب تشریف لائے، پھر دمشق چلے گئے۔ آپ نے الجامع الصغیر کی شرح لکھی ہے۔

آپ کا انتقال حلب میں ۵۵۳ھ کو ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهیة)

☆......☆......☆

(۹۶) صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ

عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، ابو محمد، حسام الدین، صدر الشہید۔

یہ المحیط البرھانی کے مصنف برہان الدین محمود بن احمد بن عبدالعزیز کے چچا ہیں۔

آپ نے علمِ فقہ اپنے والد برہان الدین کبیر عبدالعزیز رحمہ اللہ سے حاصل کیا اور آپ کے شاگردوں میں صاحبِ ہدایہ علی بن ابی بکر مرغینانی اور صاحب محیط رضوی رضی الدین سرخسی رحمہ اللہ جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ آپ کو اختلافی مسائل اور مذہب حنفی پر عبور حاصل تھا۔

آپ کی تصانیف میں الجامع الصغیر کی تین شروحات، امام خصاف کی ادب القاضی کی شرح، الفتاوی الصغری، الفتاوی الکبری اور المنتقی شامل ہیں۔

آپ کی شہادت، سمرقند میں ۵۳۶ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ۔ المحیط البرھانی کا مقدمۃ التحقیق)

☆......☆......☆

(۹۷) ابونصر عتابی رحمہ اللہ

احمد بن محمد بن عمر، زاہد الدین، ابونصر، عتابی۔

یہ عتابیہ کی طرف نسبت ہے، جو بخارا کا ایک محلہ تھا۔

آپ کی تصانیف میں سے "شرح الزیادات" ہے۔ علماء نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے اور اسے بے مثال قرار دیا ہے۔ اسی طرح شرح الجامع الکبیر، شرح الجامع الصغیر اور جوامع الفقہ جو فتاوی عتابیۃ کے نام سے مشہور ہے، نیز قرآن مجید کی تفسیر بھی آپ نے لکھی ہے۔

آپ کا انتقال ۵۸۲ھ یا ۵۸۶ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۹۸) فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ

نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم، ابو اللیث، سمرقندی۔

آپ نے علمِ فقہ ابوجعفر ہندوانی رحمہ اللہ سے حاصل کیا۔

آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں: تفسیر القرآن، النوازل، العیون، الفتاوی، خزانة الفقه، بستان العارفین، شرح الجامع الصغیر، تنبیه الغافلین۔

آپ کا انتقال ۳۷۳ھ میں ہوا۔

فائدہ: حافظ ابو اللیث سمرقندی اور فقیہ ابو اللیث سمرقندی دونوں الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ سمرقندی کی وفات ۲۹۴ھ میں ہے، جب کہ فقیہ سمرقندی رحمہ اللہ کی وفات ۳۷۳ھ میں ہے۔

رحمهما الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۹۹) قاضی اسبیجابی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن منصور، ابو نصر، اسبیجابی۔ یہ ''اسبیجاب'' کی طرف نسبت ہے۔

علامہ سمعانی رحمہ اللہ نے ان کی نسبت ''اسفیجابی'' لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ترکی کی سرحد پر بڑا شہر ہے۔ آپ نے اپنے شہر میں علم حاصل کیا، پھر سمرقند تشریف لے گئے اور منصبِ تدریس پر فائز ہوئے۔ ابو شجاع رحمہ اللہ کے بعد لوگوں نے آپ کی طرف رجوع کیا۔

آپ کا انتقال ۴۸۰ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۱۰۰) اکمل الدین بابرتی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن محمد بن محمود، اکمل الدین، بابرتی۔

یہ دجیل کے علاقوں میں سے بابرتی کی طرف نسبت ہے، جو بغداد کے مضافات میں ہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی۔ پھر حلب تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے علم حاصل کیا۔ ۷۴۰ھ کے بعد آپ قاہرہ چلے آئے اور صاحب النهاية شرح الهداية علامہ حسام الدین شارح مختصر ابن حاجب علامہ محمد بن عبدالرحمن اصفہانی اور صاحب البحر المحیط ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ سے علوم میں مہارت حاصل کی۔

آپ حدیث اور علوم حدیث نیز لغت، نحو صرف، علم معانی اور علم بیان کے ماہر تھے۔ آپ سے سید المحققین شریف جرجانی اور دیگر بہت سے لوگوں نے علم حاصل کیا۔

آپ کی تصانیف میں سے العناية شرح الهداية، تفسیر کشاف کے حواشی، التقرير والانوار، شرح مختصر ابن حاجب، شرح اصول البزدوی اور شرح الفرائض السراجية قابل ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال شب جمعہ ۱۹ رمضان المبارک ۷۸۶ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۱۰۱) محمد بن شجاع ثلجی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن شجاع، ابوعبداللہ، ثلجی۔

یہ ثلج بن عمرو بن مالک بن عبدمناف کی طرف نسبت ہے۔ ثلج یعنی برف کے کاروبار کی طرف نہیں۔

آپ نے علم فقہ حسن بن ابو مالک رحمہ اللہ اور حسن بن زیاد رحمہ اللہ سے حاصل کیا۔ آپ عراق کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ بعض سوانح نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کا میلان معتزلہ کے افکار کی طرف تھا۔

آپ کی تصانیف میں سے الردّ على المشبهة، كتاب المناسك ساٹھ سے زائد جلدوں میں، کتاب النوادر اور کتاب المضاربة قابل ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال عصر کی نماز کے دوران سجدہ کی حالت میں ۲۶۷ھ میں ہوا۔

ابوالحسن علی بن صالح کہتے ہیں کہ مجھے میرے دادا نے یہ بتایا کہ انہوں نے محمد بن شجاع ثلجی رحمہ اللہ کو یہ فرماتے

ہوئے سنا تھا کہ "مجھے اس جگہ دفن کرنا کیونکہ میں نے اس کے ہر کونے میں ایک قرآن مجید ختم کیا ہے"۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۱۰۲) جمال الحصیری رحمۃ اللہ علیہ

محمود بن احمد بن عبد السید بن عثمان، جمال الدین، بخاری، حصیری۔

ان کے والد مشہور تاجر تھے اور ان کی رہائش اُس محلے میں تھی جس میں حصیر یعنی چٹائیاں بنتی تھیں۔ انہوں نے علمِ فقہ حسن بن منصور قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور یہ اُن کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے۔

ان کی تصانیف میں سے الجامع الکبیر کی شرح اور الجامع الصغیر کی شرح مشہور ہیں۔

آپ کا انتقال ۶۳۷ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

(۱۰۳) علی بن معبد شداد رحمۃ اللہ علیہ

علی بن معبد بن شداد، ابو الحسن، یہ ابو محمد الرقی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

مصر میں رہائش پذیر تھے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور اُن سے الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر کی روایت کی ہے۔

یہ بڑے محدث بھی تھے چنانچہ یہ عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، لیث رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدثین سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور ابو عبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل ہیں۔

'تھذیب التھذیب' میں ان کے بارے میں حاکم رحمۃ اللہ علیہ کا قول لکھا ہوا ہے:

"هو شيخ من اجلة المحدثين" (کہ یہ بڑے محدثین میں سے تھے)

ان کا انتقال ۲۱۸ھ میں اختتامِ رمضان المبارک سے دس دن پہلے ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البهية۔ تهذيب التهذيب)

☆......☆......☆

(۴۰۴) ہشام بن عبید اللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ

ہشام بن عبید اللہ۔ انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال "رئ" میں انہی کے گھر ہوا اور انہی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے یہ مقولہ نقل کیا ہے:

"میں نے سترہ سو مشائخ سے ملاقات کی ہے اور علم کے حصول کیلئے سات لاکھ درہم خرچ کیے ہیں"۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں کہتے ہیں: "آپ صدوق تھے اور میں نے "رئ" میں آپ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا"۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(ميزان الاعتدال۔ الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۴۰۵) ابو حازم عبد الحمید بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

عبد الحمید بن عبد العزیز، ابو حازم (بعض نے اسے ابو خازم بھی کہا ہے)۔

انہوں نے عیسیٰ بن ابان، بکر بن محمد عمی اور ہلال بن یحییٰ بصری سے علم حاصل کیا۔ اُن سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو طاہر دباس رحمۃ اللہ علیہ نے شرفِ تلمذ پایا۔ ابو الحسن کرخی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی مجلسِ درس میں حاضر ہوئے تھے۔

یہ ثقہ، متقی اور حساب و فرائض کے عالم تھے۔ کوفہ وغیرہ میں عہدۂ قضاء پر بھی فائز رہے۔ ان کی ایک کتاب کتاب المحاضر والسجلّات ہے۔ علاوہ ازیں کتاب ادب القضاء اور کتاب الفرائض بھی آپ کی

تصانیف ہیں۔

آپ کا انتقال ۲۹۲ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(تاج التراجم)

☆......☆......☆

(۱۰۶) ابن عبدک الجرجانی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن علی بن عبدک، ابو احمد۔ عبدک کا اصل نام عبدالکریم جرجانی ہے۔

حاکم نے تاریخِ نیساپور میں لکھا ہے کہ ''عبدالکریم، امام محمد بن حسنؒ کے شاگردوں میں سے ہیں اور انہی سے علمِ فقہ حاصل کیا ہے''

انہوں نے علی بن موسیٰ قمی اور ابو داؤد اصبہانی سے حدیث بھی روایت کی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الجواھر المضیۃ)

☆......☆......☆

(۱۰۷) محمود بن احمد مازہ رحمۃ اللہ علیہ

محمود بن احمد بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ۔

یہ عمر بن مازہ کے خاندان سے تھے۔ اس خاندان نے ''امراءِ آلِ برہان'' کے نام سے ماوراء النہر کے ممالک پر ۴۵۰ھ سے ۶۰۴ھ تک حکومت کی۔ اس خاندان میں دینی و دنیاوی ریاست و وجاہت جمع تھیں۔

انہوں نے علمِ دین اپنے والد صدر سعید تاج الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے چچا صدر شہید عمر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔

ان کی تصانیف میں سے المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی، اس کا خلاصہ ذخیرۃ الفتاوی المعروف "بالذخیرۃ البرھانیۃ"، امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ کی ادب القاضی کی شرح، الجامع الصغیر کی شرح اور زیادات کی شرح شامل ہیں۔ آپ کا انتقال ۶۱۶ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

فائدہ: ابن امیر حاج رحمہ اللہ اور علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کے مطابق جب صرف "المحیط" کہیں تو اس سے مراد المحیط البرهانی ہی ہوتی ہے۔

(الفوائد البهیة۔ المحیط البرهانی کا مقدمة التحقیق)

☆......☆......☆

(۱۸۸) تاج الدین کردری رحمہ اللہ

عبد الغفور (یا عبد الغفار) بن لقمان بن محمد شرف، شمس الآئمہ، تاج الدین، ابو المفاخر، کردری، یہ کردر (بروزنِ جعفر) کی طرف نسبت ہے جو خوارزم کی ایک بستی ہے۔

انہوں نے امام ابو الفضل عبد الرحمن بن محمد کرمانی رحمہ اللہ سے علمِ فقہ حاصل کیا اور سلطان عادل نور الدین زنگی رحمہ اللہ کی طرف سے حلب کے قاضی رہے۔ یہ اپنے وقت میں حنفیہ کے امام تھے اور انتہائی متقی پارسا شخص تھے۔

ان کی اصول فقہ میں ایک تصنیف ہے۔ نیز "التجرید" کی شرح، جو ان کے شیخ علامہ کرمانی کی تصنیف ہے۔ ان کی شرح کا نام "المفید والمزید" ہے۔ الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور زیادات کی شروحات۔ اسی طرح ان کی ایک کتاب "حیرة الفقهاء" ہے، جس میں انہوں نے ایسے مشکل مسائل جمع کیے ہیں، جن کے حل میں علماء وفقہاء بھی حیران رہ جاتے ہیں۔

آپ کا انتقال حلب میں ۵۶۲ھ کو ہوا۔

فائدہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے حالات پر لکھی گئی مقبول اور معروف کتاب "مناقب الکردری" اِن کی تصنیف نہیں ہے بلکہ وہ امام محمد بن محمد کردری کی تصنیف ہے، جو بزازی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں اور اُن کا سنۂ وفات ۸۲۷ھ ہے۔ فتاویٰ بزازیہ جس کا اصل نام الجامع الوجیز ہے، وہ بھی انہی کی تصنیف ہے۔

اسی طرح یہ بھی ذہن میں رہے کہ (پہلے) تاج الدین کردری رحمہ اللہ کے استاذ امام کرمانی رحمہ اللہ الگ شخصیت ہیں اور "الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری" کے مصنف علامہ محمد بن یوسف بن علی بن سعید، شمس الدین کرمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۷۸۶ھ) الگ شخصیت ہیں۔

رحمهم الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الجواهر المضیة، الفوائد البهیة، کشف الظنون)

ابو حفص سراج ہندی رحمہ اللہ

عمر بن اسحٰق بن احمد، ہندی، غزنوی۔

انہوں نے علمِ فقہ شیخ وجیہ الدین دہلوی (جو دہلی کے بڑے آئمہ میں سے تھے) علامہ شمس الدین خطیب دولی (یہ دول کی طرف نسبت ہے، جو ری اور طبرستان کے درمیان ایک بستی ہے) سراج الدین ثقفی رحمہ اللہ اور علامہ رکن الدین بدایونی رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا۔ یہ سب حضرات امام ابو قاسم تنوخی کے اہم شاگردوں میں سے ہیں اور وہ امام علی بن محمد بن علی حمید الدین الضریر رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، جو اپنے وقت میں علماء ماوراء النہر میں سب سے نمایاں تھے، نیز حمید الدین ضریر رحمہ اللہ، عبداللہ بن احمد نسفی صاحب کنز الدقائق کے استاذ بھی ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے "التوشیح شرح الهداية" "الشامل فی الفقه" "شرح الزیادات" اور شرح الجامعین (یہ دونوں زیر تکمیل ہی تھیں کہ آپ کا انتقال ہو گیا) نیز الفتاویٰ السراجیه (اس کی آپ کی طرف نسبت میں شک ہے) بہت مشہور ہیں۔

آپ کا انتقال ۷۷۳ھ میں اور بقولِ بعض ۷۹۳ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(تاج التراجم۔ الفوائد البهية۔ الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۳۰) ابو عبداللہ جرجانی محمد بن یحییٰ بن مہدی

ابو عبداللہ، جرجانی۔ صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے آپ کو اصحاب التخریج میں سے شمار کیا ہے۔ آپ سے ابو الحسین قدوری رحمہ اللہ، احمد بن محمد ناطفی رحمہ اللہ اور ابو بکر رازی رحمہ اللہ نے علم فقہ حاصل کیا۔ آپ کی تصانیف میں سے شرح الجامع الکبیر، ترجیح مذهب ابی حنیفة اور القول المنصور فی زيارة سید القبور ہیں۔ عمر کے آخری حصہ میں آپ کو فالج ہوا اور ۳۹۷ھ یا ۳۹۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کی تدفین امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پڑوس میں ہوئی۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الفوائد البهية)

اسد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ

اسد بن عمرو قاضی بجلی (ب پر فتحہ اور ج کے سکون کے ساتھ) یہ بجلۃ کی طرف نسبت ہے۔
بَجَلی (ب اور ج دونوں کے فتحہ کے ساتھ) مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی نسبت ہے جیسا کہ علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات القاری سے نقل کیا ہے۔
یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسد بن فرات رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ "امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے وہ شاگرد جنہوں نے کتابیں مدوّن کی ہیں چالیس حضرات تھے۔ ان میں سے پہلے دس میں ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، زفر رحمۃ اللہ علیہ، داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ اور اسد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ ...... ہیں"۔
محدثین کا ان کی توثیق اور تضعیف کی بابت اختلاف ہوا ہے لیکن ان کی ثقاہت کیلئے اتنی بات کافی ہے کہ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔ علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، سبکی رحمۃ اللہ علیہ اور سخاوی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ صرف ثقہ راوی سے ہی حدیث لیتے ہیں۔
یہ ہارون الرشید کی جانب سے بغداد اور واسط کے قاضی بنائے گئے۔ جب ان کی بینائی میں کچھ فرق آ گیا تو آپ نے یہ عہدہ چھوڑ دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ہارون الرشید کی بیٹی آپ کے نکاح میں تھیں۔
آپ کا انتقال ۱۸۹ھ یا ۱۹۰ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البہیۃ)

☆......☆......☆

علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ظفر احمد بن لطیف عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔
اعلاء السنن آپ کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ امداد الاحکام کے نام سے آپ کے مجموعۂ فتاویٰ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قابل قدر تصانیف ہیں۔
آپ کی پیدائش ۱۳۱۰ھ کو اپنے آبائی گھر، جو دارالعلوم دیوبند کے قریب واقع ہے، میں ہوئی۔ تین سال کی عمر میں

آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی دادی جان نے آپ کی بہت اچھی تربیت کی۔ جب آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید مکمل کرلیا تو دارالعلوم دیوبند میں مزید دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر آپ اپنے ماموں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھانہ بھون چلے گئے۔ اور وہاں کچھ عرصے انہی کی نگرانی میں زیرِ تعلیم رہے۔ بعدازاں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں آپ نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر شاگردوں سے صحاح ستہ اور مشکوٰۃ المصابیح پڑھیں اور بالآخر مظاہر علوم سہارنپور میں صاحبِ بذل المجھود حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں ایک عرصے تک شرکت کی۔

حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو ۱۳۲۸ھ میں جب آپ کی عمر صرف ۱۸ ربرس تھی، حدیث پاک اور تمام علومِ نقلیہ کی اجازت عطا فرمادی۔ پھر آپ مدرسہ جامع العلوم میں مدرس مقرر ہوئے اور سات سال تک وہاں تدریس کی۔ بعدازاں آپ مدرسہ امدادالعلوم تھانہ بھون تشریف لائے جہاں آپ نے حدیث پاک اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اعلاء السنن کی تالیف اور افتاء وتدریس کے کئی کام آپ کے سپرد کردیے جن کو آپ نے بحسن، خوبی سرانجام دیا۔ آپ اعلاء السنن کی تالیف میں بیس سال تک مصروف رہے۔

تھانہ بھون کے بعد آپ نے ہندوستان، برما اور پاکستان کے مختلف علمی مراکز میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے اور آپ اپنی شدید بیماری کے باوجود اذکار اور نوافل کے بہت پابند تھے۔ سخت تکلیف اور مشقت کے باوجود تمام نمازیں مسجد میں ادا کرتے تھے۔

آپ کا انتقال ذوالقعدہ ۱۳۹۴ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(اعلاء السنن کا مقدمۃ التحقیق)

☆......☆......☆

(۱۱۳) ابن نُجَیم رحمۃ اللہ علیہ

زین الدین بن ابراہیم بن محمد بن محمد، ابن نجیم، حنفی۔

آپ نے علم فقہ علامہ قاسم بن قطلوبغا، برہان کرکی اور امین بن عبدالعال وغیرہ سے حاصل کیا۔

آپ نے آغاز عمر سے ہی فقہ حنفی میں مختلف رسائل تحریر فرمائے اور پھر البحر الرائق شرح کنز الدقائق کی تالیف کا آغاز کیا۔ اس شرح کو آپ آخر کتاب الاجارۃ تک ہی لکھ پائے تھے' اس کی تکمیل بعد میں علامہ طوری رحمہ اللہ نے کی۔ الاشباہ والنظائر ' شرح المنار فی الاصول' لُبّ الاصول' مختصر تحریر الاصول لابن ہمام' الفوائد الزینیۃ فی فقہ الحنفیۃ' ھدایہ پر تعلیق اور جامع الفصولین پر حاشیہ' یہ آپ کی مفید عام تصانیف میں سے خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ کا انتقال بوقت صبح' بروز بدھ' رجب ۹۷۰ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(شذرات الذھب)

☆......☆......☆

(۱۱۳) امام حاکم شہید رحمہ اللہ

محمد بن محمد بن احمد' حاکم شہید' مروزی' بلخی۔

یہ المستدرك کے مؤلف حاکم رحمہ اللہ کے اُستاذ تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ساٹھ ہزار احادیث کے حافظ تھے۔

جب آپ کو بخارا کا عہدۂ قضاء سونپا گیا تو آپ امیر حمید کے ہاں بہت زیادہ آتے جاتے تھے اور آپ نے انہیں فقہ کی تعلیم بھی دی۔ پھر جب یہ امیر حمید وزارت کے منصب پر فائز ہو گئے تو انہوں نے تمام اہم امور آپ کے حوالے کر دیے۔ آپ وزارت کا نام آنے سے بچتے تھے اور ہر نماز کے بعد یوں دعا مانگا کرتے تھے:

اللھم ارزقنی الشھادۃ

(اے اللہ! مجھے شہادت نصیب فرما)

جس صبح یہ شہید کیے گئے' رات کو عشاء کے وقت انہوں نے کچھ شور و غوغا اور ہتھیاروں کی آوازیں سنیں تو پوچھا کہ یہ کیسا شور شرابا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ تمام اہل لشکر جمع ہیں اور آپ پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ آپ ہی اُن کے وظائف ملنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جب آپ نے یہ سنا تو صرف اتنا کہا: اے اللہ! میری بخشش فرما۔ پھر آپ نے حجام کو بلوا کر اپنے سر کا حلق کروایا اور غسل کر کے بہترین کفن پہن لیا۔ پھر آپ پوری رات نماز میں مصروف رہے یہاں تک کہ

صبح اہلِ لشکر نے آپ پر دھاوا بول دیا۔اس موقع پر سلطان نے ایک فوجی دستہ بھیجا جنہوں نے اُن حملہ آوروں سے قتال کیا لیکن ان اہلِ لشکر نے آپ کو سجدہ کی حالت میں ربیع الثانی ۴۳۴ھ کو شہید کر دیا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(ملخص من الفوائد البہیۃ)

☆......☆......☆

(۱۱۵) شمس الآئمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن احمد بن ابی سہل، ابوبکر، سرخسی، شمس الآئمہ۔

آپ طویل عرصے تک شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانی کے پاس رہے اور اُنہی سے علوم کی تکمیل کی، یہاں تک کہ اپنے زمانے کے بے مثال عالم قرار پائے۔

آپ سے علم فقہ حاصل کرنے والوں میں برہان الآئمہ عبدالعزیز بن عمر بن مازہ اور محمود بن عبدالعزیز اوزجندی شامل ہیں۔

خاقان (وقت کے حکمران) نے آپ کو ایک نصیحت کی پاداش میں اوزجند کے ایک کنویں میں قید کر دیا تھا، جہاں یہ کئی سال تک رہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ انہوں نے اسی کنویں سے المبسوط جیسی جلیل القدر کتاب، مکمل طور پر اپنے شاگردوں کو بغیر کسی کتاب کی مراجعت کے املاء کروائی تھی۔

بعض حضرات کا یہ کہنا خلافِ تحقیق ہے کہ آپ نے المبسوط کا بڑا حصہ کنویں سے لکھوایا لیکن اُس کی تکمیل رہائی کے بعد کی۔ اسی طرح آپ نے شرح السیر الکبیر بھی کنویں سے ہی املاء کروائی تھی اور اصول السرخسی کا بڑا حصہ بھی وہیں سے لکھوایا، اسی دوران آپ کو رہائی میسر آئی۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ان کے حالات اور یہ تحقیق اپنے سفرنامے ''سفر در سفر'' میں تفصیل سے لکھی ہے، ہم وہاں سے یہ مکمل نقل کرتے ہیں:

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں

یہاں سے ہم اوزجند کے پرانے محلوں سے گزرتے ہوئے ایک محلے میں پہنچے جہاں شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر بتائی جاتی ہے۔ یہ قبر ایک گنجان آبادی کے درمیان واقع ہے، اور آثارِ قدیمہ کے لوگوں نے بتایا کہ اس قبر پر ایک پرانا کتبہ لگا ہوا

تھا جس پر شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے لوگ اس کو روس لے گئے تھے۔ ہم جب اس قبر کے پاس پہنچے تو شہر کی انتظامیہ کے کچھ اعلیٰ افسر ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ہمیں صاحب قبر کی اہمیت اور عظمت کا علم ہوا تو ہم نے یہاں اس قبر کے قریب ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پورا علاقہ مکانات کی گنجان آبادی سے گھرا ہوا تھا اور یہاں کے لوگ کہیں اور منتقل ہونے کو تیار نہیں تھے، لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ یہاں ایک بہت بڑے عالم کی یادگار کے طور پر ایک مسجد و مدرسہ تعمیر کرنے کا ارادہ ہے تو یہاں کے مکین اپنی جگہ مناسب قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں مجوزہ مسجد اور مدرسہ کا نقشہ بھی لگا ہوا تھا، اس نقشے سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ قبر کو بھی پختہ کر کے اس پر گنبد بنانے کا ارادہ ہے۔ میں نے انتظامیہ کے لوگوں سے کہا کہ پختہ بنانا اور اس پر گنبد تعمیر کرنا درست نہیں ہے، اور خود علامہ سرخسی رحمہ اللہ اس کو ہرگز پسند نہ کرتے، اس لئے نقشے میں یہ تبدیلی کرنی چاہئے۔ انہوں نے اس پر غور کرنے کا وعدہ تو کیا، لیکن معلوم نہیں وہ کس حد تک اس پر عمل کر پائیں گے۔

امام سرخسی رحمہ اللہ اور کنویں میں مبسوط کی تالیف

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۳۸ھ) کا پورا نام محمد بن احمد ابوبکر سرخسی ہے، وہ پانچویں صدی کے ان علماء میں سے ہیں جنہیں آیۃ من آیات اللہ کہنا چاہئے۔ اصل میں تو وہ خراسان کی ایک بستی سرخس کی طرف منسوب ہیں، لیکن شاید حصولِ علم کے لئے فرغانہ کے اس علاقے میں آئے ہوں گے۔ انہوں نے حاکمِ وقت کی مرضی کے خلاف کوئی فتویٰ دیا، یا کوئی بات بطورِ نصیحت کہی جس کی پاداش میں حاکمِ وقت خاقان نے انہیں ایک کنویں نما گڑھے میں قید کر دیا۔ وہ بات کیا تھی جس پر حاکمِ وقت نے انہیں اتنی سخت سزا دی؟ اس کی تفصیل کسی مستند ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے شرح السیر الکبیر کے مقدمے میں ایک وجہ بیان کی ہے کہ خاقان نے اپنی کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا تھا۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا تھا، مگر اس کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا اور اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ان کی رہائی کے بعد کا مستند تذکروں میں ملتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس سے اشتباہ ہو گیا ہو۔ وجہ کوئی بھی ہو حاکمِ وقت نے انہیں کسی حق کے کلمے کی پاداش میں اس سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ سالہا سال کے لئے ایک کنویں نما گڑھے میں قید کر دیئے گئے، جہاں ان کے لئے چلنا پھرنا ممکن نہیں تھا۔ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے مبسوط کی کتاب السیر کے آخر میں یہ بات لکھی ہے کہ انہیں ایک حق کے کلمے کی وجہ سے قید کیا گیا تھا، لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ (ان کی عبارت آگے آ رہی ہے)

ظاہر ہے کہ ان کے شاگردوں کو اس واقعے سے کتنا دکھ ہوا ہوگا، انہوں نے اپنے استاد کی دل بستگی کے لئے

درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے، آپ ہمیں کچھ املاء کرادیا کریں۔ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ پہلے سے چاہتے تھے کہ امام حاکم شہید رحمہ اللہ کی کتاب الکافی کی شرح لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی کنویں سے اپنی عظیم کتاب ''المبسوط'' املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار اوزجند کے ایک کنویں نما قید خانے میں اس طرح وجود میں آیا کہ تیس ضخیم جلدوں کی یہ کتاب کنویں سے بول بول کر کنویں کے منہ پر بیٹھے ہوئے شاگردوں کو لکھوائی گئی۔ کتاب کے مقدمے میں خود شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

فرأيت الصواب في تأليف شرح المختصر لا ازيد على المعنى المؤثر في بيان كل مسألة اكتفاء بما هو المعتمد في كل باب وقد انضم الى ذلك سوال بعض الخواص من اصحابي زمن حبسي حين ساعدوني لأنسي ان املي عليهم ذلك فأجبتهم اليه۔ (المبسوط، ص۵، ج۱)

''میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مختصر (حاکم) کی ایک شرح لکھوں، جس میں ہر مسئلے کے بارے میں راجح بات پر کوئی اضافہ نہ کروں اور ہر باب میں صرف وہ حکم بیان کروں جو قابل اعتماد ہو۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ میرے ساتھیوں میں سے کچھ خاص لوگوں نے میری قید کے زمانے میں مجھ سے اس کی فرمائش بھی کی اور میری انسیت کی خاطر میری یہ مدد کی کہ میں انہیں یہ شرح املا کرادیا کروں، چنانچہ میں نے ان کی اس فرمائش کو قبول کیا۔''

چنانچہ جن شاگردوں نے شرح لکھنی شروع کی، ان کا یہ جملہ کتاب کے بالکل شروع میں موجود ہے کہ:

قال الامام الاجل الزاهد شمس الائمة ابو بكر محمد بن ابي سهل السرخسي رحمہ اللہ ونور ضريحه وهو في الحبس بأوزجند املاء۔

(یعنی امام اجل شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے اوزجند میں قید ہونے کی حالت میں فرمایا)

پھر امام سرخسی رحمہ اللہ کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ کنویں سے جو املا کراتے تھے، وہ خالص اپنی یادداشت کی بنیاد پر املا کراتے تھے۔ کسی کتاب کی مدد انہیں حاصل نہیں تھی۔ اور یہ بات ظاہر بھی ہے کہ کنویں میں قید ہونے کی حالت میں دوسری کتابوں سے باقاعدہ استفادہ بظاہر ممکن نہیں تھا۔ جن حضرات نے مبسوط سے استفادہ کیا ہے، وہ اس کرامت کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں کہ اتنی تحقیقی کتاب جو بعد والوں کے لئے فقہ حنفی کا مستند ماخذ بن گئی، کس طرح تمام تر حافظے سے لکھوائی گئی ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین ہو تو اس روایت کی صحت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو متعدد تذکرہ نگاروں نے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے درس کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے کہا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے منقول ہے کہ ان کو تین سو کراسے (یعنی کاپیاں) حفظ یاد تھیں، اس پر امام سرخسی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"حفظ الشافعي زكوٰة محفوظي"

یعنی مجھے جتنا یاد ہے امام شافعی رحمہ اللہ کو اس کی زکوٰۃ یاد تھی۔

(الجواهر المضيئة للقرشي۔ ج۳،ص۸۰)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ سرخسی رحمہ اللہ کو امام شافعی رحمہ اللہ سے تقریباً چالیس گنا زیادہ باتیں یاد تھیں، اور انہوں نے جس حالت میں جس طرح لکھوائی ہے، اس کے پیش نظر یہ بات کچھ زیادہ بعید معلوم نہیں ہوتی، ایک کنویں یا گڑھے میں بند ہونے کی حالت میں اس عظیم شخصیت پر کیا گزرتی ہوگی؟ اس کا اندازہ بھی ہمارے لئے مشکل ہے اور خود انہوں نے مبسوط کی تالیف کے دوران مختلف ابواب کے آخر میں اپنی حالت کا بڑے پُردرد الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ عبادات کے مسائل چار جلدوں میں لکھوانے کے بعد کتاب المناسک (حج) کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:

هذا آخر شرح العبادات باوضح المعاني واوجز العبارات املاه المحبوس عن الجمع والجماعات، مصليا على سيد السادات، محمد المبعوث بالرسالات، وعلى اهله من المؤمنين والمؤمنات۔ تم كتاب المناسك ولله المنة وله الحمد الدائم الذي لايفنى امده ولا ينقضي عدده. (المبسوط، ج۴،ص۲۴۸)

"یہ واضح ترین مضامین اور مختصر ترین عبارت میں عبادات کی شرح کا آخری حصہ ہے، جسے ایک ایسے شخص نے املا کرایا ہے جو اس طرح قید میں ہے کہ نہ جمعہ میں حاضری دے سکتا ہے، نہ جماعت سے نماز پڑھ سکتا ہے (البتہ) سید السادات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے پیغام لے کر مبعوث ہوئے تھے ان پر اور جو مؤمن مرد اور عورتیں آپ کے اہل میں داخل ہیں، ان پر درود بھیجتے ہوئے اس حصے کو لکھوایا ہے۔ (اس طرح کہ) کتاب الحج، اللہ تعالیٰ کے احسان سے پوری ہوگئی ہے۔ بے شمار ابدی تعریفیں اسی کی ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں"۔

اس عبارت میں اس دلی حسرت کا انتہائی مؤثر اظہار ہے کہ چار ضخیم جلدوں میں نماز اور دوسری عبادتوں کے احکام ایسی حالت میں لکھوائے گئے ہیں جب خود مؤلف جماعت سے نماز پڑھنا تو کجا، جمعہ میں حاضر ہونے سے بھی محروم ہے۔ لیکن آزمائش کی حالت میں یہ عظیم خدمت انجام دینے پر اللہ تعالیٰ نے انہیں جمعہ اور جماعت کے ثواب سے بھی نہ جانے کتنا زیادہ نوازا ہوگا۔ اعلى الله تعالىٰ درجاته۔

اور پانچویں جلد میں کتاب النکاح کے ختم پر فرماتے ہیں:

هذا آخر شرح كتاب النكاح بالماثور من المعاني والآثار الصحاح املاه المنتظر

للفرج والفلاح مصليا على المبعوث بالحق بالسيوف والرماح وعلى آله واصحابه اهل التقى والصلاح الذين مهدوا قواعد الحق وسلكوا طريق النجاح۔ (ج۵،ص۵۱۲)

''نکاح کے بارے میں جو مضامین صحیح روایتوں پر مبنی ہیں، یہ ان کا آخری حصہ ہے، جسے ایک رہائی اور کامیابی کے منتظر شخص نے اس حالت میں املا کرایا ہے کہ وہ اس ذات (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجتا ہے جسے حق دے کر نیزہ وتلوار کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور ان کے آل واصحاب پر جو صلاح وتقویٰ کے حامل تھے جنہوں نے حق کی راہیں ہموار کیں اور کامیابی کے راستے پر چلے۔''

پھر ساتویں جلد میں کتاب الطلاق کے ختم پر فرماتے ہیں:

هذا آخر شرح كتاب الطلاق بالمؤثرة من المعاني ادقاق املاه المحصور عن الانطلاق المبتلى بوحشة الفراق مصليا على صاحب البراق وعلى آله واصحابه اهل الخير والسباق صلاة تتضاعف وتدوم الى يوم التلاق كتبه اعبده البرى من النفاق۔ (ج:۷،ص:۱۰۷)

''یہ کتاب الطلاق کی شرح کا آخری حصہ ہے جس میں دقیق مضامین میں سے قابل ترجیح مسائل درج کئے گئے ہیں۔ اسے ایک ایسے شخص نے لکھوایا ہے جو اس طرح قید ہے کہ چل پھر نہیں سکتا اور (عزیزوں دوستوں کی) جدائی کی وحشت میں مبتلا ہے۔ وہ صاحب براق صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل واصحاب پر جو بھلائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے، ایسا درود بھیجتا ہے، جو قیامت کے دن تک دوگنا چوگنا ہوتا رہے۔ اسے ایک ایسے بندے نے لکھا ہے جو نفاق سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔''

پھر آٹھویں جلد میں کتاب الولاء کے ختم پر فرماتے ہیں:

انتهى شرح كتاب الولاء بطريق الاملاء من الممتحن بانواع البلاء يسال من الله تعالىٰ تبديل البلاء والجلاء بالعز ولعلاء فان ذلك عليه يسير وهو على ما يشاء قدير صلى الله على سيدنا محمد وعلى آله واصحابه الطاهرين۔ (ج:۸۔ص۲۲۳)

''یہاں کتاب الولاء کی شرح اختتام کو پہنچی جو ایک ایسے شخص نے لکھوائی ہے جو کئی طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اس آزمائش اور جلاوطنی کو عزت اور سربلندی سے تبدیل فرمادے۔ کیونکہ یہ اس کے لئے بہت آسان ہے اور وہ ہر اس چیز پر قادر ہے جو اس کی مشیت کے مطابق ہو۔

وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله واصحابه الطاهرين''۔

اس کے بعد بارہویں جلد میں کتاب الجہاد والسیر کے خاتمے پر فرماتے ہیں:

انتهى شرح السير الصغير المشتمل على معنى اثير بأملاء المتكلم بالحق المنير المحصور لاجله شبه الاسير المنتظر للفرج من العالم القدير السميع البصير المصلى على البشير الشفيع لامته النذير،وعلى كل صاحب له ووزير،والله هو اللطيف الخبير.(ج:۱۲،ص:۳۵۴)

''سیر کی شرح اختتام کو پہنچی جو منقول معانی پر مشتمل ہے، اور ایسے شخص نے املاء کرائی ہے جس نے واضح حق کا کلمہ کہا تھا جس کی وجہ سے اسے قیدی کی طرح بند کر دیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے جو ہر چیز جاننے والا، ہر بات سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے، رہائی کا منتظر ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے ہر صحابی اور مددگار پر درود بھیجتا ہے جو اپنی امت کو خوشخبری دینے والے، ان کی شفاعت کرنے والے اور خبردار کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ لطف فرمانے والے، ہر چیز سے باخبر ہیں''۔

اسی طرح مبسوط کے کچھ نسخوں کی اٹھارہویں جلد میں کتاب الاقرار کے ختم پر یہ عبارت بھی موجود ہے:

"انتهى شرح كتاب الاقرار ،المشتمل من المعانى ما هو سر الاسرار ،املاه المحبوس فى موضع الاشرار ،مصليا على النبى المختار.

''کتاب الاقرار کی شرح پوری ہوئی، جو حقائق واسرار کے مضامین پر مشتمل ہے، اسے ایسے شخص نے نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہوئے املا کرایا ہے جو برے لوگوں کے مقام پر قید ہے''۔

اکثر تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری مبسوط قید ہی کی حالت میں لکھی ہے۔ البتہ چونکہ پرانے تذکرہ نگاروں نے پندرہ جلدوں کا ذکر کیا ہے اور موجود مطبوعہ نسخہ تیس جلدوں میں چھپا ہے اس لئے بعض حضرات یہ سمجھے کہ انہوں نے آدھی کتاب قید میں اور باقی آدھی رہائی کے بعد لکھی ہے، لیکن تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ کتاب کو تیس جلدوں میں تو بعد میں تقسیم کیا گیا، ابتداء میں جو مسودہ تیار ہوا تھا، وہ پندرہ جلدوں ہی میں کیا تھا اور پوری کتاب قید ہی میں لکھوائی گئی ہے۔ جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ تیسویں جلد میں کتاب الرضاع کے شروع میں یہ عبارت ہے۔

"قال الشيخ الامام الاجل الزاهد شمس الائمه فخر الاسلام ابو بكر محمد بن ابى سهل السرخسى املاء يوم الخميس الثانى عشر من جمادى الاخرة سنة سبع وسبعين واربعمائة."(المبسوط۔ ج:۳۰،ص:۲۸۷)

جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب الرضاع کا آغاز ۱۲ جمادی الآخرہ ۴۷۷ھ میں ہوا تھا۔ دوسری طرف "اصول السرخسی" کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام سرخسی رحمہ اللہ شوال ۴۷۹ھ تک قید میں تھے اور اسی وقت انہوں نے اصول السرخسی کی تالیف شروع فرمائی (عبارت آگے آرہی ہے) مبسوط کی کتاب الرضاع سے کتاب کے آخر تک کل سولہ صفحات ہیں، اور جمادی الآخرۃ ۴۷۷ھ سے شوال تک تقریباً سوا دو سال کا فاصلہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ سولہ صفحات کی تعداد چھ ہزار تین سو تینتیس ہے، اسی قید کی حالت میں لکھوائی گئی ہے جس میں دوسری کتابوں سے باقاعدہ مراجعت کا امکان نہیں تھا۔ (کہیں انتہائی ضرورت کے وقت جزوی طور پر کسی کتاب سے رجوع کیا گیا ہو تو بات اور ہے) اور موضوع بھی کوئی عام واقعات کا سیدھا سادہ موضوع نہیں تھا جس میں غور وخوض اور کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ یہ فقہ کے انتہائی دقیق اور مشکل مباحث پر مشتمل کتاب ہے اور اس کے بعد سے علماء وفقہاء اس کتاب کو صدیوں پڑھتے رہے ہیں، لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ قید کی حالت میں حافظے کی بنیاد پر کتاب لکھوانے کی وجہ سے فلاں جگہ غلطی ہوگئی ہے۔ اس کے بجائے اس کتاب کو فقہ حنفی کے مستند مآخذ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کی کوئی مثال کسی اور قانون کی کتاب یا مصنف کی زندگی میں نہیں ملتی۔

صرف یہی نہیں، امام سرخسی رحمہ اللہ کی دوسری مشہور کتاب شرح السیر الکبیر ہے جو جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے اسلامی قوانین پر مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ پانچ جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے، اور شاید اس وقت اس موضوع پر اتنی مفصل کتاب کوئی اور نہیں تھی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب بھی انہوں نے قید ہی کی حالت میں لکھوائی ہے۔ کتاب کے موجودہ نسخوں میں اس کتاب کے اندر کوئی عبارت مجھے ایسی نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ کتاب بھی قید میں لکھی گئی ہے۔ لیکن حاجی خلیفہ رحمہ اللہ نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے آخر میں امام سرخسی رحمہ اللہ نے یہ جملہ لکھا ہے:

"انتهى املاء العبد الفقير المبتلى بالهجرة الحصير المحبوس من جهة السلطان الخطير باغراء كل زنديق حقير وكان الافتتاح باوزجند في آخر ايام المحنة والتمام عند ذهاب الظلام بمرغينان في جمادى الاولى سنة ثمانين واربعمائة." (كشف الظنون۔ ۲:۱۰۱۳)

''اس کتاب کو لکھوانے کا سلسلہ اس محتاج بندے کی طرف سے مکمل ہوا جو کسی ذلیل زندیق کے کہنے پر خطرناک بادشاہ کی طرف سے جلاوطنی اور قید میں مبتلا تھا اور اس (کتاب) کا آغاز اوزجند میں آزمائش کے آخری دنوں میں ہوا تھا، اور تکمیل جمادی الاولی ۴۸۰ھ میں مرغینان میں اس وقت ہوئی جب اندھیرا چھٹ چکا تھا۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نسخے میں یہ جملہ موجود تھا جو بعد کے نسخوں میں حذف ہوگیا، لیکن اپنے اسلوب کے لحاظ سے یہ جملہ اس جملوں سے واضح مطابقت رکھتا ہے، جو مبسوط کے کئی ابواب سے اوپر نقل کئے گئے ہیں۔

پھر امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب اصولِ فقہ کے موضوع پر ہے جو "المحرر فی اصول الفقه" یا "اصول السرخسي" کے نام سے مشہور ہے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف بھی اسی قید میں ہوئی ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں یہ عبارت آج بھی موجود ہے:

"قال الامام الاجل الزاهد شمس الائمة ابو بكر محمد بن ابي سهل السرخسي املاء في يوم السبت سلخ شوال سنة تسع وسبعين واربعمائة في زاوية من حصار اوزجند.

(اصولِ السرخسي۔ طبع بیروت۔ ص۴)

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ کتاب بھی امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ سے اوزجند کے قید خانے میں شوال ۴۷۹ھ میں لکھوانی شروع کی تھی۔

ان تمام باتوں کو ملانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مبسوط تو پوری کی پوری قید میں لکھوائی گئی اور بظاہر اس کی تکمیل ۴۷۷ھ میں ہوگئی تھی۔ اس کے بعد بھی دو سال سے کچھ زیادہ مدت تک امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ قید میں رہے اور اسی حالت میں دو مزید کتابوں کی تالیف شروع فرمادی۔ ایک شرح السیر الکبیر اور دوسری اصول السرخسي۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی تالیف ساتھ ساتھ جاری تھی، پھر صاحبِ کشف الظنون نے لکھا ہے کہ جب اصول السرخسي کے باب الشروط پر پہنچے تو قید سے رہائی ملی۔

(کشف الظنون۔ ج۱، ص۱۸) اس طرح ان دونوں کتابوں کا باقی حصہ مرغینان میں جا کر مکمل فرمایا۔ جیسا کہ شرح السیر الکبیر کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے جو حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پیچھے گزر چکا ہے۔ اصول السرخسي میں باب الشروط کے نام سے کوئی باب نہیں ہے، البتہ ایک فصل "فصل الشرط" کے نام سے موجود ہے۔ شاید حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مراد وہی ہو۔ لیکن بعض حضرات نے اس سے مبسوط کی کتاب الشروط سمجھ کر جو یہ کہا ہے کہ وہاں پہنچ کر انہیں آزادی مل گئی تھی، بظاہر وہ بات درست نہیں ہے اس لئے کہ کتاب الرضاع جس کے شروع کی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے، وہ کتاب الشروط کے بہت بعد ہے اور کتاب الرضاع کا آغاز یقیناً قید میں ہوا تھا، جیسا کہ اوپر تحقیق کی گئی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عظمت تو اس وقت سے دل میں تھی جب سے بچپن میں اپنے والد ماجد قدس سرہ سے مبسوط کی تالیف کا حال سنا تھا۔لیکن آج میں ان کے اسی شہر میں کھڑا تھا جہاں انہوں نے یہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا جسے حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔آج نہ اس گڑھے یا کنویں کا کوئی نام ونشان موجود ہے، جہاں انہوں نے سالہا سال انتہائی صبر آزما وقت گزارا، نہ اس حاکم سے کوئی واقف ہے جس نے تکبر اور رعونت کے عالم میں ایسے مقدس شخص کو اتنی بربریت کے ساتھ قید کیا،لیکن سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا نام زندہ و پائندہ ہے،اور ان شاء اللہ قیامت تک اسے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہے گا اور لوگ ان کے لئے رحمت کی دعائیں کرتے رہیں گے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ وجزاہ عن الامۃ الاسلامیۃ احسن الجزاء۔

اوزجند کے شہر میں مجھے صرف چند گھنٹے ملے۔لیکن تصور کی نگاہیں یہاں علم وفضل اور عظمتِ کردار کے وہ پہاڑ دیکھتی رہی جن کی خدمات سے آج پوری علمی دنیا سیراب ہو رہی ہے۔

☆......☆......☆

(۲۰۱) علامہ طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم بن علی بن احمد بن عبدالواحد، نجم الدین، طرسوسی۔یہ (طاء اور راء کے فتحہ اور سین کے ضمہ کے ساتھ) شام کے سرحدی علاقوں میں سے طرطوس کی طرف نسبت ہے۔

یہ اپنے والد قاضی القضاۃ عماد الدین کے انتقال کے بعد ۷۴۶ھ میں دمشق کے قاضی القضاۃ بنے۔سوانح نگاروں میں سے بعض نے آپ کا نام ابراہیم لکھا ہے، جب کہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے الجواهر المضیة میں آپ کا تذکرہ باب احمد بن علی میں کیا ہے۔علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول کو اصح قرار دیا ہے۔

آپ کی تصانیف میں سے ' نفع الوسائل المعروف بفتاویٰ الطرسوسیة ، تحفة الترك فیما یجب ان یعمل فی الملك ، ذخیرة الناظر فی الاشباہ والنظائر (مخطوط) " " الفوائد البدریة (مخطوط)"، یہ فقہ کے مسائل پر مشتمل اشعار ہیں۔

"الدرة السنیة فی شرح الفوائد الفقهیة " جو ان اشعار کی شرح ہے۔الانموذج من العلوم لارباب الفهوم " یہ چوبیس علوم کی جامع کتاب ہے۔" وفیات الاعیان من مذهب ابی حنیفة النعمان" (مخطوط) بہت مشہور ہیں۔

آپ کا انتقال ۷۵۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

فائدہ: انہوں نے اپنے والد شیخ عماد الدین علی بن احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پورا قرآن مجید سرِ عام لوگوں کے سامنے تین گھنٹے اور چالیس منٹ میں ختم کر لیتے تھے بلکہ اتنی دیر میں تراویح بھی پڑھا دیتے تھے۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوائد البھیۃ میں ان کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اتنی جلد قرآن مجید مکمل کر لینا یقیناً اُن کی کرامات میں سے ایک کرامت ہے اور اس انکار صرف وہ ہی کر سکتا ہے جو خلافِ عادت کرامت کا منکر ہو اور ایسا شخص تو جمہورِ امت کے اجماع کا مخالف ہوگا۔

☆......☆......☆

(۱۷۰) ابو عصمۃ رحمۃ اللہ علیہ

نوح بن ابی مریم یزید ابو عصمۃ مروزی۔

یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور الجامع کے لقب سے معروف تھے۔

اس لقب کی کئی وجوہات لکھی گئی ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ الجامع اس لیے تھے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ جمع کی۔ چند حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ تمام علوم کے جامع تھے اس لیے الجامع کہلائے۔

بعض علماء کا خیال ہے اس لیے یہ الجامع کہلائے کہ انہوں نے تمام اکابر علماء سے علم حاصل کیا تھا۔

علم فقہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا۔ حدیث ابن ارطاۃ رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، تفسیر، کلبی سے اور مغازی، ابنِ اسحاق سے سیکھے۔ حدیث، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اور مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت فرمائی۔

ان کی چار مجالس درس ہوتی تھیں۔ ایک مجلس روایتِ آثار کیلئے۔ دوسری مجلس اقوالِ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیلئے۔ تیسری مجلس علمِ نحو کیلئے اور چوتھی مجلس شعر و ادب کیلئے تھی۔

یہ مرو کے عہدۂ قضاء پر فائز تھے۔ علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ جلیل القدر فقیہ تھے لیکن محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مجروح ہیں۔ تفصیل کیلئے الفوائد البھیۃ دیکھیں۔ آپ کا انتقال ۱۷۳ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

۵۱۸ / شیخ بدر عالم رحمہ اللہ علیہ

بدر عالَم بن الحاج تہور علی رحمہ اللہ علیہ

آپ کی پیدائش ۱۳۱۶ھ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم آپ نے محدثِ جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ علیہ کی نگرانی میں' مظاہر علوم سہارنپور میں حاصل کی۔ پھر آپ دار العلوم دیوبند آئے اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی۔

آپ نے سلوک وطریقت میں حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی رحمہ اللہ علیہ سے استفادہ کیا اور اُن کے خلیفہ حضرت مولانا محمد اسحاق میرٹھی رحمہ اللہ علیہ نے آپ کو اجازتِ طریقت سے نوازا۔

آپ نے دار العلوم دیوبند' جامعہ اسلامیہ ڈابھیل' بہاولنگر اور ٹنڈو الہ یار میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے اور ۱۳۷۲ھ میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے۔

آپ کی مؤلفات میں سے حضرت کشمیری رحمہ اللہ علیہ کے افاداتِ بخاری کا مجموعہ "فیض الباری" اور ترجمان السنّہ اور جواہر الحکم بہت مفید ہیں۔

آپ کا انتقال بروز جمعہ' ۳/رجب المرجب ۱۳۸۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(چالیس بڑے مسلمان)

☆......☆......☆

۵۱۹ / شیخ احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ علیہ

یہ محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ علیہ کے داماد تھے اور اُن کی صحبت میں سولہ برس رہے۔

ہندوستان کے شہر بجنور میں آپ کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۲۳ء میں دار العلوم دیوبند آئے اور حضرت کشمیری رحمہ اللہ علیہ کے درسِ حدیث میں شریک ہوئے۔ پھر تین سال کیلئے آپ نے کرنال یونیورسٹی میں داخلہ لیا' جہاں آپ نے انگریزی زبان سیکھی۔

بعد ازاں آپ نے ڈابھیل میں مجلسِ علمی کی ذمہ داری' حضرت کشمیری رحمہ اللہ علیہ کی نگرانی میں اٹھائی اور مختلف قیمتی علمی

خزانوں اور بالخصوص حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے رسائل منظرِ عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت کشمیری رحمہ اللہ کی چھوٹی صاحبزادی سے آپ کی شادی ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ آپ نے "انوار الباری" کے نام سے حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے افاداتِ بخاری اردو میں مرتب فرمائے اور بہت سی علمی ابحاث کا اضافہ بھی کیا۔

آپ کا انتقال رمضان ۱۴۱۸ھ (مطابق ۱۹۹۸ء) کے آخری عشرہ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(علماء دیوبند وخدماتہم فی الحدیث)

☆......☆......☆

امام انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

محمد انور بن معظم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق، بزوری، کشمیری، حنفی۔

ذہانت اور حافظے میں آپ قدرتِ الٰہی کی نادر نشانی تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۹۲ھ میں سرزمینِ کشمیر کے مشہور علاقے لولاب کے قریب "دُدوان" نامی بستی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد صاحب سے حاصل کی اور منطق وفلسفہ کی تعلیم ماہرینِ فن سے حاصل کی۔ پھر آپ عالمِ اسلام کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند پہنچے، جہاں آپ نے کتبِ حدیث پڑھیں اور بقیہ علوم کی تکمیل کی۔ وہاں سے آپ ۱۳۱۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ بعدازاں آپ نے دہلی میں رہائش رکھی اور پھر آپ اپنے وطن تشریف لے گئے جہاں مسلسل تدریسِ علوم میں مصروف رہے۔

۱۳۲۵ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ نے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں رکنے کا کہا اور صحاحِ ستہ میں سے چند کتابوں کا سبق آپ کے حوالے فرمادیا۔ حضرت کشمیری رحمہ اللہ نے حکم کی تعمیل فرمائی اور جب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ حج کیلئے تشریف لے گئے تو انہیں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اس طرح آپ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث بن گئے اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس مسلسل ۱۳۴۵ھ تک دیتے رہے۔

آپ کے مایۂ ناز شاگرد حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"آپ کی تعریف میں یہ کہنا کافی ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور محقق العصر علامہ شبیر احمد عثانی رحمہ اللہ جیسی شخصیات بلکہ وہ اکابر ومشائخ بھی کہ جن سے آپ نے علم حاصل کیا تھا، آپ کے علم سے مستغنی نہیں تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر علامہ اقبال رحمہ اللہ جیسا بڑا شخص بھی فلسفہ میں آپ کی دقیق آراء سے بے نیاز نہیں تھا"۔

آپ کی گرانقدر تصانیف میں سے التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، نیل الفرقدین فی مسألة رفع الیدین اور چار سو اشعار کا مجموعہ ضرب الخاتم علی حدوث العالم قابلِ ذکر ہیں۔ صحیح بخاری پر آپ کی درسی تقریر، عربی میں فیض الباری کے نام سے اور جامع ترمذی پر "العرف الشذی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتابیں آپ کے افادات کی محض چند جھلکیاں ہیں۔

آپ کا انتقال، دیو بند میں ۱۳۵۳ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(مقدمة فیض الباری۔ نفحة العنبر)

☆......☆......☆

(۱۴۱) عصام بن یوسف رحمۃ اللہ علیہ

عصام بن یوسف بن میمون بن قدامہ، ابو عصمۃ، بلخی، حنفی۔

یہ بڑے محدّث تھے۔ یہ خود اور ان کے دوسرے بھائی ابراہیم بن یوسف اپنے زمانے میں بلخ کے مشائخ میں سے شمار ہوتے تھے۔

آپ کا سنہٴ وفات علامہ قرشی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۱۰ھ اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۱۵ھ تحریر فرمایا ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(تاریخ الاسلام۔ الجواھر المضیئة)

☆......☆......☆

(۱۴۲) ابن رُستم رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم بن رُستم، ابو بکر، مروزی۔

مشہور فقہاء میں سے ہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ حدیث کے ثقہ راویوں میں سے آپ کا شمار ہوتا ہے۔ بغداد ایک سے زائد مرتبہ تشریف لائے اور وہاں حدیث پاک کا درس دیا۔ آپ سے حدیث حاصل کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور ابو خیثمہ زہیر بن حرب رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔

آپ کا انتقال ۲۱۱ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الجواھر المضیئۃ)

☆......☆......☆

([illegible]) محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ

ابوعبداللہ، بلخی۔ پیدائش ۱۹۲ھ میں ہوئی اور علمِ فقہ شداد بن حکیم اور ابوسلیمان جوزجانی سے حاصل کیا۔

آپ کا انتقال ۲۷۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

([illegible]) محمد بن مقاتل رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن مقاتل، رازی۔ رَی کے قاضی تھے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے سلیمان بن شعیب اور علی بن معبد کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابوالمطیع سے روایت کرتے ہیں۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق آپ وکیع اور اُن کے طبقے والوں سے روایت کرتے ہیں۔

ان کا انتقال ۲۴۷ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال۔ الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

([illegible]) نصیر بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ

انہوں نے علم فقہ ابوسلیمان جوزجانی سے حاصل کیا، جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۲۶۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۱۲۶) الناطفی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن محمد بن عمرو (علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے قاری رحمۃ اللہ علیہ سے عمر نام نقل کیا ہے) ابو العباس، ناطفی، طبری۔ عراق کے بڑے فقہاء میں سے تھے۔

ان کی تصانیف میں سے الاجناس، الفروق، الواقعات اور جمل الاحکام ہیں۔

یہ ابو عبداللہ جرجانی کے شاگرد تھے اور وہ ابو بکر الجصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔

ناطفی، ان کی نسبت ایک خاص قسم کی مٹھائی بنانے یا اُس کی تجارت کی وجہ سے تھی۔

آپ کا انتقال رَی میں ۴۴۶ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البهية، الجواهر المضيئة، الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۲۷) رضی الدین سرخسی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن محمد بن محمد رضی الدین، برہان الاسلام، السرخسی۔

یہ المحیط کے مصنف ہیں۔ المحیط کی کل تعداد کتنی ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ان کی چار تصانیف اس نام سے تھیں۔ دیگر کا خیال ہے کہ تین المحیط تو ان کی ہیں اور چوتھی المحیط جو چالیس جلدوں میں ہے، وہ امام برہان الدین ابن مازہ کی تصنیف ہے، جس کا نام المحیط البرهانی ہے۔ بعض کا کہنا یہ بھی ہے کہ چار تو ان رضی الدین سرخسی کی ہیں اور پانچویں برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

رضی الدین سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے علم صدرِ شہید حسام الدین عمر سے حاصل کیا۔

الجواهر المضيه میں آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ حلب آئے اور تدریس کا آغاز کیا تو آپ کی

زبان میں لکنت تھی، جس کی بناء پر بعض فقہاء نے آپ کے خلاف تعصب برتا اور آپ کے خلاف نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کو خطوط لکھے کہ یہ الفاظ بولنے میں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ مثلاً جبایو کو خبایز کہتے ہیں۔ اس بناء پر آپ کو تدریس سے معزول کردیا گیا۔ تب آپ دمشق تشریف لے گئے۔ ٹھیک اسی زمانے میں علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب بدائع الصنائع قاصد بن کر حلب آئے، جہاں نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اُنہیں مدرسہ حلاویہ میں ایک تحریر دی۔ علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سفارت کا کام مکمل کیا اور پھر واپس آکر اسی مدرسہ میں تدریس کا آغاز کیا۔ رضی الدین سرخسی رحمۃ اللہ علیہ دمشق کے مدرسہ خاتونیہ میں مدرس ہو گئے۔ جب وہ سخت بیمار ہوئے تو اُنہوں نے المحیط کی جلدیں پھاڑیں، جن میں سے چھ سو دینار نکلے۔ انہوں نے ان کے بارے میں وصیت کی کہ یہ تمام اسی مدرسہ کے فقہاء میں تقسیم کردیے جائیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الجواھر المضیئۃ)

☆......☆......☆

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ

شہاب الدین ابوالعباس، احمد بن محمد بن محمد بن علی بن حجر، ہیتمی، سعدی، انصاری، شافعی۔

کہا گیا ہے کہ ابنِ حجر، ان کے آباؤ اجداد میں سے کسی کی طرف نسبت ہے۔ جو بہت خاموش مزاج تھے جس کی وجہ سے اُنہیں پتھر کے مشابہ قرار دے دیا گیا۔

آپ کی پیدائش مغربی مصر کے علاقے محلہ ابی الہیتم میں رجب المرجب ۹۰۹ھ کو ہوئی۔ آپ کی پرورش حالت یتیمی میں بعض مشائخ کی سرپرستی میں ہوئی۔

آپ ازہر میں طلب علم میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ تفسیر، حدیث، کلام اور فقہ میں خوب مہارت حاصل کرلی۔

ابھی آپ کی عمر بیس برس بھی نہ تھی کہ آپ کو تدریس اور فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی۔

آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً "تحفة المحتاج شرح منهاج النووی" "الخیرات الحسان فی مناقب ابی حنیفة النعمان" "الفتاویٰ الهیتمیة" (چار جلدیں) شاید یہ فتاویٰ ان کے فتاوی حدیثیه اور فتاویٰ الفقهیة الکبریٰ کا مجموعہ تھے۔ ہمارے زمانے میں ان کے یہی دونوں فتاویٰ مشہور ہیں۔

آپ مکہ مکرمہ منتقل ہو گئے اور وہیں ۹۷۳ھ یا ۹۷۴ھ میں انتقال ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(شذرات الذہب۔الأعلام)

☆......☆......☆

قاضی ابو المحاسن رویانی شہید رحمۃ اللہ علیہ

عبدالواحد بن اسماعیل بن احمد بن محمد' ابوالمحاسن' رویانی۔ یہ رویان نامی شہر کی طرف نسبت ہے جو طبرستان کے علاقے میں واقع ہے۔ فخر الاسلام' شافعی۔

آپ کی پیدائش ۴۱۵ھ کے آخر میں ہوئی اور ایک عرصہ تک آپ نے بخارا میں علم فقہ حاصل کیا۔ پھر طلبِ حدیث وفقہ میں مسلسل سفر کیے اور خوب مہارت حاصل کی۔

آپ فرمایا کرتے تھے:

''اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں نذرِ آتش کردی جائیں تو میں اپنی یادداشت سے اُنہیں لکھوا سکتا ہوں''۔

آپ سے کئی آئمہ مثلاً اسماعیل بن محمد تیمی اور ابوطاہر سِلَفی نے علم حاصل کیا۔

آپ کی تصانیف میں سے "البحر" ہے' جو مذہبِ شافعی کی ضخیم کتب میں سے ہے۔ اسی طرح مناصیص الشافعي، حلية المؤمن اور الكافي بھی قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کو اسماعیلی گروہ نے بروز جمعہ' محرم ۵۰۱ھ میں مجلس املاء ودرس کے بعد شہید کردیا تھا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

ابوبکر القفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ

ابوبکر' عبداللہ بن احمد بن عبداللہ' مروزی' خراسانی' قفال، شافعی۔

پہلے پہل آپ نے تالہ سازی میں ایسی مہارت حاصل کی کہ آپ نے ایک تالہ بنایا جس کا وزن چابی سمیت صرف ۴/۱ حبہ تھا۔ پھر آپ تیس سال کی عمر تک مسلسل علم وفقہ حاصل کرنے میں مصروف رہے۔

آپ فقہ شافعی میں خراسانی طرزِ فکر کے نمائندے ہیں، جب کہ امام ابو حامد اسفرائینی عراقی طرزِ فکر پر تھے۔ انہی دونوں حضرات سے مذہب شافعی کی اشاعت ہوئی۔

قاضی حسین اپنے اُستاذ قفال رحمہ اللہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سبق کے دوران کئی مرتبہ آپ پر رقت اور گریہ طاری ہو جاتا اور آپ فرماتے: ''ہمارے ساتھ جو پیش آنے والا ہے، ہم اُس سے کتنے غافل ہیں''۔

آپ کا انتقال نوے برس کی عمر میں ۴۱۷ھ کو ہوا۔

فائدہ: یہ قفال جو مروزی ہیں، القفال الصغیر کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسرے امام ابو بکر قفال شاشی رحمہ اللہ (المتوفی ۳۶۵ھ)، وہ القفال الکبیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں شافعی المذہب ہیں۔ قفال شاشی کا مکمل نام محمد بن علی بن اسماعیل ہے۔

رحمهما الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(سیر اعلام النبلاء۔ تهذیب الأسماء واللغات)

(۱۳۱) ابن امیر حاج رحمہ اللہ

محمد بن محمد بن محمد بن حسن بن علی، حلبی، حنفی، ابنِ امیر حاج، ابن مؤقت۔

آپ کی پیدائش ۸۲۵ھ کو حلب میں ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ حصول علم میں ہمہ تن مصروف رہے اور صاحبِ فتح القدیر ابنِ ہمام رحمہ اللہ سے علم فقہ حاصل کیا۔

اپنے اُستاذ ابنِ ہمام رحمہ اللہ کی کتاب التحریر کی شرح تین جلدوں میں التقریر والتحبیر کے نام سے لکھی، جو اصولِ فقہ میں ہے۔ اسی طرح ذخیرة القصر فی تفسیر سورة والعصر اور "حلبة المجلی شرح منیة المصلی" بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے ان کی ابحاث اور فوائد سنے ہیں اور انہوں نے مجھ سے القول البدیع کے کچھ حصہ کی سماعت کی اور اسے مجھ سے روایت کیا ہے''۔

آپ کا انتقال شبِ جمعہ، رجب ۸۷۹ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الضوء اللامع۔ الأعلام)

(۱۳۲) امام سغدی رحمۃ اللہ علیہ

علی بن حسین، رکن الاسلام، ابوالحسن، سُغدی۔

یہ سمرقند کے مضافات میں ایک بستی سُغد کی طرف نسبت ہے۔ یہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور اُن سے شرح السیر الکبیر روایت کی ہے۔ ان کی ایک کتاب "النتف فی الفتاوی" ہے۔

آپ بخارا میں رہائش پذیر رہے اور وہیں افتاء و قضاء کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اپنے زمانے کے بڑے فقہاء میں سے تھے اور نئے پیش آنے والے مسائل میں آپ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ آپ کا تذکرہ فتاویٰ قاضی خان اور دیگر مشہور کتبِ فتاویٰ میں کئی جگہ ملتا ہے۔

آپ کا انتقال ۴۶۱ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۱۳۳) ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ

عبداللطیف بن عبدالعزیز بن امین الدین بن فرشتا، کرمانی، ابن مَلَک، ملک عربی میں فرشتے کو کہتے ہیں اور ان کے جدامجد کا نام چونکہ فرشتا تھا، اس لیے ابن مَلَک کہلائے۔

یہ ترکی کے علاقے ازمیر کے قریب تیرہ میں رہائش پذیر تھے اور وہیں مدرس تھے۔ یہ سلطان مراد کے دور میں امیر محمد بن آیدین کے معلم بھی رہے۔

ان کی بہت مفید اور متنوع تصانیف ہیں، جن میں سے سرِ فہرست "مبارق الازهار شرح مشارق الانوار" ہے۔ یہ کتاب علومِ حدیث پر بہترین اور عمدہ تصنیف ہے۔ اصول فقہ میں علامہ نسفی کے متن "المنار" کی آپ نے شرح بھی لکھی ہے۔ اسی طرح ابنِ الساعاتی کی فقہ پر کتاب مجمع البحرین کی شرح بھی تحریر کی۔ آپ نے شرح وقایہ کی شرح بھی لکھی تھی لیکن اُس کا تبییض شدہ نسخہ چوری ہو گیا۔ بعد میں آپ کے صاحبزادے محمد نے مسودہ سے اُسے دوبارہ لکھ کر اُس پر مزید اضافے بھی کیے۔

علامہ زرکلی رحمہ اللہ نے آپ کی طرف "تحفة الملوك" کی شرح بھی منسوب کی ہے لیکن دکتور عبدالمجید درویش، جو اس کتاب کے محقق ہیں، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ شرح ان کے صاحبزادے محمد بن عبداللطیف کی تحریر کردہ ہے اور اسے ابن الملک کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔

ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، زرکلی نے ۸۰۱ھ کو ترجیح دی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(الفوائد البهية۔ هدية العارفين۔ الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۳۴) خیر الدین رملی رحمہ اللہ

خیر الدین بن احمد بن علی، ایوبی، علیمی، فاروقی، رملی۔

آپ کی پیدائش آغاز رمضان المبارک میں فلسطین کے علاقے رملہ میں ہوئی۔ آپ حنفی فقیہ، مفسر، محدث، لغوی اور بڑے علماء میں سے تھے۔

آپ نے مصر کے جامعہ ازہر میں تعلیم پائی اور پھر اپنے شہر واپس آ کر تعلیم، افتاء اور تدریس میں مشغول رہے جہاں نامور علماء نے آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کی تصانیف میں سے "الفتاوى الخيرية لنفع البرية" "مظهر الحقائق الخفية من البحر الرائق" اور "الأشباه والنظائر پر حاشیہ" معروف ہیں۔

آپ کی وفات ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(الأعلام۔ معجم المؤلفين)

☆......☆......☆

(۱۳۵) امام شاطبی رحمہ اللہ

ابراہیم بن موسیٰ بن محمد لخمی، غرناطی، أبو اسحاق، شاطبی، مالکی۔

اپنے زمانے میں اندلس کے مجددین میں سے ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ بلند پایہ محققین میں سے تھے۔

آپ کی کتابوں میں سے ایک "الموافقات" ہے جو شہرۂ آفاق حیثیت کی حامل، مقاصد شریعت پر لاجواب تصنیف ہے، دوسری کتاب "الاعتصام" ہے جس میں آپ نے اپنے زمانے میں پھیلی ہوئی تمام بدعات کی تردید واضح انداز میں کی ہے۔

آپ کا انتقال ۷۹۰ھ میں ہوا۔

فائدہ: یہ امام ابواسحاق شاطبی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ علم قرأت کے عظیم عالم، قصیدہ شاطبیہ کے مصنف امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ ان سے دوصدی پہلے کے ہیں اور ان کا مکمل نام ابومحمد قاسم بن فیرہ شاطبی الضریر رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

ان کا انتقال قاھرہ میں ۵۹۰ھ کو ہوا۔

رحمهما الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الموافقات اور الاعتصام کا مقدمة التحقیق۔ کشف الظنون)

☆......☆......☆

(۱۳۶) ابن ابی العوام رحمۃ اللہ علیہ

ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن احمد بن یحییٰ بن حارث بن ابی العوام، سعدی۔

مصر کے قاضی تھے، امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوبشر دولابی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں۔ کئی سوانح نگاروں نے آپ کے پوتے ابوالعباس احمد بن محمد بن عبداللہ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور کتاب فضائل ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی طرف منسوب کیا ہے لیکن علامہ لطیف الرحمٰن بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ نے اصل صورت حال واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل کتاب تو ابوالقاسم یعنی ابوالعباس کے دادا کی ہے اور پوتے ابوالعباس نے دادا سے اس کی روایت اپنے والد ابوعبد اللہ محمد بن عبداللہ کے واسطے سے کی ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے موطا اور کتاب الآثار میں کچھ اضافہ کیے ہیں، اسی طرح انہوں نے بھی اپنے دادا کی کتاب میں مفید اضافے شامل کیے ہیں۔

ان کا انتقال ۳۳۵ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(مقدمة المحقق لکتاب فضائل ابی حنیفة واخبارہ ومناقبه)

(۳۷) کردری رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن محمد بن شہاب الدین بن یوسف کردری، بریقینی، خوارزمی، بزازی۔

ان کا تعلق کردر سے تھا، جو خوارزم کی طرف ایک علاقہ ہے۔ آپ القرم اور بلغار کے علاقے میں منتقل ہو گئے، جہاں سے حج کیا اور شہرت پائی۔ آپ تیمور لنگ بادشاہ کی تکفیر کیا کرتے تھے۔

آپ کی کتابوں میں سے "الجامع الوجیز" ہے جو "الفتاویٰ البزازیة" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح "المناقب الکردریة فی سیرۃ الامام ابی حنیفة" "مختصر فی بیان تعریفات الاحکام اور آداب القضاء بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

آپ کا انتقال ۸۲۷ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۳۸) علامہ بیری رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم بن حسین بن احمد بن محمد بن احمد بن بیری۔

یہ ان کے وطن بیرہ کی طرف نسبت ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کے مفتی تھے ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ۱۰۲۰ھ میں ہوئی۔

خلاصة الأثر میں ۱۰۲۰ھ سے چند سال بعد ولادت لکھی ہے۔

آپ کا انتقال مکہ مکرمہ میں ۱۰۹۹ھ میں ہوا، اور قبرستان المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(خلاصة الأثر)

☆......☆......☆

(۱۳۹) ابن نجیم رحمہ اللہ (صغیر)

عمر بن ابراہیم بن محمد، سراج الدین، ابن نجیم، حنفی، مصری۔

انہوں نے علم اپنے بھائی زین الدین ابن نجیم صاحب البحر الرائق سے حاصل کیا۔

کنز الدقائق کی شرح النھر الفائق انہی کے قلم سے ہے، جس میں انہوں نے اپنے بھائی کی شرح پر چند اعتراضات بھی کیے ہیں۔

ان کا انتقال ۶ ربیع الاول ۱۰۰۵ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(خلاصۃ الأثر)

☆......☆......☆

(۱۴۰) ابن وھبان رحمہ اللہ

عبد الوہاب بن احمد بن وہبان، امین الدولۃ، ابو محمد، دمشقی۔

آپ کی پیدائش ۷۳۰ھ سے پہلے ہوئی۔ آپ رحمہ اللہ نے علم فقہ فخر الدین احمد بن علی بن فصیح اور دیگر علماء شام سے حاصل کیا۔ حماۃ میں عہدۂ قضاء پر فائز رہے۔

آپ نے فقہ کے نادر مسائل پر ہزار اشعار کی ایک نظم کہی، جس کا نام قید الشرائد ہے اور یہ منظومہ ابن وھبان کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "عقد القلائد شرح قید الشرائد" "أحاسن الاخبار فی محاسن سبعۃ الاخیار" قراء سبعہ کے بارے میں "المتثال الامر فی قرأۃ ابی عمرو" جو ۱۲۷ اشعار پر مشتمل نظم ہے، اسی طرح علامہ محمد بن یوسف قونوی رحمہ اللہ کی درر البحار کی ایک شرح بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔

آپ کا انتقال علامہ قونوی رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی ۷۶۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الأعلام۔ الفوائد البھیۃ)

☆......☆......☆

([illegible]) علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن علی بن محمد حصنی ،علاء الدین، حصکفی ۔

یہ حصن کیفا کی طرف نسبت ہے جو دیار بکر میں آمد اور جزیرہ ابن عمر کے درمیان دجلہ کے کنارے ایک عظیم شہر اور قلعہ ہے۔

الدر المختار جو فقہ حنفی کی معروف کتاب ہے آپ کی ہی تصنیف ہے۔علماء نے اس کتاب کی بکثرت شروح وحواشی لکھے ہیں۔

یہ دمشق میں حنفیہ کے مفتی تھے۔ان کی پیدائش بھی دمشق میں ۱۰۲۵ھ میں ہوئی۔

آپ کی کتابوں میں "افاضۃ الأنوار علی اصول المنار" "الدر المنتقی شرح ملتقی الأبحر" "شرح قطر الندی فی النحو" بھی شامل ہیں۔

آپ کا انتقال دمشق میں ۱۰۸۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الأعلام ۔معجم البلدان)

☆......☆......☆

([illegible]) شیخ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

عبد العزیز بن احمد (امام شاہ ولی اللہ دہلوی)۔

آپ کی پیدائش ۲۵ رمضان المبارک ۱۰۵۹ھ میں ہوئی۔ابتداءً قرآن مجید حفظ کیا اور پھر اپنے والد صاحب سمیت دیگر مشائخ سے علم حاصل کیا۔پھر پندرہ برس تک تدریس وافادۂ خلق میں مصروف رہے۔صرف پچیس برس کی عمر تھی کہ آپ کو جذام، برص اور نابینا پن جیسی تکلیف دہ بیماریوں نے آگھیرا۔اس کے باوجود بھی آپ ہمیشہ افتاء اور وعظ و نصیحت میں مصروف رہے۔

آپ کی کتابوں میں سے ایک تفسیر عزیزی ہے، جس کا نام فتح العزیز ہے۔شدید بیماری میں آپ نے اسے املاء کروایا تھا۔یہ کئی ضخیم جلدوں میں تھی لیکن افسوس کہ پہلی اور آخری جلد کے علاوہ انقلابِ ہند میں باقی تمام تفسیر ضائع ہوگئی۔

تحفۂ اثنا عشریہ' جو اپنے موضوع پر لاجواب کتاب ہے' یہ بھی آپ کی تصنیف ہے۔ محدثین کرام کے حالات پر بستان المحدثین بھی آپ نے تحریر فرمائی۔

آپ کا انتقال اسی برس کی عمر میں ۱۲۳۹ھ کو ہوا۔ آپ کی قبر دہلی میں اپنے والد صاحب کی قبر کے ساتھ ہے۔

رحمهما الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(نزهة الخواطر)

☆......☆......☆

(۱۴۳) قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ

ابوالفداء' زین الدین حنفی۔

آپ کے والد بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ آپ نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا۔ کچھ کتابیں عزالدین بن جماعۃ سے پڑھیں۔ سلائی کے فن میں مہارت پیدا کی اور اسی سے روزی کماتے تھے۔

پھر حافظ ابن حجر' عزالدین بن عبدالسلام بغدادی اور عبداللطیف کرمانی جیسی ہستیوں سے علم حاصل کیا۔ علامہ ابنِ ہمام صاحبِ فتح القدیر سے بھی بہت سے علوم حاصل کیے۔ آپ کے شاگردوں میں علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں' جنہوں نے آپ کے مفصل حالات الضوء اللامع میں لکھے ہیں۔

سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تصانیف میں سے شرح المجمع' شرح مختصر المنار' شرح المصابیح اور شرح درر البحار کا ذکر کیا ہے۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے آپ کی تصانیف میں سے آپ کے فتاویٰ' شرح مختصر المنار اور کئی رسائل کا مطالعہ کیا ہے' یہ سب ہی فن فقہ اور حدیث میں آپ کی مہارت پر گواہ ہیں''۔

آپ کی مشہور تصانیف میں سے "الترجیح والتصحیح علی مختصر القدوری" اور "تاج التراجم فی طبقات الحنفیة" بھی ہیں۔

آپ کا انتقال ۸۷۹ھ میں ہوا۔

رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(الضوء اللامع۔ کشف الظنون۔ التعلیقات السنیة علی الفوائد البهیة۔ الاعلام)

(۱۴۴) مُلا خسرو رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن فرامرز بن علی (جو مُلّا یا مُنْلا یا مولیٰ خسرو کے نام سے معروف ہیں)۔

نسلاً رومی تھے۔ آپ کے والد صاحب نے اسلام قبول کیا تھا اور آپ کی پرورش حالت اسلام میں ہی ہوئی۔

آپ نے علم، علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد برہان الدین حیدر ھروی سے حاصل کیا۔ سلطان محمد بن مراد کے زمانے میں بروسہ شہر میں مدرس رہے۔ قسطنطنیہ کے عہدۂ قضاء پر بھی فائز رہے اور شاہی مفتی بھی رہے۔ قسطنطنیہ میں کئی مساجد آباد کیں۔

آپ کی کتابوں میں "درر الحکام فی شرح غرر الاحکام" (یہ فقہ حنفی میں ہے) بلاغت کی کتاب المطول پر حاشیہ، اصول فقہ کی کتاب "التلویح" پر حاشیہ اور تفسیر بیضاوی کے ایک حصے پر حاشیہ قابل ذکر ہیں۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(الفوائد البھیۃ۔ الاعلام)

☆......☆......☆

(۱۴۵) علامہ تُمرتاشی غزی رحمۃ اللہ علیہ

شمس الدین، محمد بن عبد اللہ بن احمد، خطیب عمری تمرتاشی۔

تمرتاش، خوارزم کے قریب ایک بستی کا نام ہے۔ آپ اہلِ غزہ میں سے تھے۔

آپ کی ولادت ۹۳۹ھ اور وفات ۱۰۰۴ھ میں ہے۔

آپ نے اپنے شہر میں مختلف علوم محمد بن مشرقی غزی مفتی شافعیہ سے حاصل کیے اور پھر قاہرہ چار مرتبہ تشریف لائے، جن میں سے آخری سفر ۹۹۸ھ میں ہوا۔ قاہرہ میں آپ نے علامہ زین الدین علیہ السلام بن نجیم صاحب البحر الرائق اور دیگر علماء سے استفادہ کیا اور پھر اپنے شہر واپس تشریف لے گئے۔

آپ کی تصانیف میں سے الدر المختار کا متن "تنویر الابصار" منح الغفار شرح تنویر الابصار" "لوصول الی قواعد الاصول" "معین المفتی علی جواب المستفتی" "الفتاویٰ" اور علم نحو میں علامہ جرجانی کی العوامل کی ایک شرح بھی ہے۔

آپ کی وفات اواخر رجب ۱۰۰۴ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃً

(الاعلام۔ خلاصۃ الاثر باعیان القرن الحادی عشر)

☆......☆......☆

فخر الآئمہ مطرزی بخاری رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن علی بن سعید ابو بکر مطرزی بخاری، جو فخر الآئمہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ چھٹی صدی کے علماء میں سے تھے اور یہ شرف الدین عمر بن محمد بن عمر عقیلی (التوفی ۵۷۶ھ) کے استاذ ہیں۔

حنفیہ میں سے جن کا لقب فخر الآئمہ ہوا، اُن میں سے ایک البحر المحیط، جس کا نام منیۃ الفقہاء بھی ہے، کے مؤلف بدیع بن منصور حنفی ہیں۔

ھدیۃ العارفین میں ہے: ''بدیع الدین فخر الآئمہ حنفی جو سیواس میں مقیم تھے، التوفی ۶۹۴ھ نے البحر المحیط لکھی، جس کا نام منیۃ الفقہاء بھی ہے۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''شمس الدین محمد بن علی داودی مالکی، جو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، انہوں نے ان کا تذکرہ طبقات المفسرین میں کیا ہے اور ان کا نام احمد بن ابو بکر بن عبدالوہاب ابو عبداللہ بدیع الدین قزوینی حنفی لکھا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ سیواس میں ۶۲۰ھ میں اقامت پذیر تھے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(التعلیقات السنیۃ علی الفوائد البھیۃ فی الحاشیۃ)

☆......☆......☆

علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن ابی علاء ادریس بن عبدالرحمن، قرافی، مصری، مالکی، ابو العباس، شہاب الدین۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو مجتہدین میں سے شمار کیا ہے، اگرچہ یہ امام مالک کے مذہب کی طرف منسوب کر کے

مالکی کہلائے۔

قرافی، قرافہ کی طرف نسبت ہے، جہاں امام قرافی مصر میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ آپ کی ولادت ٦٢٦ھ میں ہوئی۔ آپ نے علم اپنے زمانے کے نامور علماء مثلاً عز الدین بن عبد السلام رحمہ اللہ اور کافیہ وشافیہ کے مصنف ابنِ حاجب رحمہ اللہ سے حاصل کیا۔

آپ کی انتہائی مفید کتابیں یہ ہیں: "الاحکام فی تمییز الفتاویٰ عن الاحکام" "انوار البروق فی انواع الفروق" اور "الذخیرۃ" جو فقہ مالکیہ میں ہے۔

آپ کا انتقال ٦٨٤ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(مقدمۃ التحقیق للفروق، لفضیلۃ الشیخ عمر حسن القیام)

☆......☆......☆

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ

عبد الفتاح بن محمد بن بشیر بن حسن ابو غدہ، خالدی، مخزومی، حلبی، حنفی۔

آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کی پیدائش شمالی شام کے شہر حلب میں ١٣٣٦ھ میں ہوئی۔

• ابتدائی تعلیم آپ نے حلب میں حاصل کی۔ پھر مصر آ کر جامعۃ الازہر کے کلیۃ الشریعۃ میں داخلہ لیا اور وہاں سے عالمیہ کی سند ١٣٦٨ھ میں حاصل کی۔ پھر آپ نے تخصص فی اصول التدریس کی تعلیم حاصل کی اور ١٣٧٠ھ میں اس کی سند بھی حاصل کر لی۔

آپ نے صرف علماءِ ازہر سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ علامہ محمد زاہد الکوثری جیسے اکابر اہلِ علم سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نہ صرف علمی ذوق سے آراستہ تھے بلکہ ساتھ ہی ورع وتقویٰ اور عبادت سے بھی متصف تھے۔ علماءِ ہند و پاک سے آپ کے خصوصی مراسم تھے (حضرت شیخ الاسلام مدظلہم کی "تکملۃ فتح الملہم" پر آپ کی تقاریظ آپ کے قلبی تعلق کی ترجمان ہیں)۔

آپ کی تالیفات ساٹھ سے اوپر ہیں اور اسلاف کی کتابوں پر آپ کی تعلیقات بھی انتہائی تحقیقی شان کی ہیں۔

علامہ عبدالحئی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" اعلاء السنن کے مقدمہ "قواعد فی علوم الحدیث اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" پر آپ کی تحقیقات اس کی شاہد عدل ہیں۔

آپ کی کتابوں میں سے "صفحات من صبر العلماء" اور "العلماء العزاب الذین آثروا العلم علی الزواج" بہت ہی مقبول ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۴۱۷ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

("امداد الفتاح" ثبت العلامة عبد الفتاح ابو غدّة)

☆......☆......☆

(۱۴۹) علامہ ابن ملا فروخ رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن عبید العظیم۔ آپ اہلِ مکہ میں سے تھے اور وہیں مفتی تھے۔

آپ اپنی کتاب "القول السدید فی بعض مسائل الاجتهاد والتقلید" کی کتابت سے ۱۰۵۲ھ میں فارغ ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۵۰) مفتی ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن محمد بن مصطفیٰ عمادی۔ اپنے زمانے میں حنفیہ کے اکابر علماء میں سے تھے۔

آپ کی پیدائش ۸۹۶ھ میں ہوئی۔ ایک قول ۹۰۴ھ کا بھی ہے۔

خلافتِ عثمانیہ کے مختلف علاقوں میں آپ قاضی اور مدرّس رہے۔ قسطنطنیہ میں تیس برس سے زیادہ افتاء کے عہدے پر فائز رہے۔

آپ بہت حاضر دماغ تھے، چنانچہ ایک دن میں بسا اوقات عربی، فارسی اور ترکی کے ایک ہزار سوالات کے

جوابات تحریر فرمالیتے۔

"تفسیر ابی السعود" آپ کی تصنیف ہے' جس کا اصل نام "ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم"۔

آپ کا انتقال ۹۸۲ھ میں ہوا اور صحابیٔ جلیل حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کے قریب مدفون ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الفوائد البھیۃ۔ الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۵۱) ابن الشحنۃ الکبیر رحمۃ اللہ علیہ

محمد بن محمد بن محمود' ابوالولید' محب الدین' ابن الشحنۃ الکبیر' حلبی۔

آپ ابوالفضل محمد ابن الشحنۃ الصغیر کے والد تھے۔ آلِ شحنہ کی نسبت اُن کے دادا محمود کی طرف ہے' جو اپنے زمانے میں حلب کے "شحنۃ" (یعنی رئیس الشرطۃ' پولیس کے افسرِ اعلیٰ) تھے۔

آپ حنفی فقیہ تھے اور آپ کو ادب اور تاریخ سے بہت اشتغال تھا۔ آپ علماءِ حلب میں سے تھے اور کئی مرتبہ وہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔

آپ کی کتابوں میں سے "روض المناظر فی علم الاوائل والاواخر" جس میں اُنہوں نے تاریخ ابی الفداء کا اختصار کیا ہے اور ۸۰۶ھ تک کے حالات کا اضافہ کیا ہے' نیز سیرتِ نبوی پر ایک نظم اور اُس کی شرح اور ہدایہ کی شرح "نہایۃ النہایۃ" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال ۸۱۵ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

☆......☆......☆

(۱۵۲) علامہ ابن قاضی سماوۃ رحمۃ اللہ علیہ

محمود بن اسرائیل بن عبدالعزیز' ابن قاضی سماوۃ' بعض نے سماونۃ پڑھا ہے۔

آپ کی ولادت روم کے علاقے قلعہ سماوۃ میں ہوئی' جہاں آپ کے والد قاضی تھے۔

بچپن میں آپ نے اپنے والد سے علم حاصل کیا اور قرآن مجید بھی حفظ کیا۔ آپ نے بعض علوم قونیہ میں پڑھے اور پھر مصر آ گئے' جہاں علوم میں مہارت حاصل کی۔

آپ کی کتابوں میں سے ایک "جامع الفصولین" ہے۔ جس میں آپ نے فصول العمادی اور فصول الاستروشنی کو جمع کر دیا ہے۔ نیز فقہ میں "لطائف الاشارات اور اس کی تسہیل' تصوف میں" مسرۃ القلوب"، علم صرف میں "عنقود الجواھر شرح المقصود" بھی قابل ذکر ہیں۔

آپ کی وفات تقریباً ۸۱۸ھ میں ہوئی۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(التعلیقات السنیۃ علی الفوائد البھیۃ۔ الشقائق النعمانیۃ۔ الاعلام)

☆......☆......☆

(۱۵۳) علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ

ابو بکر بن مسعود بن احمد' علاء الدین' ملک العلماء، کاسانی، یہ دریائے سیحون کے پار ترکستان کے ایک بڑے شہر کی طرف نسبت ہے۔

آپ نے علم فقہ علامہ محمد بن احمد سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا' جو تحفۃ الفقھاء کے مصنف تھے اور آپ نے اسی کتاب کی شرح بدائع الصنائع کے نام سے لکھی' جو شہرۂ آفاق اور مقبول عام ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ نے یہ شرح' مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو دے دیا اور اسی شرح کو اُن کا مہر مقرر کیا۔ اسی سے یہ جملہ مشہور ہو گیا" شرح تحفتہ و تزوّج بنتہ"۔

آپ کو سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے تدریس کیلئے حلب کے مدرسہ حلاویہ بھیجا تھا۔

آپ کا انتقال ۱۰؍رجب ۵۸۷ھ میں ہوا اور آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا کی قبر کے پاس ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ان دونوں کی قبور کے پاس مانگی ہوئی دعا، اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔

رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الجواھر المضیۃ۔ الفوائد البھیۃ)

(۵۴) امام عزالدین بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ

عبد العزیز بن عبد السلام بن ابوالقاسم بن حسن، سلمی، دمشقی، سلطان العلماء، عز الدین۔

آپ شافعی المسلک تھے لیکن خود بھی درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔

آپ کی ولادت دمشق میں ۵۷۷ھ یا ۵۷۸ھ میں ہوئی۔ آپ نے وہیں پرورش پائی اور زاویہ غزالی میں خطبات اور تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور پھر جامع اموی۔ کے خطیب رہے۔ آپ شیخ الاسلام ابن دقیق العید کے اُستاذ تھے اور اُمراء کے سامنے حق بات کہنے میں بہت جری تھے۔ دینی احکام کے بارے میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔

تاریخ کا یہ عجیب ترین واقعہ آپ کے ہی متعلق ہے کہ جب چند اُمراءِ سلطنت کی آزادی آپ کے نزدیک ثابت نہیں ہوئی تو آپ نے اُنہیں غلام قرار دیتے ہوئے، یہ طریقہ تجویز کیا کہ پہلے سرِ عام اُن کی بولی لگائی جائے اور پھر کوئی شخص اُن کو خرید ے اور آزاد کردے۔ اُن امراء کو شیخ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اس طریقۂ کار کو اپنانے کے بعد ہی وہ آزاد قرار پائے۔

آپ کی قیمتی تصانیف میں سے "التفسیر الکبیر" "قواعد الاحکام فی اصلاح الانام" "الالمام فی ادلۃ الاحکام" اور تصوف میں "مسائل الطریقۃ" ہیں۔

آپ کا انتقال ۶۶۰ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(الأعلام۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

☆......☆......☆

(۵۵) شیخ ابو المعین نسفی رحمۃ اللہ علیہ

میمون بن محمد بن محمد بن معبد بن مکحول، ابو المعین، حنفی، نسفی۔

آپ کی ولادت ۴۱۸ھ میں ہوئی۔ آپ سمرقند کے رہنے والے تھے اور بخارا میں رہائش رکھی۔

آپ کی تصانیف میں سے "بحر الکلام" "تبصرۃ الادلۃ" "التمہید لقواعد التوحید" "العمدۃ

فی اصول الدین" " العالم والمتعلم" " ایضاح المحجة لكون العقل حجة" "شرح الجامع الكبير" اور "مناهج الائمة" قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال ۵۰۸ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعةً

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۱۵۶) امام اثرم رحمۃ اللہ علیہ

احمد بن محمد بن ہانی، ابوبکر، اسکافی، اثرم، طائی۔ ایک قول کے مطابق کلبی۔

آپ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور ثقہ حفاظِ حدیث میں سے تھے۔ آپ کی پیدائش ہارون الرشید کے دور میں ہوئی۔ آپ نے امام احمد کے مذہب کی بہت خدمت کی اور اُن سے بہت سے مسائل روایت کر کے اُنہیں ابواب کی شکل میں مرتب کیا۔ آپ ایک عرصے تک محدّث ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی رہے۔

آپ نے علل حدیث پر ایک کتاب لکھی نیز ایک کتاب ''السنن فی الفقه علی مذهب احمد و شواهده من الحدیث'' بھی آپ کی تصنیف ہے۔

آپ کا انتقال بغداد کے قریب اسکاف بنی جنید نامی شہر میں ہوا۔ سنہ وفات میں کئی قول ہیں، ۲۷۳ھ یا ۲۶۱ھ یا ۲۹۶ھ وغیرہ۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(طبقات الحنابلة۔ سیر اعلام النبلاء)

☆......☆......☆

(۱۸۷) ہیثم بن جمیل رحمۃ اللہ علیہ

ابوسہل، انطاکی۔

آپ نے زہیر بن معاویہ اور امام مالک بن انس اور ان کے طبقہ کے دیگر محدثین سے حدیث روایت کی۔ ان

سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے احادیث لی ہیں۔

موسیٰ بن داؤد کہتے ہیں کہ یہ ہیثم طلبِ حدیث میں دو مرتبہ بالکل مفلس ہو گئے تھے۔ سفیان المصیصی کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس ایسے وقت آیا کہ ان کا سانس نکل رہا تھا اور یہ قبلہ رخ چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کی باندی ان کے پاؤں درست کرنے کیلئے سُتو لینے لگی تو انہوں نے فرمایا:

''اس پاؤں کو سیدھا کردو کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہ کبھی کسی حرام کی طرف چل کر نہیں گیا''۔

اکثر محدثین نے آپ کی توثیق کی ہے۔ البتہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے آخری عمر میں اختلاط پیش آنے کی نشاندہی کی ہے۔

آپ کا انتقال ۲۱۳ھ میں ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(تاریخ بغداد۔ سیر اعلام النبلاء۔ تقریب التھذیب)

☆......☆......☆

امام صیمری شافعی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالواحد بن حسین بن محمد قاضی، ابوالقاسم صیمری۔

علامہ سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں صیمری، بصرہ کی ایک نہر صیمر کی طرف نسبت ہے، جس پر کافی بستیاں آباد ہیں۔ صیمرۃ نام کا ایک شہر بھی ہے، جو دیارِ جبل اور خوزستان کے درمیان واقع ہے۔ میرا خیال نہیں ہے کہ یہ اُس کی طرف نسبت ہو۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ بظاہر ایسا ہی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ صیمری بصری ہیں۔

شیخ ابو اسحاق نے طبقات میں فرمایا ہے کہ صیمری، بصرہ میں رہے اور قاضی ابو حامد المروذی کی مجلس میں آتے رہے۔

یہ شوافع کے کبارِ اصحاب الوجوہ میں سے تھے۔ "المھذب" اور "الروضۃ" میں آپ کا بارہا ذکر آیا ہے۔ آپ سے بہت سے علماء نے علمی استفادہ کیا، جن میں سے ایک "الحاوی" کے مصنف قاضی ماوردی رحمہ اللہ بھی ہیں۔

ان کی تصانیف میں سے "الایضاح فی المذھب" سات جلدوں میں، "کتاب الکفایۃ" قیاس وعلل میں ایک کتاب، ادب المفتی والمستفتی پر ایک مختصر کتاب اور کتاب الشروط قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال ۳۸۶ھ میں ہوا۔

فائدہ: صیمری کی نسبت سے دو آئمہ مشہور ہوئے ہیں۔ایک تو یہی شافعی ہیں اور دوسرے حنفی ہیں۔جن کا نام حسین بن علی بن محمد بن جعفر، ابوعبداللہ، قاضی صیمری ہے۔

یہ بڑے فقہاء میں سے تھے اور ابوبکر جصاص رازی، ابوالحسن کرخی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوسعید بُردعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر اہل علم سے انہوں نے استفادہ کیا۔

ان سے علم حاصل کرنے والوں میں قاضی القضاۃ ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانی بھی ہیں اور ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی نے بھی آپ سے روایت حدیث کی ہے اور آپ کے بارے میں یہ کہا ہے:

"کان صدوقاً وافر العقل جمیل المعاشرة"۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے شاگردوں کے بارے میں آپ کی ایک ضخیم کتاب ہے' جس کا بہت سا حصہ علامہ کفوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ''طبقات'' میں نقل کیا ہے۔

آپ کا انتقال ۴۳۶ھ میں ہوا۔

رحمهما الله تعالیٰ رحمةً واسعةً

(الفوائد البهية)

☆......☆......☆

(۱۵۹) احمد بن حمدان حرانی رحمۃ اللہ علیہ
(صاحب صفۃ الفتوی)

احمد بن حمدان بن شبیب' نجم الدین' ابوعبداللہ' حرانی' حنبلی' القاضی۔قاہرہ میں رہائش پذیر رہے۔

آپ کی پیدائش حران میں ۶۰۳ھ میں ہوئی۔وہاں آپ نے کئی مشائخ سے سماع کیا' جن میں سے آپ کے آخری استاذ حافظ عبدالقادر رہاوی بھی ہیں۔دمشق میں آپ نے حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا اور اُن کے چچازاد علامہ مجدالدین عبدالسلام بن عبداللہ ابن تیمیہ (جو مشہور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا ہیں) کی مجلس میں بھی شرکت کی اور اُن کے ساتھ کئی مسائل میں ان کی بحث رہی۔

آپ قاہرہ میں نائب قاضی رہے اور آپ سے علامہ دمیاطی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ حارثی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ مزی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ برزالی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی استفادہ کیا۔آپ کی کئی تصانیف ہیں' جن میں سے "الرعاية الصغریٰ" "الرعاية الكبریٰ" "کتاب الوافي" اور "صفة الفتویٰ والمفتي والمستفتي" قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کا انتقال ۹۲ برس کی عمر میں ۶۹۵ھ کو ہوا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(شذرات الذھب)

☆......☆......☆

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ

عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد، ابوالقاسم، قشیری، نیساپوری، شافعی۔ زین الاسلام آپ کا لقب تھا۔

آپ تصوف کی بلند پایہ کتاب الرسالة القشیریة کے مصنف ہیں۔

آپ کی پیدائش ربیع الاول ۳۷۶ھ میں ہوئی اور انتقال نیساپور میں ۴۶۵ھ میں ہوا۔

آپ نے نمایاں اہلِ علم مثلاً ابوبکر محمد بن بکر طوسی رحمۃ اللہ علیہ، استاذ ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ، استاذ ابواسحٰق اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابوعبداللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔

طریقت میں آپ نے امام ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا اور انہوں نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کی شادی آپ سے کی۔

حدیث پاک کی روایت میں بھی آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ چنانچہ خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے احادیث لکھیں اور آپ کو ثقہ قرار دیا۔

رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً

(تاریخ بغداد۔ طبقات الشافعیة الکبریٰ۔ مقدمة التحقیق للرسالة القشیریة)

☆......☆......☆

سمعانی کبیر رحمۃ اللہ علیہ

المجموع کے حاشیہ میں ہے:

"شیخ نے سمعانی کی صفت کبیر اس لیے بیان کی کہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ ابوسعد سمعانی ہیں جو الانساب کے مصنف ہیں۔ یہاں مراد اُن کے دادا ابومظفر سمعانی ہیں جو کبار آئمہ شافعیہ میں سے تھے، اور اُن کا نام منصور بن محمد بن عبدالجبار بن احمد بن محمد بن جعفر بن احمد بن عبدالجبار ہے۔ آپ کی ولادت ۴۲۶ھ میں ہوئی۔

آپ پہلے حنفی تھے پھر مذہب شافعی اختیار کرلیا۔ الانساب میں ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو خط میں لکھا کہ "میں

نے وہ مذہب نہیں چھوڑا جس پر میرے والدِ گرامی تھے بلکہ میں تو صرف مذہبِ قدریہ سے منتقل ہوا ہوں"۔ یہ اس لیے کہا کہ اہلِ مرو کی اکثریت نے عقائد میں قدریہ کی پیروی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے قدریہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جو بیس حصوں سے زائد پر مشتمل تھی اور اُسے اپنے بھائی کے پاس ہدیہ بھیجا، جس پر وہ ان سے راضی ہو گئے اور اُن کا دل خوش ہو گیا۔

ان کی تفسیر سمعانی' تین جلدوں میں ہے۔ نیز "الانتصار لأصحاب الحديث" "القواطع" اصولِ فقہ میں "المنهاج لاهل السنة" اور "الاصطلام" ابوزید دبوسی رحمہ اللہ کی تردید میں' یہ بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

آپ کا انتقال ۴۸۹ھ میں ہوا۔

(الأنساب۔ الأعلام)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں مراد امام ابومظفر کے صاحبزادے اور امام ابوسعد "صاحب الأنساب" کے والد ہوں۔ جن کا نام محمد بن منصور بن عبدالجبار تمیمی' سمعانی' مروزی ہے۔ یہ فقیہ' محدث اور واعظ تھے۔ ان کی پیدائش ۴۶۶ھ میں ہے۔ ان کی کتاب ''الامالی'' ہے' جس میں ۱۴۰ مجالس ہیں۔

ان کا انتقال مرو میں ۵۱۰ھ میں ہوا۔

رحمهم الله رحمةً واسعةً

(الأعلام)

☆......☆......☆

(۲۲) ابن صباغ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالسید بن محمد بن عبدالواحد' ابونصر' ابن الصباغ۔ یہ شافعی فقیہ تھے اور اہلِ بغداد میں سے تھے۔ یہ مدرسہ نظامیہ بغداد کے بالکل ابتدائی مدرس تھے۔ آپ آخیر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ آپ کی کتاب "الشامل" فقہ میں "تذكرة العالم" اور "العدة" اصول فقہ میں ہیں۔

آپ کا انتقال ۴۷۷ھ میں ہوا۔

رحمة الله تعالىٰ رحمةً واسعةً

(الاعلام)

★ ... ★ ... ★

الفهارس

(۱)......فهرس الآيات الكريمة

(۲)...... فهرس الاحاديث النبوية و آثار الصحابة رضی اللہ عنہم

(۳)...... فهرس المسائل الفقهية

فهرس الآ يا ت الكريمة الواردة فی الکتاب
"اصول الافتاء و آدابہ"

فہرس أطراف الاحادیث النبویہ و آثار الصحابہ رضی اللہ عنہم الواردۃ فی الکتاب "اصول الافتاء و آدابہ"

☆......☆......☆

فہرس المسائل الفقہیة الواردة فی الکتاب
"اصول الافتاء و آدابه"

★ ★ ★

برائے یادداشت قارئین